ہندوستانی ادب مشرقی تہذیب کلچر اور مغرب کی انقلابی سوچ کا علمبردار

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

ایشیا

زیر سرپرستی

آنریبل ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا وزیر تعلیمات صوبہ بہار

(بہار گورنمنٹ کی طرف سے اسکولوں کیلئے منظور شدہ)

اڈیٹر: ساغر

سالانہ مجلد ایشیا سـ۶
سالانہ غیر مجلد ایشیا صہ

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت ایک نمبر مجلد عہ علاوہ محصول
قیمت ایک نمبر غیر مجلد عہ علاوہ محصول

آج کل لٹریچر میں ترقی پسندی، انقلاب اور ہمہ گیری کے خیال نے جگہ لے لی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانی زبان اور پرانے خیالوں کی بڑھوتری کا اب کوئی امکان نہیں۔ اور یہ شعور تو اس نیم مذہبی سیاسی شعور کی بھی ضد ہے۔ جو اس سے پہلے سماج پر اپنا اثر جمائے ہوئے تھا اور جسکے مظہر حالی اقبال اکبر اور پریم چند وغیرہ تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک چند برسوں میں یہ انقلاب کیونکر ہوگیا! ؟ یہ کیوں؟ بس یہی زندگی کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ نیم مذہبی سیاسی شعور کو قبول کرنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ فرد اُن تمام پرانی اور دقیانوسی باتوں سے تنگ آچکا تھا جو سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے غلیظ رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں اور اب اس کی روح آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر سماج اسی پرانی افیون کی پینک میں تھی ہاں مسلمانوں میں کسی قدر سر سید نے ذہنی آزادی کی روح دوڑائی تھی لیکن اس کی نوعیت بھی یہی تھی جیسے کونین پر شکر چڑھا کر مریض کو دی جائے۔ اس عمل کا بھی ردِ عمل ہونا ہی تھا چنانچہ نئے سیاسی واقتصادی تصورات ادب پر اپنا اثر جمائے بغیر نہ رہ سکے، اور مطالبہ کیا جانے لگا کہ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

آخر زندگی سے ادب کی ہم آہنگی کے معنی کیا ہیں!؟

(باتیں بڑی روکھی پھیکی ہیں، نہ ان میں استعاراتِ مجمل ومفصل کا ذکر ہے اور نہ ایطائے خفی وجلی کا، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اُس پر میں نے غور کیا ہے)۔

——— ہاں تو ادب سے زندگی کی ہم آہنگی کیا معنی رکھتی ہے!؟

واقعہ یوں ہے کہ عوام کی بیداری نے ادب برائے ادب (Art as a Art) کے نظریہ میں تو کوئی جان باقی رکھی نہیں، سماج کا ڈھانچہ ہی بدل گیا، اور نظامِ حکومت کی تبدیلی در تبدیلی نے فرد کی مطلق العنانی کا خاتمہ کردیا۔ اس انقلاب کے بعد "ادب برائے خدمت انسان" کے نظریہ نے قدرتی طور پر ایک ذی روح حیثیت اختیار کرلی۔ گویا اب ایک ادیب اور ایک افسانہ نگار ۱۹۰
و شاعر کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ کسی ایک فرد کے شاعرانہ ذوق کے مطابق شاعری اور ادب کا مصنوعی بچہ زچہ ایکٹرس کی طرح جنے بلکہ اب فرد کے بجائے اسکی پشت پر ہزاروں انسانوں کے ذوق اور ضرورت کا مطالبہ ہے اور اس مطالبہ کو قدرتی طور پر پورا کرنا ہی ادب کا زندگی سے ہم آہنگ ہونا ہے۔!

ادبی انقلاب کے دوران میں شعر و ادب کو مفید اور عام بنانے کیلئے سب سے پہلے ٹیکنک بدلنی پڑتی ہیں اور اسکے ساتھ ہی ایسی زبان میں لکھنا اور بولنا ضروری ہے جسے عوام زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں، سب سے پہلے تو بنیادی خیال کے انقلاب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے مگر اس وقت تک زیادہ تر ہماری اُردو شاعری اور ادب انہیں اخلاقیات اور فلسفوں کا غلام ہے جن میں انسانی ذہن ہزاروں سال سے اُلجھا ہوا ہے، دُنیا کا بڑے سے بڑا ادیب و شاعر فرد کو یہی تعلیم دیتا رہا ہے کہ "اتقا" بلندی ہے اور صبر کا پھل میٹھا، لیکن جو مستری سماج کی اخلاقی مشینری کے زنگ آلود کل پرزوں سے واقف ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ تعلیم کیوں دی جاتی تھی، یہ تعلیم طبقاتی مفاد کے لئے لازمی تھی، کیونکہ عوام میں صبر کرنے والے نہ ہوتے تو صبر نہ کرنے والوں کی زندگی خوشی اور چین سے کیونکر گزرتی!؟

میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک دُنیا کے بیشتر شاعروں نے اپنے وقت اور ماحول کا ساتھ دیا اگر وہ اپنے زمانہ کا ساتھ نہ دیتے تو زندہ رہ نہیں سکتے تھے ان کا زمانہ ان کی زبان سے بولتا تھا۔ اب ہندوستان کی نئی صبح ہے۔ انقلاب کی دیوی انگڑائی لیکر جماہی لیتی ہوئی اُٹھ رہی ہے، ہر طرف بیداری اور زندگی جھن رہی ہے، ہر طرف کامیابی اور ترقی کی دھندلی تصویریں سایوں کی طرح نظر آرہی ہیں، گو بہت کم

۳۰ جون ۱۹۳۹ء کو یاد رکھئے

۱۵ مئی ۱۹۳۹ء کو نہ بھولئے

ساغر کے مجموعۂ کلام

بادۂ مشرق کا نیا روپ

ساغر کوتا

(ناگری ایڈیشن)

(مع تازہ گیتوں، غزلوں اور نئی قومی نظموں کے جو بادۂ مشرق میں نہیں چھپیں)

۱۹۳۵ء میں ادبی مرکز میرٹھ نے بادۂ مشرق کو اُردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی زبان میں شائع کرنیکا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بادہ کا اُردو ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا اور آج مکتبۂ ساغر میں اسکی ایک جلد بھی باقی نہیں۔ اُردو زبان میں طبع ثانی سے پہلے ادبی مرکز اس وعدہ کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اس نے پبلک سے ناگری ایڈیشن کے متعلق کیا تھا، چنا۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ ناگری پڑھنے والی پبلک کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ٹھیک

۳۱ مئی ۱۹۳۹ء

کو بادۂ مشرق ناگری رسم الخط میں شائع ہو جائیگا۔ تمام کتاب جوں کی توں اُردو حروف کے بجائے ناگری حروف میں چھپیگی اور حاشیہ پر اُن الفاظ کے معنی آسان زبان میں لکھ دیئے جائینگے جن کو سمجھنے میں کچھ دقت ہوسکتی ہے۔ قیمت کے متعلق ابھی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ لیکن جو صاحب ۲ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ۱۵ مئی تک بنام ساغر نظامی ارسال فرمائینگے ان کو بہر حال کتاب مع محصول تین روپیہ میں ۳۱ مئی ۱۹۳۹ء کو ارسال کردی جائیگی۔

(۱۵ مئی ۱۹۳۹ء کے بعد رعایت نہیں دی جائیگی اس لئے کہ ۳۰ جون کو کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ ہوچکا ہے)

...رہیں سہی لیکن تغیر کی روح ذرہ ذرہ میں اس طرح محسوس ہو رہی ہے جیسے دق کے مریض کے رگ و پے میں صحت کی روشنی!

یہ ہے ہمارا آج کا ماحول، جس میں سوال ہوتا ہے کہ شاعری کیا ہے —— !؟

اپنی اپنی بولی میں بہت سے بزرگوں نے شاعری کی تعریفیں آپ کو بتائی ہیں۔ میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں، ہاں میں ان پیاسوں میں سے ضرور ہوں جو بتانے سے زیادہ جاننے کی فکر میں رہتے ہیں۔

شاعری کیسی ہونی چاہئے —— !؟ بہت سے اُستادوں نے آپ کو ہدایتیں کیں، مولانا حالی سے لیکر اس وقت تک آپ کو برابر یہ تنبیہ کی جاتی رہی کہ شاعری کیسی ہونی چاہئے۔ ابھی ایک سال ہی ہوا کہ اسی مشاعرہ کی مسندِ صدارت سے ایک بزرگ نے ہدایات اور احکامات کے دریا بہائے تھے۔

دُنیا کے قیام سے لیکر اس وقت تک حُسن اور شاعری کی اَن گنت تعریفیں کی گئیں مگر کسی تعریف پر دُنیا متفق نہ ہو سکی سو اب بھی کیا دعویٰ کیا جا سکتا ہے لیکن ۱۷ سال کے غور و فکر اور تجربات کی روح چند لفظوں میں بغیر کسی دعویٰ کے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

"شاعری" شاعر کے محسوسات، جذبات اور معتقدات کا رنگین عکس ہے۔

یہ شاعری کی خارجی تعریف نہیں، داخلی ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری، شاعر ہی کی روح کی پیداوار ہے، اور شاعر اپنے ماحول کی مخلوق! جذبات، محسوسات، اور معتقدات کو جامع اور حسین الفاظ میں ظاہر کرنے کی مہارت حاصل کر لینا ضرور خارجی اور مادّی ہے باقی تمام جوہر داخلی ہے۔

یاد رکھئے مصوری، موسیقی، بُت سازی، ان تمام فنون میں بھی اکتساب کو رائی بھر ہی دخل ہے، شاعری کی طرح بالکل نہ سہی لیکن مصوّر، مغنی، اور بُت ساز کے لئے بھی داخلی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک فطری شاعر، دنیا، اس کی چیزوں یا دُنیا سے اونچے معاملات پر فلسفیانہ غور و فکر کرتا ہے اور اپنے اعتقاد کو روح کی روشنی میں ترتیب دیتا ہے اُسے اپنے موضوع سے فطری لگاؤ ہوتا ہے وہ فطرت کے گہرے مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے —— یہ سب کیا ہے —— یہ سب کیوں ہے، اور دُنیا کو کیا اور کیسا ہونا چاہئے اس استفہام و تفہیم میں اسکی روح اُلجھی رہتی ہے، شاعری اسی داخلی اور خارجی ماحولی کشاکش کی مخلوق ہے۔

—— محض حسین لڑکیوں، خوبصورت مناظر، چمکتے دمکتے ہوئے لباسوں، پھولوں، ستاروں، آبشاروں، گاتی ہوئی ندیوں سے فطری شاعر کا متاثر ہونا، جمالیاتی ذوق کا کوئی کمال نہیں، بلکہ شاعر کی یہ عادت اسی پُرانے نظام جاگیردارانہ کی بنا پر پڑی ہے جس میں تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا جاتا تھا، اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ شاعر کو حُسن سے متاثر ہونا جرم ہے، میں یہ بار تو ذہنوں پر ڈالنا گناہ خیال کرتا ہوں، کہ شاعر کو کیا ہونا چاہئے۔ شاعر کو شاعر ہونا چاہئے۔ مگر محض حُسن ہی جاذب نہیں، بدصورتی بھی کشش رکھتی ہے، لچکتی ہوئی کمروں کے بجائے جھکی ہوئی کمروں کو دیکھ کر جس آنکھ سے اک بے ساختہ آنسو گر پڑے وہ آنکھ سب سے بڑی شاعر ہے۔

زندگی کے ایک ہی رُخ سے متاثر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نصف شاعر ہے اور اسکی شاعری یک رُخی اور ادھوری ہے۔ پُرانے زمانے کے شعراء اگر امراء کے نمائندے تھے تو موجودہ سوسائٹی کی ترتیب و تشکیل کے لحاظ سے اس زمانے کے شاعر عوام کے نمائندے ہونے چاہئیں۔

غالباً حقیقی شاعر ہر وقت اصلی حیثیت کو محسوس کرتا ہے کہ وہ قدامت کا چولا اُتار پھینکے اور جدت و انقلاب کی نمائندگی کرے۔

فہرست

قیمت سالانہ مجلد ۶ غیر مجلد ۵
قیمت ششماہی مجلد ۳ غیر مجلد ۳

قیمت ایک نمبر مجلد ۱۲
قیمت ایک نمبر غیر مجلد ۱۰ } علاوہ محصول

رسالہ ایشیا (سہ ماہی) اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۹ء

(مشترک نمبر)

اڈیٹر: ساغر نظامی — ادبی مرکز میرٹھ

غلطی

صفحہ ۹۹ پر کاروان ادب میں بہاری کی جگہ "پنہاری" ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے جس سوال پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ "کیا ہندوستان ایک واحد قومیت پیدا کرسکتا ہے؟" اس سوال کا جواب دینے سے پہلے قدرتاً ان کا ذہن "قومیت" کی تعریف کی جانب منتقل ہوتا ہے۔ قومیت کی تعریفیں "اتنی کثیر التضاد ہیں کہ یہی گھپلا اٹھتا ہے" اور اس لئے وہ قومیت کی بنیاد ایک "مشترک اخلاقی شعور" پر قائم کرتے ہیں "جس کا نفوذ ان سب افراد کی زندگی میں ضروری ہے جو ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہنا چاہتے ہوں" آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اجزاء اتحاد کے فقدان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف نسلی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ہندوستان میں یکسانیت نہیں بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی یہ ملک دو عظیم الشان تہذیبوں کا مجموعہ ہے یعنی "اسلام" اور "ہندومت" اس استدلال کے بعد وہ اس منطقی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان کیلئے مشترکہ قومیت کا راگ الاپنا جبکہ وہ تمام عناصر جن سے قومیت کی سرشت ہوسکے مفقود ہوں ایک بڑی ہٹ دھرمی ہے" اسکے بعد وہ کانگریس کے اس دعویٰ کی تغلیط کرتے ہیں کہ یہ ادارہ واحد قومیت بنانا چاہتا ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں واحد قومیت کا پیدا ہونا بحالات موجودہ قریب قریب محال ہے۔ اس لئے "واحد قومیت کی بنیاد پر کسی پروگرام کے چالو رکھنے پر اگر اصرار کیا گیا تو اسکے معنی یہی ہونگے کہ ہندو قومیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے" انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین جو واحد قومیت پیدا کرنے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک "مسلمانوں کیلئے اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتا" ان کی رائے میں واقعات یہ بتاتے ہیں کہ کانگریس ہندوستان میں "ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے" کانگریس کے پروگرام اور نصب العین کو لغو اور عبث ثابت کرنیکے لئے ڈاکٹر صاحب نے "تہذیبی تحفظات" کے سلسلہ میں ایک قابلِ غور نکتہ پیش کیا ہے۔ مسلمانوں کے تحفظ کے یہ معنی ہونگے کہ شریعت اسلامیہ کے مفادات کا بھی تحفظ کیا جائے" اگر ایسا ہو اور زندگی ان سب شعبوں کو جن پر شریعت محیط ہے بلاشرکت غیرے مسلمانوں کے لئے محفوظ رہنے قرار دیا جائے تو پھر نظم و نسق کے تمام اہم شعبوں میں جن میں عدالت، کوتوالی اور تعلیم بھی شامل ہونگے۔ مسلمانوں کیلئے متوازی انتظامات کرتے پڑینگے اور اگر یہ انتظامات کردئے جائیں تو سوال یہ ہے کہ پھر حکومت کے پاس کیا رہ جائیگا جس کی بنیاد پر وہ سارے ملک کیلئے متحدہ قومیت کے ڈھانچہ کو کھڑا کرسکے"

متحدہ قومیت کے امکانات کا بطلان کرنے کے بعد مقالہ زیرِ نظر میں ہندوستان کے مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اس حل کی بنیاد دو اہم مسلمات پر رکھی گئی ہے۔ (۱) ہر قوم کی تہذیبی آزادی اور (۲) ہندوستان کا سیاسی اتحاد۔ تہذیبی آزادی کے معنی اس مقالہ میں یہ سمجھائے گئے ہیں کہ ہندوستان کو ایسی آزاد مملکتوں میں تقسیم کیا جائے جو یا تو خالص ہندو تہذیب کے زیرِ فرمان ہو یا خالص مسلم تہذیب کے۔ اور ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی تشکیل ان آزاد مملکتوں کے ایک "عہدیہ" یا "وفاق" کے ذریعہ کی جائے اور ان تہذیبی منطقوں کی تشکیل آبادی کے تبادلوں کے ذریعہ عمل میں لائی جائے یعنی تمام مسلمان سمٹ کر مسلم تہذیبی منطقوں میں آباد ہوجائیں اور اسی طرح تمام ہندو اپنے تہذیبی منطقوں میں۔ اس تقسیم کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ نقشہ دیکھا جائے جو فاضل مفکر نے مرتب کیا ہے قارئین کی دلچسپی اور آسانی کے لئے ہم دوسرے صفحہ پر اس نقشہ کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تہذیبی حلقے یہ ہیں:۔ (۱) شمالی مغربی حلقہ (۲) شمالی مشرقی حلقہ (۳) دہلی اور لکھنؤ کا حلقہ (۴) دکن کا حلقہ (۵) مسلمانوں کے چھوٹے منطقے جو راجپوتانہ، گجرات، مالوہ اور مغربی ہند کی دیسی ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے تجویز کئے گئے ہیں اور جو بھوپال، ٹونک، جوناگڈھ، جاورہ اور دوسری اسلامی ریاستوں پر مشتمل ہیں۔ اسکے علاوہ باقی تمام ہندوستان ہندو تہذیبی حلقوں کو دیدیا گیا۔

یہ ہے مجمل خاکہ اس اسکیم کا جو ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کے نزدیک موجودہ حالات میں ہندوستان کی سیاسی دورکر سکتی ہے۔ قطع نظر اس واقعہ سے کہ یہ خلقی اسکیم اپنے اندر کتنے قابل عمل امکانات رکھتی ہے ابتداء میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس اسکیم میں ہندوستان کے ان کروڑہا انسانوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے جو ہریجن، یا صحرائی، یا عیسائی، یہودی یا پارسی، سکھ ناموں سے موسوم ہیں۔ یہ فروگذاشت اتفاقی نہیں بلکہ دانستہ ہے اس لئے کہ فاضل مفکر نے اسی مقالہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ "ہریجنوں کا مسئلہ ایک بالکل جداگانہ بنیاد پر قائم ہے۔ ان کا طبقہ کچھ چھوٹا نہیں ہے وہ کروڑہا کی تعداد میں سارے ملک میں منتشر ہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی پائے جاتے ہیں .... ان کی کوئی مشترکہ تہذیب بھی نہیں ہے"........... انہیں اس امر کی کامل آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی جگہ ہندو قومیت یا کسی دوسری قومیت میں حاصل کرلیں۔" اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہریجن لوگوں کو یا تو ہندومت اختیار کرنا ہوگا اور یا اسلام، اس لئے کہ ہندوستان صرف انہیں دو تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن بالفرض اگر ہریجن عیسوی مذہب میں ضم ہوجانا طے کریں تو پھر ان کیلئے ہندوستان میں کون سی جگہ تجویز کی جائیگی آزادی فعل کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ آپ کسی پسماندہ طبقہ کو ہندو یا مسلمان بن جانے پر مجبور کریں

اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تہذیبی تقسیم میں ہندو یا مسلمان کے علاوہ کسی اور مذہب یا گروہ کو کوئی اور حصہ عطا نہیں کیا گیا۔ ایک یہی نقص اتنا عظیم الشان ہے کہ اس اسکیم کا بروئے کار لانا نہ صرف احمقانہ بلکہ شدید ناانصافی ہے۔ ہندوستان ہر اس فرد کا ملک ہے جو اس سرزمین پر پیدا ہوا ہے اس کے وہ پیدائشی حقوق جو بحیثیت انسان کے اسے حاصل ہونے چاہئیں بجز جبر و استبداد کے اس سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے۔ اگر اس تہذیبی تقسیم کا مآل کار یہ ہے کہ مسلمان اور اعلیٰ ذات کے ہندو تمام ہندوستان کو ہڑپ کرلیں تو اس اسکیم کو زمانہ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام سے سبق حاصل کرنا چاہیے جو محض اپنی حد بندیوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہوکر رہا۔ یہ کتنا
۸ بیرحمانہ فیصلہ ہے کہ چونکہ ہریجنوں کی کوئی مستقل تہذیب نہیں اس لئے انہیں ہندو یا مسلم قومیت اختیار کرلینی چاہئے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر انہیں مسلمان یا ہندو سماج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ انصاف پسندی کے یہ معنی تھے کہ ہریجنوں کے لئے بھی سرسبز و شاداب حلقے تجویز کئے جاتے جہاں وہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے۔ مذہبی تہذیب کی بناء پر ہندوستان کا تقسیم کرنا اور وہ بھی محض دو مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بانٹ لینا اعلیٰ درجہ کی ڈکیتی ہے۔

فاضل مفکر نے اس مقالہ کی ابتدا چند مفروضات سے کی ہے۔ پہلے انہوں نے ان مفروضات کو مسلمات کا درجہ دیا اور پھر بڑی پھرتی سے حسب دلخواہ نتائج برآمد کرلئے۔ اگر گہری نظر سے فاضل مفکر کے نفسیات کی تحلیل کی جائے تو یہ سمجھ لینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ انہوں نے پہلے نتیجہ سوچ لیا تھا اور پھر اسی کے مطابق صغریٰ و کبریٰ مرتب کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "قومیت" کی تعریف کرنے سے وہ گھبرا اٹھے۔ لیکن "اخلاقی شعور" کو بیدریغ استعمال کرتے چلے گئے ہیں اور اس اخلاقی شعور کو ہی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے لیکن یہ "اخلاقی شعور" کیا چیز ہے؟ کن موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے؟ اسکی وجہ صرف مذہب ہی مذہب ہوتا ہے یا زمانہ کے تقاضات ماحول کی کارفرمائیوں اور عقل انسانی کے ارتقار کا بھی اس میں کوئی دخل ہے؟ اس میں شک نہیں کہ کسی زمانہ میں "اخلاقی شعور" مختلف مذاہب کی تعلیمات کے زیر اثر نشو و نما پاتا تھا۔ اس وقت انسانی حیات میں مذہب سب سے زیادہ دخیل تھا لیکن ارتقار کے موجودہ درجہ پر مذہب ایک انفرادی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ امریکہ یا یورپ کا "اخلاقی شعور"، "مسیحی شعور" ہے۔ حیرت ہے کہ ایسا فاضل اس قسم کی فاحش غلطی کا ارتکاب کرے۔ تاریخ یورپ کے معمولی طلباء اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یورپ کی "قومیت" کی ابتداء مذہبی عالمگیر استبدادیت کے خلاف بطور بغاوت ہوئی تھی اور یورپ و امریکہ کا موجودہ نظام سوسائٹی

قومی نظام ریاست (Nation State System) پر مبنی ہے۔ باوجود مذہب کی نام نہاد یکسانیت کے یورپ کے ہر ملک کا "اخلاقی شعور" قومی احساس کے ماتحت ہے۔ اور قومی احساس ذہنی ارتقاء کا براہ راست نتیجہ ہے "اخلاقی شعور" کا سوال اٹھانے کا راز شاید اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت بننے کے امکان سے انکار کیا جائے۔ یہ اعلیٰ طبقا کی نمائندگی ہے ورنہ مسلمان اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ مصر، ترکی، ایران، افغانستان اور دیگر اسلامی ریاستوں میں کوئی اسلامی شعور کار فرما نہیں ہے بلکہ خالص اور سیدھا سادا وطنی شعور ہے۔ یہ سب کے سب اپنے آپ کو مختلف قومیں کہتے ہیں اور ان کا اخلاقی شعور" قومی احساس کے ماتحت ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جس طرح دوسرے ممالک میں اخلاقی شعور کی وجہ مذہب نہیں ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی "اخلاقی شعور کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسکی تازہ ترین مثال فلسطین میں موجود ہے۔ وہاں کے باشندے بحیثیت مسلمان کے آزادی طلب نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کا مطالبہ عرب قوم کی آزادی کا ہے۔ وہاں کا "اخلاقی شعور" مذہب کی بنیادوں پر نہیں ورنہ عیسائی اور مسلمان جو مذہبی حیثیت سے دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں دوش بدوش تحریک آزادی میں حصہ نہ لیتے۔

افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں واحد "اخلاقی شعور" کے موجود ہونے سے محض اس لئے انکار کیا ہے کہ انہیں دو تہذیبیں ثابت کرنی تھیں جو مذہب کے زیر اثر قائم ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ دو تہذیبیں کب تیار ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے مسلم فاتحین کی تہذیب کوئی اسلامی تہذیب نہ تھی۔ بلا شبہ عبادات کا طریقہ اسلامی تعلیم کے ماتحت تھا لیکن معاشرت حتیٰ کہ سیاسی قوانین اور جزا و سزا کے قوانین بھی اسلامی نہ تھے۔ اسلامی تہذیب جو حقیقتاً عرب کی ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ کچھ یونانی آمیزش اور زیادہ تر ایرانی آب و ہوا میں رہ کر اپنا چہرہ بدل چکی تھی اور اب اس میں نہ وہ سادگی تھی اور نہ وہ خلوص جو قرون اولیٰ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ترکی فاتحین آئے اور ایک مخلوط تہذیب ساتھ لائے جو نہ خالص ترکی تہذیب تھی اور نہ اسلامی۔ ہندوستان میں اس تہذیب نے یہاں کی دیسی تہذیب سے کافی اثرات قبول کئے اور خود ملکی تہذیب پہ کافی حد تک اثر انداز ہوئی۔ خوراک، لباس، شادی موت کے رسم و رواج جو مسلمانوں کی حکمرانی کے دوران میں موجود تھے اور جو اب تک مغربی تہذیب کے کثیر اثرات کے باوجود بہت کچھ موجود ہیں ہرگز اسلامی تہذیب کے آئینہ دار نہیں کہے جا سکتے۔ بلاشبہ کلچر کی بعض فروع میں اختلافات موجود ہیں لیکن یہ اختلافات قومی زندگی میں حائل نہیں ہو سکتے۔ یہ مسئلہ فی نفسہٖ غور طلب ہے کہ آیا ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کلچر کا اختلاف مذہبی وجوہ کی بنا پر ہے یا مختلف صوبوں کے طبعی حالات، آب و ہوا طریق پیداوار اور ماحول پر مبنی ہے۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا کلچر ایک نہیں۔ یو۔ پی اور مدراس کے مسلمانوں کے طرزِ معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہے وعلیٰ ہذا۔ پھر مذہب کو ایک مشترک عنصر قرار دے کر کلچر کی غیر یکسانیت پر حجت لانا کہاں تک حق بجانب ہے یہ مسئلہ کلچر کا تجزیہ ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے بھی کیا جا سکتا ہے وہ زاویہ سوسائٹی کے مختلف طبقات کے کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ دربارِ میسور کا کلچر وہی ہے جو دربارِ نظام کا کلچر ہے۔ جو کلچر مسٹر محمد علی جناح کا ہے وہی کلچر بھولا بھائی ڈیسائی، جواہر لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کا ہے۔ اور جو کلچر ایک مسلمان مزدور یا کسان کا ہے وہی کلچر ایک ہندو مزدور یا کسان کا ہے۔ اس لئے کلچر کا نعرہ لگانا اور اس طریق پر کہ ہندو مسلمانوں کو دو جدا جدا قومیں ثابت کیا جائے ایک مجرمانہ فعل ہے جس کا مقصد فرقہ پرستی کی آگ کو مذہبی جنگاری کے ذریعہ بھڑکانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس مسئلہ پر اگر زیادہ قریب سے نگاہ ڈالی جائے تو روز روشن کی طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں دو تہذیبوں کو نمایاں

کر کے دکھانے کا مشغلہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور اصلیت سیاسی اغراض میں لپٹی ہوئی ملے گی۔ برطانی سامراج کے قیام اور کامیابی کا مدار ہی ان نوزائیدہ تہذیبوں کی ٹکر پر منحصر ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اس سے پہلے بھی ہندوستان میں رہتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے تحت ہندو رعایا بستی تھی اور ہندو حکمرانوں کے زیرنگین مسلم رعایا زندگی بسر کرتی تھی۔ ہر جگہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق و اتحاد سے رہا کرتے تھے۔ لڑائیاں ملک گیری کی ہوس کا نتیجہ ہوتی تھیں نہ کہ مذہب یا اختلاف تہذیب کی وجہ سے۔ اگر کسی نے صحیح تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے تو اسے یہ حقیقت معلوم کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگے گی کہ بیسویں صدی سے قبل تک ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار اور برادرانہ تھے۔ اب بھی وہی دو قومیں اس ملک میں آباد ہیں اور ظاہر ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے کی امداد کی محتاج ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے زیرسرپرستی دو مِل جُل کر رہ سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں وہ کیوں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جائینگے۔ باہمی بدگمانی اور گائے اور باجے کا سوال کوئی حقیقی سوال نہیں اور نہ اس کی زندگی کچھ زیادہ ہے۔ یہ اس وقت تک قائم رہے گا جبتک خارجی مفادات کا ہندوستان سے تعلق ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں اس وقت تک جان رہے گی جبتک ہمارے چند تعلیم یافتہ افراد اپنی ملازمتوں اور ممبریوں کی خاطر عوام کو بھڑکانا بند نہ کرینگے۔ متنازعہ فیہ مسائل جس قدر بھی ہیں عوام کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زہریلے مادہ کا سرچشمہ اعلیٰ طبقوں کے مفاد کے تحفظ کی جدوجہد میں ملے گا۔ اسی مفاد کی خاطر ہندوستان کے کلچر میں فرق کیا جاتا ہے اور اسی مفاد کے تحفظ کے لئے دو تہذیبوں کے وجود کی نفیری بجائی جاتی ہے۔ ورنہ حقیقت میں تہذیب کا اختلاف ہندو اور مسلمان کی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ جغرافیائی خصوصیات سے وابستہ ہے۔ کسان اور مزدور خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی قسم کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور ان کا مفاد بھی ایک ہی ہے۔

مقالہ زیرنظر میں یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت نہیں بنائی جا سکتی۔ اور اگرچہ فاضل مصنف نے قومیت کی تعریف سے گریز کیا ہے تاہم یکساں "اخلاقی شعور" کو واحد قومیت کا ایک ضروری عنصر قرار دے کر نہایت ہوشیاری سے "قومیت" کی تعریف بھی کر دی ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ خود "اخلاقی شعور" کی اصطلاح کی مصنف نے کوئی تعریف نہیں بتائی۔ ہمارے نزدیک "اخلاقی شعور" کی اصطلاح خود ایک معمہ ہے۔ تاہم ایک اچھا ہندو اور ایک اچھا مسلمان جس "اخلاقی شعور" کا حامل ہوتا ہے وہ ہرگز ہرگز قومیت کے منافی نہیں اور نہ کوئی علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ قومیت کے معنی نہ ہندو غلبہ ہیں نہ مسلم استیلاء کے۔ اس لئے ہندو اور مسلمانوں کا "اخلاقی شعور" اگر جدا جدا بھی ہے تو بھی اس کا قومیت کی تعمیر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لئے کہ "قومیت" کے مبادیات میں ہر فرد کے لئے آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ عمل داخل ہے۔ بشرطیکہ وہ دوسرے افراد کے حقوق پر دست انداز نہ ہو۔ انگلستان میں یہودی آباد ہیں اور ایک زمانہ تھا کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ تھا لیکن ان کا مذہب انگلستان کی "قومیت" کی تشکیل میں مانع نہ ہوا۔ امریکہ میں مذہب کی بنا پر قومی حقوق تقسیم نہیں کئے گئے۔ ہر وہ شخص جو امریکی قومیت میں داخل ہو چکا ہے اس نظام کا ایک رکن ہے اور تمام وسائل و ذرائع سے متمتع ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان کا اخلاقی شعور صرف قومی احساس کا پروردہ ہے۔ روس میں صدہا نسلیں اور سینکڑوں زبانیں بولنے والے انسان رہتے ہیں۔ مذاہب کا بھی کافی اختلاف ہے۔ بایں ہمہ یہ سب لوگ بخوشی ایک نظام میں شامل ہیں۔ چین میں کتنے مذاہب ہیں لیکن ہر چینی قومیت کے سلسلہ میں منسلک ہے۔ ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب "قومیت" کا منافی نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو چین میں جہاں مسلمان، عیسائی، اور بدھ، کروڑہا کی تعداد میں ہیں جدا جدا تہذیبی حلقے قائم کر کے چین کے حصے بخرے کر لیتے۔ حقیقت میں اکثر افراد یہ غلطی کرنے کے عادی ہیں کہ وہ اصطلاحات رائج الوقت کی تعریفات، کتابوں میں تلاش کیا کرتے ہیں۔ "تعریفات" میں بھی

اسی عجلت کے ساتھ انقلاب ہوتا ہے جیسا کہ سیاسی دُنیا میں۔" قومیت " کے اجزا رکا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے بھی اسی قسم کی غلطی کی ہے۔" قومیت " کے لئے جن اجزا مشترک کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان میں سب سے بڑی چیز اقتصادی وحدت ہے۔ ہر شخص مذہب اور کلچر کی طرف دوڑ جاتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں کرتا کہ اس مشترک مفاد پر بھی ایک منٹ کے لئے غور کرے جو حقیقتاً کل مفادات کی جڑ ہے۔

ہندوستان صدیوں سے ایک قسم کی اقتصادی وحدت قائم کرتا چلا آیا ہے مسلم حکمرانوں نے اس وحدت کو اور بھی استوار کیا اور یہ" مشترک اقتصادی شعور" اب اس درجہ وسیع اور گہرا ہو چکا ہے کہ اسے تہذیبی تقسیم کے ذریعہ شکست نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہندوستان میں واحد قومیت کی تشکیل ارتقائی سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہے جو ہو کر رہے گی۔ بدگمانیاں، اور تہذیب و کلچر کا شور صرف ایک محدود حلقہ میں گونج رہا ہے۔ کسان اور مزدور جو ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ہنوز بالکل گونگے اور بہرے ہیں جس وقت انھیں یہ علم ہو جائے گا کہ کس طرح مذہب اور کلچر کا نام لیکر ان کے مفادات کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو انتشار پیدا کرنے والے تمام عناصر کو ایک ایک کر کے قومی جسم سے نکال باہر کردینگے۔ اور ہندو مسلم ملاپ کی گتھی چشم زدن میں سلجھ جائیگی۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے سیاسی بازی گروں کے دلوں میں بدگمانیاں ہیں تو ہوا کریں لیکن فیکٹریوں کے مزدوروں اور گاؤں کے سیدھے سادے دہقانیوں میں اب بھی ملاپ ہے اور کوئی بدگمانی نہیں۔ ہندوستان میں آج کل جو ہلچل ہے اسکے اسباب پر ایمانداری سے غور کرنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہلچل پیدا کرانے والے کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو برسرِ اقتدار رہنا چاہتا ہے اور جسے یہ خیال ہے کہ اگر متحدہ قومیت قائم ہوگئی تو ان جیسی ذہنیت کے انسانوں کو اس بلندی سے نیچے اُترنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت براجمان ہیں۔ جو لوگ فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا جھنڈا اُڑائے پھرتے ہیں انکی یہ ذہنیت کچھ طبقاتی مفاد سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ انگریزی راج کے برکات کا نتیجہ ہے۔ ورنہ " قومیت " کی تشکیل دورِ حاضر کی ایک ہوجد حقیقت ہے اور ہیئت اجتماعیہ کے ارتقاء کی ایک ضروری کڑی ہے۔ قومیت کا نتیجہ " شہری حقوق " کی آزادی ہے اور شہری حقوق قریب قریب سب کے یکساں ہوتے ہیں۔ آزادئ ضمیر، شخصی قانون کا تحفظ اور اسی قسم کے دیگر مسائل " قومیت " کے مبادیات میں شامل ہیں اور ہندوستان کا کوئی دستور انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر غلامی کی حالت میں عبادات اور معاشری قوانین میں ایک غیر ملکی حکومت دست انداز نہیں ہوئی اور ہندو و مسلمان مسجدوں اور مندروں میں آزادی کے ساتھ عبادتیں کرتے ہیں نیز معاشرتی معاملات میں اپنے اپنے مذاہب کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی انہیں آزادی حاصل ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک قومی جمہوری حکومت کے ماتحت یہ آزادی کس مصلحت کی بنا پر واپس کرلی جائے گی۔ کیا ہندو اس بات کو پسند کر سکتے ہیں اور اگر پسند بھی کریں تو کیا وہ حکومت کو ایک لمحہ کیلئے چلا سکتے ہیں جبکہ ہندوستان کے نو کروڑ باشندے تلملاتے رہیں۔ کوئی قوم اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ وہ قومیت کی تشکیل کی خواہشمند بھی ہو اور ساتھ ہی اس قومیت کے ایک زبردست حصّہ کو بے چین رکھے۔ بدگمانی ایک مصنوعی اور عارضی بات ہے اور قومی حکومت ہی اس کا علاج ہے۔ یہ بڑا زبردست فریب ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں ضم ہوئے بغیر متحدہ قومیت کی بنا نہیں ڈال سکتے۔ چین اور یوگوسلاویہ میں مسلمان کسی دوسرے مذہب میں ضم نہیں ہوئے لیکن قومیت متحدہ کے ارکان ہیں۔ فلسطین، شام، عراق اور مصر کے عیسائیوں نے اپنے مذاہب کو خیر باد نہیں کیا اور اسکے باوجود وہ قومیت متحدہ میں شامل ہیں۔ یہ تمام نظائر اور حقائق اس بات کے سمجھنے کیلئے کافی ہیں کہ " قومیت متحدہ محض مذہبی کیسانیت کی محتاج نہیں ہے۔ ان ممالک کے تمام عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی تہذیب اور بقول فاضل مصنف کے ان کا " اخلاقی شعور " یقیناً مذہبی روایات کے زیر اثر ہے لیکن بایں ہمہ ان کا " وطنی یا قومی شعور " اتنا ہی قوی ہے جتنا کہ مذہب سے پیدا شدہ " اخلاقی شعور "

اس اسکیم کے متعلق شروع میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ پست اقوام کا کوئی حل اس نے پیش نہیں کیا اور محض اس بنا پر بھی یہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں یا ہندوؤں کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ کروڑہا انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق دوسری قوموں میں ضم ہو جانیکا حکم دیں۔ یہ صاف اور صریح ہٹلریت ہے۔ اسکے علاوہ اس اسکیم کے اور گوشے بھی غور طلب ہیں۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان کو فاضل مقالہ نگار کی تجویز کے مطابق تہذیبی اصول پر خود مختار حکومتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان جداگانہ تہذیبی حلقوں کو ایک مشترک سیاسی مرکز سے وابستہ بھی کر دیا جائے تو مرکز اور ان خود مختار ریاستوں کے مابین رشتہ کیا ہوگا؟ آیا "مرکز" کوئی فرمانروا ادارہ ہوگا یا محض "نگراں انجمن"۔ اگر فرمانروا ادارہ ہوگا تو اسکے لئے لازمی ہے کہ اسکے پاس اپنے احکام منوانے کیلئے کافی طاقت ہو یعنی یہ کہ فوج اسکے قبضے میں ہونی چاہئے۔ اس فرمانروا ادارہ میں اقلیت اور اکثریت کے سوال کو کیسے طے کیا جائیگا۔ فاضل مصنف کی بدگمانی کے مطابق ہندو یقیناً مرکز میں اپنی طاقت کو زیادہ رکھے گا اور جب مرکز میں ہندو طاقتور ہوگا اور ہندو ذہنیت "ہندو راج" (بقول مقالہ نگار) قائم کرنا چاہیگی تو اسے ایسا کرنے سے کون سی طاقت باز رکھے گی۔ برخلاف اسکے اگر مرکزی ادارہ محض ایک "نگراں انجمن" ہوگا تو اسکی طاقت محض اخلاقی طاقت ہوگی اور اسکی پوزیشن بالکل وہی ہوگی جو یورپ میں لیگ آف نیشن کی ہے جس طرح یورپ میں ہر قوم اپنی برتری اور مفاد کی خاطر دیگر اقوام سے برسر پیکار رہتی ہے اسی طرح ہندوستان کی یہ خود مختار ریاستیں اپنے پڑوسیوں سے دست و گریباں ہونے میں پس و پیش نہ کرینگی۔ وہ کونسی ضمانت اور طاقت ہوگی جو ہندوستان کی ان متعدد فرمانروا جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف چیرہ دستی کرنے سے روک سکے گی۔ ظاہر ہے کہ مرکزی ادارہ بالکل بے بس ہوگا اس لئے کہ اسکے قبضہ میں نہ فوج ہوگی اور نہ پولیس۔ حشر وہی ہوگا جو اس وقت یورپ کا ہو رہا ہے یعنی بین الاقوامی انتشار اور بے آئینی۔ ممکن ہے کہ اس وقت واضعین دستور ولسن کی طرح "انجمن اقوام" پر بھروسہ کر بیٹھیں اور باوجود ان تمام بدگمانیوں کے جن کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے انسان کی فطری نیکی میں یقین کر کے بزعم خود یہ سمجھ لیں کہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل ہو گیا لیکن آئندہ نسلیں واضعین دستور کے منشاء کو نہیں دیکھیں گی بلکہ ان علیحدہ علیحدہ 1
. . . . خود مختار حکومتوں میں پل پل کر جوان ہوں گی اور ان کے حوصلے وہی ہونگے جو ہٹلر یا مسولینی کے ہیں۔ یہ تمام حقائق ہیں اور کسی حل کو قبول کرنے سے پہلے ان پر غور کرنا ضروری ہے۔

اسکے ماسوا، یہ اسکیم ناقابلِ عمل بھی ہے۔ اسکیم زیر بحث کی بنیاد آبادی کے تبادلہ پر ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جبتک ہندو اور مسلمان دونوں اسے قبول نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ہندو، ہندوستان میں "ہندو راج" قائم کرنا چاہتا ہے اور یہ اسکیم ہندو راج کے قیام کے بالکل منافی ہے۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس آلہ کو بھی بتا دیتے جس کے ذریعہ سے ہندو کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس اسکیم کو قبول کرلے۔ ایک طرف یہ بدگمانی کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک جگہ زندگی بسر نہیں کر سکتے اور دوسری طرف یہ حسن ظن کہ ہندوؤں سے یہ توقع کہ وہ ایسی اسکیم کو منظور کرلیں جو ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے والی ہو۔ بلاشبہ ڈاکٹر عبداللطیف جیسا معصوم انسان ہی اس قسم کی جسارت کر سکتا ہے۔ مزید براں آبادیوں کا تبادلہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا کہ فاضل مقالہ نگار سمجھے ہوئے ہیں۔ کسی فرد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا اس وقت تک ممکن نہیں جبتک وجہ ترغیب کافی قوی اور دلکش نہ ہو۔ دوآبہ کے کروڑہا ہندوؤں کو ان کی ہزارہا سال کی جنم بھومی سے جدا کرنا اور یہاں کی اچھی آب و ہوا اور سرسبز و زرخیز میدانوں سے محروم کر کے پورب کی ناموافق آب و ہوا میں آباد کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ . . . .

. . . . اسی طرح مالابار۔ بمبئی اور دیگر مقامات کے مسلمانوں کو راجپوتانہ کی مسلم ریاستوں یا حیدرآباد کی چٹیل سرزمین میں لا کر بسانا ان کے لئے کچھ کم اذیت رساں نہ ہوگا اور غالباً وہ اس تبادلہ کیلئے کسی قیمت پر بھی

تیار نہ ہونگے۔ پھر وہ کونسی طاقت یا ایجنسی ہوگی جو عوام کو ان کی مرضی کے خلاف نامانوس علاقوں میں آباد ہو جانے پر مجبور کرے گی۔ کروڑہا انسانوں کا اِدھر اُدھر کرنا بغیر ان کی اپنی خواہش اور مرضی کے ممکن نہیں۔ دیگر ممالک کی مثالیں یہاں چسپاں نہیں کی جاسکتیں اس لئے وہاں آبادی کا تبادلہ یا تو اقتصادی ضرورت کی بنا پر ہوا ہے اور یا اذیتوں سے بچنے کے لئے اور ان میں خود عوام کی مرضی کو زیادہ دخل تھا۔ اسکے علاوہ یہ تبادلے اتنی کثیر تعداد پر مشتمل نہ تھے جتنی کثیر تعداد اس تہذیبی تقسیم کی رو سے عمل میں آئے گی۔ ہندوستان میں تبادلہ آبادی نہ تو اقتصادی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آئے گا اور نہ اذیت سے بچنے کے لئے اور پھر یہ عوام کی مرضی کے خلاف بھی ہوگا ایسی صورت میں اسکے امکان کا تصور صرف ایسا ہی شخص کرسکتا ہے جو جنت حمقا میں بیٹھ کر ناممکنات کا خواب دیکھنے کا عادی ہو۔

غرضیکہ جس پہلو سے بھی اس تجویز پر غور کیا جائے یہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں تاخیر ہوسکتی ہے لیکن اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ متحدہ قومیت کی موافقت میں اتنے قوی دلائل ہیں کہ کسی مفکر کے تصورات اور قلبی واردات اسکی ضرورت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ یہ ساری مصیبت اس لئے نازل ہوئی ہے کہ موجودہ فضا کو ایک مستقل حالت قرار دے کر اس پر نتائج اخذ کئے گئے ہیں حالانکہ قوموں کی زندگی میں ایسے حادثات ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جب کبھی کسی نئے نظام کی آمد ہوتی ہے تو پرانے نظامات مذہب اور کلچر کی دُہائی دے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ کا رجحان اور ارتقا کا مضبوط ہاتھ ہونیوالی چیز کو پورا کرکے چھوڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اسکیم بھی اسی قسم کی فکری بے اعتدالی ہے۔ اور چونکہ انہوں نے ہندوستان کے مرض کی تشخیص غلط کی ہے اس لئے نسخہ بھی غلط ہی تجویز کردیا ہے۔

یحییٰ

۱۳

نیا ادب اور اسکے عناصر

سیاسی بیداری ملکوں اور قوموں کے ادب پر ہمیشہ اثر ڈالا کرتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بیداری نے پہلے پہل سماج میں اُن بنیادی تصورات کو شک کی نگاہ سے دیکھا جو قدامت سے اس کو ورثہ میں ملے تھے اور جن کو مٹانے یا جن کو سمجھنے کا خیال بھی کبھی کسی فرد کو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اپنے ماحول کو اس طرح سمجھنے کا خیال جب سماج میں زیادتی سے پیدا ہوا تو سب سے پہلے جس چیز پر نظر گئی وہ سیاسی تھی یعنی ملکی غلامی۔

مسلمان رہبر ہوں یا ہندو لیڈر، سب کے سب قدیم سماج اور پُرانی سماج کے اخلاقی رنگوں میں رنگے ہوئے تھے لہذا انہیں اس ملکی غلامی کا علاج حال سے رجعت اور بغاوت میں نظر آیا؛ یعنی اگر محمد علی نے کہا کہ یہ تمام سماجی و سیاسی امراض محض اس لئے ہیں کہ "ہم سچے مسلمان" نہیں ہیں، تو دوسری طرف گاندھی جی نے ملک کی اکثریت رکھنے والی قوم کو بتایا کہ ہم نے اپنی قومی و مذہبی روایات کو چھوڑ دیا ہے اس لئے ملک غلام ہے اور اسی لئے ہم ترقی نہیں کرسکتے؛ اس غلامی کے علاج کیلئے جو نسخہ تجویز کیا اسکی روح "اہنسا" قرار دی، جو جہابیر ازم اور بدھ ازم کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ملکی اور نفسیاتی تقاضوں کی بنا پر "اہنسا" کے مقابلے میں کوئی ایسا طریق کار نہیں ہوسکا جو گاندھی جی کے اس نسخے کو باطل کرسکتا اس لئے ملک کے جملہ سیاسی اداروں نے اس اصول کی بنا پر بنائے ہوئے ہر پروگرام پر عمل کیا اور اسکے بعد کیا ہوا۔ قومی ارتقا کے درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل سفر سے ہر شخص واقف ہے۔

سماج میں پیدا ہونے والے اس شعور کو ہم "نیم مذہبی سیاسی" شعور کہہ سکتے ہیں۔ اس شعور کے پیدا ہونے کے نتیجے میں تحریک ترک موالات اور خلافت کی تحریک کے زمانے میں جو ادب پیدا ہوا، وہ بڑی حد تک حالی کے نیم مذہبی قومی تخیل کی تکمیل تھا۔ ایک طرف بنگال نے ٹیگور کو نمایاں کیا اور دوسری طرف پنجاب نے "بانگ درا" کے مصنف کو، یو، پی نے بھی چکبست کو پیدا کیا جس کی وطنیت کے نسخہ میں متحدہ قومیت کے پورے اجزا نہ تھے، مگر وطنیت کی ایک محدود اسپرٹ ضرور کارفرما تھی۔

پریم چند اس عہد کی خاص پیداوار تھے۔ ان کے ادب میں اپنے زمانے سے کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ سب لوگ اپنے عہد کے "نئے ادب" پیدا کرنے والے کہلائے، اور سماجی و سیاسی شعور کے لحاظ سے ان کے ادب کو ادب جدید سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اسکے بعد ابھی اس ادب کی امکانی ترقیوں کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ زمانے کے عقاب نے اپنے شہپر زور سے پھڑپھڑائے اور اسکی پرواز تیز تر ہو گئی، سیاسی و ملکی شعور نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں، اور مفکرین کو یہ احساس ہو گیا کہ مرض کا علاج غلط تجویز کیا گیا ہے، ہم زمانے سے بہت پیچھے ہیں اور ملک کی مکمل نمائندگی نہیں ہو سکی ہے؛

سیاسی تجربات نے یہ بھی بتایا کہ ملک کا اصلی مرض اخلاقی نہیں اقتصادی ہے، اس مرض کو معلوم کرتے ہی، سوشلزم کے ابتدائی خیالات جنتا میں پیش کئے گئے اور گو ان کو پروان چڑھانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی مگر دہکتی ہوئی آگ تھی۔ روٹی کے مسئلہ نے بھوکی اور مفلس جنتا میں جلدی جگہ کر لی۔ اس نئے شعور کا اثر ہندوستانی ادب کے ہر گوشہ پر پڑا اور پڑ رہا ہے، اور شاید زیادہ پڑیگا؛

اس شعور کے بعد ادب میں ترقی پسندی، انقلاب اور ہمہ گیری کے خیال نے جگہ لی؛ جسکے معنی یہ تھے کہ زبان سے لیکر خیال تک میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ اور یہ شعور قدرتی طور پر اس نیم مذہبی سیاسی شعور کی ضد تھا جو اس سے پہلے سماج پر اپنا اثر جما چکا تھا۔

"نیم مذہبی سیاسی شعور" کو قبول کرنے کی وجہ در اصل یہ تھی کہ فرد اُن تمام پرانی اور دقیانوسی باتوں سے تنگ آچکا تھا جو سادہ تمدن اور اسکے غلیظ رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں۔ اور اب اسکی روح چاہتی تھی کہ اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو۔ لیکن سماج اس پرانی افیون کی پینک میں تھا مسلمانوں میں کسی حد تک سر سید نے ذہنی آزادی کا پیغام دیا لیکن اسکی نوعیت بھی یہی تھی کہ جس طرح کونین پر شکر چڑھا کر مریض کو دیا جائے لیکن بہر حال سوشلزم کا محض ہلکا سا خیال؛ ادب پر گہرا اثر چھوڑ گیا اور اُس نے مطالبہ کیا کہ "ہمارے ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ آخر زندگی سے ہم آہنگی کے معنی کیا ہیں —!؟

یہ ایک سوال ہے جس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ ادب کیلئے مفید اور عام ہونا لازمی ہے۔ (Art aa na art) ادب برائے ادب کے نظریہ میں اب کوئی جان نہیں۔ ادب برائے خدمت انسان کے نظریہ کی کسوٹی پر جو نیا ادب ٹھیک اُترے گا وہی نیا ادب کہلانے کا مستحق ہے۔

ادب کو مفید اور عام بنانے کے لئے سب سے پہلے ٹیکنکس بدلنی پڑتی ہیں، اور اسکے ساتھ ہی ایسی زبان کو اختیار کرنا لازمی ہو جاتا ہے جسے عوام زیادہ سمجھ سکیں؛ اسکے ساتھ ہی بُنیادی خیال کو بدل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ادب پر جن باتوں کا قبضہ ہے وہ وہی اخلاقیات ہیں جس میں انسانی ذہن ہزاروں سال سے اسیر ہے اور جو اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی ترقی میں بھی روڑہ بنے رہے مثلاً دُنیا کا بڑے سے بڑا ادیب و شاعر فرد کو یہ تعلیم دیتا چلا آیا ہے کہ "اکتفا" بلندی ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہے۔ لیکن جو مستری سماج کی اخلاقی مشینری کے زنگ آلود پرزوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ تعلیمات کیوں دی جاتی تھیں: یہ تعلیم طبقاتی مفاد کیلئے لازمی تھی کیونکہ اگر صبر کرنے والے عوام میں نہوتے تو صبر کرنے والوں کی زندگی خوشی اور اطمینان سے کیونکر گذرتی؛!؟

ادیب اور ادب دونوں ماحول کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس شعور نے ادب میں واقعیت نگاری (Realism) کا باب کھولا، یہ چیز تو ٹھیک ہوئی مگر لکھنے والوں کی تمام توجہات رومانی واقعیت نگاری (Realism) ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اور زیادہ سے زیادہ ترقی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ "کسان" اور "مزدور" کو ادب میں خاص مقامات مل گئے۔ کم از کم اردو شاعری "کسان" اور "مزدور" کی صدا سے بازگشت معلوم ہونے لگی۔ اور تمام تر ترقی پسندی اور ادب کی جدت کی بنیاد رومانی واقعیت نگاری اور کسان اور مزدور پر چند نظموں پر قائم ہو کر رہ گئی حالانکہ نئے ادب کے عناصر میں، ہمہ گیری پیدا کرنے کے لئے ٹیکنکس بدلنے اور زیادہ سے زیادہ آفاقیت ( ) پیدا کرنا سب سے اوّل لازمی ہے یعنی خیالی انقلاب کے ساتھ ساتھ لسانی انقلاب نہایت لازم و ملزوم ہے ورنہ تخیلاتی انقلاب کے امکانات دھندلے پڑ جائیں گے۔ رومانی واقعیت نگاری کا بھی جہاں تک تعلق ہے اسکے یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ ادب میں کھردراپن پیدا ہو جائے اور انقلابی گیتوں کا بھی یہ مفہوم ہرگز نہ ہونا چاہئے، کہ ان کو درباری زبانوں میں لکھ کر شائع کر دیا جائے۔

میرا خیال یہ ہے کہ نئے ادب کے عناصر میں، سب سے بڑا عنصر نفسیاتی انقلاب اور ہمہ گیری ہے۔ محض طبقاتی پروپگنڈا نیا ادب نہیں کہلایا جا سکتا، البتہ یہ ضروری ہے کہ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور سماج کی ذہنی زندگی ہمارے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کا نمونہ ہو گی جنکی آج کوئی آواز نہیں۔ اس لئے نئے ادب میں ان کے احساسات، خیالات، اور جذبات کا عکس ہونا لازمی ہے۔ لیکن بہر حال رائے اور پروپگنڈے میں فرق لازمی ہے جس طرح سینما کے پوسٹر اور کسی مصور کے شاہکار میں ہوتا ہے۔ طبقاتی خیال کو اگر آپ نئے روپ کی زمین بنانا چاہتے ہیں تو اس کو وسیع نفسیاتی بنیادوں پر بنائیے۔ نئے ادب کو انسانی فطرت کے لطیف اور اچھوتے نفسیات اور ان کے گوشوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں، دکھوں اور مسرتوں کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

نئے ادب کے عناصر میرے خیال سے یہ ہیں یا یہ ہو سکتے ہیں:۔

(۱) اخلاص۔
(۲) ہمہ گیری۔
(۳) لسانی انقلاب
(۴) فطرت انسان کی مصوری
(۵) زندگی۔
(۶) آزادی اور اسکے منتہا (عام انسانی مسرت) کی پیامبری۔
(۷) نفسیاتی مصوری
(۸) شگفتگی و تازگی۔
(۹) عام انقلاب۔

نئے ادب پر یوں تو سیاسی و سماجی شعور کے پرتو پڑتے اور پڑتے رہینگے لیکن نئے ادب کی پیدایش اگر ہوش و حواس اور غور و فکر کے ساتھ ہو تو وہ خود سیاسی انقلاب کا باعث ہو سکتا ہے جس کی نظیر یں آپ تاریخ میں ملتی ہیں، لیکن افسوس کہ ملک میں ہر شخص اپنی ذات کو نئے ادب کا علمبردار تو سمجھتا ہے مگر اب تک کوئی روسو اور والٹیر پیدا نہیں ہوا۔

یورپ نقشے بدل رہا ہے!!

سال بھر ہوا کہ آسٹریا پر یکایک حملہ ہوا اور آسٹریا کی آزادی ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی۔ یورپ کی جمہوری حکومتوں (برطانیہ، فرانس) کے ہزار وعدوں کے باوجود اور خود ہٹلر اور مسولینی کے متعدد بار یقین دلانے کے باوجود آسٹریا کی آزادی دیکھتے ہی دیکھتے چھن گئی۔ اور نتائج اس صورت میں ظاہر ہوئے کہ غریب چیکوسلاوکیا کو بھی نازی حرص و آز کیلئے راستہ کھول دینا پڑا؛ اور جرمنی کا اقتدار سارے یورپ پر قائم ہو گیا۔ شیر برطانیہ کی حیثیت عجائب گھروں کے

بالتو جانوروں کی سی رہ گئی۔ آسٹریا کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس سے وہ تیس سالہ جنگ یاد آجاتی ہے جبکہ اسی طرح جرمنی اور اٹلی کی حریف نظروں کا اسے شکار ہونا پڑا تھا، مگر اس وقت آسٹریا جمہوری حکومتوں کے بے عمل وعدوں میں اُلجھی ہوئی نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے طویل عرصہ تک تن تنہا ان دو بڑی طاقتوں کی سیاسی چالبازیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

آج جو کچھ ہوا وہ ایسا اچانک ہوا۔ کہ نہ صرف آسٹریا کی آزادی گئی بلکہ چشم زدن میں آسٹریا کے آرٹ اور کلچر کی قبر بھی کھود گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہودی اکثریت آسٹریا کے آرٹ اور تمام کلچر کی خالق و کارساز تھی۔ ہٹلر اپنی کتاب (Mein Kampf) "میری جدوجہد" میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"جب میں وائنا کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا مجھے اس احساس سے تکلیف ہوتی تھی کہ ذلیل اور ناپاک یہودی سارے آسٹریا پر اس طرح چھائے ہوئے تھے جیسے اس ملک پر ان کا پیدائشی حق ہو، فیکٹریوں، ہوٹلوں اور سڑکوں پر چلتے پھرتے ہمیشہ یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے۔ جب میں یہودی لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتا تھا مجھے بڑی گھن آتی تھی اور اُسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جب مجھے طاقت حاصل ہوگی، میں آسٹریا کو انکے ناپاک وجود سے پاک کردوں گا"

ہٹلر نے لفظ بہ لفظ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ لوٹ مار، بے عزتی، تکلیفیں، مصیبتیں، سب بیچارے یہودیوں پر ٹوٹیں اور یہاں تک کہ ان میں سے ہزارہا ان مصائب کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے خودکشی کرلی۔ لیکن آسٹریا کو یہودیوں کے وجود سے پاک کرکے ہٹلر نے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ ان نوجوانوں کو کہ جن کی رگوں میں یہودی خون نہ تھا مجبور کیا گیا کہ ہٹلر کی جرمن فوج میں بھرتی ہو جائیں اس طرح اُس نے جرمن فوج کو وسیع کیا اور ساتھ ہی نیشنل بینک پر قبضہ کرکے اسکا سرمایہ اسلحات اور جنگی تیاریوں پر صرف کیا، یہ یاد رہے کہ اس بینک میں جرمنوں کا سرمایہ زیادہ نہ تھا، یہ آسٹریا کا قومی بینک تھا جس میں آسٹرین حکومت کا سارا قومی اثاثہ جمع تھا، ساتھ ہی دوسرے ملکوں کے بھی کثیر حصے شامل تھے۔

ہٹلر کو اس پر بھی چین نہ آیا۔ آسٹریا کا نام تک لینا جرم عظیم قرار پایا۔ سالہا سال کے تاریخی کارنامے حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے وہ آسٹرین قوم ہی تھی جس نے ترکوں کے سیلاب کو بڑھنے سے روک دیا تھا۔ یہ آسٹریا ہی تھا جس نے مغربی موسیقی کے تین سب سے بڑے اُستاد بیتھوبن۔ موزرٹ۔ شوبرٹ اپنی آغوش سے پیدا کئے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ جب ان تین موسیقاروں کے مجسموں کے سامنے سے نازی فوجیں گذریں تو اخلاقاً ٹوپیاں بھی نہ اُٹھیں۔

ہٹلر نے جرمنی کا مختار مطلق بن جانے کے بعد جرمن نوجوانوں سے ہمیشہ کیلئے بے روزگاری کو مٹا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ چونکہ انفرادی سرمایہ داری کے ماتحت وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا اور ملک میں بے اطمینانی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اب غالباً چھوٹے چھوٹے ملکوں پر اختیار کلی حاصل کرلینے کے بعد جرمن نوجوانوں کی روزی کے لئے مواقع نکال سکے گا۔ آسٹریا میں اسکے طرز عمل نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی، دفتروں، فیکٹریوں اور تمام چھوٹی بڑی تجارتوں میں ذمہ دار جگہوں پر جرمن دیش کے نوجوان رکھے گئے۔ خود آسٹرین کو چھوٹی چھوٹی ایسی جگہیں دیدی گئیں جن میں نہ ذمہ داری کا پہلو تھا نہ طاقت کا امکان۔ ہٹلر کے اس طرز عمل سے آسٹرین نازیوں کو بھی حیرت ہوئی اس لئے کہ ان کو بھی جرمن نازیوں کے مقابلہ میں نظرانداز کیا گیا۔

جب سے یہ واقعہ ہوا ہے میں نے اکثر مغربی اور مشرقی مدبرین کے مضامین پڑھے اور مجھ کو ان کے فیصلے پر حیرت ہوئی اس لئے کہ وہ سب کے سب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ خود آسٹرین قوم چاہتی تھی کہ آسٹریا اور جرمنی ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائے اور نازی جھنڈے کے تلے

(بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۲۲)

حکومت صوبجات متحدہ کا مسلمان اقلیت کیساتھ سلوک

۱۱ر فروری ۱۹۳۹ء کو یو۔پی گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جسکے ضمنی عنوانات یہ ہیں۔

(۱) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(۲) مسلمانوں کی علمی ترقی میں حکومت صوبجات متحدہ کا حصہ

(۳) حکومت صوبجات متحدہ اور اُردو ہندی۔

(۴) چند اُردو اخبارات کی غلط بیانیاں۔

جس دن سے کانگریسی صوبجاتی حکومتیں قائم ہوئی ہیں مخالف حلقوں کی طرف سے برابر کہا جارہا ہے کہ کانگریسی حکومتوں نے مسلمان اقلیت کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا۔ پڑھے لکھے احتجاج کرنیوالوں نے جاہل اور ناواقف مسلم عوام کے دلوں میں پختگی کے ساتھ یہ خیال پیدا کردیا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو مجموعی طور پر ہندوستان سے مٹا دینا چاہتی ہے اس خیال کو مذہب اور کلچر تمدن اور تہذیب کے نام پر نفرت کے مسالوں کے ساتھ دلوں میں مستحکم کیا گیا ہے۔ لیکن حکومت نے اپنے اعمال کو اعداد و شمار کے ساتھ شائع کرکے اس مسالہ کو پگھلا دیا ہے اور جو شخص عدل و انصاف کی معمولی سی اسپرٹ بھی رکھتا ہے وہ اس رپورٹ کو دیکھکر تسلیم کرلے گا کہ کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف جو لوگ محاذ بنائے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُنکے بعض خیالات صحیح ہوں لیکن وہ مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔

کانگریسی حکومتوں کے مخالف حلقوں کی مخالفت ہرگز عوام کی نمائندگی نہیں ہے۔ بلکہ اپنے زوال پر چراغ پا ہونا ہے۔ وہ مسلمان جو کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف ہیں اسلئے خلاف نہیں ہیں کہ وہ اسلام دوست ہیں اور مسلمانوں کی فلاح چاہتے ہیں بلکہ وہ ان قوم پرست مسلمانوں کے برسرکار آنے میں مستقلاً اپنا نقصان اور تباہی خیال کرتے ہیں جو کانگریس کے ساتھ ہیں اور کانگریس وزارتوں کی کرسیوں پر وزارت کے فرائض انتہائی قربانی و ایثار کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ وہ کسی نہ کسی مرکز پر کانگریس کے ساتھ صلح کیوں نہیں کرلیتے!؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور ہر طبیعت اسکا جواب چاہتی ہے کہ اگر مسلم لیگ یا کوئی ایسی ہی مخالف جماعت ہندوستان کے قومی ارتقا کی موید ہے تو ملک کو جانبدارانہ جدوجہد سے تباہی اور بربادی کے غاروں کی طرف کیوں لئے جاتی ہے وہ...... باوجود امکانات صلح کے کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کیوں نہیں کرلیتی!؟

اس سوال میں وہ بھید چھپا ہوا ہے جو بنیاد ہے تمام تر مخالفانہ جدوجہد کی اور جس کے سہارے مخالفت کا تمام کاروبار چل رہا ہے۔ آئیے اس مسئلہ پر ذرا غور و فکر سے ایک لمحے کیلئے سوچیں اور معلوم کریں 17

کہ وہ کون سے وجوہ و اسباب ہیں جو اسوقت تک فضا کو ابر آلود کئے ہوئے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ کانگریس کے برسر اقتدار آجانے کے بعد اُن تمام حلقوں کا قدرتی طور پر زوال ہوگیا ہے جو برٹش گورنمنٹ کے موید تھے۔ اور جن کی تائید ان حلقوں کو حکومت میں بلند مرتبہ بناتی تھی یعنی انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور کانگریس کے عہدہ قبول کرنے کے بعد منفرد طور پر ان لوگوں کے لئے کانگریس کے مقابلے میں گنجائش نہیں رہی خصوصاً رجعت پرست مسلمانوں کے لئے جنکے مزاج اور حالات یا جنکی نزاکتیں انقلاب و آزادی کی سختیوں کی تاب نہ لاسکیں اور نہ آئندہ لاسکتی ہیں قطعی ناممکن ہوگیا کہ وہ غیر کانگریسی رہتے ہوئے حکومت میں کوئی نمایاں جگہ حاصل کرسکیں۔ ہر دماغ اور ہر مزاج ایک خاص ماحول اور ایک خاص فضا کا پروردہ ہوا کرتا ہے۔ کشمیر کے درختوں کو آپ ملتان اور سندھ کی ریتیلی سرزمین میں پروان نہیں چڑھا سکتے اسی طرح سمندر کی تہ میں جو نباتات اُگتے ہیں وہ ذرا چھوتا نے کے پھیلاؤ

میں بیج ڈالکر بھی پیدا نہیں کرائی جا سکتیں۔

مجھے معاف کیا جائے۔ مسلم لیگ یا زمیندار کانفرنس میں جو حضرات برسرِ اقتدار ہیں اُن کا خمیر ایسی مٹی سے گوندھا ہی نہیں گیا ہے کہ وہ کبھی اور کسی شدید سے شدید عہد میں بھی انقلاب کے ابتدائی جھونکوں کو برداشت کر سکیں۔ ان کے حالات اُن کا تمدن ان کی رہائش ان کی زندگی سب نازک لطیف حسین اور بالکل مختلف ہے۔ جس ظرف سے چراغ کے لئے تیل آتا ہے اگر چراغ کا تیل اُسی ظرف میں اُنڈیل دیا جائے تو چراغ کیونکر جل سکتا ہے!؟ سو اگر یہ حضرات عوام اور مزدور و کسان سے "زندگی" اور جان حاصل کرنا بند کر دیں تو خود "ذی روح" (یعنی صاحبِ ثروت) کیونکر رہ سکتے ہیں!؟

اسلئے سوال محض ہندوستان کی آزادی، مذہب اور جانبداری کا نہیں ہے بلکہ طبقاتی زندگی کا ہے۔ شخصیتوں کا ہے۔ اور فرقوں کی بقا و موت کا ہے۔

قوم پرست مسلم جمہوریہ نے وزارتوں کی گدیاں سنبھال لیں ہیں۔ محض پارٹی کے فیصلے اور پروگرام پر عمل کر رہے ہیں۔ ایک حیثیت سے تو وہ بھی معمولی قومی کارکن ہو سکتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو مسلم لیگ کی لڑائی براہ راست انہیں "کافروں" سے ہے۔ اور کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ کی جدو جہد کے جاری رکھنے کا اولین منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے الیکشن تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ قوم پرست مسلمانوں میں سے ایک فردِ واحد بھی منتخب ہو کر اسمبلی اور کونسلوں میں نہ جا سکے۔ اس معمولی نکتہ کی بنا پر میں پُر زور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ کانگریس کی طرف سے ہزار سمجھوتہ کی کوشش ہو لیکن مسلم لیگ کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گی یہاں تک کہ "خزاں کا موسم" نہ گذر جائے اور موسمِ بہار آکر اُنکے اُمید کے پھولوں کو نہ کھلا دے۔!؟

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو اس "خود غرضانہ جدو جہد" سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ ہر دل اور ہر دماغ تقسیم ہو گیا ہے۔ ہر طرف کفر و ایمان مولویت و مسٹریت، مذہبیت ولا مذہبیت اور طرح طرح کی مزخرافات کا ایک خوفناک طوفان ہے کہ ساری قوم کو اڑائے لئے جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اسکا انجام کیا ہوگا!؟..... جو کچھ بھی ہو لیکن انجام ظاہر ہے اور وہ یہی ہے کہ غلامی کی ایک صدی اور بڑھ جائے گی۔ مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن جو کچھ بھی ہو

مگر کانگریس اور ہندو قوم دونوں کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو شخص یہ خواب دیکھتا ہے کہ مستقبل میں سوائے ہندو قوم کے ہندوستان میں کوئی باقی نہ ہوگا وہ مرنے کے بعد خواب دیکھ رہا ہے اسکے یہ خواب اسی طرح پورے نہیں ہو سکتے جسطرح انسان فنا ہونے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ جان لینا چاہئے کہ قدیم اور مُردہ ہندوستان کے سینے پر سانس نہیں لے رہے ہیں اب وہ ایسے ملک میں زندہ ہیں جسکے نفس کی آمد و شد میں بیداری، جدت اور انقلاب کی روح کارفرما ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں ان..... عناصر کی روح پیدا نہیں کرینگے تو وہ زمانہ کے ہاتھوں سلامت نہیں رہ سکتے۔ انکو یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ انگریزوں کی دوستی انکے کام نہیں آسکتی۔ قدرتی طور پر انگریز طاقت اور اکثریت سے متاثر ہونے والی قوم ہے۔ اور اپنے مصالح کو پیش نظر رکھکر قدم اُٹھاتی ہے۔ اور اُسکے مصالح اور منافع ہندو قوم کے ہاتھ میں ہیں۔ ہندوستان میں انکی قسمت کا فیصلہ کانگریس کی نوکِ قلم کرے گی اسلئے کبھی انگریز مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نہ دینگے وہ ہندوستان پر تسلط کی خاطر مسلمانوں کی خود غرض اور وطن فروش جماعتوں کو اُلو تو بناتے رہینگے لیکن مسلمانوں کی ترقی اور آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور کیوں کریں جبکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی وہ طاقتور اور شاندار قوم ہے جو اگر چاہے اور اُٹھ سکے تو ایشیا کو متحد کر کے مغرب کے استعمار کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔

ان حالات میں قدرتی و انسانی طور پر بھی مسلمانوں کے لئے

ایک ہی راہِ عمل ہے۔ اور وہ صرف یہ ہے کہ "وطنیت" کو اپنا مقصدِ سیاست بنائیں ہندوستان سے محبت کریں ہندوستان کو اپنا مولد خیال کریں (جیسا کہ بدقسمتی سے اسکو مسلمانوں کے مولد ہونے کا شرف حاصل بھی ہے)۔ اور اتحاد و محبت کیساتھ ہندوستان کی آزادی کے لئے ان طریقوں پر عمل کریں جو کانگریس نے بنائے ہیں۔ اور اگر ان طریقوں سے کچھ اختلاف ہو تو کانگریس میں داخل ہوکر ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کریں۔ اپنی کثرت سے اسکی موجودہ فضا کو تبدیل کر دیں۔ اور کانگریس کو اس سانچے میں ڈھالیں جسے وہ مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید خیال کرتے ہیں۔

اُن مسلمانوں کی جو "اپنی ڈفلی اپنا راگ" کے قائل ہیں یہ شدید خام خیالی ہے کہ بغیر کسی تعمیری پروگرام اور خلوص عمل کے وہ زیادہ دن تک اس کارواں کا جلوس نکال سکینگے جسکے مساوِد کے پاؤں سر کنڈوں پر قائم ہیں اور جسکے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہیں۔ نفرت کی آگ برسا کر پوری قوم اور اسکے تمام مستقبل کو خطرہ میں ڈالدینا اسلام کی ہرگز کوئی خدمت نہیں۔ جو شخص بھی مہاسبھائیوں کی طرح "مسلم راج" کے خواب ہندوستان میں دیکھتا ہے یا ہندوستان کی قومی تقسیم کو ممکن خیال کرتا ہے وہ احمقوں کی جنت کا باشندہ ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندو قوم سے ملکر رہنا پڑیگا یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جو کبھی باطل نہیں ہو سکتی۔ اور جو جماعت اسکو باطل کرنے کی کوشش کرے گی وہ خود باطل ہو جائے گی۔

مخالف جماعتوں کی طرف سے مسلمانوں میں کانگریسی حکومتوں کے خلاف جو غلط پروپیگنڈا ہوا ہے اُسنے ضرورت پیدا کر دی کہ حکومت عوام کی واقفیت کے لئے ان تمام باتوں کو شائع کر دے جن سے ثابت ہو جائے کہ صوبہ کی حکومت نے کوئی قدم مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہیں اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو یو۔پی میں مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فیصدی ہے۔ لیکن سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ۴۴-۴۰-۴۸-۳۱-۲۶-۲۵-۲۷-۳۳-۲۹-۴۵-۵۳ اور ایک موقع پر ۴۴ مسلمان ڈپٹی کلکٹروں کو سٹینڈ پوسٹ میں جگہ دے کر صوبہ کی کانگریسی حکومت نے ۵، فیصدی ترقی دی ہے۔

صوبے کے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں صوبہ کی حکومت نے کئی کمیٹیاں بنائی ہیں اور اسلامی اداروں کو مختلف قسم کے عطیات بھی دیئے ہیں۔ مسلمانوں کے اسکولوں کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا گیا ہے اور لوکل بورڈز کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خاص طور پر مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل حکومت نے ایک علیحدہ پمفلٹ میں شائع کی ہے۔

مذہبی جذبات کا احترام

کسی قوم یا فرقہ کے مذہبی جذبات کا احترام ہر حکومت پر اتنا ہی فرض ہے جسقدر کہ اُسکے ذمہ دار افراد اپنے مذہب و اصول کا احترام کرتے ہوں۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہمیشہ ہندو قوم کے مذہبی جذبات کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ بابر نے ہمایوں کو وصیت کی کہ گاؤکشی سے احتراز کیا جائے کیونکہ اس ملک کے باشندوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی ملک میں ایک طاقت بھی برسرِ کار ہو تو اس وقت بھی محکوم قوم یا کسی اقلیت کے مذہبی جذبات کا احترام بمنزلۂ فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ موجودہ حکومت ہندو مسلمانوں کی ایک ملی جلی قومی حکومت ہے تو اس فرض کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

لیکن کیا بدقسمتی ہے کہ موجودہ حکومت پر جو سب سے بڑا چارج لگایا جا رہا ہے وہ یہی ہے کہ کانگریسی حکومتیں ہندوستان سے مسلمان اور اسلام دونوں کو مٹا دینا چاہتی ہیں۔ پڑھے لکھے ایجیٹیٹروں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو حرکت دے کر اُس نفرت کو پروان چڑھایا ہے جو ناواقفیت کی بنا پر ہمیشہ غیر مذہب والوں سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اور یہ شدید طور پر افسوسناک ہے۔

اسلئے حکومت کو بھی ضرورت پڑی کہ وہ اپنے اعمال سے ثابت کرے کہ اُسنے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا نہ صرف اپنے صوبے میں

احترام کیا بلکہ صوبہ بمبئی میں بھی جہاں کے متعلق اسکو کچھ اطلاعات ہوئیں۔ اوقاف کے متعلق ایک کمیٹی بنانا اس کا علیحدہ دفتر کھولنا اور دفتر کے اخراجات سرکاری آمدنی سے پورا کرنا۔ اخباروں اور رسالوں کی نگرانی وضبطی رسلمان میلوں کو میلہ بل سے مستثنیٰ قرار دینا۔ بظاہر یہ تمام باتیں نیک اور خوش نیتی پر مبنی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ صوبہ کی حکومت مسلم اقلیت کے حقوق کی مکمل طور نگہبان ہے۔ اور اس کا ایمان ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام خود بھی کرے اور دوسروں سے اس احترام کا مطالبہ کرے۔

فرقہ وارانہ فسادات

ہم رپورٹ کے اس حصہ سے متفق نہیں جس میں دبے لفظوں میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ صوبہ میں ہونے والے فسادات مسلمانوں میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے کی وجہ سے ہوئے کہ "ہندو مسلمانوں کے دشمن ہیں"۔ "وہ ان کو غلام بنانا چاہتے ہیں اور ان کی تہذیب ومعاشرت کو فنا کر دینا چاہتے ہیں"

ملک کی فضا اس پروپیگنڈے سے پہلے بھی خراب تھی اور دونوں قوموں میں حائل ہونے والی اس خلیج کو جو مذہبی نفرت اور سیاسی اختلافات کی دلدل سے پر تھی پہلے ہی اسقدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ ہر وقت یہی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی جو فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ صوبہ جاتی حکومتوں کے قیام کے بعد جو پروپیگنڈا کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے خلاف مسلمانوں میں کیا گیا اسنے آگ پر تیل کا کام دیا۔ ان تمام فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری ان انجمنوں کے سر ہے جنھوں نے اس قسم کا پروپیگنڈا کیا اور کر رہی ہیں۔ حکومت نے فرقہ وارانہ فسادات پر یقیناً بروقت قابو حاصل کیا اور فضا کو بدل بدل دیا لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ بنیادی طور پر اس قسم کے خوفناک فسادات کو روکنے کی تدابیر فوری غور وعمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان اپنے موجودہ مرکز ترقی سے مزید ترقی کرے گا۔

آج ہم نتھے بھی لیکن ہماری پہلی آرزو ہے کہ ہم صاحب اہل ہوں اس صورت میں اگر باہمی قومی اختلافات رہے تو یہ فسادات "سول وار" کی صورت اختیار کرینگے۔ اسلئے سب پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان جراثیم کو ختم کیا جائے جو فسادات اور قومی نفرت کا اصلی سبب ہیں۔ صوبہ جاتی حکومتوں کے لئے اس باب میں دو ہی راستے ہو سکتے ہیں۔

(۱) آئینی (۲) اخلاقی۔ آئینی طرز عمل میں کم گنجائش ہیں صوبہ کی اسمبلی میں ایسے قانون بنائے جا سکتے ہیں جنکے ذریعہ بلوائیوں اور فسادات کا بیج بونے والوں کو شدید ترین سزائیں دی جائیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس آئینی طریق کار میں رد عمل کا بھی اتنا ہی اندیشہ رہیگا جسقدر کہ صحت وکامیابی کا تصور ہے مگر دوسرے طریق کار میں .... البتہ گنجائشیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی ذہنیت بدلنے کے لئے ایسا لٹریچر علم کیا جائے جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی محبت وغیرہ کے جذبات ترقی کریں۔ جلسے۔ جلوس تقریر و تحریر ہر ذریعہ سے بتایا جائے کہ فرقہ پرستی مستقل درندگی ہے اور اس درندگی سے ہر شریف شہری کو پرہیز کرنا چاہئے۔

ان دونوں راستوں کے علاوہ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ان مخالف انجمنوں سے کانگریس سمجھوتہ کرے جو اس قسم کی خراب فضا پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں لیکن میں خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ اس سمجھوتہ کے بعد بھی ایک پارٹی ملک میں ایسی ضرور باقی رہے گی جو اپنی فساد پرستی اور ملک دشمنی کا ثبوت دیتی رہیگی، یہ پارٹی ان افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے ازل کے روز شیطان کی موجودگی میں انگریزی حکومت کے لئے حلف وفاداری اٹھایا ہے۔ اور جنکے دلوں سے انگریزوں کی محبت قیامت تک نہیں جا سکتی۔

آگے چل کر رپورٹ میں ٹانڈہ کے واقعات کی تصیح ہے اور "ہندو پر پابندیاں" کے عنوان سے مسٹر جناح کے سوال کا یہ جواب دیا گیا ہے کانگریسی حکومت کے عہد میں مسلمانوں پر کسی جگہ کوئی نئی

نگرانِ آنکھیں

ایشیا کا "مشترک نمبر"

ایشیا کا یہ نمبر "مشترک نمبر" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تنہا ہی نہیں بلکہ چہ ماہی پر مشتمل ہے اور اس میں اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء۔ اور جنوری، فروری، مارچ ۱۹۳۹ء کے دو نمبر یکجا شامل ہیں۔ یہ صورت محض اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اپنے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق ایشیا وقت پر شائع ہوتا رہے؛

اس سے پہلے جو نمبر شائع کیا گیا تھا وہ تقریباً ۔۔ ۳۰ صفحات پر مشتمل تھا، اب جو نمبر آپ دیکھ رہے ہیں یہ بھی ۲۵۴ صفحات پر شائع کیا گیا ہے مگر اسکے بعد جو نمبر شائع کیا جائے گا اس کا وہی حجم ہوگا جو عام نمبروں کا ہوتا ہے

اس سے پہلا نمبر اپنے مضامین کی جدت اور افادیت اور تازگی و تکمیل کے لحاظ سے تمام ملک میں نہایت سراہا گیا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور ادبی مرکز کے وہ تمام کارکن ارکان جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، مخلصانہ طور پر اپنے کاموں کی اچھائی اور برائی کو معلوم کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایشیا کے پڑھنے والے بھی اچھائی اور برائی اور اسکے نقص و کمال پر آزادانہ رائے دینے میں بے باک واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ اندازہ کرکے بڑی مسرت ہے کہ مجموعی طور پر ناظرین ایشیا کو ترقی یافتہ اور نئے ادب کا علمبردار قرار دیتے ہیں اور اکثرین کی رائے یہ ہے کہ دن بدن اس کا ادبی معیار ترقی ہی کرتا جاتا ہے؛

گذشتہ نمبر عام طور پر نہایت مقبول ہوا لیکن موجودہ نمبر جسے پہلے نمبر سے کہیں غور و فکر کے بعد مرتب کرنے کی کوشش کیگئی ہے یقیناً اپنے گذشتہ نمبروں سے زیادہ مقبول و کامیاب ہوگا۔

آپ اس نمبر کے مضامین میں وہی رنگا رنگی، ترقی اور زندگی پائینگے جو کسی زبان کے اعلیٰ اور جدید ادب کی جان کہی جا سکتی ہے۔ آدبستان میں اڈیٹر کے مضامین کو نظر انداز کرکے جتنے مضامین ہیں وہ اپنا ایک مقصد اور اپنے اندر گہری فکر کی روح رکھتے ہیں؛

سیاسی مضامین میں "دنیا کو کیا ہو گیا؟" اور علمی و تنقیدی مضامین میں ابو نواس پر لائق علی صاحب شمیم قاسمی کا مضمون ایک نہایت جامع مضمون ہے؛ اسی طرح ترجموں میں "سرمایہ داری میں اصولی تضاد" اور "خطبات زرتشت" کوئی معمولی چیز نہیں؛

"خطبات زرتشت" مشہور المانوی فلسفی فریڈرک نیٹشے کی زبردست تصنیف کا ترجمہ ہے جس کو براہِ راست جرمنی سے محمد عبد السلام صاحب رامپوری نے ہندوستانی کے قالب میں ڈھالا ہے؛ اور "سرمایہ داری میں اصولی تضاد" ایم، ایم جوہر میرٹھی کا ترجمہ ہے جو کارل مارکس کی مشہور تصنیف "کیپٹل" (   ) سے ماخوذ ہے۔

ہندوستان میں لوگ بے دینی، الحاد اور بے اصولی کو سوشلزم خیال کرتے ہیں اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو اصحاب سوشلزم کا چارہ

کرنا چاہتے ہیں وہ خود سوشلزم کی ابتدائی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے مگر اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کسی موضوع کے متعلق براہِ راست معلومات بہم پہنچانا اور بات ہے اور حماقت ہوگا پھیلانا دوسری چیز۔ جوہر صاحب کا ایک اور زبردست مضمون اس نمبر کے بعد شائع ہونے والے نمبر میں آئے گا جو اس موضوع پر انکے تمام عمر کے مطالعہ اور سوچ وچار کا نتیجہ ہے۔

"مشرق اور مغرب" کے عنوان سے ایک چینی پروفیسر کا مضمون ملک کے مشہور ادیب اسرائیل احمد خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک عجیب اور نگر مضمون ہے۔ اس میں بظاہر مشرق و مغرب کی تہذیبی تحلیل کی گئی ہے، اور دلچسپ پیرایہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ گو مشرق و مغرب کی تہذیب اور معتقدات میں بنیادی اختلاف اور دوری ہے مگر دونوں میں اتحاد ناممکن نہیں، مقالہ نگار کا وہی اعلیٰ تصور ہے جو موجودہ عہد میں بٹنے سے بچے انسان کا ہو سکتا ہے۔ اور دنیا کے امن کیلئے جس کی ضرورت ہے۔ اسکے ساتھ ہی طرز بیان دلچسپ اور بہت دلنواز ہے۔ لیکن اس مضمون کی زبان اس درجہ سخت ہے جو بجائے خود ایک موضوع ہے اور اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے۔

اسرائیل احمد خاں صاحب اور ان کا اسلوبِ تحریر، بہت ہی دلچسپ ہے، اور ایک طرح سے ان کو صاحبِ طرز رومیوں کی پہلی صف میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کے اسلوب میں لچک اور دلنوازی کافی سے زیادہ ہے۔ لیکن میرے دوست اگر مجھے معاف کردیں تو عرض کروں کہ بعض مضامین میں ان کی زبان اتنی سخت ہو جاتی ہے جسے عوام نہیں سمجھ سکتے۔ عوام ہی نہیں، بلکہ وہ شخص جو عربی و فارسی پر کافی قدرت نہیں رکھتا وہ بھی اکثر مواقع پر سٹ پٹا جاتا ہے۔

ان کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ چند ہی برسوں میں، ادب اور زبان کے اسلوب اور معیار نے ایک بالکل نئی صورت اختیار کر لی ہے نئے ادب کا نیا نظریہ، ہر وقت لکھنے والوں سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ وہ بات کہیں جو زیادہ سے زیادہ سمجھی جائے اور اسی زبان میں کہیں جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں۔

کسی صاحبِ طرز سے کسی ادارہ کا یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنا اسلوب تبدیل کردے، ایک کھلی ہوئی حماقت اور زیادتی ہے، لیکن ہم اتنا مطالبہ تو کرہی سکتے کہ اسرائیل احمد خاں صاحب سے اعتدال کی درخواست کریں۔

لیکن ان کے علاوہ میں آیشیا کے تمام لکھنے والوں سے باادب عرض کروں گا کہ آیشیا کسی قسم کی بے اعتدالی کا ناشر نہیں ہے۔ زبان کے معاملے میں اس کا مسلک کھلا ہوا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اسکے مضامین ایسی زبان میں ہوں جن کو ہندو مسلمان سب آسانی سے سمجھ سکیں، اور اس میں غیر ضروری بلاغت اور ثقالت نہو۔ کیونکہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے شائع نہیں کیا جاتا اور نہ محض ادبِ لطیف کی اشاعت ہی اس کا مقصد ہے وہ خیالات اور عقائد کا رسالہ ہے اور موجودہ زمانے کی ساری دماغی و ذہنی سیاسی و سماجی روح کو پیش کرنا اس کا سب سے اعلیٰ اور سب سے پہلا مقصد ہے۔

میں یہ سطور اپنے دوست سید فرید جعفری کے مکان پر دہلی میں لکھ رہا ہوں جہاں آیشیا کے مطبوعہ اوراق میرے پاس نہیں ہیں لیکن ادبستان میں جس قدر مضامین شائع کئے گئے ہیں ان کو میں نے اچھا ہی سمجھا ہے تبھی شائع کیا ہے، اس لئے ان سب کے متعلق میری پسندیدگی اس لحاظ سے یکساں ہے کہ میں ان سب کو آپ کی نگاہوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

"ہزار داستان"۔ چند نمبر پہلے میں آیشیا میں چھپنے والے افسانوں اور ڈراموں کی طرف سے غیر مطمئن تھا۔ اکثر ایسا ہوتا رہا کہ ادبستان اپنی خصوصیت میں مکمل ہوگیا مگر ہزار داستان میں وہ تکمیل پیدا نہ ہو سکی جو میں چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اطمینان ہے کہ دو نمبروں سے ہزار داستان اپنے

افسانوی معیار میں ادبستان سے بازی لیجاتا ہے اور موجودہ نمبر میں تو اسکی تکمیل سے مجھے بیحد مسرت ہے۔ اس مسرت کے ساتھ ایک دلی رنج بھی ہے کہ اس نمبر میں ملک کے ترقی پسند چوٹی کے افسانہ نگار سید فرید جعفری مجیلی شہری کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ پہلے نمبر میں ان کے دو افسانے، "جوار بھاٹا" اور "دیمک" شائع ہوئے تھے، جو اس قدر مقبول ہوئے کہ اطراف ملک سے تقریباً دو سو خطوط دفتر میں موصول ہوئے کہ ان کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اور محض ان کے افسانوں کی وجہ سے یہ نمبر خاص طور پر بڑی تعداد میں فروخت ہوا۔ اس مرتبہ بھی ان کی مصروفیت اور استغنار کے باوجود میں "سونے کے بٹن" ان کی قمیص سے چُرا ہی لایا تھا، لیکن یہ چوری اس وقت ہوئی جب وقت کا قزاق بہت دور جا نکلا تھا اور ہزار داستان جھک کر اپنے گیتوں کی تکمیل کر چکی تھی۔ لیکن آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ ان کا ایک لاجواب افسانہ "سونے کے بٹن" اور ایک ڈرامہ اپریل، مئی، جون نمبر کے لئے کاتب کو دیا جا چکا ہے۔

موجودہ ہزار داستان میں ٹالسٹائی کا مشہور افسانہ حملہ ختم ہوتا ہے۔ اس کو بہار کے ادیب و شاعر سہیل عظیم آبادی نے ترجمہ کیا اور یہ بھی بیحد مقبول و مشہور ہوا۔ سہیل صاحب ترجمہ ہی کرتے وہ خود ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی کہانی میں نئے افسانہ کے وہ تمام عناصر ہوتے ہیں، جن کی نئے ادب کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

اس باب میں کاونٹ ٹالسٹائی کی عالمگیر شہرت رکھنے والے ناول "اناکرینینا" کا ترجمہ شروع کیا گیا ہے۔ اسے ہمارے دوست محمود الحسن صدیقی بی۔ اے نے خاص میری درخواست پر ترجمہ کیا ہے۔

محمود خالص ادبی انسان ہیں، لیکن ان کے ساتھ قدرت نے جو ظلم کیا ہے اس کو میں جانتا ہوں، مگر کہہ نہیں سکتا۔ بہر حال نامساعد حالات میں ان کا اتنا بڑا کام شروع کرنا ان کی ہمت اور قابلیت کی دلیل ہے۔

دو جاذب شخصیتیں آپ کے لئے بالکل نئی ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہر نئی چیز اپنی جگہ زبردستی حاصل کر لیتی ہے۔ انسانی فطرت کی رنگارنگی اور انقلاب پسندی نئی شخصیتوں کی کامیابی کی خود ضامن ہوا کرتی ہے اور جب ان کے ساتھ ان کی منوہر خصوصیتیں بھی ہوں تو دُنیا کے محفوظ رہنے کی کونسی صورت ہے — !؟

ان دو منوہر شخصیتوں میں سے ایک نے روس کے زندۂ جاوید افسانہ نگار چخوف کا شاہکار "شہید" ترجمہ کیا ہے۔ محمد اطہر بی۔ اے بی ال بہار کے ان ذہین نوجوانوں میں سے ایک ہیں جن کی ذات پر ادبی دُنیا فخر کر سکتی ہے۔ ایک عرصہ تک صحافتی دُنیا میں وہ بھی مجاہد کی طرح کام کرتے رہے ہیں۔ کئی سال ہوئے ان کی ادارت میں "شمیم" پٹنہ سے شائع ہوا تھا جو ایک اچھا رسالہ تھا۔ اطہر ہندوستان کے ترقی پسند لکھنے والوں میں سے ایک ہیں، اور دل سے لیکر دماغ تک بالکل جدید ہیں۔

ان کے علاوہ شاکر علی بھی آپ کے لئے بالکل نئے ہیں۔ جن کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "خانۂ خدا" ہزار داستان میں شائع کیا جا رہا ہے، یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے لیکن اتنی بے ساختہ اور تخلیقی چیز ہے کہ میں نے اسکے نیچے "طبعزاد" خود اپنے قلم سے لکھ کر وہ مسرت حاصل کی ہے جو شاکر علی کے تمام تر مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

——— شاکر علی مولانا محمد علی کے قریبی عزیزوں میں سے ایک ہیں۔ لیکن دماغی طور پر وہ بالکل دوسری چیز ہیں، ان کے افسانوں اور ڈراموں میں زندگی کے اُن گوشوں سے پردہ اُٹھتا نظر آتا ہے جو اب تک نامعلوم تھے۔ وہ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو چھیڑتے ہیں اور انکا

انداز بیان اور زبان کی نزاکت ان کی کہانیوں میں وہ تاثیر پیدا کر دیتی ہے جو کسی آرٹسٹ کا مقصود ہوا کرتی ہے۔

بعض لوگ ادب کے نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ ساتھ یہ خیال نہیں رکھتے کہ ترقی پسند ادب کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ادب میں گھروا پن پیدا ہو جائے اور واقعیت نگاری (Realism) سے مطلب یہ نہیں ہے کہ تصور کے سامنے ایسے گھناؤنے مناظر آجائیں جس کو ابھی انسانی ذہن برداشت نہیں کر سکتا۔

شاکر علی باوجود جدت اور انقلاب کے صناعانہ لوچ اور لچک کو اپنی کہانیوں میں خاص طور پر قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں آئندہ نمبر میں ان کے دو افسانے شائع کئے جائیں گے جن کو پڑھ کر آپ یقینی محظوظ ہوں گے۔

ل۔ احمد صاحب (زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔) کا ترجمہ کیا ہوا ایک ڈرامہ ہزار داستاں کی جان ہے۔ یہ چینی وطن پرستی کو پیش کرتا ہے اور ایسی حالت میں کہ جاپان و چین کی آویزش ابھی ختم نہیں ہوئی کافی برمحل ہے۔ لطیف احمد صاحب کو کوئی خراج عقیدت پیش کرنا گویا ان کی مسلّمہ شخصیت کے ساتھ ایک مذاق کرنا ہے۔ لطیف نے اُردو ادب کی جس سنجیدگی کے ساتھ خدمت کی ہے اس کی مثال نہیں، اور اس خدمت کے ساتھ اپنے تغیر اور ترقی کا جو ثبوت دیا ہے وہ ان کے تدبر اور ذہانت کی دلیل ہے۔

ان حضرات کے علاوہ بھی ہزار داستاں کے جس قدر افسانہ نگار ہیں میں ان کی فرداً فرداً کیا تعریف کروں، کسی رسالے کے غریب اڈیٹر کا سب سے پہلا اعتراف تو وہ لمحۂ عمل ہوتا ہے جب وہ کسی مضمون کو چھاپنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے بعد کی باتیں محض ادبی رسم و رواج ہے۔ جواب زیادہ مرغوب طریقہ نہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ ان قدامتوں سے اب پرہیز ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

سب سے پہلی بات سب سے آخر میں جب کہی جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس بات کی تقدیم کا نمایاں طور پر اقرار کر رہے ہیں۔ اس نمبر میں "ایک بے نام آرٹسٹ" کا ایک پنسل اسکیچ بھی شائع ہو رہا ہے جو ہمارے دوست ضیاء الاسلام بی، اے کے دلکش گیت ۲۴
کے ایک بند کی تصویر ہے۔ مصوّر یا مصوّرہ بہرحال تصویر بنانے والا جس صنف سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ نہایت نازک نقاش ہے اور شاعر کے جذبات کو اپنے خطوط میں ظاہر کرنے کی ایسی اہلیت رکھتا ہے جو اس کو موضوع کا ماہر اور نباض ثابت کرتی ہے۔

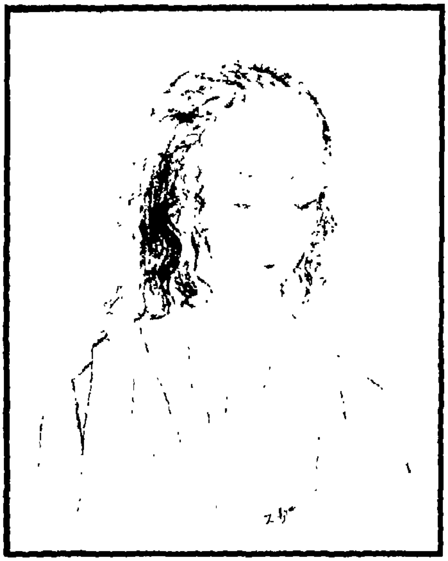
"میخانۂ الہام" میں ملک کے مشہور و غیر مشہور شعراء کا منتخب کلام ہے۔ غزل، انقلابی نظمیں، گیت اور رنگا رنگ نظمیں ہیں اور ہر نظم پڑھنے اور پڑھ کر جھومنے کے قابل ہے۔ سوائے ان نظموں کے جن کے نیچے یا اوپر "ساغر" لکھا ہوا ہے۔ میں نے بارہا ان نظموں کو پڑھا اور جھوما۔ میرے کیف کا حاصل اب آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ پڑھئے اور جھومئے۔

نظموں میں جنوبی ہند کی شاعرہ مس پاروکٹی اما کی ایک انگریزی نظم بھی کافی دلدوز ہے۔

آخر میں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا جنہوں نے اس شاندار نمبر کے لئے خاص طور پر اپنے نثر و نظم کے مضامین عنایت فرمائے میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ میں ان کی پُر خلوص نوازشوں کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔

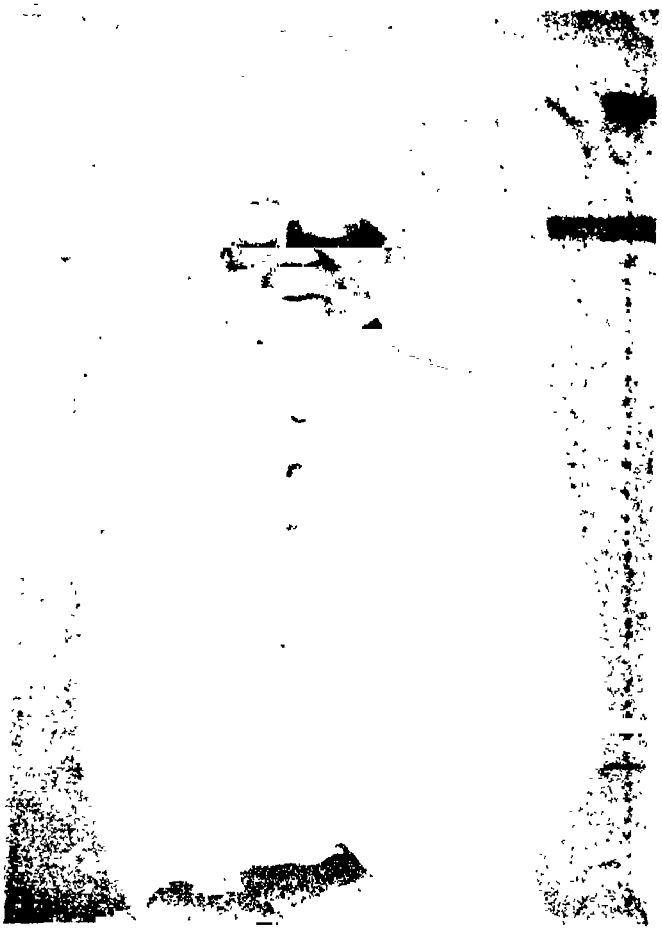
ساغر

دہلی [illegible]



سمجھو گے جو تم ہی باتیں میری
سمجھو گے سوز دامن میری
دل سے پڑھو تم باتیں میری!

Asia



SAGHAR

His collection of Urdu Poems, 'Bada-i-Mashriq' was sold out in a short time. Now its Hindi Edition is in Press.

ادبستان



ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۳۹ء

(مشترک نمبر)

دُنیا کو کیا ہوگیا!؟

(از سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

دُنیا کی بدحالی کوئی معمہ نہیں۔ پھر بھی یہ سوال اُٹھتا ہی رہتا ہے کہ آخر جب سب لوگ امن اور سکون چاہتے ہیں تو پھر ہر قوم اپنی کمائی کا زیادہ سے زیادہ حصہ، رائفلوں، مشین گنوں، ہوائی جہازوں، بحری بیڑوں، فوجی پلٹنوں، زہریلی گیسوں، اور طرح طرح کے دفاعی آلاتِ جنگ پر کیوں صرف کر رہی ہے۔

پریشان حال دُنیا ایسے سینکڑوں سوال کرتی ہے۔ سوالوں کی شکلیں اگرچہ مختلف ہیں لیکن سب کی تہ میں سوال ایک ہی ہے۔ یعنی دُنیا کو کیا ہوگیا؟ یہ کس مرض میں گرفتار ہے۔ اس "کیا ہوگیا" کا جواب ہماری انسانی سوسائٹی کا سب سے اہم اور وزنی مسئلہ ہے۔ یہ سوال اس وقت سے چلا آتا ہے جبکہ پہلے پہل سوسائٹی کی بُنیاد قائم ہوئی تھی۔ یہ "کیا ہوگیا" میں ہی "کیوں ہوگیا" بھی چھپا ہوا ہے۔ اس وقت مجھے پُرانے زمانہ کو بحث میں لانا مقصود نہیں ہے۔ پُرانی دُنیا کا زاویۂ نگاہ مختلف تھا۔ اگرچہ مرض اس کا بھی اسی طرح کا تھا لیکن اس نے روحانی فردوس میں پناہ تلاش کر لی تھی۔ ہماری دُنیا جسم اور روح کی بیماریوں کا علاج چاہتی ہے۔ تشخیص نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ تشخیص وہ خود کر چکی ہے۔

ہاں! تو اصل سوال یہ ہے کہ دُنیا پریشان کیوں ہے؟ وہ پریشان اس لئے ہے کہ وہ بھوکی ہے۔ پہلے وہ بھوکا رہنے پر قناعت کر سکتی تھی۔ لیکن اب تجربوں نے اسکی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب وہ قناعت نہیں کر سکتی۔ پہلے اس کا عقیدہ تھا کہ "حق طاقت ہے" جو بالآخر غالب ہوتا ہے۔ اب وہ سمجھ گئی ہے کہ دراصل "طاقت حق ہے" یہ فیصلہ سینکڑوں صدیوں کے تجربہ کا حاصل ہے۔

یوں تو ہر زمانہ انقلابی ہوتا ہے لیکن ہمارے زمانہ میں جو محرکات کام کر رہے ہیں ان سے ایک غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی ہے مختلف اور متضاد فلسفوں کی ٹکر، نظریوں کا اُلٹ پھیر، اور ان سب سے زیادہ ہر معاملہ پر سائنٹفک انداز میں غور و فکر کرنے کی عادت نے مسائل کو صاف بھی کر دیا ہے اور اُلجھا بھی دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسکے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اور ہر قوم آزادی اور حقوق کے صحیح مفہوم سے واقف ہو چکی ہے۔ اس لئے حق تلفیوں کو مٹانا اور عدل قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک عام بیداری ہے۔ اس بیداری سے خوش حال بدحواس ہیں اور بدحالوں میں ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دُنیا میں ہیجان بپا ہے۔

اس وقت دُنیا کی نبض یورپ کے ہاتھ میں ہے۔ چند مستثنیات کے علاوہ چپہ چپہ دُنیا کا اسکے قبضہ میں ہے۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر یورپ کی سیاسیات پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔ کیونکہ یہی سیاسیات موجودہ عہد میں دُنیا کی بدحالی کی ذمہ دار ہیں۔

یورپ کی بڑی جنگ ہوئی۔ سب لوگوں نے ایک جگہ اکٹھا ہوکر یہ سوچا کہ آئندہ خونریزی کیسے بند کی جائے۔ امریکی جمہوریت کے صدر "ولسن" نے اس کا علاج (Self Determination) یعنی (حکومت خود اختیاری) کے سنہری اصول میں پیش کیا۔ اصول تو اچھا تھا لیکن اس پر عملدرآمد کیسے ہوتا؟ جس کمرہ میں اس اصول کی آواز گونج رہی تھی وہاں سب کے سب "چودھری" تھے۔ ہر ایک کے حلقۂ ارادت میں غلاموں کی ایک دُنیا آباد تھی۔ اس لئے یہ اصول اپنی پیدائش سے قبل ہی موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ ایک نیا آلہ تیار کیا گیا جس کا ظاہری حُسن بلاشبہ دلفریب تھا لیکن اندر سے وہ کھوکھلا تھا۔ تشخیص صحیح تھی مگر نسخہ غلط لکھا گیا۔ "انجمن اقوام" یعنی (League of Nation) کے دعوے خواہ کچھ ہوں، یہ واقعہ ہے کہ عدم مساوات نے بعض اقوام کے لئے دُنیا تنگ کردی ہے اور بعض قومیں تمام قدرتی ذرائع کی مالک بن بیٹھی ہیں۔ عدم مساوات اقتصادی ہے۔ اخلاقی یا نسلی نہیں۔ دُنیا کی محروم قومیں اس عدم مساوات کو زیادہ عرصہ تک برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم گھر میں بیٹھ کر امن وامان کا وعظ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ہمیں زندگی کی تمام ضروریات میسر ہیں۔ دن رات عیش و آرام سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ عالیشان محل اور ان کی پرتکلف آرائشیں۔ بنکوں میں موٹی موٹی رقمیں ہماری خوش حالی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ضمانتیں ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے آس پاس کوئی شورش نہ ہو۔ لیکن ہمارا پڑوسی جس کے پاس موسموں کے گرم و سرد سے اپنا بدن بچانے کے لئے نہ کپڑا ہے اور نہ مکان، اور جسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا، خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتا، جب وہ شور مچاتا ہے تو ہمارے آرام میں خلل پڑتا ہے اور ایسے شخص کو ہم امن شکن، غنڈا، اور بدمعاش کہنے لگتے ہیں گویا کہ امن کے معنی صرف ہماری عیش پسندانہ زندگی ہے اور سکون کا مطلب صرف ہماری طمانیت قلب میں پوشیدہ ہے۔ لیکن ذرا اصلیت کے کرخت چہرہ سے پردہ اُٹھا کر دیکھئے۔ حقیقت میں اس ہیجان اور شورش کا باعث خود ہم ہی ہیں اور دُنیا کا امن وامان ہماری ہی خودغرضی اور کم نگاہی کا شکار ہو رہا ہے۔

ولسن کی غلطی تھی کہ اس نے اصولِ حکومت خود اختیاری (Self Determination) کا صور پھونکا۔ آج وہ یا اسکے ماننے والے گہری نظر سے دیکھیں کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ انجمن اقوام نے جن ہاتھوں میں پرورش پائی وہ آزاد اور خودمختار ریاستیں تھیں۔ خود انجمن اقوام کو فرمانروائی کا حق حاصل نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خوش حال اور بدحال ریاستوں میں تصادم ہوا، جرمنی، اٹلی اور جاپان کا کھلا ہوا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے بقا کے لئے زیادہ زمین اور منڈیاں لیکر ہٹینگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں بدامنی کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یورپ کی بدامنی کی وجہ سے تمام عالم کا امن وامان خطرہ میں ہے۔ ۲۰

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس صدی میں جبکہ جمہوریت اپنے وسیع ترمعنوں میں دُنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے مطلق العنان حکمراں اتنی بڑی آبادیوں کو اپنے قابو میں کیسے کئے ہوئے ہیں۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ان ممالک میں جمہوریتیں ناکام رہیں یہ ناکامی اس لئے نہیں تھی کہ عوام جمہوریت سے بیزار تھے بلکہ اسکی وجہ محض یہ تھی کہ وہاں کی جمہوریتیں عوام کی اقتصادی بدحالی کا کوئی علاج نہ کرسکیں۔ یہ کچھ جمہوری نظام پر ہی موقوف نہیں۔ اس سے پہلے شخصی حکومتیں بھی اسی مرض کا شکار ہو چکی ہیں۔ اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر دُنیا کے موجودہ ڈکٹیٹر اپنے ملکوں میں اقتصادی مسائل کا حل نہ کرسکے تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ناکام حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ "فاسزم" اور "نازی ازم" حقیقت میں "مسولینی" اور "ہٹلر" کا نام ہے۔ اور "مسولینی" اور "ہٹلر" اطالوی اور جرمن قوموں کی اقتصادی بدحالی کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ اُس عدم مساوات کا عملی اظہار ہیں جو صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اقتصادی ہے۔

جنگ کے ختم کرنے کا دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس کا علاج غلط کیا گیا۔ موجودہ حالات کی تحلیل کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام

قوموں کے لئے سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی تحفظ کی بھی ضمانت ہو۔ اگر دُنیا کی قومیں آزاد ہو کر اقتصادی بیماری سے نجات حاصل کرلینگی تو پھر کوئی ایسی بین الاقوامی انجمن آسانی کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہے جو امن عالم کی حفاظت کرسکے۔ جب دُنیا کا ایک ہی مفاد ہوگا تو پھر کسی بوالہوس قوم یا فرد کو یہ جرأت نہ ہوسکے گی کہ تمام دُنیا کا مقابلہ کرسکے۔ آج محروم قوموں کے بچوں کو گہوارہ سے ہی مارنے اور مرنے کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن جب سیاسی اور خصوصاً اقتصادی خوش حالی عام ہو جائیگی تو عالمِ انسانیت کے تمام بچے امن و امان کی فضا میں پرورش پاکر ایک بالکل نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ دُنیا کی عملی زندگی میں شریک ہونگے۔

مصیبت یہ آ پڑی ہے کہ جمہوریت کے نام پر قوم پرستی اور قوم پروری کی جارہی ہے۔ بلاشبہ قومی نظامِ ریاست (Nation State System) خطروں سے بھرا ہوا ہے کسی مضبوط بین الاقوامی قانون کی عدم موجودگی میں قوموں کے باہمی تعلقات، ان کی چیرہ دستیاں اور جارحانہ کارروائیاں انکی قومی پالیسی کے مطابق ہوتی ہیں ہر حکمراں قوم اپنی قوت کو بڑھانے کی غرض سے ان تمام ذرائع اور وسائل کو حاصل کرنا چاہتی ہے جو اُسکی قومی پالیسی کو کامیاب بنائیں ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں انہیں محکوم قوموں کے وسائل کو چھیننا پڑیگا اور اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ محکوم قومیں اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو کر نہ چین سے بیٹھیں گی اور نہ بیٹھنے دینگی۔

یہ مختصر داستان تو آزاد اور حکمراں قوموں کی ہے اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دُنیا کی ابتر حالت کی ذمہ داری سب سے زیادہ اُس جارحانہ قومیت پر ہے جو سینکڑوں برس سے یورپ کے دامن میں پرورش پارہی ہے لیکن محکوم قوموں کی کہانی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ یورپ میں تو ذہنی انقلاب سے طوفان بپا ہے۔ لیکن محکوم اقوام خصوصاً ایشیا والوں کا دامن ابھی ابھی ذہنی انقلاب سے تر ہوا ہے۔ یوں تو آزادی کا جذبہ ہر شخص میں فطرتاً ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایشیا نے "روسو" اور "والٹیر" کی آواز کو حال ہی میں سُنا ہے۔ آزادی، مساوات، اور بھائی چارہ کا نعرہ محکوم قوموں کو اُبھارتا چلا جارہا ہے۔ اگر یہ انقلابی ذہنیت کوئی اچھی چیز ہے تو یورپ قابلِ شکریہ ہے اس لئے کہ یہ اُسی کے خوانِ نعمت کے تبرکات ہیں جنہیں غلام قوموں نے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ اس جذبہ سے ایک طرف قوم اور قومیت کی تشکیل کی جارہی ہے اور دوسری طرف سوشلزم کے فلسفے نے گرے ہوئے طبقوں کو چونکا دیا ہے۔ اس طرح محکوم قوموں میں دو تحریکیں بڑی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہیں یعنی "قومی آزادی" اور "اقتصادی مساوات"۔ ان تحریکوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ حاکم اور محکوم، امیر اور غریب کے درمیان خلیج بڑھتی جاتی ہے اور امن و سکون کا سامان برہم ہوگیا ہے۔

"قوم" اور "قومیت" اس زمانہ کی سب سے بڑی حقیقت ہے لیکن اس سُنہری خول میں انسانی نامرادی کا زہریلا مادّہ پوشیدہ ہے "حکومتِ خود اختیاری" (Self Determination) کے اصول کا جوڑ قومیت سے ملایا جاتا ہے لیکن یہ نہ صرف غلط بلکہ کھُلا ہوا فریب ہے۔ قومیت کے اصول ضرور چمکیلے ہیں لیکن اس کا منتہا آنکھوں کے سامنے ہے۔ دُنیا آگ اور خون کی بارش میں صرف قومیت کے نام پر نہا رہی ہے۔ سوچنے والا سوچتا ہے کہ آخر جب قومیت کی بڑائی اور خصوصیت اسی میں ہے کہ قومیں آپس میں ٹکرائیں اور کمزور قوموں کی گردنوں میں غلامی کا طوق بدستور پڑا رہے تو پھر "حکومت خود اختیاری" کے کیا معنی ہیں۔ اس کا فکر صرف ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ (Self Determination) انسانی زبان کا سب سے زیادہ مہمل لفظ ہے اور اس لئے قطعاً بے حقیقت ہے۔ "قومی برتری" اور اس "برتری" کو قائم رکھنے لئے دوڑ دھوپ دُنیا کو مصیبتوں کی طرف ڈھکیل رہی ہے کون نہیں جانتا کہ قومی برتری برقرار رکھنے کیلئے جو رقابتیں سیاسی مدبّروں کے سینوں میں مشتعل ہیں ان کا لازمی نتیجہ اقتصادی تباہ کاری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اقتصادی تباہ کاری میں ایک ہولناک مستقبل پوشیدہ ہوتا ہے۔ لوگ بھوکے مرتے ہیں۔ بیماریاں پھیلتی ہیں۔ تجارت ختم ہو جاتی ہے اور آخر میں انسانی آبادی گھٹنے لگتی ہے غور کیجئے کہ ہمارے ذہن کی یہ کتنی عجیب حالت ہے کہ ایک سانس میں دُنیا کے امن و امان اور خوشحالی کا وعظ کہتے ہیں اور دوسرے سانس میں اسی امن و امان اور خوش حالی کی جڑوں کو اُکھاڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

انسانی ترقی کے سفر میں ایک منزل راہ میں ملتی ہے۔ یہ منزل سوشلزم کی ہے۔ اسلئے دعوے بہت بلند ہیں لیکن اس کی عمل میں اپنی صلاحیت کہ اسکی ہمہ گیری ابھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اقتصادی بدحالی دور کرنے اور دبے ہوئے طبقوں کو فرمانروائی دلانے میں صرف یہی ایک پروگرام مفید اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے مفسروں میں بھی وہی جنگ و جدل ہے جو جماعتی لیڈروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ طاقتور سوشلسٹ یہ چاہتا ہے کہ سوشلزم کے معنی صرف اتنے ہی سمجھے جائیں جتنا وہ سمجھتا ہے اور جتنا سمجھنے کی وہ اجازت دیتا ہے۔ آج اگر سوشلزم کے ماننے والوں میں سے کسی ایک فرد یا جماعت کو عوام کی خوشنودی حاصل ہے تو وہ اپنے ان تمام رفیقوں کو مٹا دیتا ہے جنہوں نے سوشلزم کی بنیاد رکھنے اور اسکے پھیلانے میں بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ وہ بھی فاشسٹ ڈکٹیٹروں کی طرح جنگ کرتا ہے اور کراتا ہے اس کی جنگ بھی کسی کمزور کی حمایت میں نہیں بلکہ سیاسی چالوں میں اُلجھی اور جماعتی اغراض میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی سرحد کے لئے زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر اپنی توپوں کے آتشیں دہانے کھول سکتا ہے لیکن خون سے لتھڑی ہوئی چین کی مظلوم آبادی اس کے دل کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ سوشلزم بحیثیت فلسفہ اور چیز ہے اور بحیثیت عملی پروگرام ایک بالکل مختلف چیز۔ یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ تمام دُنیا کے خیالات یکساں ہو جائیں۔ اس لئے وہ تمام تحریکیں جو اپنے دائرۂ عمل میں مخالفوں کی گنجائش نہیں رکھتیں بلاشبہ لڑائی جھگڑے اور کشت و خون کا باعث ہونگی۔

میں نے کہا ہے کہ انسانی بدحالی میں اقتصادی ناانصافی کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ لیکن اسکے علاوہ ایک اور چیز ہے جو اگرچہ اسی ناانصافی کا براہ راست نتیجہ ہے مگر علیحدہ اپنی مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یہ چیز زبردست نفسیاتی حقیقت ہے۔ اگر صنعتی اور تجارتی کمپنیاں رحم و کرم سے خالی ہیں تو شکستہ بنجارے بھی کچھ کم سنگدل نہیں۔ اگر ایک طرف دولتمند کا دل اُس مشین کی مانند ہے جو ہر اُس چیز کو پیس دیتی ہے جو اُس کے دباؤ میں آجائے تو دوسری طرف غریب طبقہ بھی وقت کا منتظر رہتا ہے اور گلوٹین کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ مزاجوں میں تلخی، طبیعتوں میں انتقام کا تلاطم، اور اپنے مخالفوں کے نام و نشان کو مٹا دینے کا ارادہ، انسانی سوسائٹی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ۴۰

ڈر معلوم ہوتا ہے کہ علمی ترقی کی شر سامانیوں کی طرف کوئی اشارہ کیا جائے۔ گذرا ہوا زمانہ روحانی تحریکوں کی عبرت آموز تصویر پیش کرتا ہے۔ مذہب اور روحانیت کے نام پر لاکھوں انسانوں کی بھینٹ چڑھائی جا چکی ہے اور آج تک اس مقدس دائرہ کے تعصبات سیدھے سادے لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ روحانی تعلیم دوسری زندگی میں فردوس پیش کرتی ہے مگر اس دُنیا کی زندگی کو اس نے جہنم زار بنا دیا ہے۔ بڑے ادب اور احترام کے ساتھ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ دُنیا کی بدحالی کی ذمہ داری کافی حد تک اس مقدس طبقہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

تہذیبِ جدید کو علمی ترقی پر ناز ہے اور بلاشبہ بجا طور پر نازاں ہے لیکن نتائج کی کسوٹی پر علم کی ترقی کو پرکھا جائے تو ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ سائنس نے قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں کو معلوم کیا۔ یہ مانا کہ تحقیق کرنے والوں کی نیت اچھی تھی۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نسل انسانی کو اس سے بڑے بڑے فائدے ہوئے۔ علم انسانی وہم و گمان سے نکل کر تجربہ اور مشاہدہ کے میدان میں آگیا۔ ریل، ہوائی جہاز، لاسلکی ٹیلیفون ٹیلیگراف، اور ریڈیو نے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا۔ طب نے ایسے ایسے بیمار اچھے کر دئے جو موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ درست مگر انسان نے انسانیت کو قوموں، طبقوں، براعظموں، مشرقیوں اور مغربیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ تقسیم برابر جاری ہے۔ سائنس نے ان ٹکڑوں کے ہاتھوں میں کیسے کیسے ہلاک کرنے والے ہتھیار دیئے ہیں۔ جو سائنس ایک بیمار کو اچھا کرنے میں کچھ وقت مانگتی ہے وہی سائنس پلک جھپکنے میں سینکڑوں بے گناہ جانوں کو بھک سے اُڑا دیتی ہے۔ سائنس کے بے پناہ ہاتھ سول آبادیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں مصروف ہیں۔

جو دولت انسانی بستیوں کو خوش حال بنانے کے لئے پیدا کی جاتی ہے اُس کا سب سے بڑا حصہ سائنس کے بتائے ہوئے اُس سامان پر صرف کیا جا رہا ہے جس کا رزق بے گناہ انسانوں کا گوشت اور ہڈیاں ہیں۔ اس میں شک نہیں سائنس نے ریگستانوں کو گلزار بنایا۔ بیابانوں کو سرسبزی شادابی بخشی، بنجر زمینوں میں پھل اور پھول لگائے، غلہ پیدا کیا، لیکن دل کی بستی سونی کردی۔ انسانوں کو درندہ بنا دیا ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری

عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تراست

کہا جا سکتا ہے کہ علم کا اس میں کیا قصور ہے۔ لیکن کاش علم مادی شکل اختیار کر سکے تو اُس سے پوچھوں کہ جب تجھے اپنے جائز استعمال پر قدرت حاصل نہیں تو پھر کیوں نا اہل دماغوں میں داخل ہو کر بھولے بھالے انسانوں کی بستیوں کو ویران کراتا ہے۔ ہماری بدحالی میں سائنس کا بھی اچھا خاصہ حصہ ہے۔

دُنیا کی تباہ حالی پر یہ مختصر تبصرہ ہے۔ واقعات ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو "حیوانِ ناطق" کہا جائے یا "حیوانِ خوں آشام"۔ درندوں نے جو کام پنجوں اور جبڑوں سے لیا ہے انسان وہی کام "عقل" سے لیتا چلا آیا ہے نقطۂ آغاز سے ابتک انسانی تہذیب نے سینکڑوں نظام بنائے اور بگاڑ دئے۔ ہر تہذیب نورانی چہرہ لیکر نازل ہوئی انسان کی بیماری کا نسخہ اسکے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ لیکن بیماری دور نہ کر سکی۔ اور بیماری دور ہوتی بھی کیوں؟ جتنی نئی تہذیبیں آئیں انہوں نے انسانیت کو نئے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ نئی نئی حدبندیاں کی گئیں۔ محبت کا سبق بھی دیا مگر محدود حلقوں میں 'تعصب' جسے مٹنا چاہئے تھا ہمہ گیر ہو گیا اور محبت جسے ہمہ گیر ہونا چاہئے تھا امتیازات کے دائروں میں مقید ہو گئی۔

میرا نہ یہ منصب ہے اور نہ مجھ میں یہ اہلیت کہ اس عظیم الشان مسئلہ کا حل پیش کروں "دُنیا کو کیا ہو گیا" اور "کیوں ہو گیا" اسکے اسباب اور حالات ظاہر ہیں۔ نچوڑ سب کا یہ ہے کہ اقتصادی عدم مساوات نے دنیا میں بدامنی پھیلا رکھی ہے۔ اسی سے نفسیاتِ انسانی پر اثر پڑتا ہے ۲۱
اور موجودہ ہیئت اجتماعیہ میں جو اکثر و بیشتر سرمایہ داری کی بنیادوں پر قائم ہے، ہر فرد اور ہر ملت نہ صرف اپنے تحفظ اور خوشحالی کی خاطر "قوم پرستانہ" نظامات کو زیادہ مضبوط اور مستحکم بنانے کی گھات میں ہے بلکہ قومی برتری اور سامراجی خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے کمزور اقوام کو اپنے پنجوں میں گرفتار کر کے تمام ذرائع پیداوار، رسل و رسائل، اور تجارت و صنعت پر اپنا قبضہ جمانا اور جو کچھ ابتک حاصل ہو چکا ہے اسے اور زیادہ بڑھانا چاہتی ہے۔ تو گویا نسل انسانی کا حقیقی مرض اقتصادی عدم مساوات ہے اور موجودہ بدامنی کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اقتصادی عدم مساوات کو دور کیا جائے۔ حقیقی سوشلزم (اگر وہ باہمی رقابتوں اور دماغی و ذہنی کشمکشوں سے پاک و صاف ہو) امن عالم کی بنیادوں کو قائم کر سکتا ہے کیونکہ سوشلزم کے اثبات میں اقتصادی مساوات ایک رکن اعظم ہے۔ اس جگہ حقیقی کا لفظ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جس سوشلزم میں بدستور طبقاتی حدبندیاں قائم ہوں وہ حقیقی سوشلزم کہلانے کا مستحق نہیں۔ آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ روحانیت اور مادیت کو ہر سلسلہ میں ٹکرا دیا جاتا ہے۔ سوشلزم کے بہت سے پیچیدہ مادی نظریات کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو کر ان لوگوں کے دلوں میں سوشلزم کے خلاف ایک زبردست مخالفانہ جذبہ پیدا کرا دیتے ہیں جو صحیح یا غلط طور پر 'روحانیات' پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ مادیت اور روحانیت کی اس مسلسل جنگ نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کائنات کی حقیقت کا مبدا ایک نامعلوم سبب کو تسلیم کر لیا جائے اور اسے خالق اور قادرِ مطلق "خدا" مان لیا جائے یا اسکے برخلاف یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسباب کا سلسلہ لامتناہی ہے اور وہ کسی ایک نقطہ پر ختم نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ ہر وجود کا ایک مادی سبب ہونا ضروری ہے تو اس تمام بحث کا انسان کی زندگی اور اسکے زندہ رہنے سے کیا تعلق ہے۔ خدا پر عقیدہ رکھنے والا

شخص بھی اشتراکی سوسائٹی کا اتنا ہی کارآمد رکن ہو سکتا ہے جتنا کہ خدا کا منکر۔ روٹی، مکان، لباس اور ضروری تفریحات کی ضرورت ہر شخص کو یکساں ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد کسی ایسے نظام میں شامل ہونے سے احتراز کرے گا جو اسے "زندہ رکھنے کا ضامن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری فلسفیانہ موشگافیوں نے ہماری زندگی کو اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ اور لڑائی درحقیقت مفکرین کے درمیان ہے جو اپنے اپنے نظریہ کو صحیح منوانے کی خاطر عوام میں معرکہ آرائی کراتے رہتے ہیں۔ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ تمام نوع انسانی ان تمام ذرائع سے مساوی طور پر فائدہ حاصل کرے جو اس کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہیں ان تمام ذرائع کے صحیح استعمال کیلئے ایک عملی پروگرام کی ضرورت ہے اور اس عملی پروگرام کو رائج کرنا ہر انصاف پسند شخص کا فرض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ابتک دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھا کر آسودہ حال بنے بیٹھے ہیں وہ اس پروگرام کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرینگے لیکن بہرکیف دُنیا کی آبادی کا زبردست حصہ بالآخران لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوگا جو مٹھی بھر انسانوں کے مفاد کی خاطر عوام کے تاتراشیدہ جذبات سے کھیلتے اور انہیں افیون گھول کر پلاتے رہتے ہیں۔ لیکن سوشلسٹ پروگرام کی کامیابی کیلئے ایک شرط ضروری ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے عملی پروگرام کو فلسفوں اور نظریوں کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے اور لوگوں کو اس بات پر مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اشتراکی سوسائٹی میں داخل ہونے سے قبل کسی خاص فلسفہ یا نظریّہ کو قبول کرلیں۔ یہ ذہنی استبدادیت اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ حکمراں استبدادیت۔

کوئی پروگرام اٹل نہیں ہو سکتا اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سوشلزم کوئی اٹل قانون ہے ممکن ہے کہ انسان اپنے ارتقائی سفر میں اس سے بھی بہتر کوئی پروگرام بنالے۔ بہر طور وقت کی سب سے بڑی ضرورت اقتصادی مساوات کا قائم کرنا ہے۔ اقتصادی مساوات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سی خوبیاں خود بخود پیدا ہو جائینگی جو ایک مہذب سوسائٹی کو ممتاز بناتی ہیں اور عالمگیر برادری بنا سکتی ہیں۔

۳۰

جامِ خمار

(محترمہ جبین صاحبہ خمارؔ)

اُنہیں یاد ابھی تک ہے وہ زمانہ ترا — نظر بچا کے وہ آنا بصد بہانہ ترا

جبینِ شوق مری کس طرح نہ جھک جائے — کہ سجدہ گاہِ محبت ہے آستانہ ترا

دلوں کو کیوں نہ ہلا دے کمال دکھے دساتھ — کہ میری آہ کے پردے میں ہے ترانہ ترا

خمارؔ کاش وہ خورشیدِ حُسن کہدیتا

کہ میرے نور سے چمکا سیاہ خانہ ترا

صدائے قوت و حیات

(شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

مسرت کی تانیں اُڑاتا گذر جا　　جہاں کو ترانے سناتا گذر جا
بشاشت کے دریا بہاتا گذر جا　　گذر جا زمانے سے گاتا گذر جا
گذر جا زمانے سے گاتا گذر جا

ہر اک دل نشانہ ہے خوف و خطر کا　　ہر اک روح مسکن ہے برق و شرر کا ۲۳
دھواں ہر نفس میں ہے سوزِ جگر کا　　بھیانک ہے ہر ذرّہ اس رہ گذر کا
حسینوں سے آنکھیں لڑاتا گذر جا

مٹا ڈال احساسِ آزارِ غم کو　　جو دانا ہے تو پھینک دے بارِ غم کو
جلا دے فرامینِ سرکارِ غم کو　　جری ہے تو ہر اک دیوارِ غم کو
ہلاتا، بٹھاتا، گراتا گذر جا

صراحی میں بھر بادۂ سرخوشی کو　　چڑھا بے خطر بادۂ سرخوشی کو
بنا ہم سفر بادۂ سرخوشی کو　　جدھر سے گذر بادۂ سرخوشی کو
گراتا، بہاتا، لنڈھاتا گذر جا

فراغت ہی میں نورِ شمس و قمر ہے   خوشا وہ فراغت سے جو بہرہ ور ہے
فراغت کا ہر لمحہ لعل و گہر ہے   فراغت کی ہر سانس عمرِ خضر ہے
فراغت سے جیتا جلاتا گذر جا

حیاتِ دو روزہ کی نادانیوں پہ   خطا اور خطا کی پشیمانیوں پہ
زمان و مکاں کی ستم رانیوں پہ   مصائب کی ہنگامہ سامانیوں پہ
نظر ڈالتا مسکراتا گذر جا

دغا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں   دغا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں
بلا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں   جفا کے گرجتے ہوئے بادلوں میں
مسرت کے پرچم اڑاتا گذر جا

یہ مانا کہ یہ زندگی پُر الم ہے   یہ مانا کہ یہ زندگی موجِ سم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی ایک ستم ہے   یہ مانا کہ یہ زندگی غم ہی غم ہے
سرِ غم پہ ٹھوکر لگاتا گذر جا

مسافر کو ہے کب مفر گھاٹیوں سے   جھجکتا ہے کیوں آ گذر گھاٹیوں سے
نہ ڈر وادیوں سے نہ ڈر گھاٹیوں سے   زمانے کی پُر شور و شر گھاٹیوں سے
اگر مرد ہے گنگناتا گذر جا

بڑی پُر فسوں ہے حوادث کی دُنیا   سراسر جنوں ہے حوادث کی دُنیا
طلبگار خوں ہے حوادث کی دُنیا   یہ دُنیائے دوں ہے حوادث کی دُنیا
حوادث کو نیچا دکھاتا گذر جا

حقائق بہت نرم و راحت فگن ہیں — حقائق بہت تند و عشرت شکن ہیں
حقائق بہت ترش و طاقت شکن ہیں — حقائق بہت تلخ و ہمت شکن ہیں
حقائق سے دامن بچاتا گذر جا

جہاں کی روش ہے بہت ظالمانہ — ریا ہر فسوں ہے دغا ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوۂ عامیانہ — کہ آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو زمانہ
زمانے کو آنکھیں دکھاتا گذر جا

اگر ہر نفس ہے ستانے پہ مائل — اگر زندگی ہے رُلانے پہ مائل
اگر آسماں ہے مٹانے پہ مائل — اگر دہر ہے رنگ اُڑانے پہ مائل
خود اس دہر کا رنگ اُڑاتا گذر جا

۵ چلا چل فراغت کی تانیں اُڑاتا — گرجتا ہوا گونجتا دَنْدَناتا
مسرت کی زنجیرِ در کھٹکھٹاتا — زمانے میں آیا تھا دھومیں مچاتا
زمانے سے دھومیں مچاتا گذر جا

خلافِ گنہ سب کا فتویٰ ہے لیکن — حرم میں بھی یہ شور برپا ہے لیکن
کلیسا بھی آنکھیں دکھاتا ہے لیکن — فریبِ مئے و نغمہ رسوا ہے لیکن
فریبِ مئے و نغمہ کھاتا گذر جا

مسطح نہیں گو کہیں صحنِ ہستی — بڑھا چل، بڑھا چل بہ ایمائے مستی
کوئی شے نہیں راہ کی چیرہ دستی — ہر اک گام ہے گو بلندی و پستی
مگر نشے میں لڑکھڑاتا گذر جا

حسن ابنِ ہانی ابو نواس

دورِ مولّدین کا کامیاب ترین ہجو گو شاعر

دنیا کا دل و دماغ تغیر و انقلاب پسند ہے یا یوں کہئے کہ پردۂ عالم پر اس رنگین اور متحرک تصویر کو دیکھتے دیکھتے انسان اس کا اس حد تک خوگر ہو گیا ہے کہ اب اسکے نزدیک تنوع و نیرنگی ایک دلچسپ مشغلۂ انسانیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزانہ کی چیزوں میں بھی یکسانیت اور پابندیٔ وضع کو تنگ نظری اور تاریک خیالی قرار دے کر سماج کے واسطے معیوب اور نامانوس سمجھتے ہیں یہاں تک کہ خورونوش۔ بودوباش۔ آب وہوا۔ خیالات و جذبات مناظرِ قدرت طرزِ کلام۔ چال ڈھال غرضکہ ہر چیز میں ہم کو نئے رنگ ڈھنگ اور جدید اسلوب کی تلاش رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قدرت حقیقت کی نبض شناس ہے اور اسی لئے اس نے انسانی تخیل کی جدت اور نیرنگی کو محسوس کر کے نظامِ عالم کا خمیر ہی اس مادہ سے کیا جسکی حقیقت میں انقلاب و تغیر جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۴

اگر ہم غور کریں تو یہ لمحۂ فکریہ بآسانی حل ہو سکتا ہے کہ عالمِ وجود کی دُنیا دیں اس مقدس سرزمین پر ہیں کہ جہاں انقلاب اور رنگ آمیزی کا ناپیدا کنار سمندر ٹھاٹھیں مارتا عالم کو زیر و زبر کرتا ان گنت اسرار کو اپنی لہروں کے پردے میں چھپائے چلا جا رہا ہے ؎

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں (اقبال)

یہ بات کس قدر واضح ہے کہ عالم کبھی اُلٹ پھیر اور ادل بدل انسان کی تمام و کمال دلچسپیوں اور دلگدازیوں کا سبب بھی ہے اگر اسی جذبِ رنگین کو حقیقتِ عالم سے خارج کر دیا تو دُنیا اور اسکی تمام چیزیں بے کیف اور بھونڈی معلوم ہوں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ انقلاب و تغیر کی خوش آئند ضیا میں کسی ایک چیز میں محصور نہیں ہو جاتی ہیں بلکہ قدرت نے انسان کے اس جدت پسندی کے جذبہ کی آسودگی میں نہایت فیاضی اور فراخدلی سے کام لیا ہے اور فطرت کے ہر شعبہ میں یہ فیاضی کارفرما نظر آتی ہے شب کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی اور بادِ سموم کے جھلسا دینے والے جھونکوں کے بعد ابر و باد کی تیز دستیاں خزاں کی دحشت اور عبرت کے بین منظر بہار کی رنگ آفرینیاں ہماری انتہائی دلچسپیوں کا راز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں۔ پستی و بلندی ذلت و عزت نشاط و غم سرمایہ داری و بے مائگی قوت و ضعف طفلی و نوجوانی غرضکہ اسی قسم کے ہزارہا تغیر پردۂ عالم پر متحرک تصویروں کی طرح ہر سمت نظر نواز ہیں اور یہی نیرنگیاں اس عالم ہست و بود میں ہماری زندگی کا سرمایہ راحت بھی ہیں اور فنا کا درس بھی۔

انسان کی شوق بھری نگاہیں نظامِ عالم پر اسی وقت تک لگی رہتی ہیں جبتک اس مرقعہ میں تغیر کی رنگینیاں اور انقلاب کے بیل بوٹے

رونما ہیں ورنہ اس کی نظروں میں دنیا ایک نگاہ غلط انداز کی قیمت بھی نہیں رکھتی۔

عالم کا الٹ پھیر اگر کسی دور میں کسی باکمال کو اہل عالم کے مستفید کرنے کیلئے ظاہر کر دیتا ہے تو وہ تمام بنی نوع انسان کا مرکز حسن نظر قرار پاتا ہے اور کل آدم زادوں کی مشتاقانہ عقیدت اس کی طرف سمٹ آتی ہے اور بسا اوقات تو عقیدت کا رنگ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ صرف ایک متنفس کے کمال کے آئینہ خانہ میں جا کر انسان پر اتنی محویت طاری ہوتی ہے کہ اپنے پردۂ خیال سے نقوش گذشتہ اور خط و خال سابقہ سب کچھ محو کر کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی مجسمہ کا مرقع پاتا ہے اور ایک وارفتگی کے عالم میں اسکے آستانہ کے نور پاش ذرات پر سر نیاز خم کر دیتا ہے۔ لیکن تابکے۔ فطری تغیر پسندی میں پھر ابھار پیدا ہوتا ہے اور انسان کی جدت پسند نظریں پردۂ عالم پر کسی جدید شکل و صورت کی پردہ کشائی کی منتظر ہو کر جم جاتی ہیں اور نہایت بے تابی و بے صبری سے قدرت کے اس متصرف ہاتھ کی تلاش کرتی ہیں جو انسانی دلچسپیوں کی خاطر زمانہ کے ورق پلٹتا رہتا ہے۔

قدرت "فطرت کی نبض شناس انسانی طبیعت کے تقاضہ کے مطابق ایک فرد کامل کو الوداع کہتی ہے اور دوسرے تاجدار کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو بیٹھتی ہے۔ الغرض اسی طرح نظام چلا آ رہا ہے یہ سب کچھ کیوں ہے صرف اس لئے کہ انسانی دلچسپیوں کے سامان مختلف حصوں الگ الگ دوروں اور جدا جدا زمانوں میں منقسم ہو جائیں اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں کچھ نہ کچھ ایسے انداز دلربائی اور جاذبیت موجود ہیں کہ انسان کی نظریں اس طرف اٹھنے اور ایک مرتبہ اٹھ کر جم جانے پر مجبور ہو جائیں۔

بالغرض قدرت کی ہمہ بیں نگاہیں طبع انسانی کے مد و جزر پر نہ جمی رہتیں یا انسانی تخئیل کی جدت طرازیوں کی قدرت کو مراعات منظور نہ ہوتی اور اپنے فضل و کمال کے انمول موتی اور بے بہا ہیرے ایک ہی دور کے گذرنے والوں پر نثار کر دیں تو قدرت کے معصوم دامن پر نہ صرف آئندہ نسلوں کو بدقسمت اور بدبخت بنانے کا بدنما داغ لگتا بلکہ قدرتی شاہکار کے اس جذبہ کی توہین کا الزام بھی قدرت اور صرف قدرت کے سر ہوتا جس پر عالم کی تمام نیرنگیوں کا انتظام ہے۔

جب یہ بات مسلّم ہے کہ انقلاب کی شعاعیں جس چیز پر بھی جلوہ ریز ہوتی ہیں اسی میں لطافت اور خوش رنگی پیدا کر دیتی ہیں تو قدرت کی طبع شناس نظریں فطرتِ انسانی کے شاہکار یعنی علم ادب کو جو عالی خیالی بلندیٔ فکر اور جوشش جذبات کی ایک جولانگاہ ہے کس طرح اس دیدہ زیب اور دلنواز رنگ سے محروم رکھ سکتی تھیں۔ ہر ایک زبان کی تاریخ اور اسکے دور بدور انقلابات پر نظر کرو تو درجہ بدرجہ کے تغیرات دیکھو۔ ہر تغیر کا پردہ سیماب رنگ بو رنگ کے عنبر بیز پھول لایا ہے اور گلزار ادب کی سیر کرنے والوں کیلئے نہایت ہی دیدہ زیب اور دلربا سامان جمع کر گیا ہے اور ہر انقلاب کا دامن ہزارہا باکمال انسانوں کو اپنی آغوش نیرنگی میں چھپائے ہوئے لایا اور مشتاقوں اور نظربازوں کی بھری محفل میں بے پردہ کر کے آگے بڑھ گیا ہے۔ اردو زبان ہی پر نظر ڈالئے کہ اسکی اسکول سازی اور درد مندی نے اس کو کیسا سدا بہار اور دلفریب بنا دیا ہے یہ تمام دلچسپیاں اور دلفریبیاں اسی ایک حقیقت کی رہین ہیں جس کو انقلاب کہتے ہیں۔

عربی ادب میں امرؤ القیس۔ نابغہ ذبیانی۔ اعشیٰ اور زہیر کے خوشنما اور دلفریب گلزار ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین سالہا سال کی سیر و سیاحت کے بعد بھی سیر نہیں ہوتے لیکن حسانؓ۔ نابغہ۔ جعدی۔ فرزدق اور جریر کی شعر و سخن کی محفلیں بار بار دامن دل کھینچتی ہیں اور اس قدر محویت طاری کرتی ہیں کہ انسان اب مستقبل میں تغیر و انقلاب سے خود فراموشی کے عالم میں انکار کر بیٹھتا ہے قدرت سادہ لوح انسان کی اس طفلانہ شوخی کا جواب عملی انداز میں دینا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ایک جھٹکے سے تغیر کا جھونکا عالم کے تمام اوراق کو پلٹ کر زمانے کے سامنے وہ صفحہ پیش کر دیتا ہے جس پر ندیم سلطان ابو نواس اپنی تمام دکمال شان دلکشی اور دیدہ زیبی سے موترنم ہے۔ ابو نواس وہ فطرت کے پس منظر اسرار کا محرم ایک طرف دنیائے عرب کو ایک خود فراموشی پر متنبہ کرتا ہے اور دوسری طرف عالم ادب کے جمود و سکوت کو ایک ہماہمی اور جوش و خروش میں بدل دیتا ہے۔

ابو نواس کی سوانح

کچھ دستور ہی یوں چلا آیا ہے کہ قدرت اس قسم کے دل و دماغ کی پرورش اور تربیت تیرہ خاکدانوں جھگڑوں اور ویرانوں میں کیا کرتی ہے۔ باستان ماتارد (علاقہ خوزستان) میں ہانی بن عبدالاول ایک غریب دیہاتی اپنی زندگی کی گھڑیاں تلخکامی اور تنگی سے گذار رہا ہے اور دن بھر کی جفاکشی اور محنت مشقت سے جو کچھ دانہ دنکا میسر آتا ہے وہی اسکی اور اسکے اہل وعیال کی اوقات بسری کا ساز و سامان ہے ۱۴۱ھ اپنے دامان رحمت کے کونے میں ایک انمول مگر گرد آلود ہیرا اس مصیبت زدہ کو نذر دینے لاتا ہے

وہ ہیرا ہے جو ست جس کی چندراں چھپ جائے (ساغر)

مگر اول تو ہانی کچھ نظر باز اور حقیقت شناس نہیں دوسرے اس ہیرے کی ساری چمک دمک ابھی صغر سنی اور طفولیت کے پردوں میں مستور ہے پہلے تو اسکی آمد کو تنگیٔ معیشت اور خرچ کی بڑھوار سمجھ کر پژمردہ ہو جاتا ہے لیکن ہانی کی پامال جبا نگاہیں جب اس نو شگفتہ پھول پر پڑتی ہیں تو ایک خود فراموشی کے عالم میں دل کنول کی طرح کھل جاتا ہے۔ شفقت بزرگانہ سے بے تاب ہو کر اس آنکھ کے تارے کو کلیجے سے لگا کر دعا دیتا ہے اور اپنی تہیدستی مفلسی اور بے سرو سامانی کی زندگی کو یاد کرکے آہ بھرتا ہے اور ساتھ ہی اس لوح فرسا اور جانگداز غم میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور بے اختیار ہو جاتا ہے محبت کے مارے باپ کی شفقت پدری سے یہ اشکباری قدرت ملاحظہ کرتی ہے ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور آئندہ زندگی میں یہی معصوم فطرت بچہ جلیل القدر خلیفۂ بغداد کی صف مصاحبین و مقربین میں جلوہ افروز نظر آتا ہے۔

ہانی نے اپنے لخت جگر کا نام حسن رکھا یہی حسن آئندہ ابو علی کی کنیت اور ابو نواس کے تخلص سے دنیا میں مشہور ہوا۔

نکل فن رجال۔ قدرت جس کسی کو جس خدمت کیلئے مخصوص کرتی ہے دوربین نگاہیں دور اول ہی میں اسکے آثار و قرائن سے نتائج نکال لیتی ہیں اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اس شخص کی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ اور راستوں کے پیچ و خم پیش نظر رکھتی ہیں کہ دیکھیں یہ کن گھاٹیوں اور راستوں سے گذر کر اس میدان تک پہنچتا ہے جہاں فرشتۂ رحمت خلعت امتیاز و شرف اس کے جسم موزوں کے واسطے لئے منتظر کھڑا ہے۔ اور اسی قسم کے رجحانات اس سے بے ساختہ عالم ظہور میں آنے لگتے ہیں اور وہ دنیا کی تمام راہوں سے بے تعلق ہو کر اپنا مرکز خیال اسی بلندی و رفعت کو مقرر کر لیتا ہے جس کی اس کو قدرت راہنمائی کرتی ہے حسن غریب تنگدست اور غریب خاندان کا فرد ۳۸
تھا اور ساتھ ہی قیامت یہ ہوئی کہ ہوش سنبھالتے ہی شفیق باپ کے سدا بہار اور بے بدل سایۂ شفقت سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا گیا اب حسن کی ننھی سی جان تھی اور دنیا وی آلام و مصائب کا تسلسل۔ وقت آیا تھا کہ ہانی اپنے لخت جگر کو تعلیم و تربیت دیتا دیکھ بھال کرتا اور ابھی عالم کے نشیب و فراز کی کچھ خبر نہ ہونے دیتا۔ ہر عالم کے رنج و الم کے دلدوز تیروں کو اپنے جگر پر لیتا اور حسن کو عالم طفلی بے فکری و عیش سے گزارنے دیتا۔ لیکن آہ ایک ذرا سا انقلاب کیا سے کیا کر گیا۔ حسن بے یار و مددگار بے مونس و غمگسار ایک ہولناک صحرا میں کھڑا تھا اور فکر معاش اور حصول رزق کے پُر خطر افکار وحشیوں اور درندوں کی طرح چار طرف سے اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ کثرت غم سے ضبط گریہ مشکل تھا اور وہ رونا بھی کس قدر بے کسی کا رونا تھا کہ کوئی سرپرست شفقت رکھ کر اپنے دامن رحمت سے غریب حسن کے خونیں آنسو پونچھنے والا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس قدر ہوشربا ہے یہ ماحول کہ بڑے بڑے مضبوط دل گردے والے اور شیر مرد میدان چھوڑ بھاگتے ہیں لیکن فطرت کا پیامی ان تمام مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کیلئے کمربستہ تھا۔

ابو نواس کی تعلیم و تربیت

کھوئے ہوئے حواس بجا کئے ہمت و استقلال لیکر اٹھا اور حطاری کی تعلیم کو اپنا لیا، شگون نیک ہے حسن کو مستقبل قریب میں

شعر و سخن کے عطر سے دنیائے عرب کی فضائیں عنبر بیز بنانی ہیں قدرت کو مشق کرانی منظور ہے۔ لیکن فطرت اس کو جس ماحول میں لیجانا چاہتی تھی وہ ابھی دور تھا آخرش اس فن سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی اور اس سے کنارہ کش ہوگیا۔ حسن کی طبیعت جب اس نامانوس الجھاؤ سے فارغ ہوئی تو فطری رنگ ابھرا اب وہی میدان سامنے تھا جس کا شہسوار تھا۔ اُٹھا اور اُستادِ عصر ابن حباب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابن حباب اپنے زمانہ کا جلیل القدر امام ادب اور مسلم الثبوت اُستاد تھا اور ساتھ ہی نظر باز بھی پہلی ہی نظر میں تاڑ گیا کہ جوہر قابل ہے لیکن سرپرستی چاہتا ہے کتنا خوش بخت ہے وہ اُستاد جس کو حسن جیسا شاگرد ہاتھ آئے اور کس قدر عالی نصیب ہے وہ شاگرد جس کو ابن حباب جیسے اُستاد کی سرپرستی نصیب ہو فخر زمانہ اُستاد نے اپنے سرمایۂ ناز شاگرد پر علم و فن کے وہ وہ جواہر ریزے نثار کئے کہ اسکے آس پاس بیٹھنے والے بھی مالا مال ہو گئے

ابن حباب کی طبیعت گریزپا اور سیلانی واقع ہوئی تھی سیر و سیاحت ان کی طبیعت ثانوی تھی انہیں ایک جگہ قیام کرنا بار تھا اس مرتبہ جب یمن میں رہتے رہتے دل گھبرایا اور آمادۂ سفر ہوا تو خوش بخت شاگرد ہمرکاب تھا اُستاد کے ہمراہ دیس بدیس مارا مارا پھرنا فطین شاگرد پر شاق ضرور گذرتا لیکن جس نے صعوبت و آلام کے تلاطم ہی میں آنکھ کھولی ہو اور مصائب و آفات کی غذائیں کھا کھا کر پرورش پائی ہو وہ ان معمولی تکالیف کو کیا خاطر میں لاسکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ سیاحت غیر اطمینانی شان اپنے اندر رکھتی تھی لیکن کسے محسوس ہوتا تھا کہ اس پریشان کن سیاحت کے پس منظر قدرت نے حسن کیلئے تاج شہرت اور لباس امتیاز رکھ چھوڑا ہے اس حیلہ سے حسن کو شعر و شاعری کے صدہا سر سبز و شاداب سبزہ زاروں اور گلستانوں کی گلچینی کا موقع نصیب ہوگیا اور اس سلسلۂ سیاحت میں کوفہ بغداد بصرہ اور دیگر بلاد عرب کے مشہور اور بے بدل اساتذہ کے حلقۂ درس میں زانوئے ادب طے کرتا بے بہا لعل اور انمول موتی اپنے کشکول گدائی میں بھرتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اساتذۂ کامل کی خدمت ذوق شوق محنت اور سب سے بڑھ کر ابن حباب کی سرپرستی اور نگاہداشت نے اس گرد آلود ہیرے پر
۳۹ ایسے دیدہ زیب طرز سے صیقل کی اور رنگ چڑھایا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور اپنے زمانے میں بے عدیل و مثیل قرار پایا۔ آخر انہیں بلند خیالیوں موشگافیوں اور جدت طرازیوں نے اس کو سلاطین عباسیہ کے مرجع انام دربار تک جا پہنچایا اور پہلے محمد المہدی پھر موسیٰ الہادی اور ہارون رشید کی درباری مجالس ادب کا صدر اور مسند نشیں قرار پایا اور ایک مدت تک اس خدمت جلیلہ پر فائز رہ کر اٹھاون برس کی عمر میں اس فطرت کے پیامی نے ۱۹۹ھ میں انتقال کیا آج بھی بغداد کی فضائیں اسکے دل نواز نغموں سے معمور ہیں۔ نیرنگیٔ تقدیر سے ابو نواس نے اپنی رنگین طبعی کے انمول موتی صدہا مرتبہ شاہی درباروں میں پیش کئے اس نرالے انداز میں اپنی گل بار طبیعت کی نمائش کی کہ تاریخ کے وہ صفحات بھی ابھی تک مشک بو اور عنبر بیز ہیں جن میں ان مجالس کے تذکرے ہیں اسی دوران میں تغیرات نے حسن کو نئے نئے عالی خیالوں اور اجنبی معاصرین سے روشناس کرایا اور وقت بر جودت طبع بلندیٔ فکر اور بدیہہ نگاری میں مقابلہ بھی ہوا لیکن آپ دیکھیں گے کہ ابو نواس کی البیلی طبیعت نے ہر میدان میں ان کو پسپا کیا اور وہ لوگ جو اپنے اپنے وقت میں شعر و شاعری کے دار و مدار شمار ہوتے تھے جب کبھی مقدر سے اسکے مقابل ڈٹے ہمیشہ منہ کی کھائی۔

یوں تو تمام عباسی خلفاء اور خصوصاً محمد المہدی موسیٰ الہادی اور ہارون رشید جواہرات کے جوہری اور زر آدمیت و انسانیت کے معیار تھے اور دیگر علوم کے علاوہ ادب اور اسکے لوازمات پر عدیم المثال دستگاہ رکھتے تھے اس پر طرہ یہ کہ اہل زبان تھے اس لئے ادبی صحبتوں اور شعر و شاعری کی محفلوں میں نقد و تبصرہ کرنے محاسن و معائب پر نظر کرتے اور افضل و غیر افضل قرار دینے کیلئے نہ کوئی ادبی بورڈ طلب کرنا پڑتا نہ کتب لغت اور اشعار جاہلیت سے سند لانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی بلکہ ایسے تمام فیصلے وقتی طور پر سرانجام کئے جاتے تھے اور سب سے واضح ظاہر اور کھلا ہوا فیصلہ وہ ہوتا جو ایسی محفلوں مقابلوں اور موازنوں کے وقت زر و جواہر اور خلعت و

نعمت کے دیدہ زیب اور خوشنما پردے ہیں ادیبوں کیلئے صادر ہوتا تھا آپ دیکھیں گے کہ ایسے مواقع پر ابونواس نے اپنے ہمچشموں اور حریفوں سے دوگنا چوگنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ وصول کیا ہے۔

بے محل نہوگا اگر یہاں ادبی شاعری پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ ابونواس کی شخصیت کو حسب مرتبہ سمجھ سکیں۔

عربی شاعری

دُنیا کا وہ خطہ جس کو جغرافیائی اصطلاح میں جزیرۃ العرب سے موسوم کرتے ہیں اگرچہ اسکی سرزمین فردوس مثال ایران اور بہشت نظیر کشمیر کی طرح رنگ برنگ کے پھولوں غنچوں سبزہ زاروں اور زیب وزینت سے بالکل خالی ہے بلکہ اسکے برخلاف وہاں ریگ اور سنگریزوں کا ایک موج انگیز سمندر ہے جو جزیرہ کے مختلف حصّوں میں لہریں مارتا کہیں سمٹتا اور کہیں پھیلتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود کس قدر معجز نما اور حیرت خیز ہیں وہ فضائیں کہ جو بھی متنفس اس ماحول میں پرورش پاتا ہے وہ گلزار شاعری میں وہ وہ نادیدہ راستے اور شاہراہیں معلوم کرتا ہے کہ دُنیا غرق حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غالباً مبالغہ نہوگا کہ جزیرۂ عرب کے سنگریزے اور ریگ کے ذرات بھی شعر و ادب کی رنگ و بو اور نقش و نگار سے مزیّن و دلفریب ہیں۔

شاعری اور موزونیٔ طبع کوئی کسی چیز نہیں، جزیرہ عرب کے گوشہ گوشہ کا ہر ذرّہ اس زبردست حقیقت کا آئینہ دار ہے سمندر سے صدہا سیپیں نکلتی ہیں۔ ان میں ہزارہا موتی ہوتے ہیں لیکن ان میں کا ہر ایک ہوتی کب اس قابل ہوتا ہے کہ اسکو سلاطین عظام کے تاج شرف اور خلعت فاخرہ کی زیب وزینت بڑھانے کا فخر نصیب ہو۔ گلشن میں روزانہ بے شمار خوشنما اور دیدہ زیب پھول کھلتے ہیں لیکن نازک خیالوں کی بزموں اور شیریں اداؤں کی محفلوں میں ان میں سے چند گنے چُنے پھول ہی بار پاتے ہیں۔ ہم کو بھی یہاں ادب کے ان خوشنما اور دلآویز پھولوں پر نظر کرنی ہے کہ جو گلستان عرب میں دلربائی کے انوکھے انداز اور دلکشی کے خوشنما طرز سے بلند ترین شاخوں پر جلوہ افروز ہوں۔ یہ تو مشکل ہے کہ عربی کے اس رستم داستاں کا پتہ لگایا جائے کہ جسکے دل و دماغ میں سب سے پہلے شعر و شاعری کا تموج و تلاطم اُٹھا اور شاید اسی خلفشار سے بچنے کے لئے مورخین نے طبقات تو ذکر کر دئے ہیں لیکن درازیٔ مدّت اور قدامت کے سبب پیشرو قافلہ کے نشان قدم کی تلاش اضاعت وقت تصوّر کرکے چھوڑ دیا ہے۔ ۴۴

عربی شاعری کے دور

جب جزیرہ عرب کے تمام سیاسی نظم و نسق اور معاشرتی تجارتی اور اقتصادی اصول و قواعد کی عنان اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو شعر و شاعری اور ادب کی دُنیا پر بھی اہل اسلام ہی قابض و متصرّف قرار پائے لہذا ادب عرب کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے دورِ جاہلیت اور زمانۂ اسلام۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں مشترک ایک اور دور شاعری ہے جس کو مخضرم کہتے ہیں۔

مخضرم میں وہ شعراء ہیں جنہوں نے دورِ جاہلیت میں بھی اپنی بلندیٔ فکر کے نمونہ پیش کئے ہوں اور اسلام کے زمانہ میں بھی بزم ادب سجائی ہو۔

پھر زمانۂ اسلام کے شعراء کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک اسلامی کہلاتے ہیں اور دوسرے گروہ کو جو اس سے متاخر ہے مولدین کہتے ہیں ان تمام دوروں میں جو فصاحت و بلاغت بلندی اور شہرت دورِ جاہلیت کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے عہد کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ زمانہ فصاحت و بلاغت میں اس قدر بلندی اور رفعت کا دور ہے کہ عرب والے اپنے علاوہ دُنیا کی ساری آبادی کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔

مولدین کا دور ہی وہ حشر بداماں تموّج اپنے اندر رکھتا ہے جو ابونواس اور اسکے معاصرین کے دل و دماغ سے نکلا اور جس نے پُرانے زمانے کے تمام نشانات اور بناؤں پر قبضہ کر لیا اسی بزم میں حسن میر مجلس اور صدر محفل بنایا گیا۔

حسن کی دربار تک رسائی

حسن کی ولادت کا ۱۴۱ھ وہ سال تھا جبکہ تختِ خلافت پر ابوجعفر منصور عباسی جلوہ افروز تھا۔ حسن نے تعلیم و تربیت کے بعد جب دُنیائے شعر و ادب میں قدم رکھا تو فضائیں ابو العتاہیہ اور دعبل کے دلنواز ترانوں سے معمور تھیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حسن نے کس وسیلہ سے دربارِ عباسی تک رسائی پائی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ منصور کے ایام خلافت ختم ہوتے تک ابو نواس کا دربار میں پتہ بھی نہیں ہے ہاں جب ۱۵۸ھ میں محمد المہدی سریر آرائے خلافت ہوا اور دنیا کو اپنی داد و دہش سے نوازا تو یہ فلک زدہ غم نصیب بھی اسکے کرم و فضل کا آوازہ سُن کر حاضرِ دربار ہو گیا اور یہیں سے اسکی عظمت و رفعت کا آغاز ہوتا ہے۔ ابو نواس نے اپنی زندگی تین خلفائے عباسیہ کے سایۂ رحمت میں گذاری ہے مہدی کی خلافت سے اس کا دور شروع ہوتا ہے اور جب ۱۶۹ھ میں مہدی کے انتقال کے بعد اسی کا بیٹا موسیٰ ہادی خلیفہ بنتا ہے تب بھی ابو نواس حاضرِ دربار ہے اور کچھ ماہ کے بعد جب ہادی کا انتقال ہو گیا اور خلافت عباسیہ کا درخشاں چاند پوری آب و تاب سے طلوع ہوا یعنی خلیفہ ہارون الرشید ۱۷۰ھ میں برسرِ اقتدار آیا تو بھی ابو نواس دربار میں موجود تھا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہارون کے سایۂ عاطفت میں ابو نواس کو وہ بلندی اور رفعت حاصل ہوئی کہ آج بھی عربی شاعری کے آسمان پر سورج بن کر چمک رہا ہے۔

ابو نواس کے معاصرین

34694

خلفاء عباسیہ علم دوست اور قدر شناس تھے اور ڈھونڈھ کر باکمال لوگوں کو اپنے دربار کی زیب و زینت کیلئے بڑے بڑے ہدایا اور تحفے دے دے کر بلواتے تھے۔ ابو نواس کے حاضرِ دربار ہونے سے پہلے ابو العتاہیہ دعبل عمرو اور ابو الاسود حمانی نے درباری فضاؤں پر پورا قبضہ جما رکھا تھا یہاں تک کہ خلیفہ ان میں سے ایک دو کو ضرور سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا اسکے ساتھ ہی بشار بن برد مروان بن ابی حفصہ ابو دلامہ صریع اور مسلم بن ولید کے اشعار و خیالات پر فن ادب کے متوالے مشتاقانہ نظریں جمائے بیٹھے
اہم رہتے تھے اب آپ غور کیجئے کہ ایک مفلس غمزدہ بے کس بچہ ایسے ماحول میں سامنے آتا ہے اور اپنی خداداد فطانت اور فطری ملکہ سے اس نرالے انداز میں ارغنون شاعری چھیڑتا ہے کہ دُنیا ایک غیر معلوم جذبہ کے ساتھ اسکی طرف کھنچ جاتی ہے اور اس ادب نواز ملک کا ذرہ ذرہ ابو نواس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے حسن کی یہ تمام کامیابی اور رفعت اسکی اپنی قوتِ خیال اور دماغی خلاقیوں کا نتیجہ تھی نہ اس میں اس کو کسی کی مدد پہنچی اور نہ کسی نے اسکی سرپرستی کی۔ اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ترتیب دینے کے بعد ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ ابو نواس سحر ساز دماغ اور معجز نما دل اپنے پہلو میں لیکر آیا اور زمانہ بھر کو اپنی شعبدہ بازیوں سے مسحور کر کے آگے بڑھ گیا۔

ابو نواس کی شاعری

خلافتِ راشدہ کے بعد سے ہی اسلامی حکمرانوں میں سلطنت، اور ریاست مع اپنے تمام لوازم کے اثر انداز ہو چلی تھیں اور جیسے جیسے زمانہ بڑھتا گیا یہ اثر زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ خلفاء عباسیہ کے درباروں میں تمام وہ تکلف زیب و زینت نام و نمود اور رنگ روپ پورا دخل پا گئے جو کبھی روم و ایران کے مزین درباروں کا طرۂ امتیاز تھے۔ عیش و عشرت عام ہو گئی اور ساتھ ہی اسکے تمام لوازمات درباروں محفلوں اور خلوتگاہوں میں آہستہ آہستہ قبضہ پا گئے لیکن یہ ضرور ہے کہ باوجود ان تمام عیش و عشرت اور شادی و فرصت کے معاملات سلطنت کی دیکھ بھال اور مظلوموں کی خبرگیری سے کوئی غافل نہ تھا۔

قاعدہ ہے کہ دربار سلطانی کا رنگ ڈھنگ رعیت کو بیحد مرغوب و دلپسند ہوتا ہے لہذا امرار وزرار شرفار اور عوام میں حسب حیثیت عیش پسندی تھوڑے ہی دنوں میں عام ہو گئی۔ دربار کے اس عشرت خیز ماحول میں مصاحبین اور شعرار کا ظریف طبع اور بذلہ سنج ہونا خاصہ لازم ہے بغیر اسکے ہر چیز بے کیف اور بے مزا ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ بڑی سعی اور کوششوں سے ہزارہا تکلیفوں اور آفتوں کو برداشت کر کرا کے اس خوش گوار رنگ کو عالم وجود میں لایا گیا ہوگا لہذا اس کو اُتار دینا یا ختم کر دینا آسان کام نہ تھا۔ ابو نواس جب حاضرِ دربار ہوا تو اس نے وہاں کے ذرہ ذرہ پر عیش و عشرت کا آب و رنگ دیکھا اور در و دیوار کو فرحت و انبساط کے نقش و نگار سے مزین پایا ہی نہیں بلکہ تمام قلمرو خلافت کو اسی ایک رنگ سے رنگین پایا۔ لہذا کیا کرتا خود بھی اسی رنگ میں غرق ہو گیا لیکن جب اُبھرا ہے تو اتنا گہرا اور چمکیلا رنگ لیکر اُٹھا کہ دوسرے لوگ حیرت کے عالم میں اسکا منہ تکتے رہتے ۔

ابو نواس نے اب وہ تمام خصوصیات اپنے میں پیدا کیں جو ایک درباری شاعر کے واسطے لازم ہیں وہ لطیفہ گو بھی بنا ظریف بھی بدیہہ گو بھی اور حاضر جواب بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ محض درباری شاعر جس میں صفات مذکورہ موجود ہوں مجموعی اعتبار سے ناقدین کی نظروں میں کسی خاص عزت و وقار کا مستحق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا درجہ ایسا باوقعت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ادبی دُنیا میں کوئی خاص مقام امتیاز حاصل کر سکے دُنیا میں صدہا باکمال آئے اور بہترین قوتِ خلاقی بھی اپنے اندر رکھتے تھے لیکن دربار کی لہو و لعب کی فضا میں ایسے پھنسے کہ اپنی ساری قابلیت اور بلند پروازی کھو بیٹھے ذوق اور آتشؔ اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

اگر ابو نواس بھی درباری دُنیا اور بزمِ خلوت کی دلچسپیوں میں گھر کر اپنی گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا کمال شاعری ختم کر دیتا تو اس کو ادبی مذاکروں میں ہرگز کوئی درجہ نصیب نہ ہوتا اور بہت تھوڑی مدت میں اس کا نام صفحۂ عالم سے نیست و نابود ہو جاتا لیکن اس باکمال نے اس نقص کو محسوس کیا اور درباری جھمیلوں اور محفلوں کی ہما ہمی میں گھر کر بھی اس نے رنگِ قدیم کو ترک نہیں کیا ....

.... بلکہ ایک طرف اس نے درباری فضاؤں اور محفلوں پر قبضہ جمائے رکھا اور دوسری طرف اپنی پُرگوئی اور فصاحت و بلاغت سے ناقدوں اور باریک بینوں کی نظروں میں وقعت پانے کا سامان جمع کرتا رہا۔ اس لئے ابو نواس کی شاعری دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔

(۱) ابو نواس کا درباری رنگ ۔ (۲) ابو نواس کا آزاد رنگ ۔

ابو نواس کے متعلق ناقدین کے اقوال

قیروانی نے رسائل الانتقاد میں ابو نواس کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ "میرے نزدیک ابو نواس ایک مستقل طرز کا بانی ہے چونکہ اس نے شاعری کا قدیم رنگ اور متعارف طرز چھوڑ دیا۔ اس نے (زمانۂ قدیم کے) کار آمد رنگ کو اپنے انداز بیان سے غیر مفید ثابت کر دیا اور جس کو لوگ مشکل سمجھتے تھے اسے آسان کر دکھایا (چونکہ لوگ اب رنگ قدیم کے خوگر نہ رہے تھے اس لئے) ان کو خیالات قدیم کی ہر سلسل اور مربوط لڑی منفصل اور بے میل نظر آنے لگی۔ ابو نواس نے رنگ قدیم کے خیالات پروئے ہوئے موتی منتشر کر دئے۔ پرانی بُنیادوں کو چھوڑ کر اپنی عمارتوں کیلئے نئی نئی بُنیادیں ڈالیں (جب اس نے شاعری شروع کی ہے تو یہ حالت تھی) کہ لوگوں میں سے ادبی ذوق تقریباً معدوم ہو چکا تھا اور قصرِ عربیت کی بُنیادیں ہل چکی تھیں اور اصلی فصاحت و بلاغت بے قدر اور بے کیف ہو چکی تھی لوگ اپنے مذاق کے مطابق چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ان کو وہی چیزیں بھاتی تھیں جن کے وہ عادی تھے پس ابو نواس کے کلام کا چرچا ہونے لگا اور لوگ اسکو ہاتھوں ہاتھ لے جانے لگے اور (اسکے خیالات) گراں بہا اور بیش قیمت چیز سمجھے جانے لگے۔ لوگ ابو نواس کے اسی ضعیف اور معمولی کلام پر شیفتہ و فریفتہ ہو گئے۔ اگرچہ قدرت نے اسکی فطرت میں فصاحت و بلاغت کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور عربیت میں تخئیل و محاکات کا آفتاب درخشاں بنایا تھا لیکن (کرتا کیا) اس نے بازاروں میں جس طرز کی چیزوں کا رواج دیکھا ویسی ہی پیش کیں اور لوگوں کو ان کے حسب منشا خیالات تحفہ بھیجے ۔

ابو نواس چونکہ متقدمین شعراء کے خلاف چلا اس لئے وہ (جلد) مشہور و معروف ہوگیا اور چونکہ وہ نئی نئی چیزیں لایا تھا اس لئے لوگوں نے ان کو پسند کیا اور خوب شہرت دی چونکہ عوام الناس کے بازار میں اچھی بری سب قسم کی چیزیں کھپ جاتی ہیں اس لئے وہ ابو نواس کے انہیں معمولی اور ضعیف شعروں کو موتیوں کی لڑیاں سمجھتے تھے لیکن ناقدین ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ابو نواس چونکہ یہ یقین رکھتا تھا کہ میرے یہ معمولی درجہ کے اشعار ناقدین کے نزدیک بے قدر ہونگے اور نکتہ چیں ان پر گرفت کرکے ضعیف تر بنا دینگے اسی لئے وہ اسکے ساتھ ہی ساتھ اپنے اس انتہائی فصیح و بلیغ کلام سے اس کا تدارک کرتا رہا جس کے نقطہ نقطہ سے اسکا زور بیان مترشح ہوتا ہے۔

(کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ) ابو نواس اپنی خود بینی اور خفیف طبعی کی وجہ سے عوام کے نزدیک اپنے (اس قسم کے) کلام کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ناقدین کی اظہار نقائص سے چشم پوشی کو غلبہ اور کمال تصور کر بیٹھتا تھا۔

اوپر کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ابو نواس ایک طرف عوام کی دلچسپی کے سامان مہیا کرتا تھا اور دوسری طرف طبقۂ شعراء میں اپنا وقار قائم رکھنے کی بھی فکر میں لگا رہتا تھا۔

ابن رشیق نے معتبر نقاد کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ لیس فی المولدین اشهر اسمًا من الحسن ابو نواس۔ مولدین میں ابو نواس سے زیادہ کسی نے بھی شہرت نہیں پائی۔ پھر بھی ابن رشیق آگے چلکر ابو نواس کو مولدین کا امرء القیس کہتا ہے۔

علامہ جاحظ کا قول ہے کہ لیس یفضل علی الحسن مولدٌ سواء بشار بن برد کہ مولدین میں بشار بن برد کے علاوہ ابو نواس سے کوئی ایک بھی بڑھ کر نہیں ہے۔

آگے چلکر ابن رشیق نے ابو نواس کے زمانے کے دس شاعر جو مولدین میں بلند درجہ رکھتے ہیں اور عربی ادب میں ان میں سے ہر ایک ایک خاص امتیاز پائے ہوئے ہے شمار کرکے کہا ہے کہ لیس فیھم نظیر ابو نواس کہ ان میں کوئی ایک بھی ابو نواس کا ثانی نہیں ہے۔

یہ لوگ جو عربی تنقید میں بہت اونچا اور بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ کیسے گرانقدر الفاظ میں ابو نواس کے فضل و کمال کو تسلیم کرکے بے مثل قرار دے رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ناقدین کی نظروں میں یہ وقعت اور ادبی مذاکروں میں عظمت اکثر و بیشتر اس زاویۂ نگاہ سے ابو نواس کو حاصل ہوئی جو درباری الجھنوں اور پسند عوام کے بندھنوں سے بچکر ادا کیا گیا۔

قیروانی نے کس صفائی سے کلام کے دونوں پہلوؤں پر نظر کی ہے کہ تصویر کے ہر دو رُخ سامنے آجاتے ہیں اور ہر شخص ابو نواس کے اصل خط و خال دیکھ لیتا ہے۔

ابو نواس دربار میں

جہاں ابو نواس ایک بے بدل شاعر تھا وہاں قدرت نے اس کو بلا کی ذکاوت اور ذہانت بھی عطا کی تھی۔ بسا اوقات نواس عجیب انداز سے اور بروقت اس کا ظہور ہوتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔

لطیفہ

خالصہ۔ خلیفہ ہارون رشید کی ایک باندی تھی شکل و صورت کی کچھ زیادہ حسین نہ تھی لیکن ہارون کو اس سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ایک روز خالصہ نہایت عمدہ لباس اور زیورات پہنے اور گلے میں جواہرات کا ایک بیش قیمت ہار ڈالے خلیفہ کے ساتھ مشغول اختلاط تھی اسی دوران میں ابو نواس حاضر ہوا۔ خلیفہ نے ابو نواس کی حاضری کی خبر سنی تو اس کو بلا تکلف خلوت میں بلا بھیجا۔

ابو نواس نے نہایت عمدہ اشعار اور لطیفے پیش کئے لیکن خلیفہ خالصہ کے ساتھ کچھ ایسا مشغول تھا کہ ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ابو نواس کو یہ بات گراں گذری اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا جب خلوتکدہ کے دروازہ سے گذرا تو یہ شعر دروازہ پر لکھتا گیا ؎

لقدْ ضاعَ شعری علیٰ بابکم کما ضاعَ عِقدٌ علیٰ خالصہ

تمہارے دروازہ پر آج میرے اشعار کی وہی توہین ہوئی ہے جیسے خالصہ کے جسم پر بیش قیمت جواہرات کے ہار کی

ابو نواس کے مخالفین نے یہ سارا واقعہ خلیفہ سے جا کر عرض کیا اور اسکے خلاف بہت کچھ زہر اُگلا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ فوراً ابو نواس کو حاضر کرو۔ ابو نواس کو بے وقت بلائے جانے سے خدشہ پیدا ہو گیا۔ جب خلیفہ کی حضوری کیلئے جانے لگا تو دروازہ پر پہنچ کر اپنے لکھے ہوئے شعر پر نظر پڑی فوراً ضاع کی عین کا دائرہ مٹا دیا اور حاضر دربار ہو گیا۔ تم نے ابو نواس دروازہ پر کیا شعر لکھا ہے خلیفہ نے طیش میں آکر فرمایا۔

حضور یہ لکھا ہے ؎ [1]

لقد ضاءَ شعری علیٰ بابکم کما ضاءَ عقدٌ علیٰ خالصہ

تمہارے دروازہ پر آج میرے اشعار میں وہ چمک دمک آگئی جو خالصہ کے جسم سے جواہرات کے بیش قیمت ہار میں۔

خلیفہ کا غصہ جاتا رہا اور اس کو بہت سا انعام دیا۔

حاضر جوابی میں تو وہ کمال تھا کہ کبھی کسی سے زک نہ اُٹھائی وقت پر ایسی بات کہتا کہ مخاطب کو خاموشی کے علاوہ کوئی راہ نہ رہتی۔

لطیفہ

ابو نواس کو شراب پینے کی بہت عادت تھی۔ ایک روز ایک بزم میں آپ بلائے گئے اور وہاں بے اندازہ پی گئے اور پھر اس تمام حالت کو ایک قصیدہ میں حکایت کر بیٹھے۔ وہ قصیدہ کسی کے ہاتھ لگ گیا اس نے ہارون خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ابو نواس اقراری مجرم تھا شاہد کی کیا حاجت تھی۔ خلیفہ ہارون نے طلب کیا۔ پوچھا تم نے شراب کیوں پی ابو نواس۔ جہاں پناہ غلام سے یہ قصور کبھی سرزد نہیں ہوا۔ خلیفہ تم نے خود اس قصیدہ میں اعتراف کیا ہے۔ قصیدہ دیکھ کر ابو نواس کے ہوش اُڑ گئے لیکن فوراً سنبھلکر کہا کہ حضور اللہ تعالیٰ نے شعراء کے متعلق فرمایا کہ (وانھم یقولون مالا یفعلون) (شاعر) وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو نہیں کرتے۔ تو پھر غلام مجرم کیسے ہوا۔ 44

ابو نواس کی جدت پسند طبیعت نے اس درباری رنگ کو بھی عامیانہ انداز میں نہیں رہنے دیا بلکہ وہ اس سلسلہ میں بھی ایسی قوت کا مالک ہے کہ جس سے اس کو معاصرین کی صف میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ بلاشبہ اس طرز شاعری میں بھی ابو نواس نے اپنے متقدمین اور معاصرین دونوں سے قدم آگے بڑھایا ہے اور اس کو دنیا کے سامنے ایک نرالے کیف سے پیش کیا ہے۔

عوام پسند شاعری میں ابو نواس کا کلام

اس سلسلہ میں جس چیز میں ابو نواس بلندی اور کمال کے آخری زینہ پر ہے وہ بدیہ گوئی ہے۔ بدیہ گو ہر زبان میں ہوتے ہیں اور عرب کی شاعری میں بدیہ گوئی تو بکثرت پائی جاتی ہے لیکن ابو نواس کی بدیہ گوئی کا طرز ہی نرالا اور انوکھا ہے۔

بدیہ گوئی کے درجات

پہلی قسم بدیہ گوئی کی یہ ہے کہ سر مشاعرہ کوئی مصرع دیا گیا اور اس پر غزلیں لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ حاضرین میں سے جو صاحب ذوق جس قسم کا مضمون چاہیں اپنے پسندیدہ الفاظ اور طرز ادا کے ساتھ مناسب بندش اور ترتیب میں ادا کر دیں۔ اس میں کوئی خاص محنت

[1] ضاع کے معنی ہیں خراب ہو گیا عین کا دائرہ مٹا دینے سے ہمزہ رہ جاتا ہے اب ضاء کے معنی چمکدار ہو جانا ہو گئے۔

نہیں ہوتی لیکن اس سے اوپر ایک دوسری قسم ہے جو پہلی قسم کی بہ نسبت دقت طلب اور مشکل ہے ۔ وہ یہ کہ صرف ایک مصرع دیکر اس کا مصرع ثانی مطلوب ہو۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ مصرع مطلوبہ کی تلاش کس قدر صعب اور کٹھن ہے اور خصوصاً جب قید لگادی جائے کہ مصرع مطلوبہ کو شعر کا مصرع اولیٰ بنایا جائے ۔ ایک تیسری قسم بدیہہ گوئی کی اور ہے جو نسبتہً پہلی دونوں قسموں سے مشکل ہے وہ یہ کہ ایک چیز سامنے رکھ دی جائے اور اس پر شعر کہنے کی فرمائش کی جائے ۔

ابو نواس نے ان متعارفہ اقسام کو ایک طرف رکھ کر دنیا کو ایک اور قسم سے روشناس کرایا ۔ یہ انوکھا انداز ابو نواس کا ایجاد کردہ ہے دوسری زبانیں تو کیا خود عربی ادب بھی اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میں یہاں آپ کے سامنے اسکے اس انوکھے طرز کو اسی کے الفاظ میں پیش کئے دیتا ہوں لیکن ایک خاص فائدہ کے ماتحت میں نے ان کی تاریخی ترتیب بدل دی ہے ۔

ایک ٹھنڈی سہانی تاریک رات میں ہارون رشید پر بے خوابی غالب آگئی ۔ بار بار کروٹیں بدلیں سنبھل سنبھل کر لیٹا لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی ۔ جب پڑے پڑے طبیعت گھبرا گئی اور پریشان ہو گیا تو شبستان شاہی سے اُٹھا اور محلسرا کے صحن میں آ گیا ۔ یہاں آکر سوچنے لگا کہ نیند آتی نہیں طبیعت گھبراتی ہے کون سا شغل اختیار کروں کہ یہ پہاڑ سی کالی رات کٹ جائے ۔ ٹہلتا جاتا تھا اور دماغ کسی مناسب شغل کی تلاش میں مشغول تھا ۔ بہت دیر کے سوچ فکر کے بعد ایک بات ذہن میں آئی اور محلسرا کے اس حصہ میں جا پہنچا جہاں ان دوشیزگان خوش منظر کی خوابگاہیں تھیں جو اسکی مملوک اور زر خرید تھیں یہ کمرے دور تک مسلسل چلے گئے اور ہر ایک میں ایک یکہ پارہ رہتی تھی ۔ کس قدر حسین شغل تھا اور کیسا دلآویز مشغلہ ۔ خلیفہ نے ایک کمرے کا پٹ کھولا ۔ دروازہ کھولنا تھا کہ سامنے لانبی لانبی عنبریں زلفوں کی چمکدار تاریکی میں لپٹی لپٹائی ایک ماہ وش اپنی تمام کرشمہ سازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے بے خبر دُنیا سے غافل خواب آور شباب کے کیف میں مست و مدہوش پڑی ہے ۔

45 "جلوہ ہے یا رُخ میں گردش کر رہا ہے آفتاب"

بے خوابی کی تکلیف کا احساس تو کجا خلیفہ کے ہوش و حواس بھی بجا نہ رہے اور بے اختیارانہ اس کو ہوشیار کرنے کیلئے پیر ہلانا شروع کیا وہ ہوشیار ہوئی اور یہ دیکھ کر کہ امیر المومنین تشریف فرما ہیں ۔ صبر شکن انداز میں فرش سے اُٹھی اور مؤدبانہ عرض کیا کہ

یا امین اللہ ما ھذا الخبر ۔ حضور، کیا معاملہ ہے

خلیفہ نے کہا :- ھو ضیفٌ طارق فی ارضکم   ھل تضیفوہ الی وقت السحر (معاملہ یہ ہے) کہ آج ایک مسافر اپنی قطع منزل کی مصیبتیں برداشت کرنے والا اتفاقاً تمہارے دیس میں آنکلا ہے کیا تم صبح ہونے تک اسکی میزبانی کر سکتی ہو۔

دوشیزہ نے عرض کیا :- بسرور سیدی اخدمہ   ان رضی لی وبسمعی والبصر

آقا، اگر وہ مہمان مجھ سے راضی ہے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اس کی خدمت سر آنکھوں سے کروں گی ۔

واقعہ گذر گیا جب خلیفہ صبح کو دربار میں جلوہ فرما ہوئے ابو نواس کو سامنے طلب کیا اور فرمایا کہ یا امین اللہ ما ھذا الخبر پر مصرعے لگاؤ ۔ اب آپ ابو نواس کی باریک بینی بلند پروازی کو دیکھئے ۔ پہلے ابو نواس نے چند منٹ سوچا پھر سر اُٹھایا اور عرض کیا ۔

طال لیلی حین وافانی السھر   فتفکرت فاحسنت الفکر

جب مجھ پر بے خوابی کا غلبہ ہوا تو مجھے رات پہاڑ معلوم ہونے لگی اور میں نے اپنی شب گذاری کیلئے کوئی تدبیر سوچنی شروع کی ۔
(سوچتے سوچتے) نہایت حسین تدبیر سمجھ میں آئی (اور فوراً)

قمت امشی فی ھلالی ساعة   ثم اخری فی مقاصیر الحجر

اپنی خوابگاہ سے اُٹھا پہلے تو باہر آکر محلسرائے کے صحن میں کچھ دیر ٹہلا اور پھر وہاں سے حجروں کی طرف چلا پھر میں نے ایک حجرہ کھلوا تو

فاذا وجهٌ جمیلٌ حسن　　　زانهُ الرحمٰن من بین البشر

دفعتہً میری نگاہ ایک نہایت حسین اور جمیل چہرے پر پڑی۔ کہ اس کو خدا نے سارے آدمیوں سے زیادہ زیب و زینت اور حسن و خوبی عطا کی تھی۔

فلمست الرجل منها موقظًا　　　فرأت نحوی ومدت لی البصر

میں نے اس حسینہ کا پاؤں اس کو جگانے کیلئے چھوا (وہ بیدار ہو گئی) اور نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا

واشارت وهی لی قائله　　　یا امین الله ما هذا الخبر

یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے کچھ اشارے کئے کہ یا امین اللہ ما ہذا الخبر۔

قلت ضیفٌ طارق فی ارضکم　　　هل تضیفوه الی وقت السحر

فاجابت بسرور سیدی　　　اخدم الضیف بسمعی والبصر

جب ابونواس اس محاکات سے فارغ ہو چکا تو خلیفہ نے کہا واللہ کنت معنا۔ واللہ تو اس وقت ہم دونوں کے ساتھ تھا۔ ابونواس نے کہا کہ حضور تخت خلافت کی قسم مجھے اس مصرع نے اس پورے واقعہ کی طرف راہ نمائی کی ہے میں حریم خلافت میں کیسے بار پا سکتا ہوں۔

یہ بدیہہ گوئی کی ایسی حیرت انگیز شان ہے کہ اس سے آگے نہ عقل رہنمائی کرتی ہے اور نہ ذہن رسائی پاتا ہے۔ اس قسم کے صدہا مواقع ابونواس کی زندگی میں آئے اور ہر جگہ اسی انداز میں ابونواس نے اپنا کمال دکھایا۔ لیکن ابونواس یہیں آکر نہیں رک جاتا بلکہ اس کا دماغ اس سے آگے ایک اور دنیا کا پتہ لگاتا ہے اور اپنی قوت فکر سے اسکو بھی فتح کرتا ہے اور بلا شرکت غیر اس دنیا پر بھی حکومت کرتا ہے۔

بدیہہ گوئی میں ابونواس کا اعجاز

محمد المہدی کا دربار

مہدی کے دربار میں بھی ابونواس کو شرف عزت کا بہت بڑا درجہ ملا ہوا تھا۔ بشار بن برد۔ جس کو جاحظ نے مولدین میں ابونواس سے افضل قرار دیا ہے۔ وہ مہدی کے دربار ہی میں ابونواس کا مقابل بن چکا تھا ہم اس موقع پر دونوں کی رفعت خیال اور بلندئ فکر کی مثال پیش کئے دیتے ہیں۔ اتفاق ایسا ہے کہ ایک موقع پر بشار اور ابونواس دونوں نے ایک ہی چیز پر اظہار خیال کیا ہے ایک روز ظہر کے وقت خلیفہ محمد المہدی ایک خیزرانی جاریہ کے مقصورہ کی طرف جا نکلا۔ مہدی اسکی بے خبری میں گیا تھا دیکھا کہ وہ غسل کر رہی ہے۔ جاریہ نے جیسے ہی دیکھا فوراً اس نے اپنے منور جسم کو اپنے سیاہ گیسوؤں کے پردے میں چھپا لیا اور زلفوں کو اس انداز سے بکھیر ڈالا کہ سارا بدن سیاہ پوش بن گیا۔ مہدی اسکی اس شوخی کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا اور اس کی اس ادا کو بہت پسند کیا اور اپنے دولتکدہ میں پہنچکر حکم دیا کہ جو جو شاعر حاضر دربار ہوں ان کو یہاں طلب کرو۔ چنانچہ بشار بن برد اور ابونواس حاضر خدمت کئے گئے۔

تم دونوں میرے واردات قلب کو اشعار میں بیان کرو خلیفہ نے فرمایا۔

بشار ابن برد کی شعر گوئی

پہلے بشار بن برد نے کچھ غور و فکر کرنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

تجنبتکم والقلب صاب الیکم بنفسی ذالک المنزل المتجنب

مجھ کو تم سے زبردستی دور (تو) کر دیا گیا ہے (لیکن) میرا دل تمہارے لئے بیتاب ہے۔ اس منزل کے ذرات پہ میری جان صدقہ جو مجھ سے زبردستی چھڑائی گئی۔

اذا ذکروا اعرضت لامن ملالۃ وذکرا کم شیٔ الیٰ محبب

جب میرے سامنے تمہارا ذکر کیا جاتا ہے تو میں اس سے بے توجہی کرتا ہوں لیکن یہ بے توجہی کسی ملال یا نفرت کے سبب سے نہیں (لے دے کے) ایک تمہارا ذکر ہی تو میری زیست کا سہارا ہے (پھر نفرت کے کیا معنی ہیں)

وقالوا تجنبنا ولا تقرب بننا فکیف وانتم حاجتی اتجنب

علی انھم احلیٰ من المن عندنا واطیب من ماء الحیوٰۃ واعذب

میرے لئے ان کا حکم ہے کہ ہم سے دور رہ اور ہرگز ہمارے قریب مت آ۔ (آہ) کیسے دور رہوں تم تو میری تمنا اور جان تمنا ہو مزید برآں یہ کہ میرے نزدیک وہ ترنجبین سے کہیں زیادہ شیریں ہیں۔ اور میں ان کو آب حیات سے خوشگوار تر اور پاکیزہ تر پاتا ہوں (پھر تم کو چھوڑ کر زندگی زندگی ہی کب رہے گی)

بشار شعر تو اچھے کہے ہیں خلیفہ نے فرمایا لیکن بخدا میرے قلبی تاثرات کی تشکیل نہیں ہے۔ اب ابو نواس کی باری تھی پہلے خلیفہ کے چہرہ پر نظریں جمائے کچھ دیکھتا رہا پھر کچھ سوچا اور کہنے لگا۔

ابو نواس کی محاکات

نضت عنھا القمیص لصب ماءٍ فورد خدھا فرط الحیاء

۴۷ اس نے غسل کرنے کے لئے اپنے جسم سے کپڑے اتارے (لیکن جب اس نے اپنے کو عریاں پایا تو حیا آگئی) اور فرط حیا سے اسکے رخسار گلابی ہو کر دمکنے لگے۔

وقابلت الھواء وقد تعرت بمعتدل ارق من الھواء

اس نے عریانی کے عالم میں اپنے ہوا سے زیادہ لطیف اور شفاف جسم کو چلتی ہوئی ہوا کے مقابل کر دیا۔

ومدت راحۃ کالماء منھا الی ماءٍ معدٍ فی الاناءِ

اور پانی جیسی شفاف ہتیلی برتن میں رکھے ہوئے پانی کی طرف بڑھائی۔

فلما ان قضت وطراً وھمت علی عجل لاخذ بالرداء

جب وہ غسل سے فارغ ہو چکی اور جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا۔

وقامت تشراب علی حذارٍ کشب الظبی افرد من ظباء

(تو) کھڑی ہوئی اور خوفزدگی کے عالم میں گردن اٹھا اٹھا کر بنظر احتیاط (چاروں طرف) اس انداز سے دیکھنے لگی جیسے ہرنیوں کی ڈار سے بچھڑ کر کوئی ہرنی اپنے آس پاس کی چیزوں پر وحشت ریز نگاہیں ڈالتی ہے۔

رأت شخص الرقیب علی التدانی فاسبلت الظلام علی الضیاء

اس کو قریب ہی اپنا شیدا نظر آیا (بس) فوراً اس نے روشنی پر تاریکیوں کو لٹکا دیا۔

فغاب الصبح منھا تحت لیل وظل الماء یجری فوق ماء

پس (اس عمل سے) اس ماہوش کے جسم کا وہ حصہ جو تا بانی میں صبح کے مشابہ تھا رات کے نیچے غائب ہو گیا۔ گویا پانی کے اوپر پانی بہنے لگا۔

فسبحان الالٰہ وقد براھا کاحسن مایکون من النساء

پاک ہے وہ خدا جس نے اس حسینہ کو تمام نقائص سے پاک صاف پیدا کیا ہے اور تمام عورتوں میں زیادہ حسین وجمیل قرار دیا ہے

خلیفہ نے ابو نواس کی محاکات سُن کر یقین کر لیا کہ اس خلوتکدہ کے کہیں آس پاس ابو نواس پوشیدہ کھڑا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن خلیفہ کو کیا خبر تھی کہ یہ خود اسکے اپنے چہرہ کے اُن وقتی اثرات کی ایک دلکش تصویر ہے جن کو ابو نواس نے شاعرانہ نکتہ رسی اور باریک بینی سے معلوم کر کے رومانیت کے دلآویز رنگ میں پیش کر دیا ہے۔

خلیفہ مہدی ابو نواس کی محاکات سُن کر زرد ہو گیا اور طیش میں آکر خدام کو حکم دیا کہ جلاّد سے کہو وہ تلوار اور چمڑا[1] لیکر حاضر ہو ابو نواس کھٹک گیا اور بہ لجاجت تمام عرض کیا۔

حضور خلافت پناہ جلاّد کی حاضری کا حکم کیوں صادر فرمایا۔

اس سرکش کے وجود سے دُنیا کو پاک کرنے کے لئے جو حریم خلافت میں پوشیدہ داخل ہو کر وہاں کے راز معلوم کرے خلیفہ نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔

حضور ایسا خانماں برباد زندگی سے سیر کون اجل گرفتہ ہے ابو نواس نے زمین پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر عرض کیا۔

تو ...... ابو نواس ...... تو خلیفہ نے فرمایا۔

اس کا ثبوت ابو نواس نے پاکدامنی کے انداز میں عرض کیا۔

ثبوت ...... ابو نواس اس کا ثبوت ...... ہوں ...... ابھی ابھی جو واقعہ اشعار کے پیرایہ میں تو نے بیان کیا ......

اور اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہتا ہے ...... بتا کیا اور بھی کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ ۴۸

حضور حریم خلافت میں پوشیدہ داخل ہونا تو کیا اجازت پا کر بھی داخلہ کی ہمت نہیں ابو نواس نے عرض کیا۔ حضور یہ تو صرف خلافت پناہی کے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ کی وساطت سے میرے دل ودماغ کی خلاقی تھی ورنہ کہاں میں اور کہاں حریم خلافت۔

آپ غور کیجئے اس شاعر کے کمال پر کہ اس نے خلیفہ کے چہرہ کے آثار سے کل واقعہ تک راہبری کر کے تغزل کے کیسے دلکش انداز میں پیش کیا۔ یہ ہے ابو نواس کا شاہکار اور اس منزل پر پہنچکر ابو نواس ہم کو رفعت کی اس چوٹی پر نظر آتا ہے جہاں اسکے معاصرین متقدمین تو کجا متاخرین بھی اس میں شرکت نہ کر سکے۔

---

[1] خلفاء عباسیہ سنگین جُرم والے سرکش مجرموں کو اپنے روبرو دربار ہی میں قتل کراتے تھے اور اسی مقصد کے لئے دربار کرتے وقت جلاّد برہنہ تلواریں کاندھوں پر رکھے مؤدب کھڑے رہتے تھے اور ساتھ ہی چمڑے کا ایک ٹکڑا جس پر چار چار چھ چھ انگل ریت بچھا رہتا تھا اور اسی پر مجرم کی گردن ماری جاتی تھی۔ ریت اس پر اس لئے بچھا رہتا تھا تاکہ مجرم کے خون سے دربار خلافت کی مقدس زمین آلودہ نہ ہو اور یہ ریت اس کو جذب کر لے۔

سرمایہ داری میں اصولی تضاد

کارل مارکس کا خیال تھا کہ :-

(۱) سماج کا دارومدار جنس پیدا کرنے کے طریقہ اور اس جنس کے طریقۂ تقسیم پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ ہر زمانہ کی سماج کا دوسرے زمانہ کی سماج سے اختلاف صرف اس وجہ سے رہا ہے کہ دونوں زمانوں کے طریق پیداوار اور تقسیم جدا جدا ہوتے تھے اور یہ کہ ہر سماجی تبدیلی خواہ معاشرتی ہو یا سیاسی اسی تحت میں آتی ہے۔

(۲) آجکل جو اس امر کا احساس بڑھ رہا ہے کہ موجودہ سماجی زندگی اور طریق معاشرت بے انصافی پر مبنی ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ موجودہ نسل زیادہ نیک اور پارسا بن گئی۔ بلکہ جنس کے طریق پیداوار اور تقسیم کے ساتھ ساتھ سماج نہیں بدلی۔ اگر طریق پیداوار وغیرہ ۷۵ فی صدی بدل گئے ہیں تو سماج صرف ۱۵ فی صدی بدلی ہے۔

(۳) موجودہ معاشرتی اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا نتیجہ ہے جسکی خصوصیت جنس کو نفع کے لئے پیدا کرنا ہے۔ اس طریق سے قبل جاگیردارانہ طریق پیداوار تھا لیکن چونکہ یہ ایک دوسرے کا رد تھے اس لئے دونوں میں جنگ ہونے لگی اب آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ سماج اپنے سامنے وہی کام رکھتی ہے جس میں پورا ہونے کی اہلیت ہو اور یہ بھی کہ دوسرا طریق پیداوار اسی وقت نمودار ہوتا ہے۔ جب پہلے طریق میں پیداوار کی طاقتوں کے بڑھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ جاگیردارانہ طریق میں پیداوار کی طاقتیں نہیں بڑھ سکتی تھیں اس لئے سماج میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار جاری ہو گیا۔

(۴) موجودہ مزدوروں کے کاندھوں پر پڑے ہوئے طریق پیداوار کو جس کا مقصد صرف نفع حاصل کرنا ہے سرمایہ داری کہتے ہیں اور کیونکہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں آزادی کے ساتھ مقابلہ کرنے۔ خرید و فروخت والوں کو برابر کے حقوق رکھنے اور ہر شخص کو اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے کی ضرورت تھی اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ آزادی اور مساوات سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ہر طرف سے آزادی آزادی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہاں اس امر پر غور کیجئے کہ پیداوار کی طاقتوں اور طریق پیداوار نے کس طرح اس زمانے کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ آزادی اور مساوات کے راگ گائیں آزادی و مساوات کا خیال کسی کے دماغ کا اختراع نہیں تھا بلکہ یہ خیال طریق پیداوار کی ضرورتوں نے ان کے دماغ میں پیدا کیا تھا پہلے طریق پیداوار بدلا پھر اس نے انسانی تخیل کو بدلا۔ سرمایہ داری آزادی اور مساوات ساتھ ساتھ لائی۔

سرمایہ داری نے آزادی اور مساوات پیدا کی اور آزادی و مساوات نے سرمایہ داری کو خوب بڑھایا۔ کل۔ بھاپ اور بجلی نے پرانی

پیداوار کی طاقتوں کو شکست دیدی اور طریق زندگی کو اس تیزی سے بدلا کہ دنیا دنگ رہ گئی کچھ عرصہ تک جاگیردارانہ طریق پیداوار جو دستکاری پر منحصر تھا اور جس کی نمایاں خصوصیت جنس کو استعمال کیلئے پیدا کرنا تھی چلتا رہا لیکن آخرکار تباہ ہو گیا جن وجوہ سے وہ تباہ ہوا تھا آج سرمایہ داری بھی انہیں وجوہات کی بنا پر تباہ ہو رہی ہے۔

(۵) شروع شروع میں سرمایہ داری سے دنیا کو بہت فائدہ پہنچا یہ اسی کا کام تھا کہ دنیا نے چند صدیوں میں زبردست ترقی کر لی لیکن اب سرمایہ داری پیداوار کی طاقتوں کے پاؤں میں زنجیر ہو گئی ہے اور ان کو بڑھنے نہیں دیتی۔ پیداوار کی طاقتیں بڑھنا چاہتی ہیں طریق پیداوار پھیلنا چاہتا ہے اور طریق تقسیم وسیع ہونا چاہتا ہے لیکن یہ تمام رجحانات سرمایہ داری کیلئے نقصان دہ ہیں کیونکہ اگر ان کو پھیلنے دیا تو پیداوار کی طاقتیں سرمایہ دار کے ہاتھ سے نکل کر سماج کے ہاتھ میں آجائیں گی حالانکہ سائنس کی بدولت استعمالی اشیاء ضرورت سے زیادہ پیدا ہو سکتی اور ہوتی ہیں۔ لیکن ضرورت مند بدستور موجود رہتے ہیں کیونکہ نہ جنس ضرورت مند کے پاس جا سکتی ہے اور نہ ضرورت مند جنس کی جانب ہاتھ بڑھا سکتا ہے۔

(۶) اگر سماج پیداوار کی طاقتوں سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے اور پیدا کردہ جنس کو نہ استعمال کر سکے تو یہ اس سماج کا سب سے بڑا نقص ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ سماجی طریق کو بدل دیا جائے۔ آج کل جو لڑائی پیداوار کی طاقتوں طریق پیداوار اور طریق تقسیم میں ہو رہی ہے کسی کے خیال کی اڑان نہیں بلکہ ایک الگ ہستی رکھتی ہے۔ سوشلزم پیداوار کی طاقتوں طریق پیداوار اور تقسیم پیداوار کی لڑائی کا حل ہے۔

(۷) آٹھویں صدی سے پندرہویں صدی تک کام کاج چھوٹے پیمانے پر ہوتے تھے جن کے بنیادی اصول کے مطابق جنس بنانے والا ہی جنس کا مالک ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسان تھا تو زمین بیل اور ہل اسی کی ملکیت ہوتے تھے۔ وہ اپنی محنت سے جنس پیدا کرتا تھا اس لئے پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔ شہروں میں بھی دستکاری چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ تنہا آدمی کام کرتا تھا وہ اپنی محنت سے جنس بناتا تھا اور قدرتی طور پر وہی اس کا مالک ہوتا تھا۔ شہروں میں بھی دستکاری چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ تنہا آدمی کام کرتا تھا وہ اپنی محنت سے جنس پیدا کرتا تھا اس لئے پیداوار کا مالک ہوتا تھا۔ تنہا آدمی کی ضرورت کے مطابق اوزار بھی چھوٹے ہوتے تھے۔ ان چھوٹے اوزاروں کو بڑا اور تیز بنانا اور موجودہ کلوں میں تبدیل کرنا سرمایہ داری کا کارنامہ ہے۔ فیوڈل یا جاگیردارانہ طریق پیداوار اس قدرتی ترقی کو نہ روک سکا اور آخرکار تباہ و برباد ہو گیا۔

(۸) کارل مارکس نے اپنی مشہور تصنیف سرمایہ کے چوتھے باب میں اس امر کا مفصل ذکر کیا ہے کہ ۱۵ صدی سے سرمایہ داری نے کس طرح آسان اور سادہ طریق پیداوار کو موجودہ صنعت و حرفت میں تبدیل کر دیا اور کس طرح سرمایہ داری نے اسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری گہری تبدیلی بھی پیدا کر دی وہ یہ ہے کہ اس نے چھوٹے اور سادہ طریق پیداوار کو جو کمزور طاقت پیداوار کا نتیجہ تھا بڑا اور تیز بنا دیا لیکن اسکی نوعیت بھی بدل دی جو شروع شروع میں غیر ارادی تھی سرمایہ داری نے انفرادی طریق پیداوار کو اجتماعی طریق پیداوار بنا دیا یعنی پہلے تنہا آدمی پورا کام کرتا تھا اور اب بہت سے آدمی مل کر وہ کام کرنے لگے۔ پرانے چرخوں کھڈیوں اور ہتھوڑوں کو بدل دیا۔ اور بجلی یا بھاپ سے چلنے والی چیزیں بنا دیں۔ لوہار کی دکان جہاں وہ اکثر تنہا کام کیا کرتا تھا فیکٹری بن گئی اور وہاں پر بہت سے لوگ کام کرنے لگے۔ جنس کسی خاص دستکار کی محنت کا نتیجہ نہیں رہی بلکہ ان تمام دستکاروں کی محنت کا نتیجہ۔ یعنی طریق پیداوار انفرادی سے اجتماعی ہو گیا۔

(۹) اب دیکھئے کہ طریق پیداوار تو تبدیل ہو کر انفرادی سے اجتماعی ہو گیا لیکن ملکیت بدستور انفرادی ہی رہی پرانا زمانہ تو وہاں ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ دستکار اول سے آخر تک خود جنس بناتا اور قدرتی طور پر وہی اس جنس کا مالک ہوتا تھا۔ دستکار کی ملکیت اسکی محنت کا نتیجہ تھی۔ اگر اس زمانے میں سب گھر والے جنس بناتے تو وہ جنس ان سب گھر والوں کی ملکیت ہوتی تھی لیکن اب جبکہ طریق پیداوار

انفرادی سے اجتماعی ہوگیا تو بھی ملکیت میں فرق نہ آیا بلکہ وہ انفرادی ہی رہی اور صنعت و حرفت پر سرمایہ دار کا قبضہ ہوگیا۔

(۱۰) پرانے زمانہ میں پیداوار ایک فرد یا گھر والوں کی ضرورت کو پورا کرتی تھی اور اگر کچھ ضرورت سے بچ رہتا تو اس کا تبادلہ کسی دوسری جنس سے ہو جایا کرتا تھا جہاں خدمتگاری کے تعلقات تھے وہاں پیداوار جاگیردار کی ضرورت کو بھی پورا کرتی تھی اب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ اس زمانہ میں جنس استعمال کے لئے پیدا کی جاتی تھی نہ کہ نفع کے لئے لیکن جب عام طریق پر کسان ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کرنے اور جاگیردار کو لگان ادا کرنے لگا تو اس وقت سے وہ پیداوار جو کہ ضرورت و استعمال کیلئے پیدا کی جاتی تھی پیداوار نہیں بلکہ جنس بن گئی جو نفع کیلئے پیدا کی جانے لگی۔ پہلے زمانہ میں کبھی کبھار طریق مزدوری دیکھنے میں آتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ لوہار وغیرہ کی دکان پر بیٹھتے بھی تھے تو ان کا مقصد مزدوری کرنا نہیں بلکہ کام سیکھنا ہوا کرتا تھا تاکہ آگے چل کر خود لوہار ہو جائیں اور یہی ہوتا بھی تھا۔ چند سال کام سیکھنے کے بعد وہ خود لوہار ہو جاتے تھے اور اپنا کام الگ شروع کر دیتے تھے دوران شاگردی میں اگر ایک لوہار ان کو کچھ دیتا بھی تھا تو وہ مزدوری نہ ہوتی تھی بلکہ ایک طرح کا وظیفہ ہوتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں غریب کو مزدوری کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک مزدور ساری عمر کے لئے مزدور ہوگیا۔ جب اجتماعی طریق پیداوار سے جنس سستی ہوئی تو انفرادی طریق مقابلہ نہ کر سکا اور لاکھوں کیا کروڑوں دستکار جو چھوٹے چھوٹے اور سادہ اوزاروں سے کام کرتے تھے بیکار ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نواب راجہ اور جاگیردار بھی فنا ہو گئے اور ان کی فوج اور نوکر چاکر سب بیکار ہو گئے ان سے مزدوروں کی تعداد اور بھی بڑھی غرضکہ کچھ عرصہ میں سماج میں دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک وہ جس کے ہاتھ میں سماج کی ساری پیداوار آگئی دوسری وہ جسکے پاس سوائے کام کرنے کی طاقت کے اور کوئی سرمایہ نہ رہا۔

(۱۱) اب اجتماعی طریق پیداوار کے بڑھنے اور جنس کے بڑی تعداد میں تبادلہ کیلئے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس طریق کے نقائص صاف نظر آنے لگے یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ جس سماج میں جنس نفع کے لئے پیدا کی جاتی ہے اس میں کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ سماج کو کب اور کتنی جنس کی ضرورت ہے سرمایہ دار یہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح قدرت کا قانون کشش کام کرتا ہے اسی طرح ہر طرح ہر طریق پیداوار کے قوانین ۵۱
کام کرتے ہیں۔ اصل قیمت کے قانون مقابلہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور بجائے اسکے کہ سرمایہ دار کی مرضی پر چلیں سرمایہ دار کو اپنی مرضی پر چلاتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سماج کا طریق لین دین کسی خاص نظام کے مطابق نہیں بلکہ ہنگامی ہے بغیر سماج کی ضرورت معلوم کئے جنس کو نفع کیلئے بنانا سرمایہ داری کا پیدائشی نقص بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکے لئے جان کا حکم بھی رکھتا ہے۔

(۱۲) پیداوار کے اجتماعی اور ملکیت کے انفرادی ہونے کے اختلاف کی وجہ سے کارخانہ میں تو انتظام لیکن سماج میں بدانتظامی ہے دیکھئے کارخانہ میں یہ حساب تو ہو جاتا ہے کہ کتنی خام جنس درکار ہے مشین ایک دن میں کتنا مال بناتی ہے اور کتنے مزدوروں کی ضرورت ہے وغیرہ۔ لیکن یہ حساب نہیں ہوتا کہ سماج کو کتنی جنس اور کب درکار ہے۔ یہی بدنظمی سرمایہ داری کو چلا رہی ہے۔ لین دین کا یہ اصول کہ جنس اپنی اصل قیمت پر فروخت ہونی چاہیئے سرمایہ دارانہ نظام میں کمپیٹیشن یعنی مقابلہ کے ہاتھوں پورا ہوتا رہتا ہے اور اسی وجہ سے جنس اپنی اصل قیمت پر آ کر رکتی ہے چاہے اسکی تبادلاتی قیمت کتنی ہی کم یا زیادہ کیوں نہ کر دی جائے۔ یہ تو بدنظمی کا پہلا نتیجہ ہوا۔ اب دوسرا سنئے؟

بدنظمی کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سرمایہ دار۔ دوسرے سرمایہ دار کے مقابلہ میں جب اپنی جنس کو دوسرے کی جنس سے سستا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسکے لئے نفع بخش کلیں بنوانا اور مزدور کی جنس بنانے کی استعداد بڑھانا ضروری ہو جاتا ہے اور اسکی مرضی کے مطابق کلیں بنانے والوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں یہ بدنظمی کا فیض ہے کہ سرمایہ دار کلوں کی تکمیل پر مجبور ہی نہیں بلکہ اسکی زندگی اور طریق پیداوار کا دارومدار ہی ان کی تکمیل پر ہے۔ کیونکہ انسانی محنت قیمت پیدا کرتی ہے اس لئے جب مشین کم انسانی محنت

خرچ کرکے جنس بنانے لگی تو جنس سستی ہوگی ۔ یہی وجہ سرمایہ دار کو مشین استعمال کراتی ہے ۔ اگر مشین قیمت پیدا کرتی تو آج دُنیا میں جنس بہت مہنگی ہوتی لیکن جنس سستی ہو رہی ہے کیونکہ قیمت پیدا کرنے والی شے جس کو انسان محنت کہتے ہیں وہ مشین کی ترقی کے ساتھ ساتھ جنس میں کم ہوتی جارہی ہے دوسرے الفاظ میں مشین کے ساتھ ساتھ مزدور بیکار ہو رہا ہے ۔ مشین مزدور کی جگہ لے رہی اور بیکاروں کی فوج میں اضافہ کر رہی ہے ۔

(۱۴) ایسے وقت میں جب سرمایہ دار کا جھگڑا اسکے مزدوروں سے جو کام کر رہے ہوں ہو جاتا ہے تو بیکاروں کی فوج سرمایہ دار کو بڑی مدد پہنچاتی ہے اور مزدور کو سرمایہ دار کے سامنے جھکنے کے لئے مجبور کرتی ہے ۔ کیونکہ سرمایہ دار ہر وقت لڑتے والے کو نکال کر دوسرا مزدور بھرتی کر سکتا ہے ۔ اور اس بیکار فوج کے بل بوتے ہی پر سرمایہ دار شرح مزدوری کم سے کم کر دیتا ہے اور مزدور چوں تک نہیں کر سکتا ۔ اس لئے مشین سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک زبردست ہتھیار ہے جو اس کو ہر طرح سے فائدہ پہنچاتا رہتا ہے ۔ بیکار مزدوروں کی فوج سرمایہ دار کو جھگڑے ہی کے موقع پر فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ (.Boom) میں جب نفع زیادہ ہو رہا ہو ۔ اور (Crisis) میں جب نفع خطرے میں ہو تب بھی بہت فائدہ دیتی ہے (.Boom) بوم ۔ میں مزدور فوراً کم مزدوری پر دستیاب ہو جاتے ہیں اور تعطل میں ان کی مزدوری فوراً گھٹا دی جاتی ہے ۔

اب دیکھئے کہ مزدور خود ہی تو مشین بنائے اور پھر مشین ہی مزدور کو بیکار کردے ۔ لیکن مشین کی تکمیل اور پیداوار کی طاقتوں کا بڑھانا سرمایہ دار کے لئے قانون قدرت کا سا حکم رکھتے ہیں ۔ سرمایہ دار کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں ۔ پہلا تو مشین کی تکمیل اور پیداوار کی طاقتیں کو قابو میں رکھتا ہے ۔ لیکن جب وہ بہت بڑھ جاتی ہیں تو سرمایہ دار کے قابو سے باہر ہو جاتی ہیں اور اب سرمایہ دار کو ان کی مرضی پر چلنا پڑتا ہے ۔ اسکی مثال ایسے سمجھئے کہ موٹر چلانے والا موٹر چلا رہا ہے شروع شروع میں تو وہ موٹر کو قابو میں رکھتا ہے لیکن اگر اسکی رفتار بڑھتا جائے تو ایک درجہ وہ آئیگا کہ موٹر اسکے قبضہ سے باہر ہو جائے گی اور اب اس کو موٹر کی مرضی پر چلنا پڑے گا ۔ اگر وہ درخت کی سمت جارہی ہے تو موٹر والا اس کو روک نہیں سکتا اور ٹکر کو بچا نہیں سکتا ۔ پیداوار کی طاقتیں ایک بھری ہوئی روح کی طرح بڑھتی اور اس چیز کو جو ان کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہے روندتی چلی جاتی ہیں ۔ اور اگر کوئی اٹل شے ان کے راستے میں آجائے تو وہ سیلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔

(۱۵) اب جو مشکل آپڑتی ہے وہ یہ ہے کہ مشین اور سائنس کی برکت سے جنس کی پیداوار تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے لیکن اسی نسبت سے مانگ نہیں بڑھتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار آپس میں سخت مقابلہ کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اور بڑی بڑی کلیں تیار ہو جاتی ہیں یعنی جہاں پہلے دس چھوٹی مشینوں پر دس مزدور کام کرتے تھے وہاں پر اب ایک بڑی مشین رہ جاتی ہے اور اس پر صرف ایک مزدور اتنی ہی دیئے گئی جنس پیدا کر لیتا ہے ۔ اس طرح سے جنس تو سستی ہو جاتی ہے لیکن مزدوروں میں بیکاری ہو جاتی ہے اور پھر ان میں اس سستی چیز کے خریدنے کی بھی طاقت نہیں رہتی اور جو سرمایہ دار سرمایہ کی کمی وجہ سے بڑی بڑی مشینیں نہیں لگا سکتے ان کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے اور دیوالہ نکل جاتا ہے اور ان کی کلوں کے مزدور بیکار ہو جاتے ہیں ۔ اب سرمایہ دار بیکار مزدوروں کی زیادتی دیکھ کر برسرکار مزدوروں کی مزدوری گھٹا دیتا ہے بہانہ یہ ہوتا ہے کہ جنس سستی ہوگئی اور مزدور اب ان کو کم دام میں خرید سکتا ہے ۔

اس طرح غریب اور انجان مزدور اس گھٹاؤ کو منظور کر لیتا ہے ۔ جب خرید کی قوت کم ہو جاتی ہے تو جنس کا بکنا بند ہو جاتا ہے اور بازار میں جنس کا انبار لگ جاتا ہے پھر جنس کے سستا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ عوام اس کو خرید سکیں ۔ قیمت کم ہونے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار کے نفع میں بھی کمی واقع ہوتی ہے اور پھر اس نقصان کو دور کرنے کے لئے پہلی مشینوں سے بہتر اور خود بخود چلنے والی مشینیں بنائی جاتی ہیں ۔ لیکن اس سب کا ردِ عمل دوسرے مزدوروں کی بیکاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ پس یہ مقابلہ اور نفع جس کو پہلے مساوات اور آزادی

سمجھا گیا تھا۔ ایک تباہی کا چکر ثابت ہوتا ہے جو سرمایہ داری کو اپنی مضبوط گرفت سے نہیں نکلنے دیتا۔

(۱۶) اب آپ دیکھئے کہ کس طرح یہ بڑی بڑی مشینیں جنگ کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں مشین مزدور کو بیکار کردیتی ہے اور جنس کو سستا لیکن جب مزدور بیکار ہو جاتا ہے تو جنس بکنی بند ہو جاتی ہے اور سرمایہ دار نفع حاصل کرنے کیلئے دوسری تیز اور نفع بخش مشینیں بنوا کر جنس کو سستا کردیتا ہے لیکن جنس پھر بھی نہیں بکتی اور جب خرچہ برداشت نہیں ہوتا تو کارخانوں کے دیوالے نکل جاتے ہیں اب بہت سے مزدور مع سرمایہ دار بیکار ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کا وقت تو اچھا گزرتا ہے لیکن مزدور پر فاقہ گزرنے لگتا ہے اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مزدور نے سماجی ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کردی۔ روپیہ جو جنس کو چکر میں لاتا ہے اب لین دین کیلئے ایک روک ہو جاتا ہے خرید و فروخت کے قوانین الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ پیداوار کی طاقتیں طریق پیداوار کے خلاف بغاوت کرنے لگتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنس اونے پونے بکنے لگتی ہے۔ لیکن سرمایہ دار اپنی دولت اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس وقت وہ اپنے اثر سے کام لیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے بازاروں کو قابو میں لانے کے لئے اپنی حکومت کو جو کٹ پتلی کی طرح ہوتی ہے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ممالک کے خلاف جنگ کرے اور ان کے لئے بازار مہیا کرے۔ اب جنگ کا سامان شروع ہو جاتا ہے۔ مزدور دن رات جنگی چیزیں بنانے کے کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں بہت سے لوگ فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیکاری کی وبا دور ہوگئی یہاں تک کہ جنگ کا گولہ پھٹتا ہے۔ اور وہی مزدور جن کا خون سرمایہ داروں نے پہلے ہی چوس لیا تھا اپنا آخری قطرہ تک اس سرمایہ داری کیلئے بہانے کو سربکف نکل پڑتے ہیں اور ملک کے نام پر سرمایہ داری کیلئے اپنی جانیں تک دے دیتے ہیں۔ اس طرح جنس اور مزدور تباہ ہو جاتے ہیں اور بازار خالی ہو جاتا ہے اب پھر وہی چکر شروع سے شروع ہوتا ہے۔ لوگ پہلے کی طرح مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ نفع خوب ہونے لگتے ہیں۔ مزدوری اچھی ملنے لگتی ہے اور بوم کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۳ یہاں تک کہ پندرہ سولہ سال بعد اوپر بیان کی ہوئی کیفیات پھر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پھر کمپٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جنس کو سستا بنانے کے لئے بڑی بڑی مشینیں بنتی ہیں۔ پھر مزدور بیکار ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ اجتماعی پیداوار انفرادی ملکیت کا اختلاف رنگ لائے بغیر نہیں رہتا اور برابر تصادم پیدا کرتا رہتا ہے۔

(۱۷) قدرت کا قانون کہ ہر شے اپنی فطرت کے مطابق گردوپیش کو اپنے رنگ پر لانا چاہتی ہے۔ طریق پیداوار یہیں بھی کام کرتا ہے اب جبکہ فیکٹری میں طریق پیداوار منظم ہوگیا۔ ایک جنس ایک مقررہ مقدار اور وقت میں بنی۔ تو یہ ضروری ہوا کہ سماج بھی اپنی تنظیم کرے یعنی جنس بنانے سے پہلے سماج یہ معلوم کرلے کہ کس اور کتنی جنس کی ضرورت ہے۔

(۱۸) کرائسس اور زمانہ گھٹاؤ کے دوران میں سرمایہ داری کے پیدائشی نقائص بہت نمایاں ہو جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جبتک پیداوار کا محرک نفع حاصل کرتا ہے اس وقت تک یہی خرابیاں پیدا ہونگی مشینیں۔ کلیں اور مزدور موجود ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال نفع پیدا نہیں کرتا مشینوں اور کلوں کی تعداد سرمایہ داری کے مانع ہو جاتی ہے۔ نفع غائب ہوتے ہی سرمایہ دار کو جنس پیدا کرنے کا لالچ بھی نہیں رہتا۔ اس لئے صنعت و حرفت سست ہو جاتی ہے۔ لیکن کیونکہ سرمایہ دار کے پاس کھانے کو کافی ہوتا ہے اس لئے اس کو کوئی فکر نہیں ہوتا۔ البتہ مزدور کے دم پر بن جاتی اور اسکے کام کرنے کی طاقت کی کوئی قیمت نہیں رہتی اس سے بھی سرمایہ دار ہی کو فائدہ پہنچتا ہے کسی نظام کا سماج کو ترقی دینا ہی اسکی زندگی ہے یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری جبتک سماج کی پیداوار بڑھانے کی ایک وجہ رہی دنیا میں اس کا دور دورہ رہا لیکن اب وہ سماج کی پیداوار پر بوجھ ہوگئی اس لئے اسکے خلاف زبردست جنگ ہو رہی ہے اور پیداوار کی طاقتیں مجبور کر رہی ہیں کہ انفرادی ملکیت کی بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے۔ جس حد تک ممکن ہے سرمایہ دار پیداوار کو اجتماعی شکل بھی دے رہا ہے لیکن وہ

سرمایہ داروں تک ہی محدود ہے۔ ایک کمپنی بناکر اسکے حصے بیچنا سرمایہ داری کو اجتماعی شکل دینے کا ایک طریق ہے لیکن اس قسم کی اجتماعی شکل کام نہیں دیتی بہت سی ایسی کمپنیاں جاری ہو جاتی ہیں اور آپس میں شدید مقابلہ ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ پھر صنعت وحرفت کی حالت مذبذب ہو جاتی ہے اور کرائسس پیدا ہو جاتا ہے اب ٹرسٹ اور سنڈیکیٹ بنتے ہیں جس میں نہ صرف ایک ملک کے بڑے سرمایہ دار بلکہ بسا اوقات مختلف ملکوں اور قوموں کے سرمایہ دار شامل ہو جاتے اور بڑے پیمانے پہ کام شروع کر دیتے ہیں یہ کوششیں اس لئے ہوتی ہیں کہ کسی طرح مقابلہ بند کیا جائے تاکہ نفع غائب نہ ہو نفع کا غائب ہونا ہی کرائسس کہلاتا ہے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مقابلہ کے بغیر سرمایہ داری چل ہی نہیں سکتی اب مونوپلی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑے سرمایہ دار مونوپلی پر قبضہ کر لیتے ہیں اس لئے چھوٹے سرمایہ دار بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں بڑے سرمایہ دار کھٹکنے لگتے ہیں چھوٹے بڑے سرمایہ داروں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

اب مقابلہ نہ ہونے سے جنس کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے اور سرمایہ دار کو فائدہ دکھائی دیتا ہے۔ مونوپلی طریق بڑھتے بڑھتے ملک کی سب بڑی بڑی صنعتوں پر چھا جاتا ہے اور ان پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طریقہ کا عام ہونا۔ سماج کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ ہو جاتا ہے۔ اسکی کیا وجہ کہ چند سرمایہ دار صنعت وحرفت پر قبضہ کر لیں؟ جنس کے دام مقرر کر دیں؟ جو شے اور جس تعداد میں وہ بنائیں اسی مقدار میں بنے اور سماج کو استعمال کرنی پڑے اور دوسرے ایسے سوالات سماج میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن حالات کے پیش نظر سماج مونوپلی توڑنے کیلئے مجبور ہو جاتی ہے سرمایہ داروں کی دوسری ٹولیاں جن کا مونوپلی میں ہاتھ نہیں ہوتا۔ عام پبلک کے ہم آواز ہو جاتی ہیں اور اپنے نمائندوں سے حکومت پر زور ڈلواتی ہیں کہ مونوپلی پیداوار اور جنس کے دام مقرر کرنے میں دخل دے حکومت اس امر پہ مجبور ہو کر دخل دیتی ہے لیکن اس کو بڑے سرمایہ دار قبول نہیں کرتے اور اس طرح ایک کشمکش کی صورت نکل آتی ہے اور بہت بڑے کاموں۔ مثلاً۔ ڈاکخانہ ریل وغیرہ پر حکومت قبضہ کر لیتی ہے۔

(۲۱) شروع شروع میں جس طرح سرمایہ داری نے مزدوروں کو بیکار کیا تھا اب سرمایہ داروں کو بھی بیکار کر دیا۔ کیونکہ سماج میں ضرورت سے زیادہ سرمایہ پیدا کر دیا اس لئے نفع غائب ہو گیا۔

(۲۲) فی زمانہ سرمایہ دار کے سب کام تنخواہ دار کرتے ہیں اس لئے سرمایہ دار سماج کے لئے ایک بیکار ہستی رہ گیا وہ نفع کو جیب میں ڈالنے یا سٹا کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔

(۲۳) آجکل کی حکومتیں تجارتی معاملات میں چاہے کتنا ہی دخل کیوں نہ دیں لیکن سرمایہ داری کا جز ہوتے ہوئے وہ اصلیت کو نہیں بدل سکتیں اور سرمایہ دار کو نہ صرف غیر ممالک کے سیاسی یا تجارتی بلکہ اپنے ہی ملک کے مزدوروں کے حملوں سے بچانا اپنا اہم فرض سمجھتی ہیں۔

(۲۴) اگر حکومت سب طریق پیداوار اپنے قبضہ میں لے لے تو اسکے معنی یہ نہیں کہ سرمایہ داری ختم ہو گئی۔ اس حالت میں حکومت خود سرمایہ دار ہو کر خوب لوٹ کھسوٹ مچاتی ہے لیکن آخر کار وہ اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ چل نہیں سکتی اس طرح سرمایہ داری حکومت کیلئے بھی کوئی خاص فائدہ مند چیز ثابت نہیں ہوتی۔ بس اب تو سرمایہ داری کا حل اس امر کا عملی اقرار ہے کہ پیداوار کی طاقتیں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ انفرادی کوشش ان کو نہیں چلا سکتی۔ اور کیونکہ پیداوار اجتماعی عمل کا نتیجہ ہے اس لئے انفرادی ملکیت اور لین دین کو ختم کیا جائے طریق پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لایا جائے۔ اور طریق لین دین کو نفع کے اصول پر نہیں بلکہ ضرورت استعمال کے اصول پر رکھا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مزدور دلیری سے حکومت پر قبضہ کرلے اور طریق پیداوار و لین دین کے طریقے کو بدل دے۔

(۲۵) جس طرح اگر ہم قدرت کی طاقتوں کو غلط سمجھیں اور ان کا غلط استعمال کریں تو وہ ہمارے لئے نقصان اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں

بالکل اسی طرح طریقِ پیداوار کی طاقتوں کا حال ہے لیکن جب ہم ان کی اصلیت سمجھ جاتے ہیں تو وہی طاقتیں زندگی کو آسودہ بنا دیتی ہیں۔ پس جبتک سماج پیداوار کی طاقتوں اور طریقِ پیداوار اور تقسیم کی حقیقتوں پر غور نہیں کرے گی اور اصلیت کو نہ پہچانے گی اس وقت تک سرمایہ داری سماج پر قبضہ کئے رہے گی۔ اسکی مثال بالکل بجلی کی سی ہے۔ جب بجلی کی نوعیت معلوم ہو گئی تو وہ ہماری زندگیوں کے لئے ایک نعمت ہو گئی لیکن پہلے وہی نعمت ایک خوفناک چیز سمجھی جاتی تھی۔ جب عمارت پر بجلی گرتی لوگ خوف و دہشت سے چلا اٹھتے اور عمارت جل کر بھسم ہو جاتی لیکن اب جب لوہے کا تار لگا دیا جاتا ہے۔ تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہ سب ایک چیز کی اصلیت کے نہ پہچاننے کا نتیجہ تھا اور جب اسکی حقیقت واضح ہو گئی تو پھر اسی خوفناک شے سے زیادہ آرام دہ کوئی دوسری چیز نہ رہی کیونکہ اب سوشلزم نے مختلف طریقِ پیداوار کے اصول اور ان کے اثرات جو سماج پر ہوتے ہیں معلوم کر لئے اور سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کے جو اثرات سماج پر ہو رہے ہیں اور ہوں گے ان کا علم ہو گیا۔ اس لئے اس وقت سماج ان قدرت کی طاقتوں اور طریقِ پیداوار کے قانونوں کی محکوم نہیں بلکہ حاکم ہو گئی۔ لیکن ان طاقتوں پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اس لئے سماج ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اگر یہ طاقتیں سماجی ملکیت میں آجائیں تو دنیا جنت ہو جائے۔

(۲۷) سرمایہ داری کے بیکار مزدور اور سرمایہ دار پیدا کرنے کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ دار۔ مزدور مزدور اور سرمایہ دار مزدور میں لڑائی ہونے لگتی ہے دوسری طرف سرمایہ داری اپنی پنچائتی، حکومت کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ غیر ملکوں کے مال پر ٹیکس لگائے اور اپنے ملک کے کارخانہ داروں کی مالی مدد کرے اس سے سرمایہ داری کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن مزدور اور غریب طبقے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ حکومت سرمایہ داروں کی ایک پنچائت ہے اور اگر اس کو ہرا دیا جائے تو سرمایہ داری ہاتھ میں آجائے گی۔

ریاست ہمیشہ کسی خاص جماعت کا نمائندہ ہوا کرتی ہے اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنی جماعت کا مفاد مدِ نظر ہوتا ہے۔
۵۵ اگر ملک میں کسی دوسری جماعت کا مفاد برسرِ حکومت جماعت کے مفاد کے خلاف ہے تو حکومت اس کو نہیں گردانتی جب سماج غلامی پر کھڑی تھی غلام کا مفاد حکومت کو مدِ نظر نہ تھا۔ حکومت آزاد انسانوں کی تھی جب ملک اور قوم کی بہبودی کا سوال پیدا ہوتا تھا اس سے آزاد آدمی کی بہبودی مراد ہوتی تھی نہ کہ غلام کی۔ جاگیرداری کے زمانہ میں جاگیرداروں کے مفاد کے مطابق سماج چلتی تھی دراصل وہی چند انسان سماج تھے باقی ان کے نوکر چاکر تھے بیگار کرنے والا سماج کا فرد خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ آج کل سماج مزدور پر کھڑی ہوئی ہے مزدور، غلام کی طرح سماج کا فرد خیال نہیں کیا جاتا۔ سرمایہ داروں کی جماعت ہی سماج ہے۔ باقی غلام ہیں جن کی زندگی سرمایہ داروں کی خدمت میں خرچ ہوتی ہے۔

ریاست اس وقت تک ہی ریاست ہے جب تک کہ وہ کسی خاص جماعت کی نمائندہ ہے لیکن جب جماعتیں اور ان کے مفاد ختم ہو گئے اور سب ملک کے باشندے ایک جماعت کے فرد ہو گئے اور اس جماعت کے نمائندے حکومت کے کاروبار سنبھالنے لگے تو نہ جماعتی جھگڑے باقی رہے اور نہ انفرادی جدوجہد۔ لیکن مزدور کا حکومت پر قبضہ کرنا کافی نہیں جبتک کہ طریقِ پیداوار اور طریقِ لین دین نہ بدل دیا جائے جونہی کہ مزدوروں نے حکومت پر قبضہ کرکے سماجی ملکیت قائم کی ریاست ختم ہو جاتی ہے۔ اب ریاست کا کام حکومت کرنا نہیں رہتا بلکہ اشیاء کا انتظام ہو جاتا ہے۔

جب سے کہ سرمایہ داری نے زور پکڑا ہے اور اسکے نقائص ظاہر ہوئے ہیں لوگوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ طریقِ پیداوار کو فوراً انفرادی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لے آنا چاہئے۔ لیکن یہاں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں ایک کا مذہب ہے کہ جبتک سماج میں وہ حالات پیدا نہ ہوں جن کی بنا پر اجتماعی ملکیت قائم کی جائے اس وقت تک انفرادی ملکیت مٹا نہیں سکتے۔ فوری تبدیلی کے خیال کو وہ خواب زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ جبتک طریقِ پیداوار اور طریقِ تقسیم سماج کی پیداوار کی طاقتوں پر بار نہ ہو جائیں اس وقت

تک سماج کو سوشلسٹ اصولوں پر نہیں چلا سکتے۔ اجتماعی ملکیت کیلئے یہ ضروری ہے کہ سماج میں بڑے بڑے کارخانے ہوں جن میں ضرورت سے زیادہ جنس بنتی ہو۔ سب کارخانے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوں۔ پیداوار کی طاقتیں پھیلنا چاہتی ہوں۔ لیکن سرمایہ داری انکو پھیلنے نہ دیتی ہو۔ طریق پیداوار اور طریق تقسیم بجائے سماجی زندگی کو خوشحال بنانے کے اس میں جماعتی جھگڑے اور بے چینی پیدا کرتے ہوں۔ جبتک سماج میں اس قسم کے حالات پیدا نہ ہوں اس وقت تک انفرادی ملکیت کو بدل کر سماجی ملکیت قائم نہیں کر سکتے۔ سرمایہ داری نے اگر کسی سماج میں پیداوار کی طاقتوں کو اتنا بڑھا دیا کہ اب ان کی مدد سے سماج ضرورت سے زیادہ جنس پیدا کر سکتی ہے تو گو یا سرمایہ داری نے اپنا مشن پورا کر دیا لیکن جب تک مشن پورا نہ ہو اس وقت تک سرمایہ داری کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ چند دماغوں کے یہ سمجھنے سے کہ اجتماعی ملکیت کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے اور اس تبدیلی سے سماج کو کیا کیا فائدہ ہوگا انفرادی ملکیت ختم نہیں کی جا سکتی۔ انفرادی ملکیت ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سماج میں ایسے معاشرتی حالات پیدا ہوں جو سماج کو اس پر مجبور کریں کہ پیداوار کی طاقتوں کو اجتماعی ملکیت میں لے آئے۔ اس خیال کے مطابق تجارتی ملکوں میں سماجی ملکیت بہ نسبت غیر تجارتی ملکوں کے جلد عمل میں آنی چاہئے تھی انگلستان۔ جرمنی۔ امریکہ میں بہ نسبت روس اور مکزیکو کے سوشلسٹ طریق پیداوار جلدی ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ مکزیکو اور روس میں تو سوشلسٹ طریق پیداوار کا نام و نشان بھی نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ جنگ عظیم کے بعد روس میں سماجی ملکیت عمل میں آگئی اور انگلستان جو تجارتی ملک ہے اور اصولاً جس میں سماجی ملکیت روس سے پہلے ہونی چاہئے تھی۔ وہ ابھی تک سرمایہ داری کا شکار ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی ملک میں حالات کا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ سوشلسٹ جماعت کا ہونا بھی ضروری ہے جو سماج کے معاشرتی حالات اور ان سیاسی حالات سے جو ان معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں فائدہ اٹھائے۔ معیشی حالات بذاتِ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ جرمنی سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے روس سے بہت آگے تھی۔ جنگ کے بعد جرمنی میں بھی انقلاب ہوا۔ لیکن اس انقلاب نے سوشلسٹ انقلاب کی شکل اختیار نہیں کی کیونکہ وہاں مضبوط سوشلسٹ جماعت موجود نہ تھی۔ حالات قدرتی رجحان کی طرف نہیں جا سکتے کیونکہ سرمایہ دار بیچ میں حائل ہے یہ سوشلسٹ جماعت کا کام ہے کہ حالات کو سرمایہ دار کے پنجے سے نکالے تاکہ وہ اپنے طبعی رجحان کے مطابق بڑھیں۔ روس میں حالانکہ معاشرتی حالات موجود نہ تھے تاہم لینن اور اسکی جماعت نے روس کی حکومت کو سوشلسٹ اصولوں پر چلایا اور اگرچہ وہ مکمل طریق پر اپنے معاشرتی حالات کو ان اصولوں کے ماتحت نہیں لا سکے لیکن مقابلتاً روس دوسرے ممالک سے بہت زیادہ سوشلسٹ ہے اس سے ظاہر ہے کہ سب سے اہم ایک طاقتور سوشلسٹ جماعت کا قیام ہے جو ملک کی حکومت پر قبضہ کرے اور اس کو اپنے اصولوں پر چلائے۔

کچھ دن کی بات ہے کہ حبش ایک غیر تجارتی ملک تھا وہاں کے حالات آٹھویں صدی کے حالات کے قریب تھے لیکن اٹلی کے قبضہ کرتے ہی وہاں وہ حالات غائب ہو گئے۔ کیا اٹلی نے اس امر کا انتظار کیا کہ معاشرتی حالات پیدا ہونے دے جو غلامی کو خود بخود فنا کر دیں۔ کیا اس نے وہاں جاگیرداری طریق شروع کیا جو دُنیا میں غلامی کے بعد آیا کرتا تھا۔ اٹلی نے آتے ہی سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی بنا ڈالدی صنعت و حرفت بڑے پیمانے پر شروع کر دی۔ اگر اٹلی سوشلسٹ ہوتی تو کیا وہ اس امر کا انتظار کرتی کہ پہلے صدیوں میں غلامی ختم ہوگی پھر صدیوں تک جاگیرداری طریقِ پیداوار کام کرے گا۔ پھر صدیوں تک سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار کام کرے گا اور پھر سوشلسٹ طریقِ پیداوار شروع ہوگا معاشرتی حالات میں اس قسم کا تسلسل ہونا ضروری نہیں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر روس چین پر قبضہ کر لے تو فوراً ہی اجتماعی ملکیت ہو جائے اور سوشلسٹ طریق پیداوار اور تقسیم جاری کر دیا جائے۔

ایم۔ ایم۔ جوہر میرٹھی

آزادی

(حضرت نہال سیوہاروی)

رونق دہِ مسجد و کنشت آزادی — ہے جلوہ طرازِ سنگ و خشت آزادی
معلوم نہیں تجھ کو اگر کیا ہے بہشت — تو مجھ سے یہ سُن کہ ہے بہشت آزادی

پردے میں سحر کے جلوہ بار آزادی — خورشید کی ضو میں آشکار آزادی
پہنائے چمن تبسمِ آزادی کا — کھلتے ہوئے پھولوں کی بہار آزادی

سرمایۂ سوزشِ دروں آزادی — خاموش رگوں میں جوشِ خوں آزادی
کیا خوب یہ تفسیر ہے آزادی کی — ہے قصرِ حیات کا ستوں آزادی

آئینۂ احساسِ وطن آزادی — اک معرکۂ دار و رسن آزادی
پل میں جو کرے کوہِ ہمالہ کو کاہ — وہ طاقتِ ضربِ کوہ کن آزادی

تہذیب کی معراج کمال آزادی — انسان کی عظمتِ خیال آزادی
کافور ہو ظلمتِ غلامی جس سے — وہ مہرِ درخشاں کا جلال آزادی

سرمایۂ عیش کائنات آزادی — ہر غم سے وسیلۂ نجات آزادی
یہ راز سکندر کو بھی معلوم نہ تھا — ہے خُم کدۂ آبِ حیات آزادی

اسبابِ جہاں کی ہے ندیم آزادی — اقوام کا خطبۂ عظیم آزادی
کہتے ہیں جسے کاشفِ انوارِ حیات — وہ طورِ معانی کی کلیم آزادی

ہر موج کے لب پہ صبح و شام آزادی — بہتے ہوئے دریا کا خرام آزادی
زنہار یہ اے بندۂ آزاد نہ بھول — فطرت کا ہے اوّلیں پیام آزادی

سرچشمۂ انوارِ فراغ آزادی — مسرورکنِ دل و دماغ آزادی
ہے جس کی بہا خونِ شہیدانِ وفا — وہ دہر کا لعلِ شب چراغ آزادی

آئینۂ سعیِ نو بنو آزادی — اقوام کو درسِ تگ و دو آزادی
غرقاب ہو دنیائے غلامی جس میں — وہ قلزمِ موّاج کی رَو آزادی

"مشرق اور مغرب"

مترجمہ اسرائیل احمد خاں صاحب

کیا مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی حقیقی اور قطعی فرق ہے؟ ہم اکثر لوگوں کو کہتے سنا کرتے ہیں کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" اور پھر ایک سخت حکمِ ناطق کے لہجہ میں اس پر اس دعوی کو مستزاد کیا کرتے ہیں کہ "ہرگز یہ توام باہم ہمدم نہ بنیں گے!" ـــــ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مشرق کہاں واقع ہے اور اس مغرب کا محل وقوع کس سرزمین پر ہے؟

بلاشبہ جغرافیائی بنا پر ایک مشرق اور ایک مغرب پایا جاتا ہے۔ لیکن کیا دوسرے ہی لمحے ہمارا خیال اس حقیقت کی طرف بھی منتقل نہیں ہو جاتا کہ یہ اصطلاحات بالآخر فرضی اور تحکمانہ ہی ہیں؟ کیا کرۂ ارض کے گرد بجز قیاسی خطوط و دوائر کے کسی اور ذریعہ سے بھی کوئی تقسیم و تفریق عمل میں لائی جا سکتی ہے؟ کیا "خطِ گرین" "یا بحر الکاہل والا بین الاقوامی خطِ تاریخ" اپنے انتخاب و تقرر میں کوئی وجہ موجہ رکھتا ہے؟ ہم اہلِ مشرق جب امریکہ جاتے ہیں تو ہماری سمت سفر ٹھیک مشرق ہوتی ہے[1]! لیکن بوالعجبی دیکھئے کہ امریکن لوگ اس وقت کہا یہ کرتے ہیں کہ ہم "مغرب" کے علوم و تصورات کی تحصیل و آشنائی کے لئے اُن (اہل امریکا) کے ہاں حاضر ہوئے ہیں!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فرق و امتیاز کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہم براعظمی پہلو کو لیا کرتے ہیں اور اس کی رعایت سے کہا کرتے ہیں کہ ایشیا مشرق ہے اور یورپ مغرب۔ لیکن اس "جدید جغرافیے" کی "قدیم تاریخ" آخر یہی تو بتاتی ہے کہ کسی بعید ماضی میں یہاں ایک ہی براعظم پایا جاتا تھا۔ جو "یوریشیا" کہلاتا تھا۔ اور یورپ و ایشیا دونوں پہ مشتمل تھا!

اب قومیت اکثر اوقات وجہ امتیاز ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ہم چین و ہندوستان، ترکی، ایران کو "مشرقی ممالک" کی فہرست میں رکھتے ہیں لیکن کیا اس میں ذرا بھی شبہ ہے کہ ہندوستان آج چین سے اُس سے زیادہ بیگانہ ہے جتنا کہ وہ دور و دراز سرزمین فرنگ انگلستان سے؟! دوسری طرف جاپانی ہیں جو ایک مشرقی قوم کہلاتے ہیں اور ایک مُستقل مشرقی تہذیب و مذہب کے حامل ہیں، لیکن پھر اپنی موجودہ ذہنیت و اسپرٹ میں مشرقیت سے زیادہ "مغربیت" کے آئینہ دار ہیں!

اسی باب تقسیم میں اب مذہب کے اہم ترین عنصر کو لیجئے۔ عموماً جو قومیں مسیحی مذہب کی پیرو ہیں وہ مغربی کہلاتی ہیں۔ درآنحالیکہ بدھیت کنفیوسیت، ہندویت اور اسلام کے حلقہ بگوش مشرقیوں کے ذیل میں داخل ہیں! یہاں ہم اس اصول کی بے اصولی کے، کہئے تو شکوہ سنج نہوں لیکن قصور معاف، کیا مسیحیت بھی کبھی اک "جنس مشرق" ہی نہ تھی؟!

مذکورہ بالا نقاط کی تنقیح سے میرا منشا یہ نہیں ہے کہ میں مشرق و مغرب کے درمیان کے فرق کے وجود ہی سے منکر ہوں، میری غرض صرف

---

[1] صاحب مضمون ایک چینی پروفیسر ہے! ـــــ "مترجم"

اس قدر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ہم کو جلد بازانہ اخذ نتائج سے پرہیز کرنا چاہیئے! ہمکو اک ایسا طریق نقد و نظر کام میں لانا چاہیئے کہ وہ ہم نفس موضوع کے عین قلب تک پہنچا دے! سابقہ ردّ و قدح سے ممکن ہے کہ قارئین یہ سمجھے ہوں کہ میرے عقیدے کی دُنیا میں نہ کوئی مشرق ہے نہ مغرب! ہرگز نہیں! میں ہر دو کی ہستی پر ایمان رکھتا ہوں صرف میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم کو الفاظ "مشرق و مغرب" کے ساتھ کچھ ایسے معانی وابستہ کرنے چاہئیں جو ہمارے مُتداول مدلول سے بالکل متغائر ہوں! یعنی مشرق و مغرب کے درمیان کے جغرافیائی، ملی، نسلی، مذہبی امتیازات کو ذرا اُن "بٹوار یا نہ میڈ بندیوں" اور "فرق امینانہ بٹواروں" سے بالاتر ہونا چاہیئے جن سے عموماً ہم کام لیا کرتے ہیں! یہ چیزیں ایک حد تک قابلِ تاویل ہوں بھی تب بھی وہ ایک سطحی بصیرت سے آگے ہمیں نہیں لے جاتیں! وہ اس قدر تنویر افکار کا باعث نہیں ہوتیں جس قدر خیرہ نظری کا! امریکا کا شہر بوسٹن بالکل اک غیر جغرافیائی مفہوم میں ایک خاص "ذہنیت" کا قائم مقام بن گیا ہے! میرے زاویۂ نگاہ میں مشرق و مغرب کی جداگانہ معنویت کی ماہیت کچھ ایسی ہی ہے! ——— مثلاً مشرق عبارت ہے اک ایسے عمران سے جس میں لوگ انفرادی تکمیل کے درپے رہتے ہیں۔ جہاں بہترین تعلقات مین النّاس، حقوق العباد، شخصی فرائض و واجبات، ذاتی سکینت قلب، نفسی نجات وغیرہ کو بشری نصب العین قرار دیا گیا ہے! بخلاف اس کے اسمِ "مغرب" کا مسمیٰ اک ایسا تمدن ہے جس میں اشخاص و افراد بہ اجتماعی اعمال فرمائیہ کیا کرتے ہیں اور سائنٹفک نظم و نسق، کاروباری ضبط و ربط، یورپین طرز کی مستعدی و کارکردگی، قوت آفرینی مادی تمتع اور راحت اندوزی وغیرہ جس کے حاصل زیست ہوتے ہیں! کہا جاسکتا ہے کہ اوّل الذکر میں ایک نوع کی "نسائیت" پائی جاتی ہے! اس کا مزاج جذباتی، سلبی، مجہولی، رجعت پرستانہ اور مقلدانہ واقع ہوا ہے! آخر الذکر کے تیور مردانہ ہیں! وہ سائنٹفک ہے اور جارحانہ! اُس کا طغرائی امتیاز عزیمتہ و زعیمیتہ! اُس کے نشاناتِ خصوصی ہیں، تقدم و ترقی، حوصلہ مندی و بلند آہنگی!

مشرق و مغرب کی یہی تعریف و تعبیر میرا خیال ہے کہ صحت سے قریب ترین ہوگی! البتہ یہاں میں ایک دفع دخل مقدر کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگ میری تفسیر کی غرض و غایت کے متعلق غلط فہمی میں نہ پڑیں! مثلاً میں یہاں اس طرح کی کوئی بات کہنی نہیں چاہتا کہ دونوں میں۔ ۶۰
یہ بہتر ہے یا وہ بہتر! ترجیح و تفضیل کا کوئی سوال یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ مشرق و مغرب درحقیقت ایک دوسرے کے "متوازی" واقع ہوئے ہیں نہ کہ "محاذی"! رہی یہ بات کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ کریں گے یا تنازعہ للبقا میں ایک فنا ہوجائیگا اور ایک باقی رہیگا، تو اس کا انحصار حالات پر ہے! یا اُس پُرخلوص جد و جہد کے ظہور یا عدم ظہور پر جو اقوام عالم کی طرف سے مستقبل میں پیش آئے! اس پہلو سے بحث کرنے کیلیے مبحث کی خاطر خواہ تنقیح اُس وقت ہوسکے گی کہ اُسے مندرجۂ تحت چار مباحث ذیلی میں تقسیم کر لیا جائے۔

(۱) مشرق و مغرب کی انفرادی روحوں کا جداگانہ سرچشمہ کیا کیا ہے؟
(۲) دونوں تمدنوں کے خصائص خاصّہ کیا کیا ہیں؟
(۳) ہر دو کی الگ الگ قدر و قیمت ہم کس طرح معلوم کرسکتے ہیں؟
(۴) مشرقیت و مغربیت کے سنگم کے بارے میں مستقبل کے امکانات و رجحانات کیا کیا ہیں؟

(۱) مشرق اور مغرب کے جداگانہ سرچشمے

مغرب کی تہذیب نے اک ساحل بحر پر جنم لیا۔ ہم یونان کو مغربی تہذیب کا مولد قرار دے سکتے ہیں! یونان قدیم کی ساری قومی عظمت جہازرانی پر تعمیر ہوئی! نامورانِ یونان کے عظیم ترین کارناموں کی بازگشت آج بھی سطح بحر پر رہی ہے! ایک شخص صرف ہومر کے منظومات و رزمیہ کا مطالعہ کرے اور پھر دیکھے کہ یونانی تخیّل کی دُنیا میں "اِلٰہ بحر" کو کیسی جلالت قدر حاصل ہے! یہ سمندر ہی تھا جس نے یونانی جنگ آزماؤں

ہنگ واڑدر پیدا کئے! نیز یونانی شاعری کی بحروں کے لئے قوافی ومعانی کے سلکھائے جواہر بہم پہنچائے!

سمندر اک عسیر المسلّط وجود فطرت ہے! اس کے ساتھ دست وگریبان ہونے میں غیر معمولی مشقت طلبی وابتلا انگیزی لازم آتی ہے جو کوئی اس قسم کی جدوجہد کا اقدام کرے گا اُسے اپنی طرف سے قوت ومقاومت کا انتہائی پیمانہ پیش کرنا ہوگا! فرد اس بےحد وحساب خزینۂ قوت کو "قلب جماعت" ہی سے فراہم کرسکتا ہے! اس طرح جماعتی عمل کی سلسلہ جنبانی ہوتی ہے اور اس کی جلو میں دلیرانہ جنگی مہارت اور حوصلہ مندانہ عزائم تجارت ظہور میں آتے ہیں! عظیم الشان یونانی تمدن اسی یونانی عمل اجتماعی کا تکملۂ آخرین اور ثمر شیریں تھا! یورپی تاریخ کے اسٹیج پر اس کے بعد ہم اطالیہ، ہسپانیہ اور فرانس کے جلوس ہائے نہضت کو جولاں دیکھتے ہیں علاوہ مغرب کی بہی بحری گرم کاریاں ہیں جن سے ناروے، سویڈن اور جزائر برطانیہ کی تہذیبی تعمیرات نے تشکیل پائی! خود جرمن لوگ بھی اپنے آباؤ اجداد کی بحر پیمائیوں ہی کا طنبور تک بجاتے ہیں! بس مغربی عمران قطع نظر اقبال وادبار کی پیہم افتادوں کے جن سے اس کو سابقہ پڑا، تقریباً اک مستقل وسلسل عمل تھا سمندر کے دیوتا سے کشتی لڑنے کا! اسی اشتغال وانہماک نے اجتماعی روح اشتراک عمل کو پیدا کیا اور حرفتی وتجارتی عزیمتوں، سائنٹفک وعملی سرگرمیوں اور کارکردگی قوت آفرینی کی عرق ریزیوں سے یورپین تمدن کو آباد وشاد کر ڈالا!

دوسری طرف، مشرقی تہذیب اک ارضی واندرون مُلک کی تہذیب کی حیثیت سے وجود میں آئی! مصر نے اپنی عظمت وشوکت کا سفینۂ زرنگار دریائے نیل پر چلایا! آشوریا وبابل نے انہار دجلہ وفرات کو اپنے تزک واحتشام کی جولانگاہ بنایا! چین نے دریائے ہوانگ ہو ویانگ سے کی وادیوں میں اپنا چمنستان شائستگی سجایا!

مصر وبابل کے بارے میں ہمارے معلومات اُتنے ہی ہیں جو حال کی جزوی اثری تحقیقات وانکشافات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اور چونکہ وہ ابھی بہت کچھ تشنۂ تکمیل ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس وقت ہم اپنی بحث کے لئے عمرانِ مشرق کے دو زندہ نمونوں کو لے لیں۔ ہمارا روئے سخن اہلِ ہند اور اہل چین کی طرف ہے!

ہندو اپنے فلسفہ وفنون کے اعتبار سے ایک خالص واخلص مشرقی روح تہذیب کو پیش کرتے ہیں۔ اپنی زرخیز وزرریز زمین، گرم آب وہوا، اور نعائم فطرت کی فراوانی کے طفیل میں ہندوستان فارغ البالی، آرام طلبی، دماغی عیاشی اور روحانی شغل فلسفہ وتصوف کا ایک قدرتی مسکن بن گیا! کثرت پیداوار اور فرصت اوقات انسان کو معاشی کشمکش سے فراغت دیدیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو اپنی رواداری ۶۱
اور امن دوستانہ افتادِ طبیعہ کے لئے ساری دُنیا میں ضرب المثل رہے ہیں! نامور مورّخ ویلز اپنے "خاکہ تاریخ عالم" میں لکھتا ہے:۔

"صدیوں اور قرنوں تک ہندوستان کی تاریخ خوشحالی ومالداری، فقدان سختی ودرشتی، افراط معیشت وعشرت، اور ایک مذاقِ سکر وخواب کی ایسی سرگزشت رہی ہے جس کی کوئی نظیر صفحۂ عالم پر نہیں ملتی"!

عہد پاستانی کا بدھ اور دور حاضرہ کا ٹیگور مشرقی ہندی روح کے یکساں عمدہ نمونے ہیں! ہندوستان — قدیم نیز جدید — کو ہم اُن تمام خصائص سے متصف دیکھتے ہیں جو "بھرے پیٹ" کی نمو خیز زمین میں "خودرو" پیدا ہوتے ہیں! اس تمام ذہنیت کا قلب تصوف ہے مع اپنے دیگر لوازم ونتائج کے۔ یعنی عام رحیمانہ حسیات غیر متشددانہ تصورات اور وجود روح کا اعتراف جملہ مظاہر حیات حتیٰ کہ حیوانات کے اندر بھی! دُنیا بھر میں ہندو ہی تنہا وہ اُمت ہیں جس کی کتاب شریعت میں لحم حیوانی علی الاطلاق حرام ہے! اُن کا عقیدہ ہے کہ جاندار کو مارنا ناقابلِ معافی "درندگی" ہے، پھر بھلا وہ کس طرح جیتی جان کو اپنا لقمۂ تر بنا سکتے ہیں؟ پس کیا تعجب ہے کہ اس قسم کی روح قومی کی مسلسل نشوونما نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کی تہذیب میں ایک نسوانی نرمی پیدا کردی اور جذبات نوازانہ، رحم پذیرانہ، درد آشنایانہ، اور قدامت پرستانہ ہوکر رہ گئی۔!!

اب قدیم چینی اپنی مرزبوم میں اپنے برادرانِ ہند کے مقابلہ میں فطرت کے کسی قدر کم منظورِ نظر ہیں! اُن کی مدنیت وحضارت کا اولین مستقر وادیٔ ہوانگ ہو اک سنگستانی خطہ واقع ہوا تھا۔ جہاں کی آب وہوا بھی گرما وسرما دونوں میں اشتداد پذیر نوعیت رکھتی تھی۔ تاہم اپنے

[1] جو فلسفۂ روحانی اہل ہند نے دُنیا کے سامنے ...... پیش کیا وہ انسانی ذہن ودماغ کی آخری پرواز تھا لیکن وہ اس کے ذمہ دار نہیں تھے کہ انسان نے اپنی فطری زندگی

وسیع وطن کے طول و عرض میں ان کو بہت سے ایسے علاقے مل گئے جو زراعت کے لئے موزوں تھے۔ ان مشاغل کے طفیل سے باشندگان چین کے اندر اک کفایت شعارانہ طرز حیات نے ظہور پایا! اسی پُر مشقت لیکن کفتی بالذات زندگی نے اک انفرادیت و رواداریت کا رنگ پیدا کر دیا لہٰذا یہی فطرت کی بخشائشوں پر اعتماد کرنے نے پھر شکر و ثنا، صبر و توکل، مجہولیت و رجعت کی تخلیق کر دی!

مغربی تہذیب کی ولادت اور پرورش اک مشقت طلب آویزش کے نتیجہ میں عمل میں آئی جو فطرت اور انسان ہر دو کے ساتھ اُسے پیش آئی درآنحالیکہ مشرق کی تمامی نشو و نما دایۂ قدرت کی کنار شفقت میں ہوئی، اور اسی دامن راحت و عشرت میں فلسفہ و مذہب نے اپنے لئے اک زرخیز کشت زار پایا! سرگرم اور قوت آفریں زندگی بیرونی ماحول کی مزاحمتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس زندگی کے دو بڑے میدان مہمات فطرت اور معاملات بشریت ہیں۔ لیکن جس زندگی کی پیدائش و پرداخت مادر فطرت کی آغوش میں ہوا کرتی ہے وہ صرف دل و روح کی "دُنیائے صغیر" کے اندر زیادہ کامیاب رہا کرتی ہے جس کے طبعی آثار بس تصوف و فلسفہ اور مذہب و اخلاق ہی ہوتے ہیں! پس مشرق و مغرب کی متباین تہذیبوں کے درمیان جو مابہ الامتیاز ہے وہ براہ راست زائیدۂ ماحول ہے ـــــــ نہ کہ متعلقہ قوموں کے اختلاف فطرت و جبلت کا نتیجہ! اس لئے کہ سرشت انسانی تمام روئے زمین پر تقریباً یکساں ہی واقع ہوئی ہے! اور اسی ناموس تمدن کی بنا پر بلا خوف تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تہذیبوں کیلئے دائماً مختلف یا متصادم رہنا بھی لازمی نہیں ہے! اس انقلاب انگیز امکان کی مثال میں جاپان کو پیش کیا جا سکتا ہے جو کلیتہً اک مشرقی الاصل اور مشرقی المذاق قوم تھی۔ لیکن اپنے ماضیٔ قریب ہی میں مخصوص حالات کے اقتضا سے یکسر ایک رنگ مغربیت میں غرق ہو گئی! ہندوستان اور چین بھی اگر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے دُوَلِ مغربی کے درمیان واقع ہوتے یا اپنے جغرافیائی ماحول کی بنا پر سمندر سے دست و گریبان ہونے پر مجبور ہوتے تو وہ بھی یقیناً عظیم الشان بحری بیڑوں کی تعمیر کرتے اور آج نام نہاد مشرقی تہذیب کے ان گہواروں کا وجود بھی نہ ہوتا!

(۲) ہر دو تہذیبوں کے خصائص

جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے، مشرقی تہذیب ایک گونہ زنانہ واقع ہوئی ہے، اور مغربی تمدن مردانہ! کیا ان دونوں کی جمالی اور جلالی طبیعت کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے؟

پہلے ہم مغرب کو لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت، اُمنگ و آہنگ، حوصلہ و ولولہ، تہوّر و نمائش، چیرہ دستی و سینہ زوری، جارحانہ انداز و غیر رواداری، سرگرمی و مشقت پسندی، اشتراک عمل و تنظیم جماعتی، چلبلا پن اور نچلا پن مغرب کی پیشانی پر بخط جلی لکھے ہوئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ فنون لطیفہ اور صناعات جمیلہ تک میں مغرب کے خط و خال مردانہ ہی ہیں! عہد قدیم کے یورپ کو اپنی چشم تاریخی کے سامنے لائیے۔ یونان و روما کی بت تراشی و تصویر کشی کے بہترین شاہکار آپ کو دیوتاؤں کے پیکروں اور مشاہیر کے رُستمانہ مجسموں ہی کی صورت میں نظر آئیں گے، نامور مغربی مصوّر مائکل انجیلو کے فن پر یہ حرف گیری کی گئی ہے کہ اُس کے موقلم سے کھینچی ہوئی صنف نازک کی ساری شبیہیں اپنے اندر ایک جارحانہ "انداز ترکانہ" رکھتی ہیں! اور پھر اُستاد روبنس کے نگار خانہ کی "ڈنڈہ پیل عورتوں" کا تو ذکر ہی تحصیل حاصل ہے! ـــــ تاہم یہی پہلوانانہ مغربی آرٹ ہے جس کی مغربی مذاق داد دیتا ہے! بات یہ ہے کہ مغرب قوت و طاقت کا پرستار ہے! بعکس اس کے مشرق کسی اور ہی چیز کا دلدادہ ہے! مشرق کا مرقع نگاریں، جمالیت کی نقشبندیوں اور نسائیت کی صورت گریوں سے لبریز ہے! مغرب جسمانی طاقتوری اور حیوانی زور آزمائی چاہتا ہے جس کی تمثیل لباس عریانی میں کی گئی ہو! لیکن مشرقی چشم و نظر کے لئے ایسے مناظر غایت درجہ مکروہ ثابت ہوتے ہیں! مغرب کی یہی ذہنیت ہے جو اس کے جملہ شعبہ جات حیات ـــــ مذہب و اخلاق، حکومت و سیاست، صنعت و حرفت، کاروبار تجارت، حتیٰ کہ تعلیم و تربیت تک ـــــ کے اندر جلوہ گر ہوئی ہے! جس وقت مشرقی پیغمبر حضرت مسیحؑ کی مسکینانہ و معصومانہ تعلیمات مغربی کلیسا کے قالب میں ڈھل گئیں تو پھر اس کے جلوس تبلیغ

یوت میں ہم کو جہاں گشتیاں اور ارض پیمائیاں، قتل عام اور خون ریزیاں ہی نظر آتی ہیں! ان کی بہترین یا بدترین مثال "حروب صلیبیہ" تھی جو اسپانوی "محکمۂ تفتیش" و تعزیر جرائم "تھا! خود " پاپائیت " بھی " یوروپین عیسائیت " کا ایک قوی ترین مظہر شمار کیا جاتا چاہیے! پاپائی منصب در اصل مغربی تہذیب ـــــ نہ کہ مشرق کے مذہب ـــــ کی قوت تنظیم و مظاہرۂ شوکت کی اک نظیر تھا! کیا یہ ساری مشنری جہاں گردیاں اور جاتی ہتھکاریاں ایک قسم کی حملہ آوریاں نہیں ہیں. اقلیم دل کے حدود حرم کے اندر؟ اب رہی مغرب کی قومی زندگی تو وہ بھی جنگجوئیوں اور پیکار طلبیوں ہی کا اک معرکۂ خونریز ہے جسے ہر مغربی حکومت نے اپنے فرائض میں بنا رکھا ہے! اگر ہم مغرب کی تاریخ کا جائزہ ـــــ از سکندر اعظم تا یمپریلیزم دوم لیں ـــــ تو خدا کی زمین کے اس قابل رشک خطے کے اندر مشکل سے کوئی دور امن ایسا نظر آئے گا جو "نصف صدی اور ایک عشرہ" سے متجاوز ہو! یورپ کی بین الاقوامی جنگیں اور بین الاحزابی کشمکشیں اسی جماعتی دستور کے مظاہر ہیں جو یوروپی دنیا کا عالم مطلق ہے! مغرب کا خلقی "پھیلاو اپن" کبھی یورپ کے قرون پیشیں کے بحری اسفار میں نمایاں ہوا تھا لیکن یہی غیر فانی شئے ہے جو دور حاضر میں سوشلزم و بالشوزم کے مہمات میں علم کشا ہوئی ہے!

یورپ کی دنیائے "عقلیات" کی شورشیں تو ظاہر ہیں ہی، لطف یہ ہے کہ مغرب کا عالم روحانیت بھی خیر سے سکون و سکوت سے نا آشنا ہے! اسے "تعلیم عام" کے عنوان کے تحت اس کا مطالعہ کیجئے! کیا یہ مغربی تنظیم مدارس و مکاتب، سررشتۂ جامعات و کلیات، اک وسیع "علمی لشکر آرائی" کی شان نہیں رکھتا؟! ـــــ جس میں ٹیچروں اور پروفیسروں کی "فوجی بھرتی" سی کی جاتی ہے اور اک خاص قسم کی "ذہنی کارگاہوں" کے اندر خاص قامت و صورت کے "سانچوں" میں ڈھلے ہوئے طلبہ کی "برآورد" کی جاتی ہے! مغرب کے ذوق قوت افزائی و غارتگری اور اس کے غیر معمولی جوہر نظم و انضباط کی آخری قابل دید نمود یورپ کی موجودہ ہمہ گیر صنعت و حرفت اور عالم آشوب بحری و بین الملی تجارت ہے!

اب دوسری طرف جب ہم مشرق کی شائستگی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کی تعلیم و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے عنوانات جلی ہم کو صرف اعتدال
۶۳ و اقتصاد، تہذیب نفس و تزکیۂ روح، حزم و احتیاط، قدامت و سلفیت، اقتداء و مقلدیت، شعور شخصیت و ارتقائے انفرادیت وغیرہ ہی نظر آتے ہیں! کوئی مغربی جو مشرق کے مزاج و مذاق اور اس کی ادا و آداب کا کبھی ناظر بھی بنا ہے وہ اہل مشرق کی مخصوص شان سکوت و متانت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا! جب مشہور تاریخ وینسی سیاح، مارکو پولو چین آیا تو جس طرح وہ مشرق کی اس بزم مجلسی کی ادا ہائے جمال سے متاثر ہوا وہ اس کے سفرنامے کی ایک قابل ذکر چیز بنی! سکون طبیعت اور ضبط نفس کے مسلک میں ہند و اہل چین ہی کے "اخوان طریقت" ہیں! انفرادی زندگی کے ممکنات کے "جوہر مضمر" کے بروئے کار لانے کا خیال، بس یہی کلید ہے مشرق کے تمامی فلسفہ و مذہب کی! خود مسیحیت میں ابتدائی داخلی تعلیم اسی کلمۂ اول پہ مبنی تھی کہ "اَسْلِمْ نَفْسَکَ!" اور بلاشبہ یہ بات محض مغرب کے گرجاؤں کا مخصوص مقامی رنگ "تھا کہ پادری حضرات نے ہر "ابن آدم" کی نجات کا بیڑا خواہ مخواہ اٹھا لیا! مشرق کے تو ہر مکتب حکمۃ اور ہر مشرب حیات کا محور "ذات" ہی ہے! "کنفیوسیت" یکسر تربیت ذات ہے! "تاؤیت" (چین کا دوسرا اہم رتبہ مسلک دینی) انکشاف ذات ہے! پھر "بدھیت" بھی بجز معرفت ذات کے کیا ہے؟!

تمدن کی عمر طبیعی کے بارے میں مشرق او مغرب کی جداگانہ تاریخ، باہمی تفاوت راہ کی حیرت انگیز مثال پیش کرتی ہے! تاریخ ہند کے متعلق ہم نے قبل ازیں ایچ، جی ویلز (مورخ تاریخ عالم) کے ایک بیان کا اقتباس دیا ہے. چین کی تاریخی سرگزشت پر اس تقریب سے نظر ڈالئے مشرق کے اس ممتاز خطے کی "غیر تغیر پذیر" طبیعت نے جو تاریخی جریدہ چھوڑا ہے اس کے افتتاحی صفحات ہی میں ہم تین شہنشاہوں کا ذکر خیر پاتے ہیں جنہوں نے "نیکوکاری اور سلیقہ مندی" کے ساتھ حکومت کی. وہ عوام الناس کے گڑھ سے بذریعہ انتخاب تخت سلطنت پہ پہنچے تھے، اور انھوں نے اپنے طریق جہانبانی میں خلق اللہ کا پورا اعتماد حاصل کیا! اب سنئے کہ چین کا اولین خانوادۂ شاہی ـــــ "شیا" ـــــ پورے چار سو برس تک مسند حکومت پر متمکن رہا! (۲۲۰۵ ـــ ۱۷۸۳ ق م). دوسرے خاندان ـــــ "شانگ" ـــــ کی فرماں روائی کا دور بھی ساڑھے چھ

صدی تک ممتد رہا! (۲۰۷۸۳ ۔ ۱۲۴۱ ق م)۔ تیسرے خاندان ــــــ "چاؤ" ــــــ کی شاہانہ زندگی پورے ۸۸۸ برس کی عمرِ نوح رہی ہے! (۱۱۲۴ ۔ ۲۴۶ ق م)۔ چین کے آخری شاہی سلسلے ــــــ "چنگ" ــــــ کو بھی جو مانچو نسل سے تھا کوئی گردشِ ارضی تین صدی سے پہلے فنا نہ کرسکی! (۱۶۴۴ ۔ ۱۹۱۲ عیسوی) پس ہر دو کے درمیان موازنہ کے لحاظ سے مشرق کی تاریخ مغرب کے مقابلہ میں بمراحل زیادہ مستحکم پُرامن، کم خونریز، اور زیادہ مرفہ حال رہی ہے! اسی فوق العادۃ محکمی ودیرپائی نے مشرقی دُنیا کو اتنا قدامت پرست بنادیا! مشرق کی وسیع سرزمین میں بہت سے دستور و آداب ایسے جاری رہے کہ قرنہا قرن تک متروک یا منسوخ نہ ہوئی! ــــــ تاآنکہ دورِ جدید کی انقلاب بدوش جہانگیر بیداری نے ظہور کیا! چین کا توہم پرستانہ "فین ہوئی" "مشرب" ذات پات کی تفریق کا ہندی آئین مجلسی، مشرقِ بعید کے دونوں مشہور ملکوں کا مذہب پرستشِ آباء وغیرہ اسی "جامد و احدی ماضی نوازی" کی لے کی "بحرِ طویل" ہیں! دُنیا کے سائنٹفک دَور کے آغاز سے صدیوں قبل مشرقی لوگ سائنس کے تصرّف کار کمالات حاصل کرچکے تھے لیکن آج وہ ایوانِ سائنس میں اک "حلقۂ بیرونِ در" بنے ہوئے ہیں اس کا وبال بھی ان کی رجعت پسندی ہی کی گردن پر ہے! طویل قرون کے دوران میں مشرق مغرب کے سامنے یہ خاموش نعرۂ بے نیازی لگاتا رہا ہے کہ ؎

تو وُ قطعِ منازل ہا من و یک لغزشِ پائے!

مشرق کی ادا نسوانی ہے اور چونکہ وہ نسائیت مآب واقع ہوا تھا اس لئے اُس کے فرزند کبھی سینہ زور نہ بن سکے! اگرچہ مشرق کے میگیار فاتحین تیرہویں صدی مسیحی میں یورپ پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ تاہم چونکہ وہ چین خاص کی اصل و نسل سے نہ تھے بلکہ منگولیا کے تُند سرچشمہ کا طوفان تھے، اس لئے وہ اصیل و نجیب مشرقی نہیں کہے جاسکتے! ڈاکٹر نیوتین اپنی تصنیف ــــــ "تصورِ جامعہ عالم" ــــــ میں فرماتے ہیں "میگیار لوگوں کا یہ حملہ مغربی تہذیب کے مزاج کو چنداں متاثر نہ کرسکا!" تاریخِ مشرق کے اس نادر جلالی مظہر کی وہ یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ "اپنی زندگی کے اس مرحلے پر اہلِ منگولیا شاید مشرقیت کی روح کے فیضان سے محروم تھے اور مشرق کا کوئی مستند سرچشمۂ تہذیب اس وقت تک ٦
ان کے پاس نہ پہنچا تھا کہ انہیں مشرق کا فرزندِ رشید بننے کی دعوت دے!" اگر میگیار لوگ صحیح النسل چینی ہوتے اور واقعۃً وہ یورپ کو مغلوب کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو لازمی طور پر یورپ کی زرعی زندگی اور عام طرزِ حیات میگیاری اثر کے آثار کا آئینہ دار ہوتا اور وہاں کی تاریخ میں حکومتی ادارات کے واسطے سے چینی روحِ تعلیم اور چینی حروف اک ممتاز جگہ حاصل کرلیتے ــــ!

بلاشبہ مشرقی اقوام کے درمیان بھی جنگ و جدل رہا ہے لیکن عموماً یہ معرکہ آرائیاں بادشاہوں اور جنرلوں کی ذاتی قسمت آزمائیوں کی حیثیت رکھتی تھیں جن پر عام قومی و اجتماعی عزائم کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا! ہم مشرق کی تاریخ میں بمشکل کسی ایسی عمومی و اجتماعی تحریک کا نشان ڈھونڈ سکتے ہیں جیسی کہ مغرب کی "حروبِ صلیبی" یا روماۃ الکبریٰ کی مذہبی فتوحات یا برطانیۂ عظمیٰ کی مستعمراتی مُہمات!

(۳) ہر دو تمدنوں کی قدر و قیمت کا موازنہ

مشرقی تہذیب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے عملی کاروبار و معاملات کو قابلیت و مہارت سے انجام دینے کی صلاحیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مشرقی لوگ فطرت کے سامنے اک "سرِ تسلیم" رہے ہیں! فطرت کی رحمت و ربوبیت پر اُن کا تکیۂ اعتماد رہا ہے! قدرت اُن کے لئے اک قادرِ مطلق ذات ہے لیکن ایسی کہ جس کی قدرت و جبروت اُس کے تلطف و نوازش سے لازم و ملزوم ہے! اہلِ مشرق کے تخیل کی رو سے ناموسِ فطرت اپنی ماہیت ذات میں قدرتِ مطلقہ اور رحمتِ کاملہ کا معجون مرکب واقع ہوا ہے! پس اُن کا خیال ہے کہ کارگاہِ فطرت میں کوئی تغیر و تصرف ــــ باستثنائے اس صورت کے کہ وہ فطرت کی مطابقت کی شرط کی بنا پر اک "بدعتِ حسنہ" ہو! ــــــ نہ صرف ناجائز اور منافئ آئینِ فطرت ہے، بلکہ

شدید خطرات سے لبریز بھی ہے! ــــــ ظاہر ہے کہ قدامت پرستی اِس ذہنیت کا خمیر اولین بنے گی! اور یہی چیز آخرکار اہلِ مشرق کی اُس نااہلیت کی ذمہ دار ہے جو اُنھیں جدید حالات و تغیرات کے ساتھ سازگار ہونے سے معذور رکھتی ہے! معمولی حالات میں تو اک مشرقی اپنی زندگی گزارتا رہتا ہے اور کافی اطمینان و سکون کے ساتھ۔ لیکن حوادث و مصائب کی اُفتاد کے اوقات میں قطعاً بیدست و پا اور حواس باختہ ہو جاتا ہے! خاص کر ایسی صورت میں وہ یکسر از کار رفتگی کا ثبوت دیتا ہے جبکہ متعلقہ حریف اس کا ہم نبرد ہو! چین دو مرتبہ شمالی وحشیوں ــــ قبائل یو آن دہنگ ــــ کے ہاتھوں مغلوب و مقہور ہو چکا ہے، اور ہندوستان نے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنیوں کے "نقرہ و طلا" سے بھی اپنے "آہن و فولاد" کو نرم ثابت کیا! چین کے حیوان صفت فاتحوں اور ہندوستان کے "دکاندار" کشورکشاؤں کے طریقوں سے کہیں زیادہ اب مغرب کے وسائل جبر و قہر اور ذرائع جلب و سلب ہولناک ہیں! یہ بات کہ مشرق کبھی مغرب کا مدمقابل بن سکے گا اس کا انحصار اس امید پر ہے کہ وہ قرار واقعی عزم و ہمت، فکر و تدبیر، باہمی تعاون و تناصر سے کام لے!

چنانچہ اسی عمل ردِ سحر کی بدولت بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر اس وقت تک جاپان نے محیر العقول کارنامے انجام دے ڈالے ہیں اگرچہ اُسے بکثرت مزاحمتوں کے درمیان یہ مہمات سر کرنی پڑیں! جاپان کے متعلق صرف ایک نہایت افسوسناک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ اوقات کے ساتھ اپنا مغربی طریق کار استعمال کرتے کرتے امتدادِ ایام سے وہ خود اپنے بھی بعض بیش بہا روحانی و اخلاقی اوصاف کو فراموش کر رہا ہے!

لیکن مشرق باوجود اپنے بہت سے کمزور نقاط کے، بعض نہایت ہی نغز و کامل العیار معنوی قوتوں کا حامل ہے! سب سے مقدم یہ کہ اُسکی تفسیر حیات مغرب کے فلسفۂ زندگی کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح و صالح عدل پرور و امن نواز ہے! البتہ ہم کو یہاں اک جزدی استثنا تسلیم کرنا چاہیے کہ مغرب میں حقیقی جلیل القدر فلاسفہ کی جو اک مختصر بزم خاص پیدا ہوئی ہے اُن کا راسخ مسلک بھی بہ اصرار یہی رہا ہے کہ آخری منزل مقصود و مقامِ محمود انسانیت کا یہی ہے کہ "انفرادی ہستی" کے ممکناتِ داخلی کو بروئے کار لایا جائے! خود سلسلۂ قوانین فطرت کی رو سے بھی اساسی عناصر ہیئتِ اجتماعیہ کے افراد ہی ٹھہرتے ہیں! ــــ جو نہ صرف اپنی ماہیتِ تخلیق ہی میں مساوی واقع ہوئے ہیں، بلکہ مساوی ہی مواقع انھیں اپنی ٦٥
اپنی شخصی نشو و نما کے ملنے چاہئیں! جماعت فرد کے لئے ہے، اور اسے فرد ہی کے لئے ہونا بھی چاہیے! افراد کے انفرادی جواہرِ مضمر جماعت کی "پنچایتی مصلحتوں" پر قربان کرنا فطرت کی ودیعت میں خیانت کے ہم معنی ہے۔ مذہب انسان کو اسی ارتقائے ذات کی دعوت دیتا ہے! لیکن فلسفہ ہر شخص کو یہ صلائے عام سناتا ہے کہ وہ اپنی اپنی ذات کے متعلقہ حقائق کی دریافت خود ہی کرے! روحانیت کا عمق زور دیتا ہے "ذاتی کشف و انکشاف" پر، لیکن مادیت کی سفلگی سارا ناز وابستہ کرتی ہے "انفرادی جد و جہد" کے ساتھ! تاہم قول فیصل اس نزاع میں یہ ہے کہ بشری تعلیم و تربیت اپنا اصول کار اس طریق کو بنائے کہ افراد کو اُن کی زندگی کی منزل اول سے ساتھ لے اور اس آخری ساحل مراد پر اُتار دے جس کیلئے وہ مخلوق ہوئے ہیں!

آئیے ہم اس نقطۂ نظر کی تحقیق و تطبیق کے لئے مغربی حکمت و ادب کے بعض "میران کارواں" کی طرف رجوع کریں! انگلستان کا متی آرنلڈ ایسا سلف پرست، برٹرینڈ رسل ایسا انقلابی مفکر، جرمنی کا گوئٹے ایسا جمہوریت نواز، اور نیٹشا ایسا دلدادۂ امارت ــــ اسی طرح فرانس کا برگسان، ناروے کا آبسن، امریکا کا ایمرسن، نیز ولیم کا جیمز، ڈیوے اور بیک حتیٰ کہ ماضیٔ قریب کا امریکن پریزیڈنٹ مائکل جان، یہ سارے اقطاب مغرب انسان کے "نفس شخصی" ہی کے نصب العین کے بلند بانگ داعی رہے ہیں! اِن سب نے جماعت اور جماعت بندی کے "اسٹیم رولر" سے بشریت کے مختلف و ممتاز یکدگر نمونوں کے ہموار و پامال ہونے پر شدید صداہائے احتجاج بلند کی ہیں!

مشرقی تہذیب اپنے مخصوص معائب رکھتی ہے، لیکن اسی طرح فضائل سے بھی اس کا دامن خالی نہیں۔ تجدید و تجدد فی زماننا دُنیا کے انجن کی سیٹی کی آوازیں ہیں لیکن آخرکار قدامت و رجعت ہی اُسے ایندھن بہم پہنچاتی ہیں! بلاشبہ فینی ہوئی فلسفے کی ضعیف الاعتقادی چین کی

پسماندگی و بیچارگی کی اک اہم علت ہے لیکن پھر بھی یہ وہ مسلکِ حیات ہے جس نے سو پشتوں سے زیادہ عرصہ تک چین کے طاقتی وسائل اور طبعی خزائن کو تقریباً مامون و محفوظ رکھا ہے! اگر فنِ کان کنی اور علم فلزات سے آشنا ہونے کے بعد ہی سے ——— جو اب تین ہزار سال قبل کے ماضیٔ بعید کی بات ہے! ——— اہلِ چین نے اپنے معادن کی کامل تلاشی لینی شروع کر دی ہوتی، مثل باشندگانِ یورپ کے تو دھاتوں کے چینی سرچشمے کبھی کے سوخت ہو چکے ہوتے! پروفیسر ڈیوے نے اس سلسلہ میں ایک سوال پیش کیا ہے: "چینی قوم نے مسلسل چار ہزار سال کی پیہم کشاورزی کے باوجود اپنی زمین کی بار آوری کو کس طرح باقی رکھا؟!" ——— اس سوال کا جواب میں دیتا ہوں "صرف اس طرح کہ خوش قسمتی سے وہ سخت قدامت پرست واقع ہوئے تھے!"

مشرقی لوگوں نے کسی وسیع پیمانے پر بحر پیمائی نہیں کی۔ "نئی دنیا" کا اکتشاف اُن کی فہرستِ مفاخر کا کوئی کارنامہ نہیں ہے اسی بنا پر اُن کی یہ نکوہش کی گئی ہے کہ وہ بزدل و نااہل ہیں، اور جذبۂ عزیمت و اقدام سے عاری واقع ہوئے ہیں! ——— لیکن ساتھ ہی چونکہ وہ حزم و احتیاط کے مالک تھے، نیز اپنے اندر ایک شانِ جہلیت و عدم تعرض رکھتے تھے، اس لئے اُن سے فاش غلطیوں اور سنگین جرائم کا ارتکاب بھی شاذ و نادر ہی ہوا! اسی نوع کی صفات اگر مغرب میں ہوتیں تو وہ یورپ کو "حروبِ صلیبیہ" کی سی گمراہی اور حبشی تجارتِ بردہ جیسی شنیع معصیت سے بچا لیتیں! قومی سیرت کے فقدان کا نتیجہ اکثر قومی پسماندگی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے لیکن یہ مشرق کا استحکامِ سیرت تھا جس نے مشرقی تہذیبوں کو تقریباً اتنا ہی دیرپا اور طویل العمر بنا دیا جتنے کہ "اہرامِ مصر" ہیں، یا "ہمالہ کی چوٹیاں"! ——— درآنحالیکہ یونان و روم ایطالیہ و ہسپانیہ اک "دولتِ مستعجل" بن بن کر چمکے اور غروب ہو گئے! خود فرانس اور جرمنی کو دیکھئے کہ کتنا مختصر العمر اُن کا دورِ شوکت رہا انگلستان تمام فرزندانِ یورپ میں سب سے زیادہ قدامت پسند سمجھا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اوج و عروج سے نسبتہً زیادہ عرصہ تک متمتع رہا!

مشرق میں اپنی مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ اک فضیلت اور ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے مقابلہ میں فی الجملہ زیادہ صلح اور زیادہ بندہ نواز ہے۔ مثلاً چین کو دیکھئے کہ اس نے کتنی قوموں کو اپنے بڑے معدے کے قعر میں ڈال لیا! لیکن پھر اس پر غور کیجئے کہ ان جذب شدہ نسلوں میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچا؟ چین کے اندر نہ کوئی نسلی منافرت ہے نہ اغیار کے متعلق کوئی معاندانہ احساس! میو اور آیو نام کے دو قدیم چینی قبائل ہیں، جو چالیس صدیوں سے قلبِ ملک کے اندر رہتے چلے آ رہے ہیں، اور بایں ہمہ اُن کی انفرادیت الآن کما کان ہے! اس تمام دوران میں وہ اپنی خود مختار "ریاست اندرونِ ریاست" کے مالک رہے ہیں! صورت اور سیرت، نیز رسم و رواج کا جو اختلاف و اجنبیت ان قبیلوں اور چینی قوم کے درمیان پایا جاتا ہے وہ اُس دوری و ناآشنائی سے کسی طرح کم نہیں جو ہندوستانیوں اور امریکنوں کے درمیان موجود ہے لیکن کچھ معلوم ہے کہ امریکہ کی "سرزمینِ باآئین" میں آج ہندوستانیوں کی کیا قدر و منزلت ہے؟! ٦٦

مغربی تمدن بھی اس میں شک نہیں کہ بہت سی محمدتیں اور بہتر مند یاں رکھتا ہے اس کی مشق و مہارتِ طبعی نیز انسانی معاملات کے طے کرنے میں، اُس کی قوت و قابلیت اپنے اثر و نفوذ کی توسیع میں، ——— بس یہی اُس کی ناصیۂ جلال کے دو عنوانات جلی ہیں! اسیا رزمذہبیت میں مسیحیہ کسی طرح بدھ مت سے برتر نہیں، تاہم غور کیجئے کہ کتنی سرعت و سبقت کے ساتھ عیسائی مبلغین فرنگستان سے چہار دانگ عالم میں اپنی تبلیغی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے! حتیٰ کہ خود بدھ مت نے ——— جو مشرقی حرم مذاہب کا قبلہ و کعبہ ہے ——— مسیحیت کے مغربی ٹھیکیداروں اور علمبرداروں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے!

مغربی رنگ کا ڈھنگ یہ ہے کہ وہ لوگوں پر اپنا تانا بانا چڑھا کرتا ہے! اُس کی غیر معمولی قوت نفوذ کو ساری دنیا نے محسوس کیا ہے۔ اُس نے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں اک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اُس نے بشریت کی شاہراہِ خیال و فکر میں تصرفِ عظیم کر ڈالا ہے! اُس نے حیاتِ بشری کے ہوا

لوازم کو بہت کچھ بلند و بالا کر دیا۔ اُس نے انسانی محنت کے عرقِ پیشانی میں غیر معمولی کفایت پیدا کر دی ہے! انواعِ انسانی کے افراد کی عمرِ اوسط میں اُس نے معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ اُس نے عام طور پر انسان کے اقتدار و تسلّط کو بہت وسیع کر دیا ہے! انسانی سرگرمی و فعالی کے نئے نئے میدان اُس نے کھول دئے ہیں۔ وہ دُنیا کے دور اُفتادہ بلاد و امصار کو ایک دوسرے سے بمراحل قریب تر لے آیا ہے! عالمِ بشری کے اسبابِ معیشت آج بہت اعلیٰ معیارِ خوبی پر نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اک مشرقی ناظر بھی بشرطیکہ وہ کچھ متعصب اور خود بیں نہ ہو، اس عجیب و غریب تمدنِ مغربی کی اِن تمام مساعیٔ حسنہ و خدماتِ جلیلہ سے مجالِ انکار نہ پائیگا! آج اس کا آفتابِ عالمتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے! یونان و روما کے افسانہائے عظمت و شوکت اُس کے سامنے اک تقویمِ پارینہ ہیں! اُس کا جلوسِ تزک و احتشام دور دور تک اقطاعِ زمین کو پامال کر چکا ہے! مشرق تو مشرق وہ تو مغرب کی مخلوق کو بھی اپنی شانِ شتابکاری، خیرہ کن جلوہ گری، اور بے پناہ قوت آفرینی و زور آزمائی سے مبہوت کئے ہوئے ہے! طغرائے مردانگی اُس کی پیشانیٔ جلال پر بخطِ جلی لکھا ہوا ہے! اک فوق البشر ہنگامۂ و ولولۂ عمل سے اُس کی ایک ایک شریانِ بدن برق تاب ہے!

لیکن مغربی تمدن کا مرضِ مضمر اور ماؤف حالت کے علامات بھی اَب بے نقاب ہونے لگے ہیں! اُس کی عظمت و دولت کا انحصار جبر و قہر پر ہے لیکن جبر و قہر جس طرح بکثرت موقعوں پر نا گزیر ہوا کرتا ہے بعض حالات میں موجبِ آزار بھی بن جاتا ہے! لیکن مغرب، مشرق کی اس مصلحت اندیشی کا خوگر نہیں کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن!

مغرب کی اسی بے لگام یکہ تازی و تیز خرامی کا خمیازہ ہے کہ سرمایہ و محنت آج باہم متصادم قوتیں بنگئی ہیں! مختلف سیاسی احزاب اور پارلیمانی پارٹیاں انہی دو جنگجو عناصر کے کیمپ بن گئے ہیں! حکومتوں کے صیغہائے حرفت و تجارت دیگر اقوام سے جلبِ منفعت کی کارگاہیں ہیں!
۶۷ حد یہ ہے کہ "سائنس" اور "تعلیم" بھی دولت کے دیوتا کی مرید بنادی گئی ہیں! لوگ اپنے نفوس کے تزکیہ کے قدیم و دائمی نصب العین کو فراموش کر چکے ہیں۔ خواص بھی عوام کالانعام کی طرح ہوائے نفس کے صید زبوں بن گئے ہیں! سب اک تند طوفان کے دھارے پر پڑ چکے ہیں اور نہ معلوم کس ورطۂ ہلاکت کی سمت میں رواں دواں ہیں! اجتماعی عمل، جو مغرب کا خاص انداز ہے، بڑی بے بہا چیز ہے۔ لیکن اس ناگزیر شرط کے ساتھ کہ وہ عام پبلک اور تمامی خلق اللہ کے مفاد کے لئے تحصیلِ دولت و طیاری اسبابِ معیشت کی خدمت انجام دے! لیکن جب وہ عظیم اکثریت کو قلّاش بنا کر گرفتارِ فلاکت و نکبت کر دیتا ہے اور معدودے چند اربابِ دولت و خداوندانِ سرمایہ، عمومی سوسائٹی کے جسمِ ناتواں کا بھاری سر بنکر اُس کے بارِ دوش ہو جاتے ہیں تو پھر یہ آئینِ حیات ذلّت آفریں بھی بن جاتا ہے اور حادثہ انگیز بھی! قوّت و شوکت بھی اہم چیزیں ہیں، لیکن ان کی غرض محمود ہونی چاہئے اور کم سے کم مقدار و مدّت کے لئے اُن کے استعمال کو روا رکھنا چاہئے! اس لئے کہ آخر میں جاکر یہ عناصر برہم زنِ محفل ہی ہوا کرتے ہیں! ــــــ نپولین اعظم اور قیصر ولیم (دوم) اپنے اپنے وطن فرانس و جرمنی کے لئے بڑے بڑے معجزاتِ ترقی انجام دیسکتے تھے بشرطیکہ وہ اپنی نادرشاہی کو قیدِ ضبط میں رکھتے!

جب ہیئتِ اجتماعیہ کے ایوان میں تجارت و جلبِ منفعت ہی عصائے حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو قوم میں "پیٹر بھی دیوی" ہی کی گادی نشینی عمل میں آتی ہے! اِس وادیٔ زندگی میں حیاتِ انسانی کا سارا جمالِ شرافت پامال ہو جاتا ہے! مذہب، ادب، موسیقی، اور تمام فنونِ لطیفہ پس پشت پڑ جاتے ہیں! آج دورِ حاضر کے آشوبِ عظیم میں وہ اسی گردش میں آچکے ہیں! وہ ابھی سے کافی مسخ ہوچکے ہیں جب ڈرامہ مسخرگی بنجائے۔ موسیقی سامعہ خراشی، اور رقص حرکاتِ مذبوحی، تو اُس وقت بہتر یہ ہے کہ تہذیب اپنی رفتار کو معطّل کر دے اور اپنی ثقافت نوازی کو ختم! ع

مرا بخیر تو اُمید نیست، شر مرساں!

آج سارے لطیف حیاتِ قلبِ انسانی، اور سارے محاسن و محامدِ بشری ۔۔۔ عشقِ صادق، وفائے خالص، ایثار و قربانی، فدائیت، شیدائیت، اُلفت و رفاقت، شرافت و شجاعت ۔۔۔ سب اک داستانِ پاستان اور اک تقویمِ پارینہ بنکر رہ گئی ہیں! گویا وہ ع

رسمے کہنے بود در عہد تو برافتاد!

شادی کی محفل میں آج لوگ بس اک طلعتِ حسین کو انتخاب کر لیتے ہیں یا اک گراں بہا حقِ شوہری کو! ۔۔۔ اور دوسری طرف صنفِ لطیف کی نگاہِ التفات کا مورد کوئی بطلِ تجارت و حرفت ہوتا ہے یا کوئی قارونِ وقت! ہیہات کہ انسان آج انسان کے پاس بس اس لئے آتا ہے کہ حیوانی زندگی کے بعض مطلوباتِ گوشت و پوست حاصل کرے! پھر جوں ہی کہ حسنِ بُت کا کُل جمال مرجھانے لگتا ہے یا فریقِ ثانی کے آثارِ تجارت اَدبار میں آنے لگتے ہیں تو مقدس گرجاؤں کے والہانہ عقدہائے نکاح بازاری عدالتگاہوں کے شرمناک طلاق بن جاتے ہیں! وہ محبتیں جن پر بقائے دوام کی مہریں ثبت ہوئی تھیں اک پُرفریب نیرنگِ روزگار ثابت ہوتی ہیں! آہ کہ انسان کو غیر انسانی صفات نے اپنا مرکب بنالیا اور "اقارب" کی کمی "عقارب" کی صورت میں قلب ماہیئت ہو گئی! آج "سینۂ بے کینہ" اور "دلِ صورتِ مینا" عنقا ہے! موجودٔ انسانی داعیات و فسادات کے غولِ بیابانی کی سرگردگی میں وصولِ حق کا امکان تو اک مہمل خیال ہے! خدا محلاً ہمارے روزمرہ کی زندگی سے اک بعد المشرقین کی دوری پر پہنچ گیا ہے! مختلف قوموں کے درمیان عصبیت ہے اور منافرت، غلامیاں ہیں اور "زندہ سوزیاں" (megalomania) حکومتوں کے درمیان پالیسیاں ہیں اور ڈپلومیسیاں، چالاکیاں ہیں اور عیاریاں، ریشہ دوانیاں ہیں اور کارستانیٔ انصاف کشیاں ہیں اور اخلاق فراموشیاں ۔۔۔ پھر نظامِ اجتماعی میں طبقاتی امتیازات ہیں اور مجلسی دامن کشیاں، ہڑتالیں ہیں، اور انقلاب کی شورشیں، ملکوں کے درمیان سیاست بازیاں ہیں اور معرکہ آرائیاں ۔۔۔ کاروبار میں تجارتی مسابقت ہے اور طلبِ منفعت، مذہب میں الحاد ہے اور تشکک! ۔۔۔ الغرض ع

6. ناچ ہے مغرب کا بزمِ دہر میں

اِس ساعت موجود پر ساری مغربی خلقت اک ہجومِ مجانین کی طرح بے تحاشا دوڑی چلی جا رہی ہے! ؎

خبر نہیں ہے کدھر جاؤں گا چلا ہوں کہاں؟ مثالِ ریگِ پریدہ ہوں پر اُڑا جاتا!

اِک طوفانِ بلاخیز ہے جس کے درمیان ناخدا کی ضعیف و خفیف صدائے المدد بمشکل گوش زد ہوتی ہے! وہ طوفان کی شورش میں تقریباً غرق ہو گئی ہے! ۔۔۔ اور اگرچہ ناخدا نے گردابِ ہلاکت کو اپنے سامنے صاف صاف دیکھ لیا ہے لیکن وہ اک فردِ واحد سارے بیڑے کی تنبیہ و بیداری سے عاجز ہے جو سرشار و بدحواس تھپیک و رطۂ غرقابی کی طرف افتاں و خیزاں رواں ہے! ۔۔۔ عالمِ بشری کا یہ منظرِ عبرت بھی کیسا دہلانی ہے!!

پروفیسر برٹرینڈ رسیل اپنے اک مقالے سے "شائع شدہ رسالہ "جمہوریۂ جدیدہ" ۔۔۔ کے دوران میں فرماتے ہیں: "اگر یورپ اپنے کو اس اختلالِ دماغی اور اس تمدنی زیاںکاری سے باز نہ رکھ سکا تو شاید ضرورت اس بات کی پیش آئے گی کہ چین کا حرمِ سکینت اپنے بعض واعظین ممالکِ مغرب کو بھیجے جو حیوانیت و وحشت کے اس نیستاں میں انسانیت کی صدا بلند کریں!" ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ اِس قول میں اک رنگِ طعن کی آمیزش ہے۔ مگر جو حقیقت اس کی پس منظر میں موجود ہے وہ اک درسِ عبرت ہے!

سچ یہ ہے کہ مغربی تمدن اب زیادہ دن جی نہیں سکتا! اگر وہ اپنے انہی احوال و اعمال کے ساتھ جاری رہنے دیا گیا اور کوئی تدارک عمل میں نہ آیا تو وہ اپنا قاتل آپ بن جائے گا! اس طرح اس بے نظیر تمدن کی بے نظیر زندگی کے ساتھ اُس کی موت بھی بے نظیر ہی ثابت ہوگی ۔۔۔ یعنی خودکشی! پس تہذیبِ مغربی کی آئندہ منزل بلافصل یہ ہے کہ ع ایک "مرگِ ناگہانی" اور ہے!

ہم کو ضرورت نہیں کہ مغرب کی تباہی کے لئے ہم دوسروں کی طرح اک اور "جنگِ عظیم" کی دعا مانگیں! اس لئے کہ آج تو اس کی تمام تر زندگی کے میدان ہی میں اُس کے انہدام کا تخم تلاش کیا جا سکتا ہے! یہ میدان صنعت و حرفت و تجارت کا میدان ہے۔ مغربی دُول عظمیٰ میں سے ہر ایک اپنے لئے عالمگیر بازارِ تجارت کا تسلط چاہتا ہے! مغرب کے ملوک التجار اور عظیم تجارتی تنظیمات صرف مقامی یا ملکی ترکتازِ تاجرانہ پر قانع نہیں! کسی کا منصوبہ بین الاقوامی اجارۂ تجارت سے کم تر کوئی چیز نہیں! اب مصنوعات کی موجودہ رفتار پیدائش ہو رہی ہے۔ پھر جس سرعت سے مختلف سرزمینوں کے طبعی ذخائر اخراج و صرف ہو رہے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ دہشتناک ہے۔ اگر ہم صرف کی حالیہ مقداروں کو بغیر کسی اضافہ کی رعایت کے مستقل فرض کر لیں تو آئندہ سو برس کے اندر اقطاعِ عالم کی لکڑی، تیل، ربڑ اور خود کوئلہ قریب قریب سوخت ہو جائے گا! ___ کیا اکیسویں صدی کے انسانوں کے لئے یہ کوئی معمولی حادثہ ہوگا؟! پھر اگر اس قیاس کو بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دُنیا کے طبعی ذخائر کشت زار و جنگلات اور وافر کان و معدن تاقیامت جاری و باقی رہیں گے۔ تب بھی ممالکِ عالم کی حرفتی کارگاہوں کی موجودہ رفتارِ کار بلامزاحمت قائم نہیں رہنے دی جا سکتی! اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً برطانیہ کی شکارگاہیں ہندوستان، مصر اور بعض دوسری نوآبادیات ہیں۔ اب جب ہندوستان، انگلستان کے اسباب کا مقاطعہ کر دیتا ہے تو برطانوی مزدور و کاریگر اپنے اوپر عرصۂ حیات تنگ پاتا ہے! اسی طرح جاپان کی بڑی کمینگاہ چین ہے۔ چنانچہ جب چینی آبادی جاپانی مصنوعات کی خریداری سے ہاتھ اُٹھا لیتی ہے تو معاً جاپان اس اقتصادی شکنجے کے فشار کو محسوس کرنے لگتا ہے! تیسری طرف ریاستہائے متحدہ امریکا اپنی دولتِ قارونی پر نازاں ہیں، اس لئے کہ یورپ اور باقی دُنیا کا بیشتر حصہ بھی آج اسکی مالی دستگیری کا محتاج ہے۔ لیکن اگر یورپ ہی گردش میں آ جائے تو امریکن سرمایہ معرضِ تلف میں آ جائے گا! مغربی تمدن کی تو بنیاد اساسی ہی اس اصول پر واقع ہوئی ہے کہ زور و زر بیک وقت آلۂ کار ہوں! اور قومیں، نسلیں، اور سوسائٹی کے مختلف داخلی طبقے یکساں مواقعِ معیشت سے مساویانہ متمتع نہ ہونے پائیں، غریب و نادار، کمزور و ناقابلِ مقاومت عناصر یا تو پیس ڈالے جائیں، یا تا زیست اُن کی خون آشامی کی جاتی رہے!

دُنیا کے ترقی پذیر حرفتی مُستقبل میں اِس احتمال کو فرض کیجئے کہ ہر مُلک، برطانیہ و امریکا ہو گیا ہے! اَب اپنی وطنی ضروریات کی بہم رسانی ٦٩
کے بعد ہر قوم اپنے اسباب و اجناس کی نکاسی کے لئے کسی بیرونی بازار کے ڈھونڈنے پر مجبور ہوگی، مان لیجئے کہ ہندوستان کے پاس انگلستان کو برآمد کرنے کے لئے سوتی مصنوعات پیدا ہو گئیں اور علیٰ ہذا القیاس چین اپنے ہمسایہ جاپان کا عام حرفتی بہم رساں بننے پر تیار ہو گیا تو ایسی صورتِ حالات میں کیا "کثرتِ پیداوار کا قحط" نہ پڑ جائے گا؟

الغرض آپ اپنے استدلال و نظر کے لئے کوئی بھی راہ اختیار کریں اس نتیجے سے مَفَر نہیں کہ موجودہ مغربی تمدن میں اگر کوئی اساسی تبدیلی عمل میں نہ آئی تو اپنی آئندہ رفتار میں وہ اپنے لئے آپ ہی زنجیرِ پا بن جائے گا! آخری انجام اُس کے سامنے یہی ہے کہ اپنے مادی سازو برگ کے ختم ہو جانے کے بعد اک فاقہ زدگی کی موت مر جائے! شکمِ زمین کے طبعی ذخائر جب اک وقت جا کر بالکل خرچ ہو چکیں گے تو بجز اس حشر کے کیا چارہ ہے؟ اور یا پھر یہ ہوگا کہ تمام اقوامِ عالم کی علمی و فنی و حرفتی خلاقیاں جب دُنیا کے بازار کو اپنے مصنوعات و اسباب و اجناس سے پاٹ دیں گی تو یہی مہیب انبارِ عظیم بین الاقوامی معیشت و معاشرت کی رفتار کو مسدود و معطل کر دے گا! ___ اور یہ تو صرف مادی اسباب معیشت و زحمت ہیں، جن کے ساتھ اس اخلاقی انحطاط اور روحانی گمگشتگی کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مستقبل کی مغربی زندگی اپنی جلو میں لائے گی اور اک روز افزوں شدت و قباحت کے ساتھ! ع

ہُشدار کہ سیلابِ فنا در پیش است!

(۴) مشرق و مغرب کا وصال و وفاق

مشرقی اور مغربی تہذیب کی جو جو صفات و خصوصیات گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہیں وہ شاید ہماری بحث کی بازگشت اُس فیصلے

کی طرف کرائیں گی جو اس مضمون کی افتتاحی سطور میں نقل کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ ؎

مشرق ہے مشرق، مغرب ہے مغرب
دونوں کا ملنا ہے غیر اغلب!

اچھا تو کیا مشرق اور مغرب کبھی باہم نہ ملیں گے؟ اِس کی نسبت کچھ بھی کہا جائے لیکن میرے ذاتی خیالات اور قلبی معتقدات کا حکم ناطق تو یہی ہے کہ یہ دونوں تمدّن ابدی طور پر بیگانۂ یکدگر نہ رہیں گے! میری محبت کا اجتہادی نکتہ یہ ہے کہ مشرق و مغرب اگرچہ بلا شُبہ ایک دوسرے سے "مختلف" واقع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے "مخالف" نہیں ہیں! اُن کے درمیان اک اجنبیت ضرور ہے لیکن صرف "اجنبیت" نکہ "منافات"! اُن کا ملنا دو نا آشنا چیزوں کا سنگم ہوگا، نکہ اک "اجتماعِ ضدّین"! میرے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی تہذیبیں اک دوسرے کا تکملہ کرتی ہیں، نکہ اک "انمل بے جوڑ" سوگ بناتی ہیں! مشرق و مغرب کی مغائرت کے بارے میں کپلنگ کا جو ضرب المثل (یا بدنامِ عام!) فقرہ ہے اُس سے تو یہ یاس خیز خیال ٹپکتا ہے کہ دونوں تمدّنوں کا معانقہ دُنیائے ممکنات ہی کی کوئی چیز نہیں! لیکن میں اِن تہذیبوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ ایک دوسری کا "عکس" نہ ہوئیں! اُن کا یہ تباین ہی اُن کے درمیان جذب و انجذاب کا طبعی داعیہ پیدا کرے گا! کیا مرد و عورت بھی بعینہٖ اسی طرح خلقاً مختلف نہیں ہوتے؟! اور کیا یہی تفریق اُن کے درمیان رشتۂ مواصلت نہیں بنجاتی؟! ؎

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ است
تو زباں فہم نۂ ورنہ خموشی سخن است!

پس نسائیت مآب مشرق، مردانہ صفت مغرب کا دلدادہ ہوجاتا ہے اُس کی قوت آفرینی اور کارفرمائی کی کارناموں سے! "جدید جاپان" اس "نذرِ دل" کی دلچسپ مثال ہے جو اُس نے مغرب کے مظاہرِ جلال کے سامنے پیش کی ہے! گویا مشرقِ بعید کے اس خطے اور دور دراز مغرب کے درمیان اک "عقدِ زوجیت" عمل میں آیا ہے! ــــ تاکہ اوّل الذکر کی نسائیت آخر الذکر کی رجولیت سے آمیز ہو کر اک متوازن الامتزاج نعومت و خشونت پیدا کرے! ہند و چین کی سرزمینوں میں بھی اسی تخم کی کاشت ہو رہی ہے! ماضیٔ قریب میں ان ہر دو مشرقی ملکوں کے اندر اجتماعی شعور، تنظیم کار، اور اشتراکِ عمل وغیرہ کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ہیں وہ تمدّنی مناکحت کے آخری قیام کے ابتدائی "پیام و سلام" ہیں! ع

اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں!

مشرق کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور عالمِ اسباب کی آزمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنی زنانہ پردہ نشینی اور اپنی دوشیزگانہ حیا پروری کو خیرباد کہے! دوسری طرف مغرب کی حالت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ اپنی گرمیٔ رفتار ہلاکت کے نتائج سے بچنے کے لئے مشرق کی شانِ سکون اور ادائے جمال کو تھوڑا اپنے سینے کے اندر اتارے! ــــ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عام طور پر مشرق کی تفسیرِ حیات پر ایمان لانے کیلئے اپنا شرحِ صدر کرے!

اگر مشرق سے فرمائش کی جائے تو یقیناً اُس میں یہ اہلیت بھی ہے اور یہ آمادگی بھی کہ وہ مغرب کو اک نیا جلوۂ زندگی دکھائے اور ایک جدید مقصدِ حیات بخشے! خاتونِ مشرق مردِ مغرب کے لئے ایک نشیمنِ دلنشیں بنائے گی۔ جو آخر الذکر کا روحانی مامن بھی بنجائے گا! اپنے پہلوئے نازکی درسگاہ میں وہ اس کو فرصت و فراغت، سکینت و متانت، تخیُّل و تصوّر، شبِ خواب اور صبحِ انکشاف کے ابواب پڑھائیگی! یہ "خاتونِ جمیل" (مشرقیت) اس "مردِ ثقیل" (مغرب) کو حفظ و ضبط، سکون و اطمینان، کیف و لطف، محبت و الفت کی ورزش کا فنِ لطیف سکھائے گی!

مشرقیت کو اک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اُس کے لئے مہمات زندگی کے اہتمام و انصرام کے بارگراں کو اپنے دوش قومی پر
ہالے! اسی طرح مغرب اک مجسمۂ نسائیت کا محتاج ہے جو اُسے اک خانۂ عافیت اور اک خلوتِ روحانیت بہم پہنچا دے! مشرق کے کان
بدانِ عمل کے "بگل" کی ضرورت ہے، اور مغرب کے سامنے کو حرم سکینت کی "نوائے اذاں" کی! مغرب مشرق کے ساتھ اس ریشمی رشتۂ زوجیت
ذریعے شیرینیٔ حیات اور نرمیٔ حسیات کے نوشدارو کا سراغ پا سکتا ہے، اور مشرق مغرب کے ساتھ اسی حبالۂ عقد کے بل پر کاروانِ زندگی
ں فاتحانہ قدم زن ہو سکتا ہے!

الغرض "خاتونِ مشرق" اور "مردِ مغرب" کی یہی "تمدّنی شادی" ہے جو تہذیبِ بشری کے ان ہر دو گھرانوں کی "خانہ آبادی" بنے گی،
اک جامع و متوازن تمدّن کا مولودِ قوی تولّد پذیر ہوگا جو مشرق و مغرب کی مجموعی ثقافتی وراثت کا لائق و فائق وارث ہوگا!

گویا شراب

(حضرت عمر انصاری لکھنوی)

بے ربط سا وہ خواب دکھا کر چلے گئے ماضی کو جزو حال بنا کر چلے گئے

مضمر تھیں بے حجابیوں میں پردہ داریاں آتی ہوئی ہنسی کو دبا کر چلے گئے

اب ذرہ ذرہ دل کا ہے مخمورِ اشتیاق تم کونسی شراب پلا کر چلے گئے

مرگ و حیات دونوں سے ہوں دور دور سا کیا جانے کیا مجھے وہ بنا کر چلے گئے

روکا ہزار بتکدے جانے سے شیخ نے ہم واسطہ خدا کا دلا کر چلے گئے

کچھ ہم بھی حرف شکوہ نہ لائے زبان پر کچھ وہ بھی آج سر کو جھکا کر چلے گئے

پاکیزگی کی شرط تھی پیشِ خدا عمرؔ
ہم اپنے آنسوؤں میں نہا کر چلے گئے

جمہوریۂ ترکی کا نیا صدر

(از کیپٹن جے آر ایس لیڈون برن)

مترجمہ: "عزت"

اپنی زندگی میں کمال اتاترک نے وہ کمال حاصل کیا جس نے سیاست دانوں کو تحیر میں ڈال دیا۔ وہ زمانہ مابعد از جنگ کا پہلا آمر تھا اسے اتنی شہرت نصیب ہوئی جس نے دیگر آمران قوم کو گویا قعر گمنامی میں پھینک دیا۔ تمام دنیا اس کو ترکی جدید کے بانی، اس کی ڈوبتی کشتی کے ناخدا کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی تھی۔ اب کہ اس کی وفات حیات جاوداں کے نام زندگی کا قیمتی ترین تحفہ بن چکی! کون ہے جو اس کے جانشین کا نام جانتا اور اس کے کارناموں سے واقفیت رکھتا ہے! چند گنتی کے افراد اس کی بابت مفصل معلومات رکھتے ہوں گے۔ میں ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

بہرکیف اب ترکی کی زمام حکومت ایک ایسے مخلص انسان کے ہاتھوں میں ہے، جو غازی مرحوم کا سایہ بنا رہا جس نے اس کی معیت میں ۴۲
بیس سال تک کام کیا۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جس میں ترکی کو ایسے مراحل سے گزرنا ہے جنہوں نے کمال کو اگر وہ زندہ ہوتا کسی حد تک پریشان کر دیا ہوتا۔ حملہ آور یونانیوں کو اپنے ایشیائی حصّہ سے نکالنے کے بعد کمال کے لئے صرف اندرون ملک کے معاملات کا سنبھالنا رہ گیا تھا، لیکن اس کے منتخب جانشین کو خارجی گتھیاں سلجھانی ہیں، اسے ایک طرف روس سے توازن قائم رکھنا ہے، مشرق کی جانب بڑھنے والی جرمن قوم کی روک تھام کا انتظام الگ رہا۔ اور پھر دول انگلستان و فرانس کے متحدہ محاذ سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یہی دونوں ملک اس کے بری و بحری ہمسایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برطانیہ ترکی سے معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے درہ دانیال کو آزادی دلائی! یہی بحیرۂ اسود کی راہ ہے۔ جس کے ساحل کی طرف جرمن بڑھ رہے ہیں۔

جنرل عصمت انونو مختصر قد کے ہنس مکھ انسان ہیں۔ وہ Benes[1] سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ترکی کا بچہ بچہ ان کو جانتا ہے اتاترک تک پہنچنا اک مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے برخلاف انونو اکثر کہیں نہ کہیں نظر آجاتے ہیں! وہ کمال کے دست راست تھے، اخبارات میں ان کا ذکر آمر سے زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ان ہی کی تصاویر سے وہ اکثر و بیشتر مزین رہا کئے ہیں، اتاترک تنہا تھے ان کی کوئی گھریلو زندگی نہ تھی۔ لیکن جمہوریۂ ترکیہ کے نئے صدر کی ایک جوان بیوی ہے اور اولاد بھی، وہ عوامی ملاپ کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ اس زمانہ میں پروان چڑھا جب باشندگان اور آمر کے درمیان پیامبر کا کام کرتے تھے، کمال فیصلہ کرنا جانتے تھے، یہ فرض عصمت کا تھا کہ ان کے فیصلوں کو جامہ عمل پہنائیں۔ طاقت کے خلاف اٹھتی ہوئی آوازوں کو دبانا انہیں پسند تھا۔

---

[1] بینز۔ چیکوسلاویکیہ کا صدر جسے ہٹلر نے جلاوطن کر دیا۔

آج کل لٹریچر میں ترقی پسندی، انقلاب اور ہمہ گیری کے خیال نے جگہ لے لی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پُرانی زبان اور پُرانے خیالوں کی بڑھوتری کا اب کوئی امکان نہیں۔ اور یہ شعور تو اس نیم مذہبی سیاسی شعور کی بھی ضد ہے۔ جو اس سے پہلے سماج پر اپنا اثر ڈالے ہوا تھا اور جسکے مظہر حالی اقبال اکبر اور پریم چند وغیرہ تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک چند برسوں میں یہ انقلاب کیونکر ہو گیا!؟ یہ کیوں؟ بس یہی زندگی کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ نیم مذہبی سیاسی شعور کو قبول کرنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ فرد اُن تمام پُرانی اور دقیانوسی باتوں سے تنگ آچکا تھا جو سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے غلیظ رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں اور اب اس کی روح آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر سماج اسی پُرانی افیون کی پینک میں تھی ہاں مسلمانوں میں کسی قدر سرسید نے ذہنی آزادی کی روح دوڑائی تھی لیکن اس کی نوعیت بھی یہی تھی جیسے کونین پر شکر چڑھا کر مریض کو دی جائے۔ اس عمل کا بھی ردِ عمل ہونا ہی تھا چنانچہ نئے سیاسی و اقتصادی تصورات ادب پر اپنا اثر جائے بغیر نہ رہ سکے، اور مطالبہ کیا جانے لگا کہ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

آخر زندگی سے ادب کی ہم آہنگی کے معنی کیا ہیں!؟

(باتیں بڑی روکھی پھیکی ہیں۔ نہ ان میں استعاراتِ مجمل و مفصل کا ذکر ہے اور نہ ایطائے خفی و جلی کا، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اُس پر میں نے غور کیا ہے)۔

——— ہاں تو ادب نے زندگی کی ہم آہنگی کیا معنی رکھتی ہے!؟

واقعہ یوں ہے کہ عوام کی بیداری نے ادب برائے ادب (Art is a Art.) کے نظریہ میں تو کوئی جان باقی رکھی نہیں۔ سماج کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ اور نظامِ حکومت کی تبدیلی در تبدیلی نے فرد کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا۔ اس انقلاب کے بعد "ادب برائے خدمتِ انسان" کے نظریہ نے قدرتی طور پر ایک ذی روح حیثیت اختیار کر لی۔ گویا اب ایک ادیب اور ایک افسانہ نگار و شاعر کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ کسی ایک فرد کے شاعرانہ ذوق کے مطابق شاعری اور ادب کا مصنوعی بچہ زچہ ایکٹرس کی طرح جنے بلکہ اب فرد کے بجائے اسکی پشت پر ہزاروں انسانوں کے ذوق اور ضرورت کا مطالبہ ہے اور اس مطالبہ کو قدرتی طور پر پورا کرنا ہی ادب کا زندگی سے ہم آہنگ ہونا ہے۔!

ادبی انقلاب کے دوران میں شعر و ادب کو مفید اور عام بنانے کیلئے سب سے پہلے ٹیکنک بدلنی پڑتی ہے اور اسکے ساتھ ہی ایسی زبان میں لکھنا اور بولنا ضروری ہے جسے عوام زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں، سب سے پہلے تو بنیادی خیال کے انقلاب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے مگر اس وقت تک زیادہ تر ہماری اُردو شاعری اور ادب انہیں اخلاقیات اور فلسفوں کا غلام ہے جن میں انسانی ذہن ہزاروں سال سے اُلجھا ہوا ہے، دُنیا کا بڑے سے بڑا ادیب و شاعر فرد کو یہی تعلیم دیتا رہا ہے کہ "اکتفا" بلندی ہے اور صبر کا پھل میٹھا، لیکن جو مستری سماج کی اخلاقی مشینری کے زنگ آلود کل پرزوں سے واقف ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ تعلیم کیوں دی جاتی تھی، یہ تعلیم طبقاتی مفاد کے لئے لازمی تھی، کیونکہ عوام میں صبر کرنے والے نہ ہوتے تو صبر نہ کرنے والوں کی زندگی خوشی اور چین سے کیونکر گزرتی!؟

میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک دُنیا کے بیشتر شاعروں نے اپنے وقت اور ماحول کا ساتھ دیا اگر وہ اپنے زمانہ کا ساتھ نہ دیتے تو زندہ نہیں رہ سکتے تھے ان کا زمانہ ان کی زبان سے بولتا تھا۔ اب ہندوستان کی نئی صبح ہے۔ انقلاب کی جری انگڑائی لیکر جاگتی ہوئی اُٹھ رہی ہے، ہر طرف بیداری اور زندگی جھنجھنا رہی ہے، ہر طرف کامیابی اور ترقی کی دھندلی تصویریں سایوں کی طرح نظر آ رہی ہیں، گو بہت کم

اور زمانہ نے ہی اس کا جواب دیا۔ کرزن جو لانڈ جارج سے ملی بھگت رکھتے تھے اپنی طاقت کھو بیٹھے۔ ترکی سے پھر معاہدہ کے فکرمند نئے سیاسی رہنماؤں نے از سر نو عصمت سے ناتہ جوڑا۔ اور جو انھوں نے لاسین پر طلب کیا تھا اس کو اس بار پالیا۔ اتفاق دیکھئے ان ہی کی کوشش سے ابھی برطانیہ نے سولہ لاکھ پونڈ کا قرضہ ترکی کو دیا لیکن قدیم اقرار ناموں میں سے ایک بھی اس قرضہ کی بنیاد نہ بنا۔

تین جمہوری کامرانیوں کے بعد جب اتاترک کی اصلاحات کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اور اُن کو ترکی کی تعمیر نو پر اپنی تمام توجہ مرکوز کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا تو عصمت کے سپرد صلحناموں پر عمل درآمد اور گفت و شنید کا کام کردیا گیا وہ وزیر اعظم بھی تھے اور وزیر خارجہ بھی، معاہدٔ بلقان ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ترکی کی صنعتی و حرفتی ترقی کے لئے دو پنجسالہ اسکیموں کی نگرانی ان ہی کے سپرد رہی ہے۔ آجکل ان کے معاون بیئر وزیر اعظم ہیں۔ اس عہدہ پر کمال کے زمانہ میں عصمت خود فائز تھے۔

یہ دونوں (کمال اور عصمت) ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ انقرہ اور ملکوا میں دونوں کے مکانات پاس پاس تھے (ہندوستانی اصطلاح میں دیوار بیچ رہتے تھے) صبح ہی صبح دونوں مل کر وہ قانون سمجھ لیا کرتے تھے جن پر اس دن مجلس کو غور کرنا اور فیصلہ دینا ہوتا تھا۔ اتاترک برانڈی اور شمپین کے جرعات لیا کرتے اور عصمت قہوہ پر اکتفا کرتے۔ وہ شاذ و نادر ہی شوق کرتے ہیں۔ اک بار اتاترک نے ان کی اس پرہیزگاری کا مذاق اڑایا تو عصمت نے مسکرا کر کہا "میں اپنی مونچھوں کی بڑی وقعت رکھتا ہوں" یہ جواب پس منظر میں ایک واقعہ پیش کر دیتا ہے۔

اک بار رات کے کھانے پر اتاترک کے ایک کامریڈ نے بہت پی لی تھی۔ اپنا سگریٹ سلگاتے وقت اس کے ہاتھ سے دیا سلائی چھوٹ کر عصمت کی مونچھوں پر جا گری۔ ان کی خیر ہو گئی کہ عصمت نے جو قریب ہی بیٹھے تھے فوراً ہی اپنی جلتی ہوئی مونچھوں کو اپنے گلاس میں ڈبو دیا۔ اس وقت وہاں صرف ان ہی کے گلاس میں پانی تھا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد پھر اک ڈنر پر، دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اتاترک نے مذاقاً ان سے کہا "تمہارے ہاتھ ٹھیک سے نہیں چل رہے، کیا شوق کرنے لگے؟" "میں نے تو پانی بھی نہیں پیا" یہ عصمت کا جواب تھا۔ "لیکن تمہارے پاس مٹر کا شوربہ تو تھا" کمال نے اپنے جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس سالن میں شیری خوب ملادی گئی تھی ـــــ بیچارے عصمت کو اس کا کیا علم تھا!!

یورپ اور دنیا کے پیچیدہ حالات سے فائدہ اٹھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہ تمام ترکیبوں اور چالاکیوں سے واقف ہیں سولہ لاکھ کا قرض انگلستان سے لینے کے بعد ابھی انھوں نے بارہ لاکھ جرمنی سے اسی مد میں حاصل کئے ہیں۔ وہ طاقتور اقوام کے درمیان بہت خوب توازن قائم رکھتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ گزشتہ بار ترکی کا پانسہ اُلٹا پڑا اور اس نے ایک سلطنت کھودی۔ اب کی بار اس کا ردِّ عمل ممکن ہے۔ انونو فیصلہ کن دماغ رکھتے ہیں، مظاہرات سے وہ نہ جلد متاثر ہوتے ہیں نہ پریشان۔

انھیں اپنے رہنما سے زیادہ سخت کام انجام دینے ہیں، ان کے بال بھورے ہو رہے ہیں لیکن ان کی مونچھیں سیاہ ہیں اور گھنی، وہ روزانہ بارہ گھنٹہ کام کرتے ہیں، سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اک لائحہ عمل کے مطابق کام کرتے ہیں، عجلت نہیں برتتے اور نہ وقت بیکار کھوتے ہیں۔

عزّت

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا مرثیہ شاعری

(ایک علمی و فنّی موازنہ)

(جو سیّد محمد یحییٰ میرٹھی اور ساغرؔ نظامی کے مابین آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء کو ۸ بجکر ۱۵ منٹ پر براڈکاسٹ کیا گیا)

ساغر (عالمِ انتظار میں) گیارہ بج گئے اور آج یحییٰ صاحب ابھی تک نہیں آئے ! ؟

(یحییٰ کی آواز) حاضر ہو سکتا ہوں !

ساغر آئیے، بھئی بڑی عمر ہے۔ ابھی ابھی میں آپ ہی کا تصور کر رہا تھا —— کہاں تھے ! ؟

یحییٰ رات کو دو تین بجے تک جاگا تھا، دن چڑھے تک سوتا رہا۔ آپ تو جانتے ہیں، سیّد صفدر علی خاں کو، ہمارے دوست ان کے یہاں شب کو مجلس تھی۔ ایک صاحب نے مرزا دبیر کا اک لاجواب مرثیہ اس انداز سے پڑھا کہ حاضرین جھوم جھوم گئے۔ ہر شخص بے تاب ہوگیا، کوئی سخت دل ہی ہوگا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آگئے ہوں ! ؟

ساغر خوب دبیر کی شاعری بھی یہ طاقت رکھتی ہے، میر انیس کے متعلق آپ ایسا کہتے تو میں تسلیم بھی کر لیتا ۔

یحییٰ ساغر صاحب معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انیس و دبیر لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ ایک کا نام لیتے ہی دوسرا سامنے آجاتا ہے۔ جس چیز پر ادب کے بڑے بڑے پہلوانوں میں رسّہ کشی ہو چکی ہے اس پر آپ بحث کرنی چاہتے ہیں۔ مجھے آپ کے زبردست نفسیاتی انسان ہونے میں شک نہیں، لیکن دوست موضوع کسی قدر خطرناک ہے۔ اور اس تفریحی صحبت میں بحث ناتمام رہ جائیگی۔ میرے نزدیک اُردو کے شعرا علم کلام کے مطابق کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہوں۔ لیکن انسانی زندگی سے ان کی شاعری کا کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ اور اگر ہے بھی تو صرف اس قدر جیسے اُردو پر سفیدی ۔

یہ میری ذاتی رائے ہے، اب رہا آپ کے سوال کا جواب، سو اگرچہ میں انیس کو ایک قادر الکلام شاعر سمجھتا ہوں، تاہم مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں نہ صرف انیس کے ہم پلہ ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان سے زیادہ کامیاب شاعر ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ انیس اور دبیر کا مقابلہ غلط طریقے پر کیا جاتا ہے۔ آپ خود شاعر ہیں اس لئے میرے اشارے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ساغر اُردو شاعری اور شعرا اور ان کی زندگی سے کم ربطی، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا بڑا تعلق سماج اور اسکے برتاؤں سے بھی ہوتا ہے، زندگی سے ربط ہونے کا خیال بالکل نیا خیال ہے اور اس نئے خیال کی جھلک موجودہ زمانے کے شاعروں میں پائی جاتی ہے،

پرانے شاعر قدیم سماج کی آواز تھے، نئے شاعر نئی دُنیا کے نمائندے ہیں۔ رہے انیس و دبیر اور ان کی شاعری تو میرے خیال میں انیس بہرحال مرزا دبیر سے بہتر اور برتر شاعر ہیں۔

حسنِ تناسب ( ) سلاست، فصاحت، شاعرانہ تراش، زور، جوش اور موضوع کے متعلقات کو مناسبت کے ساتھ نظم کرنا، یہ خصوصیتیں انیس کی شاعری کے ترکیبی عناصر ہیں۔ وہ جس ماحول کی تصویر کھینچتا ہے اس سے تعلق رکھنے والی نازک سے نازک چیز کو موضوع کی کامل مناسبت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اتنا کامل اور خلاق آرٹسٹ اُردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کے سوائے کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ انیس کی شاعری دبیر کی شاعری کے مقابلہ میں، غرابت، ثقالت اور آورد و تعقید سے قطعاً پاک ہے۔

انیس کی نظم میں الفاظ بھی رقص کرتے، کبھی جھومتے، کبھی سر دُھنتے اور کبھی سینہ تانے ہوئے آتے ہیں۔ اور نگاہ کے سامنے منظر کی مکمل تصویر کھنچ جاتی ہے ؎

نکلا یہ سُن کے غیض میں اک پہلوانِ روم　　　گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
سرہنگ و پُر غرور و سیہ قلب و نحس و شوم　　　لنگر سے جس کے ہل گئے مقتل کے مرز و بوم
مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

دوسری جگہ "ذوالفقار" کی تعریف و تصویر ملاحظہ کیجئے ؎

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا　　　جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جُدا
مہتاب سے شعاع جدا، گل سے بو جُدا　　　سینہ سے دم جدا، رگِ جاں سے لہو جُدا
گرجا جو رعد، ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

اور جب صبح کی تصویر کشی کرتا ہے تو الفاظ صبیح، رنگین، پاکیزہ، اور شاداب استعمال کرتا ہے۔ سُنئے ؎

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا　　　درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا　　　سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

انیس نہ صرف منظر نگاری میں کمال رکھتا ہے بلکہ مناظر کے جو اثرات انسانی جسم و روح پر ہوتے ہیں ان کو بھی جنچے تلے الفاظ میں نہایت فصاحت کے ساتھ نظم کرنے میں حیرت انگیز کمال رکھتا ہے!!

یحییٰ　بجا ہے لیکن کلام کے اجزاء کو اگر نکھارا جائے۔ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک کلام پر دوسرے کلام کی فضیلت الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی؛ بلکہ جب ترتیبِ الفاظ معانی کے لحاظ سے ہوتی ہے تو خوبی اور خصوصیت کہلاتی ہے۔

ساغر　خیر آپ علمِ معانی پر روشنی ڈالئے میں سُننا چاہتا ہوں کہ آپ انیس کے متعلق کیا کہنا چاہتے ہیں؟

یحییٰ　انیس ہو یا روح الامین! بے خوف نقاد کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتے۔ علم معانی سے مراد وہ مقاصد ہیں جو مرکب الفاظ کو ایک

دوسرے کے ساتھ ترکیب دینے سے سمجھے جاتے ہیں۔ گویا علمِ معانی ہی حقیقتاً بلاغت ہے جس میں مرکب کلموں سے بحث ہوتی ہے اسکے برخلاف فصاحت کا تعلق مفرد الفاظ سے ہوتا ہے۔ ان مفرد الفاظ پر علم بیان کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ بھئی واقعہ یہ ہے فصاحت اور بلاغت ذوق سے تعلق رکھتی ہیں؛ ان کا احساس رومانی ( ) ہے انیس بلاشبہ مرزا دبیر کے مقابلے میں فصیح تر ہیں۔ لیکن فصاحت میں اگر معنوی خوبیاں نہوں تو علم کلام کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ گھٹ جاتا ہے۔ الفاظ تو محض خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس لئے خیالات ہی اصلی چیز ہیں۔ الفاظ کے مقابلے میں خیالات پر غور کرنا چاہئے۔ مرزا دبیر کی بلاغت، بلند پروازی سیر گوئی ان کے کلام کو زیادہ ٹھوس اور بلند پایہ کردیتی ہے۔ رہی روانی و سلاست تو دبیر کے کلام میں اسکی کمی نہیں۔ حضرت اصغر کی شہادت پر مرثیہ کے شروع میں جناب امامؑ کی خودداری کی تصویر کھینچتا ہے ؎

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے ۔۔۔ چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے ۔۔۔ چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ساغر بہت خوب، یحییٰ صاحب خیال کو میں بھی بنیادی حیثیت دیتا ہوں، لیکن شاعر کا رنگ و روغن محض الفاظ ہیں۔ تناسب' توازن' اور سلیقے کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہی شاعر کو ممتاز کرتا ہے، حسین اسلوب الفاظ کے نادر طریقۂ استعمال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی میں اس شاعر کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جو الفاظ کے گورکھ دھندے ہی میں اُلجھا رہے اور کوئی اچھوتا خیال یا جذبہ پیش کرسکے۔

۷۷ انیس ہمیشہ اپنے موضوع اور بنیادی تخیل کے ماتحت الفاظ کو استعمال کرتا ہے۔ تراکیب و بندش کی چستی و پختگی اور ترتیب الفاظ سے جو ترنم پیدا ہوتا ہے وہی اسکی کامیابی کا ضامن ہے؛ شعر کا اصلی جوہر یہی ترنم لفظی ہے جو انیس کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ الفاظ کا ترنم انسانی شعور کو متوالا بنا دیتا ہے' سوئی ہوئی روح کو بیدار کردیتا ہے۔ یعنی انیس کے کلام میں "آہنگ" ہے' جو حرکت و حرارت پیدا کرتی ہے۔ آپ خود غور فرمائیے مرثیہ نگاری غزل گوئی سے کتنی مختلف چیز ہے' غزل متفرق مضامین اور مختلف جذبات کا آئینہ ہوتی ہے مگر نظم میں ایک ہی عنوان اور ایک ہی موضوع کی مطابقت و مناسبت سے تسلسل قائم رکھنا پڑتا ہے' نظم مطلقاً جذبات، محسوسات یا مناظر اور چیزوں کی تصویر کشی کو کہتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تصویر میں اسکی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک برش' اچٹا یا رپٹا ہوا پڑا اور تصویر غلط، اسی لئے میرا دعویٰ ہے کہ انیس کا ہر نقش اپنے موضوع کے جزو و کل کا حقیقی اور مکمل مظہر ہوتا ہے۔

یحییٰ میں اس کو تسلیم نہیں کرتا ـــــــ اور

ساغر (بات کاٹ کر) سنئے۔ میں آپ کو انیس کے ایک مرثیہ میں صبح کے منظر کی مثال سناتا ہوں' وہ نہ صرف مشاہدات اور مناظر کی سچی تصویریں کھینچنے پر قادر ہے بلکہ انسانی نفسیات کے قدرتی تقاضات کا کامل ماہر ہے۔ دیکھئے اس سے تو آپ کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انسان کی قوتِ شامہ آنکھ سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔ اب سنئے انیس کہتا ہے ؎

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار

سب سے پہلے اس نے ماحول کی طرف ایک عام اشارہ کیا؛ "وہ دشت" پھر نسیم کے جھونکوں کا ذکر کیا "وہ نسیم کے جھونکے" اسکے بعد وہ منظر کی چھوٹی باتوں کی طرف متوجہ ہوا "وہ سبزہ زار"

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار

چوتھے مصرع میں ایسا منظر نظم کرتا ہے جس پر نگاہ جم کر رہ جاتی ہے ؎

بالائے نخل ایک جو بُلبُل، تو گل ہزار

تجنیس لفظی صنعتِ تضاد، صنائع بدائع اور اسی قسم کے محاسن کلام خود بخود اسکے قلم سے ضمنی طور پر برس پڑتے ہیں پھر اس ٹیپ میں مرثیہ سے ربط یوں پیدا کرتا ہے ؎

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے — شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

یحییٰ — فریب خوردۂ رنگینیٔ طلسمِ بہار — تجھے خبر بھی ہے کچھ اپنے آشیانے کی!

میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ آپ بحث میں بیجا انتہا پسند ہو جاتے ہیں، خدا کے لئے یہ تو سوچئے کہ انیسؔ جس صبح کی تصویر کشی کر رہا ہے وہ کشمیر کی صبح نہیں ہے کربلا کی صبح ہے جہاں ایک مظلوم کارواں، ایک بلازدہ قافلہ مصیبت میں گھرا ہوا ہے، تیروں کی بارش ہو رہی ہے، بھوک اور پیاس فضا پر چھائی ہوئی ہے، موت سر پر منڈلا رہی ہے، یہ کسی بہاریہ قصیدہ کی تشبیب ہے مرثیہ کی صبح ہرگز نہیں کربلا کی صبح کا نام لے کر سامعین کے دماغ پر کشمیر کی صبح کو منڈھ دینا شاعر کا نقص اور عجز ہے مگر میں ثابت کر سکتا ہوں کہ دبیرؔ اپنے ماحول کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ وہ محل اور موقع کے لحاظ سے صبح کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو فطری اور قدرتی ہے ؎

تھی صبح یا [illegible] کا وہ جیب دریدہ تھا — یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا — یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہئے نہ مہر، صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

ساغر — بجا فرمایا، لیکن آپ نے ٹیپ کے پہلے مصرع میں اس گریز پر غور نہیں فرمایا ؎

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے

کربلا کی سرزمین پر ظلم وستم کا منظر دن بدن وسیع اور خونیں ہوا ہے، انیسؔ تو انیسؔ کسی معمولی شاعر سے اتنی عظیم فنی غلطی نہیں ہو سکتی، یہ منظرِ صبح جس مرثیہ کا جزو ہے اس کا محل ...... ایسی ہی صبح دکھانا مقصود ہے، ورنہ انیسؔ کا فکر و قلم کہیں عاجز نہیں۔ نظم کی محدود صنف مرثیہ کو انیسؔ نے جو ہمہ گیری اور وسعت بخشی اس میں ہرگز اس کا کوئی شریک نہیں۔ اچھا ذرا مرزا دبیرؔ کا پہلا بند تو سنائیے

یحییٰ — سُنئے ؎

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیٔ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٔ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک جب ہوئی

فکرِ رُوشنی چسپ خ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

ساغر . خوب اسی پر آپ کا دعویٰ ہے کہ مرزا دبیر ماحول کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں صبح کا حسین و لطیف منظر' اور معترضانہ صرف قیاس اور تصور سے بعید ہے بلکہ اس کا کوئی تعلق موضوع سے نہیں، تشبیہ واستعارہ جائز مگر ہر سچا شاعر وہ استعارات وتشبیہات سوچتا ہے جو اسکے عنوان نظم سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ کسی شہزادی کو جنگلی عورت کا لباس اور کسی جنگلی عورت کو شہزادی کی پوشاک پہنا دینا کسی شاعر کے لئے ہرگز ماحول کی نمائندگی کرنے کے ہم معنیٰ نہیں۔

یحییٰ (بات کاٹ کر) ساغر صاحب ذرا سنبھل کر فرمائیے۔ اس فقرہ نے میر انیس کی تمام منظر نگاری اور نفسیات کی ترجمانی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب صبح کی لذت' اہلِ بیت کے حرم کا طریقِ شیون' کربلا کی سرزمین سے منتقل ہو کر شاہان اودھ کی محل سرا اور بنارس کی گنگا کے کنارے میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ساغر . جی نہیں، انیس اپنی جگہ اٹل ہے شاعر کو ہر قسم کی جائز اور مناسب خلاقی کا حق حاصل ہے لیکن انیس کی شاعرانہ خلاقی بھی کبھی ماحول کے خلاف نہیں ہوتی، شاعر کا کام دراصل جذبات پیدا کرنا ہوتا ہے انسانی روح کبھی گرم نہیں ہوتی جب تک کامل طور پر متاثر نہ ہو جائے اور ہر گز متاثر نہیں ہوسکتی جب تک اس کو شاعر کا ہم نوا نہ بنا دیا جائے۔ انیس روح انسانی کے سامنے اپنے موضوع و مقصد کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے جس میں تصویر اور خود انیس کی شاعرانہ جادوگری کارفرما ہوتی ہے، مگر مرزا دبیر موضوع کی صحیح نمائندگی پُر جوش الفاظ میں نہیں کرتے۔ موضوع کے ساز وسامان کو ہاتھ نہیں لگاتے اور اپنے دماغ سے دور از کار تشبیہات واستعارات پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نام آپ نے بلاغت اور علم بدیع رکھا ہے۔

یحییٰ . سُنئے ساغر صاحب علمِ کلام میں انیس کا مرتبہ فصاحت پر پوری قدرت رکھنے تک محدود ہے۔ تاہم دبیر جب سلیس پر آجاتا ہے تو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ بے ساختگی' سلاست اور روانی ملاحظہ ہو۔ ایک سلام میں کہتا ہے کہ ؎

خدا بھی ملا، پنجتن بھی ملے ۔۔۔ پھر اب اور بندہ کو کیا چاہیئے

ایک دوسری جگہ کہتا ہے ؎

ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا ۔۔۔ ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا ۔۔۔ آئینہ گر اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشہ کا ہُما ہو نہیں سکتا
بُت سجدہ کا فرسے خدا ہو نہیں سکتا

حقیقۃً میں نے جو ابتداء میں عرض کیا تھا اس پر آپ نے غور نہیں فرمایا۔ انیس و دبیر کا موازنہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ غالب و داغ کا مقابلہ!

ساغر (بات کاٹ کر) غالب ان دونوں میں کون ہے ؟

یحییٰ یہ خود ظاہر ہو جائیگا۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ موازنہ صحیح نہیں ہے' ظاہر ہے کہ زبان کی چاشنی دیکھنا ہو تو داغ کے ہر مصرع سے آپ لذت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن مضمون آفرینی' دقیق فکر' اور ہوس خیالات کو آپ غالب کے کلام ہی میں پاسکتے ہیں صبح سے شام تک آپ غالب کی زبان پر اعتراض کرتے رہئے لیکن داغ کو غالب کا ہم پلہ کہنے کی جرأت نہیں فرما سکتے۔ انیس روحِ انسانی کو اپنی سلاستِ منظر نگاری اور حُسن بیان کے ذریعہ مسحور کر لیتا ہے، مگر یہ اثر کچھ دیرپا نہیں ہوتا۔ مگر دبیر مرثیہ کے

مفہوم کو سمجھتے ہوئے منظر نگاری، سلاست کو مرثیہ میں اتنی ہی جگہ دیتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اسکے نزدیک اہلِ بیت کے مصائب زیادہ اہم ہیں۔ شاعرانہ مصوری اتنی اہمیت نہیں رکھتی، محاورات نگاری اور زبان کی صحت دبیر کا حصہ ہے۔ عبدالغفور نساخ نے انیس کے کلام میں محاورات کی جو غلطیاں ثابت کی ہیں وہ آپ نے پڑھی ہیں۔ مرثیہ کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں دبیر کی بلند خیالی پر کبھی آپ نے توجہ نہیں کی۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے، تصوف کے میدان میں بھی جو فارسی و اردو شعراء کی جولانگاہ رہا ہے اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ میر انیس کہتے ہیں کہ ؎

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و صحرا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دبیر کہتے ہیں ؎

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

آپ نے دیکھا انیس کا عجز، مقامِ حیرت میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے دبیر کی سرمستی اور عرفان اسکی رباعی کے حرف حرف سے ٹپک رہا ہے مقصد یہ ہے کہ دبیر فصاحت اور موسیقی ہی پر زور نہیں دیتا، وہ مقصد اور مدعا کو بلاغت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور یہی اس کے کلام کی خوبی ہے۔

ساغر میں جانتا ہوں یہ ہرگز کلام کی خوبی نہیں، سرمستی دوسری بات ہے مگر عرفان کا کس کو دعویٰ ہو سکتا ہے 'جلوہ' کہکر حیرت نہ کہنا شعریت کے قطعی منافی ہے۔ جلوہ اگر حیرت نہ پیدا کرے تو جلوہ کہاں رہا۔ انیس اس ربطِ معنوی کو اپنی رباعی میں پیشِ نظر رکھتا ہے مگر دبیر کی فکرِ بلیغ بے حسوں کی طرح گذر جاتی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ ہر صنفِ کلام پر انیس یکساں قادر ہے۔ رباعی، مرثیہ، غزل، رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ اور سلام میں اسکی زبان کی سادگی، سلاست، فصاحت، سوز و جوش، مصوری، روزمرہ اور خاص طور پر محاورات غرضکہ اس کی جملہ خصوصیات کا ثبات مستقل طور پر قائم رہتا ہے۔ افسوس وقت نہیں ورنہ نساخ کے رسالے اور اعتراض کا مفصل ذکر کرتا مگر واقعہ یہ ہے کہ انیس الفاظ و تخیل، بیان و معانی، جذبات و محسوسات، ہر نقدِ سخن کا گوہر شناس جوہری ہے۔ آپ کہتے ہیں شاعرانہ مصوری، انیس کے کلام میں مرثیہ کی اہمیت کو کم کر دیتی ہے، کیا خوب، تو پھر شاعری ہی کی کیا ضرورت ہے، فنِ خطابت کے جملہ محاسن اور آرٹ کے تمام شعبے فنا کر دینے چاہئیں۔ غالب و داغ سے انیس و دبیر کی مثال آپ نے خوب پیش کی، مرزا داغ کا تو ذکر ہی کیا ایک بلند مرتبہ آرٹسٹ کی حیثیت میں غالب بھی انیس کے ساتھ نہیں بٹھائے جا سکتے، وہ اپنی مملکتِ ادب کا بلا شرکتِ غیرے آزاد بادشاہ ہے، یحییٰ صاحب اس کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور قیامت تک بولتا رہے گا۔ بہت ممکن ہے اس کے موضوع میں کشش نہ رہے مگر اس کا آرٹ فنا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اسکے آرٹ کے ترکیبی اجزاء و عناصر معیار و صحت پر مبنی ہیں۔

یحییٰ مگر دبیر بھی زندہ رہے گا۔

ساغر اس کی خبر آپ کو ہوگی۔ مگر مرزا دبیر کو انکی جگہ میں ایک بڑا شاعر ضرور مانتا ہوں۔

کار سازیاں

بربطِ اشک پر اُنہیں نغمۂ غم سُنا دیا　　جو نہ زباں سے گا سکے اسکو نظر سے گا دیا

پھر تو کہو کہ کیا تجھے ہم نے یہ کم صلہ دیا　　پیکرِ کیف کر دیا، صاحبِ غم بنا دیا

اُس نے جو زعمِ حسن میں رُخ سے نقاب اُٹھا دیا　　ہم نے بھی شوقِ دید میں دل کو نظر بنا دیا

پھول نے صبحدم بہت درسِ غمِ فنا دیا　　کیفِ شگفت نے مگر کلیوں کو گدگدا دیا

سنگ کو بُت کی شکل دی صنعتِ بُت تراش نے　　میں نے مگر تراش کر بُت کو خدا بنا دیا

یادِ غریب جرم تھی کفر تھی دینِ حسن میں
اب میں یہ کیوں صفائیاں خوب کیا بھلا دیا

ساغر

مشرقی کتب خانہ، بانکی پور پٹنہ
اور
اسکے چند لوازمات

(مختار الدین احمد آرزو فاضل شمسی)

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ شاہانِ مغلیہ کو علم و ادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ، اور قرطبہ کے حکمرانوں کی طرح عظمت و شہرت حاصل نہیں ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو انہوں نے علماء کی ہمت افزائی میں نمایاں حصہ لیا، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علماء اسی مغلیہ دورِ حکومت میں آسمانِ علم پر مہرِ درخشاں ہو کر چمکے اور مغل تاجداروں کی فیاضیوں سے مالامال ہوئے، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی، بانیٔ سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اسکے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، ہمایوں بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علماء کی قدر افزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگرچہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اسکی علم پروری دیکھنا ہو تو آئین اکبری کے آخری ابواب پڑھو، جہانگیر اپنے توزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف و زلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا، صرف اسی ایک واقعہ سے تم اسکی علمی قدر دانی کا اندازہ کرو، کتب خانۂ مشرق، نیز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہدِ طفولیت ہی سے بادۂ علم میں سرشار تھا، اورنگ زیب عالمگیر خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا۔ اسکے رقعات میں علمی قدر دانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہانِ مغلیہ کی نوازش و کرم گستری سے دہلی علم و ہنر کا مرکز بن گئی تھی۔ دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں خطاطی و مصوری کے بہترین نمونے تیار کئے گئے اور چونکہ ان دنوں وسط ایشیا و ایران اور عرب میں طوائف الملوکی اور خونریز لڑائیاں غیر منتہی سلسلہ قائم کئے ہوئے تھیں اس لئے وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی منتقل ہو گئے۔ پھر دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست و نابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہو گئے امراء و اہالیانِ منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہو کر شہنشاہی کتب خانہ سے ضم ہو جاتے تھے۔ چنانچہ دربار اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے وفات پائی تو ان کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہو گئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت و ندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا، اٹھارویں

صدی میں نوابانِ اودھ نے بھی قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی، ریزیڈنٹ کی ایما سے شہور جرمن مستشرق مسٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کے اُردو اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کتب خانوں کے علاوہ اطراف و اکناف ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور غدر کی ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانو کے تمام قابلِ ذکر علمی خزانے غارتگروں کے دستِ تظلم سے تباہ برباد ہو گئے۔

غدر کے موقعہ پر نواب رامپور نے انگریزوں کا ساتھ دیا اس لئے لوٹ کا ایک معتد بہ حصہ انہیں دستیاب ہوا۔ انہوں نے انگریزی فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دےگا اسے ہر قلمی نسخہ کے معاوضہ میں ایک روپیہ ملیگا۔

بہرکیف یہ تو سلف کی باتیں تھیں لیکن خلف میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوئے جن سے سلف کی یاد تازہ تھی۔

بہار کے ایک شہر چھپرہ میں ایک وکیل محمد بخش تھے جنہیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا اور اس شوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مرتے وقت حالتِ نزع میں بھی کتابیں ہی ان کے پیشِ نظر رہیں۔ اپنے لائق فرزند خدابخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کتب خانہ کو ترقی دیکر رفاہ عام کے لئے وقف کر دیا جائے۔

خدابخش مرحوم ۲ راگست ۱۸۴۲ء میں چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں کلکتہ تعلیم کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کی سرٹیفکٹ حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنیکے بعد ڈسٹرکٹ جج کے پیشکار ہوئے لیکن کسی مجبوری سے اسے چھوڑنا پڑا۔ اسکے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے لیکن آخر اس سے بھی الگ ہونا پڑا۔ آخرکار ۱۸۶۶ء میں وکالت شروع کی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ ملا۔ ۱۸۹۱ء میں مشرقی کتب خانہ کی بنیاد ڈالی اور ۲۹ راکتوبر کو پورا کتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامہ کی رو سے حکومتِ وقت کی سرپرستی میں قوم و ملک ۸۳ کے حوالہ کر دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں نظام حیدرآباد میں چیف جسٹس مقرر ہوئے اور تین برس کی مدت ختم ہو جانیکے بعد ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے پٹنہ آکر پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۰۳ء میں سی آئی آئی کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دو سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر کتب خانہ کی نظامت تفویض ہوئی۔ لیکن افسوس کہ کتب خانہ کے ناظم کی حیثیت سے ابھی پانچ ہی سال رہے تھے کہ ۳ راگست ۱۹۰۸ء کی ایک بجے شب کو ۶۶ برس کی عمر میں پٹنہ میں انتقال کر گئے۔ لائبریری کی دونوں عمارتوں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی حسبِ وصیت وہیں دفن کئے گئے۔

کتابوں کے جمع کرنے میں کہا جاتا ہے کہ خدابخش مرحوم کو فرشتوں سے بڑی مدد ملی، یہ فسانہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کتب خانہ کو محمد مکی (عرب) سے بڑی مدد ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خدابخش مرحوم نے انہیں پچاس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا تھا، انہوں نے عرب، شام، مصر، ایران کی نادر نادر قلمی کتابوں کا کافی ذخیرہ لاکر ڈھیر کر دیا۔ اور خود خدابخش مرحوم نے دورانِ قیام حیدرآباد میں اپنے کتب خانہ کیلئے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت بھی خدابخش مرحوم کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کتب خانہ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کر کے کتب خانہ کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انہیں لاہور لیجا کر ایک کتب فروش کے حوالہ کیا۔ مؤخر الذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کر کے خدابخش خاں سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدرداں، اور کون ہو سکتا ہے انہیں کے پاس بغرض فروخت پیش کیا۔ اس طرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدائی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنو۔ ایک مرتبہ پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے، ایل، الیٹ نے محمد بخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا، صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اس کو واپس دینے کے بجائے ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے محمد بخش مرحوم نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے، صبر کر کے خاموش ہو رہے۔ مسٹر الیٹ مخطوطات کے

جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے انہوں نے "بوڈلین لائبریری" میں بہت سی کتابیں دیں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر پٹنہ سے جانے لگے تو انہوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لیجانے کے لئے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کرا کے ہدایت کی کہ انہیں اسی طرح سربمہر نیلام کر دیا جائے مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردّی کتابوں کا صندوق الیٹ صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتا ہے، محمد بخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اسمیں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سی نادر و نایاب جوہر گراں مایہ پاتے ہیں۔ چنانچہ "مجالس خمسہ" کا وہ نسخہ جسپر شاہ جہاں کے دستخط ہیں اسی میں ملتا ہے۔ خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً از راہ تشکر سر بسجود ہو جاتے ہیں، دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہنچ کر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں تو فرطِ غم سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔

ایک دن خدا بخش مرحوم حیدر آباد میں ہائی کورٹ سے واپس آرہے تھے مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دکانوں پر ادھر اُدھر پڑ رہی تھیں، ایک دکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا فوراً گاڑی رکوا کر اتر پڑے۔ اس کوڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور دکاندار سے قیمت دریافت کی اس نے کہا حضور! اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھ کر اس کو تین روپے میں دیدیتا مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہے تو اس میں یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لونگا۔ پورا انبار خرید کر ساتھ لائے، اس میں چند نہایت نادر و نایاب کتابیں نکلیں۔ بعد کو صرف ایک کتاب کیلئے نظام حیدر آباد کی طرف سے چار سو روپیہ پیش کئے گئے مگر انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح "برٹش میوزیم" کسی کتاب کی ایک گراں قدر رقم دے رہی تھی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں اپنے لالچ کا شکار ہو کر اپنے والد کی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتا۔

خدا بخش مرحوم کو کتب خانہ سے جو انہماک تھا اس کے بیان کیلئے تو ایک دفتر چاہئے لیکن اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وفات سے دو دن پہلے جبکہ مرض نہایت شدت پر تھا اور ہواس خمسہ جواب دے رہے تھے انہوں نے صحیح طور پر بتا دیا کہ سنن ابو داؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانہ میں فلاں کتاب کے بعد ہے۔

کتابوں کی تعداد محمد بخش مرحوم کے انتقال کے وقت پندرہ سو تھی۔ بارہ سو (۱۲۰۰) محمد بخش مرحوم کی حاصل کردہ تھیں اور تین سو انہیں وراثت میں ملی تھیں۔ خدا بخش مرحوم نے ترقی دیکر پانچہزار تک پہنچا دیا۔

تفصیل حسب ذیل ہے: —

نسخ خط عربی	۲۹۵۱
نسخ خط فارسی	۲۵۰۰ (تقریباً)
نسخ خط اردو	۵۶
نسخ خط ترکی	۱۵

مجموعہ پانچہزار پانچ سو بائیس (۵۵۲۲)

۱۸۹۱ء میں جبکہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھی، سر الفریڈ کرافٹ ([illegible]) کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اسکی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کیا تھا، قلمی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتد بہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا ہے جس کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

لیکن یہ اعداد و شمار خدا بخش مرحوم کی وفات کے وقت کی تھی مگر اب اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت

کے مطابق ان کی سات ہزار تین سو (۷۳۰۰) کتابیں بھی اس کتب خانہ میں منتقل ہوگئی ہیں اور اس طرح عربی فارسی اُردو اور انگریزی مطبوعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، سر دست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) ہے۔

مشرقی کتب خانہ (بانکی پور) کی کتابوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ اگر دُنیا کے دوسرے اہم کتب خانوں کے اعداد و شمار بھی لکھ دوں تو مناسب ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس	۲۹۸۸
موزیۂ برطانیہ لندن	۲۹۶۱
کتب خانہ بودلین	۲۰۲۰
کتب خانہ برلن	۱۰۹۸
کتب خانہ پارس	۱۱۶۰
کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن	۳۰۵۲

نقشۂ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں ان تمام کتب خانوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اب میں قارئینِ "ایشیا" کی ضیافت طبع کیلئے چند اہم اور نادر کتابوں کا ذکر کرتا ہوں امید کہ یہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

اس کتب خانہ میں عربی کتابوں کا بہت ہی کافی ذخیرہ ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ان کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے "مشتے نمونہ از خروارے" چند عربی کتابوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن شریف ۔ اس کتب خانہ میں قرآن پاک کے کئی قیمتی نسخے موجود ہیں، ایک حمائل خط کوفی میں لکھا ہوا ہے خیال کیا جاتا
۵ ہے چوتھی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، اعراب کیلئے سرخ نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔

ایک قرآن شریف جمال الدین یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قرآن خطاطی کا بہترین نمونہ ہے یہ ۶۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک مصحف میر علی تبریزی کا لکھا ہوا ہے، اس نسخہ کی خطاطی، طلاکاری، منقش حواشی اور زرنگار بین السطور کو دیکھ کر زمنہ ماضیہ کی صناعی پر انسان محو حیرت ہوتا ہے۔

ایک مصحف عبدالباقی حداد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عبدالباقی فنِ خطاطی میں یگانۂ روزگار تھے شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور یہیں انہیں "یاقوت رقم" کا خطاب ملا۔ اس مصحف کے علاوہ اور مصاحف اور پنجسورے اس کتب خانہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

"تفسیر" فنِ تفسیر میں بھی بیشمار قیمتی ذخیرے موجود ہیں جار اللہ زمخشری کی مشہور آفاق تصنیف "کشاف" کا ایک قلمی نسخہ ہے جو سلطان شاہ رخ کے کتب خانہ کیلئے لکھا گیا تھا، ابوبکر محمد بن احمد سمرقندی کی شرح التاویلات بھی یہاں موجود ہے۔ سیوطی کی اتقان کا بھی ایک نسخہ ان کے شاگرد محمد بن علی الداؤدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

"حدیث شریف" فنِ حدیث میں خطیب بغدادی کی الکفایۃ کا وہ قیمتی نسخہ ہے جس میں شاہزادہ ابوالعباس احمد نے درس لیا ہے "کتاب المشیخۃ" دُنیا میں اس کا کوئی نسخہ نہیں لیکن یہاں اس کا نہایت قدیم اور مکمل نسخہ موجود ہے۔

متعلقات حدیث میں ایک نادر کتاب بہت زیادہ قابل ذکر ہے، اس کا نام کتاب الاغتباط بمن رمی بالاختلاط ہے اسکے مصنف امام برہان الدین ابراہیم ابن محمد سبط ابن العجمی الحلبی ہیں۔ یہ چھوٹا سا اک مختصر رسالہ ہے جس میں آن ۴۰۱ راویوں کا بیان ہے جن سے اختلاط ثابت ہے۔ کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

"وصلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ وسلم الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین علی سیدنا محمد و خاتم النبیین الخ"

اور خاتمہ ان سطروں پہ ہے :-

"قالہ جامعۃ ابراهیم بن محمد بن صهبل سبط بن العجمی الحلبی عفا اللہ عنہ"

اس کتاب کے دنیا بھر میں صرف دو تین نسخے ہیں ایک کتب خانہ برلن (جرمنی) میں۔ دوسرا کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں تیسرا نسخہ ملک العلماء فاضل بہار حضرت مولانا ظفر الدین صاحب قادری مصنف "صحیح البہاری"⁵ کے ذاتی کتب خانہ میں ہے، یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ ہر صفحہ میں ۷ اسطریں ہیں کتابت ایک حد تک خوشخط ہے۔ کاتب کا نام "مختار الدین الخطاط" ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت نادر اور قیمتی کتابیں ہیں جن کی تفصیل کیلئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے ذیل میں چند ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں مصنفین نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

"شرح خصوص الحکم" یہ عبدالرحمن جامی متوفی ۸۹۸ھ کی مشہور تصنیف ہے اسے مصنف نے خود اپنے ہاتھ سے ۸۹۶ھ میں لکھا تھا۔ "جوامع الکلم" اسکے مصنف علی المتقی ہیں۔ یہ انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

"مواہب اللدنیہ" اگرچہ تمام شائع ہو چکی ہے لیکن یہاں اس کا وہ نسخہ ہے جو مؤلف نے ۸۹۸ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

"مختصر النہایۃ" علامہ ابن ابی عصران کی مشہور تصنیف انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

مغلطائی کی شرح ابن ماجہ مصنف کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح احمد بن علی الحنبل کی الاربعین بھی مؤلف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

اس مضمون میں بڑی کمی رہ جائیگی اگر میں تصوف کی ایک کتاب "کتاب فی التصوف" کا ذکر نہ کروں، یہ کتاب اس کتب خانہ کی قلمی کتابوں میں سب سے قدیم کتاب ہے۔ ۸۶

عربی کتابوں کے علاوہ فارسی مخطوطات کا بھی کافی ذخیرہ ہے چند اہم مخطوطات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

"دیوان مرزا کامراں" یہ شہنشاہ ہمایوں کے بھائی شاہزادہ کامراں کا دیوان ہے۔ کامراں کو شعر و شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں کہتا تھا۔ چنانچہ اس دیوان میں دونوں زبان کے اشعار موجود ہیں دیوان میں غزل قطعہ رباعی مثنوی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں ہے۔ شروع میں الف کی ردیف میں چھ غزلیں ہیں پہلی چار فارسی میں اور دو آخری ترکی میں۔ ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے

چوں بمقصود نشد ہیچ کسے رہبر ما | بعد ازیں خاک در پیر مغاں در ما
کار ما چوں زدر بستہ زاہد نکشود | بو کہ زیں پس ز خرابات کشائند در ما

---

⁵ جب پورے مضمون میں کتابوں ہی کا تذکرہ ہے تو میں ایک اور قیمتی اور قابل قدر کتاب کا تذکرہ کیوں نہ کر دوں۔

کتاب کا نام "صحیح البہاری" ہے اور اسکے مصنف ہندوستان کے مشہور فاضل اور ریاضی و ہیئت کے ماہر حضرت مولانا ظفر الدین صاحب قادری ہیں اصل یہ ہے کہ عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جس قدر احادیث مذہب احناف کی مؤید ہیں تمام کتابوں سے ان سب کو انتخاب کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے اور مناسب ترتیب و تبویب کے ساتھ کتابی شکل میں ان کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے جس سے اس غلط پروپگنڈہ کا ازالہ ہو سکے جو بعض لوگوں نے پھیلا رکھا ہے کہ امام صاحب کو صرف ۱۷ حدیثیں یاد تھیں اور فقہ حنفی کا دارومدار ذاتی رائے اور قیاس محض پر ہے۔ اس کتاب کی ۲۴ جلدیں ہیں جنمیں طہارت و صلاۃ کی احادیث کی چار جلدیں بانکی پور سے اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ (مختار الدین آرزو)

بارگی مست و شب تیرہ و رہزن کمیں   ولے اگر بادی لطفت شود رہبر ما

ایک فارسی ہی کا مقطع ہے ؎

غمت را کامراں در دل نہفتہ
کہ باشد گنج را ویرانہ منزل

اب چند ترکی شعر بھی سُن لیجئے ؎

قیلیب چہر نگدار و جہ الشل منظور   عیاں بولدی منکا نورٌ علےٰ نور

فروغ چہر تنگ ایردر صبح اک جہاں افروز   طلوع حسنونگ ایردر آفتاب عالم سوز

لالہ وگل رونقے حسن جمالنگ چہ بوق   سرو صنوبر نقی تازہ نہالینگ چہ بوق

آخر میں ایک فارسی کا ساقی نامہ بھی ہے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بیا ساقی آں مے کہ جاں پرور است   کہ جانِ حزیں مراد رخور است
بمن دہ کہ دوراں بکینِ منست   پےٴ قصد جانِ حزین من است

دیوان کا خاتمہ ان سطور پر ہے :۔

"تمت دیوان حضرت الاعلیٰ حفظہ اللہ تعالیٰ عن الآفات والبلا؎ یا علی یا عبد الضعیف محمود بن اسحٰق
۸۷ الشہابی الھروی علیٰ طریق الاستعجال"

کتاب کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:۔

"اللہ اکبر"

"دیوانِ مرزا کامراں کہ عم پدر بزرگوار من است بخط محمود بن اسحٰق شہابی حررہٗ
نورالدین محمد جہانگیر شاہ سنہ ۲ جلوس موافق سنہ ۱۰۲۴ھ"

جہانگیر کی تحریر کے دائیں طرف شاہ جہاں کی یہ تحریر ہے :۔

"الحمد للہ الذی انزل علےٰ عبدہ الکتاب ۔ حررہ شاہ جہاں ابن جہانگیر شاہ"

اس نسخہ کا کاتب خواجہ محمود اسحٰق شہابی ہے جس کا درجہ میر علی کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب خوبصورت نستعلیق میں لکھی گئی ہے اور سُنہرے پانی سے مزین کی گئی ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں سائز ۹¾ × ۶ و ۷½ × ۴½ ہے۔

مشرقی کتب خانہ پٹنہ کی فہرست میں اس کتاب کا فارسی نمبر ۷۰۴ اور انگریزی نمبر ۲۳۷ ہے۔ یہ دیوان اس کتب خانہ کے علاوہ دُنیا میں کہیں نہیں،

اقبال نامۂ جہانگیری، مصنف کا نام محمد شریف المخاطب بمعتمد خاں ہے کتاب کے نام سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ مصنف نے

؎ "حفظہ اللہ تعالیٰ" سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کی کتابت کے وقت شاہزادہ کامراں بقید حیات تھا ۱۲ (مختارالدین آرزو)

اس میں صرف جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکبر و جہانگیر دونوں کی حالت بسط کے ساتھ موجود ہے، ہاں کتاب کا نام اقبال نامۂ جہانگیری لکھنے کی وجہ مصنف کے زبان قلم سے سُنئے: -

"چوں ایں تالیف بنام نامی آں حضرت زیب دفتر یافتہ بہ اقبال نامۂ جہانگیری موسوم گشت" دیباچہ ص۳

اس کتاب کی تین جلدیں ہیں پہلی جلد میں اکبر کے آباؤ اجداد کی تاریخ ہے جو اکبر نامہ سے کچھ تصرف کرکے لکھی گئی ہے۔ اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے "طلوع کوکب جہان افروز یعنی ولادت باسعادت حضرت خاقان" دوسری جلد میں اکبر کے آغاز جلوس سے سنہ وفات تک کے حالات درج ہیں اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے "سلسلۂ انتظام کارگاہ آفرینش کہ مظاہر حقیقت نمائی" الخ تیسری جلد میں جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ ہے اور یہ یوں شروع ہوتا ہے "شائستہ سریر سلطنت و فرمان روائی و زیبندہ افسر" الخ

اقبال نامہ کی تینوں جلدوں میں سے جلد سوئم جس کا تعلق جہانگیر کے ایام حکومت سے ہے عام طور پر ملتی ہے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں اسکے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں لیکن اقبال نامہ کی پہلی اور دوسری جلد بے حد نادر اور کمیاب ہے۔ ریو نے پہلی جلد اقبال نامہ کو بہت کمیاب لکھا ہے، پروفیسر بینی پرشاد نے بھی اپنی کتاب (History of Jahangeer) میں پہلی دو جلدوں کی کمیابی کی تصریح کی ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر کیٹیلاگر مشرقی کتب خانہ پٹنہ نے بھی لکھا ہے کہ اسکی پہلی دو جلدیں بہت کمیاب ہیں۔

بوڈلین، کیمبرج، اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں صرف جلد سوئم کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں اقبال نامہ کا ایک مکمل نسخہ موجود ہے، جس کا نمبر ۱۰۹ ہے۔

اقبال نامہ جلد اول و دوم کے کئی نسخے دُنیا میں اور بھی ہیں[1] لیکن مشرقی کتب خانہ کے نسخہ کو اس بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ تقریباً سبھوں میں سب سے زیادہ صحیح لکھا ہوا ہے۔

اقبال نامۂ جہانگیری کے سال کتابت کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ بعض مخطوطے ایسے ہیں جن پر سرے سے سنہ کتابت ہی درج نہیں، جس پر ہے بھی تو وہ اتنا مبہم ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

"انڈیا آفس" میں بھی جلد اول و دوم کے مکمل نسخے پر سنہ ہجری یا عیسوی درج نہیں بلکہ دس ربیع الاول ۱۹ سال جلوس رقم ہے اس سے "ایتھے" نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ غالباً جلوس عالمگیری ہوگا، اس حساب سے سنہ کتابت ۱۰۸۰ھ قرار پاتا ہے مگر ممکن ہے کہ سنہ جلوس محمد شاہ یا شاہ عالمگیر ثانی کا ہو جنہوں نے ۱۹ سال سے زیادہ حکمرانی کی ہے۔ اس بنا پر ۱۰۸۰ھ یقینی طور پر سنہ کتابت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انڈیا آفس کی جلد دوئم پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے[2]۔

مشرقی کتب خانہ بانکی پور کے مکمل نسخہ پر بھی سنہ کتابت درج نہیں، اس کتب خانہ میں جلد اول کا بھی ایک مکمل نسخہ ہے لیکن افسوس کہ سال کتابت اس پر بھی درج نہیں ہے[3]۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڈھ لائبریری میں اقبال نامہ کے بعض نسخے ہیں جن پر سال کتابت ۱۱۰۲ھ مطابق ۳۵ سنہ جلوس عالمگیری لکھا ہے۔

---

[1] اس کا ایک مکمل نسخہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں بھی ہے۔ یہ نسخہ خوشخط فارسی جلی قلم سے لکھا گیا ہے، عنوان مطلا و لاجوردی اول سے آخر تک تمام اوراق سنہری جدولوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ابتدائی ورق تو بالکل مطلا ہیں ہر ہر سطر کو سونے سے معمور کیا گیا ہے اسکی تذہیب و آرائش شاہانہ اور عظیم القدر ہے اس نسخہ کی ایک خاص چیز جو دوسرے نسخوں میں نہیں پائی جاتی شجرہ سلاطین مغلیہ ہے۔ جو قبل آغاز کتاب لکھا ہوا ہے ہر ایک زریں حلقے میں ہے حاشیہ کے نام بھی حلقہ زریں میں تحریر کئے گئے ہیں۔ (مختار الدین آرزو)

[2] فہرست انڈیا آفس لائبریری کالم ۱۲۱ تا ۱۲۳۔ [3] ریو جلد سوم صفحہ ۹۲۲ تا ۹۲۳

مشرقی کتب خانہ کا مکمل مخطوطہ جس کا نمبر ۱۰۹ ہے اس کتاب کے پہلے صفحہ پر جسے ٹائٹل پیج سمجھئے اس پر چند اصحاب کے دستخط ہیں ایک جگہ لکھا ہوا ہے "مالک این کتاب مرزا امداد علی" دوسری جگہ ذرا ہٹکر لکھا ہوا ہے "سید ولایت علی خاں" دوسرے صفحہ پر سید خورشید علی صاحب کے دستخط ہیں۔ دستخط کے اوپر لکھا ہوا ہے "وقف عوام" کتاب کی ابتدا میں خورشید علی اور ولایت علی دونوں صاحبوں کی مہریں بھی ہیں۔ بسم اللہ کے بعد یہ عبارت ہے:۔

"منتہائے حمد ما منتہا خدا یا بے ہمتا کہ مارا خلعتِ وجود کرامت فرمود، در عہد بادشاہ عادل کامل حکیم کریم کہ روزگار را و عروسی را ماند آراستہ و چار چمن ملک ہوشیار عدالت او پیراستہ، و درود نا محدود بر سپہ سالارِ جہان ہستی کہ مارا از پستی جہالت بفراز ایمان بر آورد و سلام و اخلاص بر آل و اصحاب و اجمعین"۔

صفحات کی تعداد ۶۸۰ ہے کتاب معمولی نستعلیق میں لکھی گئی ہے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کئی کاتبوں نے مل کر لکھی ہے اس لئے کہ حروف میں جا بجا بہت فرق نظر آتا ہے۔

"کلیات جامی"۔ مشرقی کتب خانہ میں کلیات جامی کا جو نسخہ ہے اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی پہلی جلد خود مؤلف (جامیؒ) کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ اسکی دوسری جلد سینٹ پیٹرسبرگ کے کتب خانہ میں تھی معلوم نہیں جنگ عظیم کے بعد اسکا کیا حشر ہوا۔

اس کتاب کی دو ضخیم جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۹ رسالوں کا مجموعہ ہے۔ (۱) سلسلۃ الذہب (۲) سلامان و ابسال (۳) تحفۃ الاحرار۔ (۴) لیلیٰ مجنوں۔ (۵) خردنامہ اسکندری۔ (۶) دیوان اوّل (۷) دیوان دوم۔ (۸) دیوان سوم (۹) معمائے کبیر (۱۰) معمائے متوسط۔ (۱۱) معمائے صغیر۔ (۱۲) معمائے تصغیر۔ (۱۳) رسالہ عروض (۱۴) رسالہ قافیہ۔ (۱۵) بہارستان۔ (۱۶) رسالہ منشیات۔ (۱۷) سبحۃ الابرار۔ (۱۸) رسالہ موسیقی۔ (۱۹) یوسف و زلیخا۔

۸۹

دوسری جلد میں ۱۸ رسالے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) فاتحۃ الباب۔ (۲) چہل حدیث۔ (۳) مسالک الحج۔ (۴) شواہد النبوۃ۔ (۵) نفحات الانس۔ (۶) لمعات۔ (۷) شرح قصیدہ میمیہ خمریہ۔ (۸) شرح رباعیات۔ (۹) لوائح۔ (۱۰) شرح مبین، مثنوی۔ (۱۱) شرح بیت امیر خسرو۔ (۱۲) شرح حدیث۔ (۱۳) رسالہ ہدایۃ النہایۃ۔ (۱۴) رسالہ طریق توجہ۔ (۱۵) رسالہ وجودیہ۔ (۱۶) رسالہ شرح کافیہ۔ (۱۷) رسالہ صرف۔

پہلی جلد میں زیادہ تر نظمیں ہیں، تعداد صفحات ۹۸۴ ہے۔ اسکی کتابت بہت پاکیزہ ہے۔ دوسری جلد میں ۷۹۶ صفحات ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق غائب معلوم ہوتے ہیں۔ جس صفحہ سے کوئی رسالہ شروع ہوتا ہے وہ مزین و مذہب ہوتا ہے۔

کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

"حمد الرب جلیل من عبد ذلیل، وسلاما علی حبیب فائق من محب صادق وعلی صحبہ و آلہ المہتدین"۔

عـــــہ عبدالغفور صاحب ایم۔ اے ایس سی علیگ معارف ج میں فرماتے ہیں:۔ جلد اوّل در ذکر اجداد خاقان گیتی ستاں ص۳ سے ص۱۲۴ تک۔ جلد دوم ۱۲۵ سے ۵۱۰ تک۔ اور جلد سوم ۵۱۱ سے ۶۱۸ تک چھپی ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ ان فاضل علمائے تاریخ پروفیسر راس، ریو، بینی پرشاد نے کیوں اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ راس صاحب نے تو فہرست مشرقی کتب خانہ میں یہ جملہ ایزاد بھی کیا ہے کہ جلد سوم عام طور سے ملتی ہے اور یہ لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء میں چھپ چکی ہے فاضل مستشرق کا اشارہ نولکشور پریس کے مطبوعہ نسخہ کی طرف ہے مگر یہ محض جلد سوم ہی نہیں بلکہ تینوں جلدوں کا مکمل مطبوعہ نسخہ ہے ۱۲ (مختار الدین احمد)

سلسلۃ الذہب کی ابتدا یوں ہے :۔

الحمد للہ قبل کل کلام
بصفات الجلال و الاکرام

پہلی جلد ان سطور پر ختم ہوتی ہے :۔

"واللہ سبحانہ ملہم الصواب ومنہ المبداء والیہ المآب وتیسیر بذالک
الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد وعلی آلہ واصحابہ"

کلیات کے علاوہ جامی رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان بھی اکثر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ دیوان جامیؒ کا ایک نادر قلمی[1] نسخہ لافیٹ کالج پنسلونیا (امریکہ) کے کتب خانہ میں بھی محفوظ ہے۔ یہ دیوان جامی کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جامی کی ولادت جام (خراسان) میں ۷ رنومبر ۱۴۱۴ء کو ہوئی تھی اور وفات ہرات کے مقام میں ۹ رنومبر ۱۴۹۲ء کو پیش آئی، یہ نسخہ وفات کے صرف بتیس سال بعد لکھا گیا اور اسے اس زمانہ کے دو مشہور ماہر فن نے تیار کیا یعنی مشہدی خوشنویس اور محمود مذہب طلاکار۔

اس دیوان میں قصیدے، غزلیں اور رباعیاں ہیں صفحات کی تعداد ۱۵۳ ہے، چار تصویریں بھی ہیں، پہلی تصویر میں جامی ایک فلسفی سے باتیں کر رہے ہیں۔ زاویہ میں مصوّر کا دستخط اور یہ عبارت ہے :۔ "اسے محمود مذہب نے بنایا" دوسری تصویر میں ملازمین باغ میں ایک دعوت کا سامان کر رہے ہیں اور ایک فقیر بچّہ کو لئے ہوئے ان کو دیکھ رہا ہے۔ تیسری تصویر میں ایران کا سلطان حسین بایقرا اپنے درباریوں اور بعض علماء کے حلقہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ چوتھی تصویر میں ایک اُستاد اپنے شاگردوں کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ تحریر ہے :۔

"اس مخطوط کو سلطان علی مشہدی نے بمقام ہرات ۹۲۱ھ مطابق ۱۵۱۵ء میں ختم کیا"

یہ مخطوط اوّل بابر کیلئے تیار کیا گیا تھا اسکی وفات کے بعد اسکے جانشینوں کے شاہی کتب خانہ میں رہا۔ اس پر جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب کے دستخط ثبت ہیں۔ پھر ایک عطیۂ شاہی کی حیثیت سے بعض صوبوں کے حکمرانوں کے پاس رہا اور ان میں سے ایک کے کتب خانہ میں ۱۸۵۷ء تک محفوظ رہا اس وقت دوسرے سامانوں کے ساتھ یہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ اور جیمس اسکاٹ (James Long Scott) نام ایک امریکن مشنری نے اس کو نیلام میں خرید لیا اور لافیٹ کالج میں یہ نسخہ اسی کا عطیہ ہے۔

"یوسف و زلیخا" جامی کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ ۹۳۰ھ کا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اسکی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے ہیں، خان خاناں عبدالرحیم نے اس کو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی اسکی قیمت ایک ہزار سنہری سکے تھی۔

اس کتاب کا دوسرا نسخہ مورخہ ۱۰۱۸ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو شاہ عباس بادشاہ ایران کے زمانہ میں کافی مشہور ہو چکا ہے، اس نسخہ کی تکمیل کے سات سال بعد وہ ۱۰۲۵ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اس نسخہ کی اعلی خطاطی مصوّری اور مطلا اور مذہب نقاشی دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔

"تاریخ خاندان تیموریہ" مصنف کا نام صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب اکبر اعظم کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تیمور سے اکبر اعظم کی حکومت کے اُنیسویں سال تک کے واقعات مندرج ہیں، تاریخی حیثیت سے تو شاید نہیں لیکن آرٹ کے لحاظ سے اس کتاب کا پایہ بہت بلند ہے۔ پوری کتاب میں ۱۱۷ تصویریں ہیں اور ہر تصویر میں مصوّر نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ جس میں تیرہ تو آگرے کے دربار کے مصوّرین میں اور بقیہ دوسرے۔ ان تصویروں میں بساؤں اور مسکین تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

[1] معارف ۰ جون ۳۵ء

ابتدائے کتاب میں شاہجہاں کے ہاتھ کی ایک تحریر اور کئی مہریں بھی ہیں، اسی کے ایک گوشہ میں "وارن ہیسٹنگس" کے زمانہ کے مشہور مورخ فرانسیسی گلیڈوین   کی دستخط ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے قبضہ میں بھی یہ کتاب رہی ہے، اسی صفحہ پر ایک اور مختصر سی تحریر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔

"شہنشاہ نامہ" اس کا مصنف حسینی ہے۔ یہ ترکوں کی تاریخ میں سولہویں صدی میں لکھی گئی، یہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے، یہ نسخہ سلطان محمد ثالث کیلئے مصنف نے خود مرتب کیا، سلطان کے نام سے معنون کیا اور شاہی کتب خانہ میں داخل رہا، کچھ عرصہ تک قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانہ میں رہنے کے بعد شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پہنچا، اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔ اس کا پہلا صفحہ دستخط اور مہروں سے بھرا پڑا ہے، سب میں نایاب دستخط ممتاز محل کی لاڈلی بیٹی جہاں آرا کے ہیں۔ اس نسخہ کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل جداگانہ ہیں ان میں بازنطینی اثر نمایاں ہے۔ شہنشاہ نامہ مشرقی کتب خانہ کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

"دیوان حافظ" اس کتب خانہ میں دیوان حافظ کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ مشہور نسخہ ہے جسے ہمایوں جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں نے بارہا فال کھولنے کے لئے استعمال کیا ہے اور جابجا حاشیہ پر حسب حال اشعار کو اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا ہے ابتدائے کتاب میں سلطان حسین بیقرہ اور دوسرے سلاطین و امرا کے دستخط ہیں۔ دیوان حافظ کے یہاں اور بھی متعدد نسخے موجود ہیں ایک نسخہ مورخہ ۹۵۱ھ ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ ۱۰۳۳ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانہ کیلئے محمد محسن خوشنویس نے لکھا تھا، یہ نسخہ فتح گولکنڈہ کے بعد اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا، اس کا تیسرا نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو مطلا ہے اور زریں عنوان اور پاکیزہ تصویر سے آراستہ ہے سہ

91 "جہانگیر نامہ" یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جہانگیر نے توزک جہانگیر کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ بھی لکھی ہے۔ اسکے نسخے بہت ہی کمیاب ہیں۔ اس کتب خانہ میں اس کا وہ نسخہ ہے جس کو ۱۰۲۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہ گولکنڈہ کے پاس بھیجا تھا۔ گولکنڈہ کے مفتوح ہونے کے بعد سلطان محمد کے قبضہ میں آیا۔ چنانچہ اسکے اول صفحہ پر شہزادہ موصوف کے دستخط بھی ہیں۔

اس نام کی ایک کتاب اور بھی یہاں موجود ہے۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

اے نام تو سر دفتر اسرارِ وجود   نقشِ صنعت بر در و دیوارِ وجود
در پردہ کبریا نہاں گشتہ ز خلق   بے خود عیاں بر سر بازارِ وجود

"کلیات سعدی" کلیات کے بھی کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ ایک نسخہ پندرہویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے ایک نسخہ کسی شیرازی خوشنویس نے لکھا ہے۔ یہ کلیات سعدی کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا ہے۔

کلیات سعدی کا ایک نادر الوجود مخطوط حضرت مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری پروفیسر ہیئت و حدیث جامعہ شمس الہدیٰ پٹنہ

ملسہ ان نسخوں کے علاوہ ایک نسخہ ابھی حال میں خدا بخش مرحوم کے صاحبزادے مسٹر شہاب الدین خدا بخش لندن سے لائے ہیں۔ یہ نسخہ خوبصورت نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ حاشیہ مذہب ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ شہاب الدین صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ نسخہ ۱۵ اشرفیوں کو لندن میں نیلام میں لیا تھا۔   (مختار الدین)

کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ کتابت نستعلیق ہے۔ حروف بہت واضح اور خوشخط ہیں۔ کلیات میں غزل، قطعہ، رباعی سبھی کچھ ہے کتاب کے پہلے صفحہ پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے "دو صد و سی ورق است" نیچے دو دستخط بھی ہیں۔ ایک حسین خاں گرامی کا اور دوسرا عبدالحسین کا، ایک گوشہ میں وارن ہیسٹنگس کے عہد کا مشہور فرانسیسی مورخ گلیڈوین کے دستخط ہیں، انگریزی میں ایک دستخط اور ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔

اس کتاب پر امجد علی شاہ، شاہ نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کی بھی مہریں ہیں۔ امجد علی شاہ کی مہر میں یہ شعر پڑھا جاتا ہے[۵]

ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

انگریزی دستخط صاف پڑھا نہیں جاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ جارج بیلی کا ہو۔

ان کتابوں کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی، سہ دیوان خسرو، دیوان امیر خسرو، مطلع الانوار۔ ہفت بند کاشی۔ بادشاہنامہ سیرت فیروز شاہی۔ دیوان رکن صائن، دیوان اثیرا ومانی۔ تاریخ ابوالخیر خانی۔ عرفات العاشقین خلاصۃ الاشعار۔ دیوان علی نقی کرد مکاتبات علامی، جواہر العلوم وغیرہ بھی بہت زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔

جذبۂ عیاں

۹۲

ہنگامۂ عالم ہمہ ممنونِ ادا ہے — کوئی پسِ آئینہ ہے آئینہ میں کیا ہے

اس طرح سے ٹھکرا نہ مرے داغِ جبیں کو — ظالم یہ تو خود تیرا ہی نقشِ کفِ پا ہے

بے کیف گل و غنچہ ہیں بے نور ستارے — آغوشِ محبت سے مرے کون اُٹھا ہے

دل میں ہو اگر شائبۂ شکوہ تو کافر — ظالم مری آہوں میں محبت کی صدا ہے

اس بے پر و بالی پہ عیاںؔ جذبۂ شبنم
احساسِ فنا ہے نہ تمنائے بقا ہے

عباس حیدر عیاںؔ کانپوری

کاروانِ انقلاب

(ایک مسلسل طویل نظم کی پہلی قسط)

یہ نظم ایک طویل تصنیف کا پہلا حصہ ہے، جو ۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ اسکی بنیاد زمانے کے اُن تقاضوں اور تصورات پر قائم کی گئی ہے جو دُنیا میں نئی اقتصادی اور سماجی روح کی پیداوار ہیں۔ ذہنی بیداری اور سیاسی شعور نے سماج کے جن دبے ہوئے طبقوں میں بیداری کا احساس پیدا کیا ہے ان تمام طبقوں کو ایک کارواں کی صورت میں دکھایا گیا ہے اور انہیں کی زبان سے ان کی نمائندگی کی گئی ہے کارواں کے ایک عام خاکے کے بعد سب سے پہلے "شندری" نیچ ذات کی ایک عورت اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوسری قسطوں میں دوسرے کیریکٹرز آئینگے اور ان کیریکٹرز کے علاوہ اعلیٰ طبقے کے افراد بھی مستقبل کے انقلابی نقطۂ نظر کی نمائندگی وقت کے تقاضے کے مطابق کرینگے اور نظم کے ختم پر شاعر کی طرف سے ایک باب میں اُن خدشوں سے مطلع کیا جائیگا جو مستقبل میں انسانی سوسائٹی کو گھیر سکتے ہیں۔

اگر آپ کا تقاضہ ہوا تو ایشیا میں اس کی دوسری قسط بھی شائع کی جائیگی ورنہ اس نظم کو کتابی شکل میں نفیس و اعلیٰ صورت میں علیحدہ شائع کر دیا جائیگا۔

ساغر

(تاریخ تحریر مارچ ۱۹۳۹ء)

کاروانِ انقلاب

(۱)

۹۴ مرحبا اے غیض میں روحِ بنی نوعِ بشر — انقلاب آیا زمانہ کا دریچہ کھول کر

زلزلہ بن کر وہ آیا کاروانِ انقلاب — جاگ اُٹھا ذرّہ ذرّہ میں جہانِ انقلاب

مفلسوں اور بدنصیبوں کا یہ بیکس کارواں — پھر بھی اپنی طاقتوں سے آج فلک رس کارواں

جن کے رُخ ہیں دھوپ کی سختی سے کمھلائے ہوئے — ہوں کنول جیسے کنارِ آب مرجھائے ہوئے

جسمِ عریاں پر حجابِ بیکسی کی دھجّیاں — سخت و ناہموار چہروں پہ مشقّت کے نشاں

چیتھڑوں کا اک پھٹیچر گاؤن سا پہنے ہوئے — زندگی ہے فاقہ مستی کی عبا پہنے ہوئے

مو پریشاں، خاک آلودہ، عرق ریز و نحیف — جنکے چہروں کی غلاظت سے نگاہیں تک کثیف
یہ جبیں پر موٹی موٹی دھاریاں تیور پہ بل — دل میں طوفانِ بغاوت آنکھ میں سوزِ عمل
پنجہ کش ہاتھوں میں بھاری پھاوڑے اعلانِ جدال — یہ کلہاڑی یہ بسولے یہ ہتوڑے یہ کدال
بوسہ دیتی ہے جوانی سجدہ کرتا ہے شباب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!

(۲)

دیو پیکر اُس بہادر کا بھلا کیا ہے جواب — بیلچہ ہے جسکے ہاتھوں میں بہ اندازِ شباب ٩٥
نیزۂ چشم و نظر کو بے گماں تانے ہوئے — بھوک ہے قلبِ امارت پر سناں تانے ہوئے
وہ جوانِ پیل تن وہ انقلابی سورما! — بھیڑ سے نکلا وہ ڈنڈے کو گھماتا جھومتا
یہ درانتی، یہ گنڈاسے، لاٹھیاں، تیغ و تفنگ — مرحبا صد مرحبا یہ جنگ یہ سامانِ جنگ
بد دعائیں، بیکسی کی آہ، اور فاقوں کا زہر! — انتڑیوں کی تلملاہٹ، حسرتِ کشتہ کا قہر
عصرِ نو کے اسلحاتِ جنگ کا مسکت جواب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(۳)

وہ علمدارِ تغیّر جھوم کر آگے بڑھا		نعرۂ "یا انقلاب" اُسنے وہ مستی میں کہا

ضرب سے جسکی دو عالم کا کلیجہ ہل گیا		دیکھ کر پرچم کو خونِ زندگی گرما گیا

خود بخود اُٹھنے لگے روئے شدّت سے نقاب

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!

(۴)

96 وہ دلیر آئے تغیّر کا رجز گاتے ہوئے		صورِ اسرافیل کو نعروں سے شرماتے ہوئے

"ہم تغیّر کا ہیں اک زندہ نمونہ دہر میں		ہم تجدّد کا ہیں با معنی خُلاصہ دہر میں

ہے ارادوں کا ہماری ذات سر چشمہ سنو		مرکزِ ہر ساز ہے جو ہم ہیں وہ نغمہ سنو

ثقل کا مرکز ہیں ہم جمہور کی منزل ہیں ہم		جسم ہے جنتا تو جنتا کے دماغ و دل ہیں ہم

ہم خیال و ذہن ہیں جمہورِ عالم کے سُنو		معنی و تفسیر ہیں دستورِ عالم کے سُنو

بخشتے ہیں ہم نوا خستہ حلق کے واسطے — بخشتے ہیں ہم صدا اعلان حق کیواسطے

ایک مجموعہ ہیں کُل مخلوق کی طاقت کا ہم — رُخ بدل دینگے نظامِ شعبۂ قدرت کا ہم

موڑ کر رکھ دینگے خنجر ہر کسی جلّاد کا — تنگ چھلّا ہیں ہمارے ہاتھ بھی فولاد کا

ہم بڑے ہیں سخت ہیں حیران کن ہیں مست ہیں — ہم امر ہیں، کارکن ہیں، روحِ بُود و ہست ہیں

ہم نڈر ہیں، مرد ہیں، مغرور ہیں، ذیشان ہیں — ہم شرر ہیں برق ہیں سیلاب ہیں طوفان ہیں

٩٧ ہم اٹل ہیں دہر میں اہرام مصری کی طرح! — مستقل دنیا میں ہیں قدرت کی شکتی کی طرح

ہم ہیں اس دنیائے آب و گل میں قدرت کا جواب"

مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(۵)

دیکھنا وہ آئیں اُن کی عورتیں باحالِ زار — زندگانی کا جنازہ نوجوانی کا مزار

جن کی دوشیزہ تمنّاؤں کو فاقہ کھا گیا — بھوک کے شعلوں سے جنکا گلستاں مرجھا گیا

جن کی آنکھیں کاسۂ سائل نگاہیں دکھ بھری — ہر نظر میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے کمتری

جنکی آنکھیں نور سے خالی ہیں اور بیٹھی ہوئی — موت کے خونخوار شعلوں سے مگر دُکھی ہوئی

خوف آگیں سُرخ لرزہ آفریں وحشت زدہ — موت کے تاریک غاروں کی طرح دہشت زدہ

جنکے بالوں کی لٹیں اُلجھی ہوئی چکٹی ہوئی — جس طرح بیمار ناگن دکھ سے ہو سمٹی ہوئی

جنکے رُخ آلام کی شدت سے ہیں سرسوں کے پھول — اور ان پھولوں پہ بیدادِ زمانہ کی ہے دھول

جن کی سوجی پنڈلیوں میں خیر سے زیور یہ ہیں — خوں زدہ چھالوں کے گھونگرو آبلوں کی چھاگلیں

جنکے کولھوں پر گھڑوں اور بوریوں کے ہیں نشاں — ان نشانوں سے بھی سنئے نازکی کی داستاں ۹۸

مست ہو سکتے تھے شاعر ان کے ہر انداز سے — یہ بھی چل سکتی تھیں سو سو لوچ سو سو ناز سے

آہ لیکن بھوک نے اُن کی نزاکت لوٹ لی — قدرتِ فیاض نے دی تھی جو دولت لوٹ لی

جنکے سینوں پر ہے عریانی کی چادر تار تار — بھوک میں ملفوف جوبن، پیاس میں لپٹی بہار

دربدر سائل جوانی، سربسر مفلس شباب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب!!

(۶)

دیکھئے وہ چھٹتا جاتا ہے غبارِ کارواں — قربِ منزل سے نمایاں مشعلوں کا ہے دھواں
اپنی اپنی شکل خود ہر شخص سمجھانے لگا — صاف منظر کا ہر اک پہلو نظر آنے لگا

بھیڑ میں اک سمت کنکر کوٹنے والی بھی ہے — ہاتھ میں ڈنڈا لئے بوڑھی پنہاری بھی ہے
ناگ پھن ہیں مالنوں کے پاس پھولوں کے عوض — جھاڑ ہیں ہاتھوں میں گلشن کے رسولوں کے عوض 99
دیدنی ہے آج تو کم عمر ماما کا سہاگ — ادھ جلی چولھے کی لکڑی ہاتھ میں اور منہ میں جھاگ
رسیاں ڈولوں کی ہاتھوں میں ہیں اور پنہاریاں — ساریوں کے چیتھڑے ہیں چیتھڑوں کی ساریاں
تیز کھرپے ہیں اُنہیں گھسیارنوں کے ہاتھ میں — شہر کے بانکے رہا کرتے تھے جنگی گھات میں
اس تباہی خستگی اور بھوک میں یہ ان کا حال — آنکھ سے شعلے برستے ہیں نگاہوں سے جلال
سندری کے ہاتھ میں دیکھو وہ رڑکے کا علم — تیغ کو شرما رہا ہے آج تو پنجے کا خم

"مرحبا اے دورِ عشرت مرحبا صد مرحبا

"بابوؤں" اور "صنا لوگوں" سے مرا پیچھا چھٹا"

(ہائیں یہ کیسی صدا ہے چپ رہو ٹھہرو رُکو | چھُپ کے اس ٹیلے کے پیچھے اسکی باتیں بھی سُنو
مہترانی رانیوں سے وہ بالا ہوگئی | خاک جستِ شوق میں اُڑ کر ستارا ہوگئی

سُندری کا خطبہ

(۷)

١٠٠
مرحبا اے دورِ عشرت مرحبا صد مرحبا | "بابوؤں" اور "صنا لوگوں" سے مرا پیچھا چھٹا
لاؤ مجھ کو بھی شرابِ ارغواں کا ایک جام | اے رفیقو! میں تھی صدیوں اور قرنوں کی غلام
دان کی امید میں شامیں سحر ہوتی رہیں | عید کے انعام میں عمریں بسر ہوتی رہیں
یوں تو میں یکسر نجاست تھی غلاظت کا نشاں | مجھ سے چھو جانا قیامت تھا قیامت الاماں
ہاں مگر دستِ ہوس کو شرم و غیرت کچھ نہ تھی | مجھ کو سینے سے لگانے میں کراہت کچھ نہ تھی

میرے بھنگی نے نہیں لوٹی جوانی کی بہار — خان صاحب کا ہدف تھی سیٹھ صاحب کا شکار
آہ وہ اُترن کے کپڑے وہ پُرانی صدریاں — میل سے معمور وہ چیتھڑے وہ جوؤں کے مکاں
شہر میں ہر رات وہ دورِ شراب ارغواں — صبح کو دوپائی پر اشراف کی وہ جھڑکیاں
وہ ڈپٹ وہ ڈانٹ، وہ دھتکار اور وہ جھڑکیاں — خشک باسی روٹیوں کے ساتھ تازہ گالیاں
وہ سڑے سالن وہ جھوٹی پتلیں وہ دال بھات — اَن گِنت نسلوں نے جھوٹن کھا کے کاٹی ہے حیات
فاتحہ کی روٹیاں بھولے سے بھی ملتی نہ تھیں — میری پرچھائیں جو پڑ جاتی تو دُھلتی تھی زمیں
لیکن اب تیار ہو جائیں خدایانِ سماج — ایک ایک جلّاد سے بدلا لیا جائیگا آج ١٠١
آج گھونگھٹ ہے، نہ سوکھی روٹیوں کا انتظار — گالیاں دیتا نہیں اب طفلکِ سرمایہ دار
پیٹ سے بندھتی نہیں اب روٹیاں سوکھی ہوئی — مرحبا ہے روحِ انساں قیدِ انساں سے بری

جگمگائیگا جہاں میں اب ہمارا آفتاب
مرحبا صد مرحبا اے کاروانِ انقلاب

(باقی)

ساغر

سوویٹ روس پر جاپان کی للچائی نظریں

(سید عقیل جعفری مچھلی شہری)

کچھ دنوں سے برّاعظم ایشیا کے شمالی علاقے میں جہاں دریائے آمور (Ammour) اور لیوری ایک قدرتی فاصل مانچوکو اور سائبیریا کے درمیان بناتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، وہاں دو زبردست فوجیں دورِ جدید کے تمام مہلک آلاتِ حرب سے لیس ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں جن کے مطمحِ خیال سے تہذیب و تمدن دور بھاگتا نظر آتا ہے اور ان کی خوفناک "مڈبھیڑ" نے ٹوکیو اور ماسکو جیسے مرکزِ تہذیب و فن شہر کے باشندوں کو بھی سراپا "انتقام" بنا دیا ہے اور آج دونوں قوموں کے سینوں میں انتقام کی آگ اس قدر بھڑک رہی ہے کہ مانچوکو کی سرحد پر ایک ہزار میل کے احاطہ میں کم و بیش پچاس لاکھ روسی اور جاپانی سپاہی دن رات بیٹھے ہوئے صرف اس بات کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

روس اور جاپان کی یہ دشمنی بہت پرانی ہے۔ سوویٹ روس جاپان کا اس وقت سے شدید مخالف ہے جبکہ ۱۹۲۳ء میں امریکہ کی مداخلت سے جاپان کی فوجوں کو مجبوراً سائبیریا سے واپس آجانا پڑا تھا۔ اب سے کچھ عرصہ پیشتر جاپانیوں کا خیال تھا کہ مشرق بعید میں سوویٹ روس کا یہ علاقہ ایک لقمۂ تر ہے جسے وہ بآسانی ہضم کر لینگے لیکن گذشتہ چند سال کے تلخ تجربات نے یہ بات اچھی طرح واضح کردی ہے کہ وہی "لقمۂ تر" قدرت کی کارفرما قوتوں سے ایک ہیبتناک دیو کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کی ہیبت نے ٹوکیو کے اربابِ سیاست کی نیندوں کو بھی حرام کر دیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دُنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہوگا جو اتنی وسعت اور اہمیت رکھنے کے باوجود سیاحوں کے نزدیک اس قدر غیر مانوس اور غیر دلچسپ ہو جس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہماری ناقص تعلیم نے ہمیں صرف یہی بتایا ہے کہ منچوریا کا علاقہ ویران اور بیکار علاقہ ہے اسکے نام کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں ایک لمبے چوڑے بے آب و گیاہ صحرا کا نقشہ پھر جاتا ہے جہاں سیاحوں کیلئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ منچوریا کے وسیع علاقے میں کثرت کے ساتھ جنگل پائے جاتے ہیں اور پہاڑوں کے دو خوشنما وسیع سلسلے ملک کے اس پار سے اُس پار تک پھیلے ہوئے ہیں جن میں جگہ جگہ خوشنما جھرنے اور خوبصورت مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں اسی طرح سائبیریا کا نام سُنتے ہی ہمارے سامنے برف سے ڈھکے ہوئے بیکار علاقہ کی تصویر پھر جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائبیریا کے بیشتر علاقے کی آب و ہوا صحت و تندرستی کیلئے دُنیا میں بہترین تسلیم کی جاتی ہے۔ یہاں آبادی بھی کافی ہے اور لوگ تیزی کے ساتھ

آباد بھی ہوتے جا رہے ہیں۔

سائبیریا اور منچوکو کے علاقے ابھی تک انسانی ضروریات کیلئے بالکل بیکار خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اب یہ خیال بدلتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے قدرتی چیزوں سے فائدہ اُٹھانے کے ذریعے دریافت ہوتے جا رہے ہیں ان علاقوں کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں کیسے کچھ انقلابات نہ رونما ہو جائینگے۔ لیکن جہاں تک قدرتی ذریعوں سے فائدہ اُٹھانے کا سوال ہے۔ روس اور جاپان دونوں کی ایک ہی صورت ہے اور بظاہر کوئی سبقت کرتا نظر نہیں آتا۔ مگر جہاں آبادی کا سوال ہے مانچوکو میں اس کی طرف مطلق کوئی خیال نہیں کیا جا رہا ہے۔ برخلاف اسکے سائبیریا میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور سرعت کے ساتھ لوگ آباد ہوتے جا رہے ہیں اور بہت باقاعدگی سے شہر بستے جا رہے ہیں۔

متنازعہ علاقہ سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان کشیدگی کا جو سبب ہے وہ دراصل وہ علاقہ ہے جو جھیل بیاکل ( ) سے لیکر ساحل سمندر تک ایک پتلی جھٹ کی شکل میں چلا گیا ہے جس کے ہوائی راستہ کی لمبائی تقریباً ۱۵۰۰ میل ہے یہ دریائے آمور ( ) کے منبع سے شروع ہو کر بتدریج شمال کی جانب پھیلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ کر جو مانچوکو کی "کوہان" کہلاتا ہے بہت وسیع ہو جاتا ہے اور پھر بتدریج جنوب کی جانب تنگ ہوتا ہوا خبراوسک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ درحقیقت اسکی طوالت اس قدر خطرناک نہ ہوتی اگر دریائے یسوری اور ساحل بحر کے مابین سوویٹ روس کے بحری علاقے حائل نہ ہوتے جو ۷۰۰ میل کی لمبائی اور تقریباً ۴۰۰ میل کی چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس طرح شمالی امریکہ میں مین ( ) کی ریاست کوئیبک ( ) اور نیو برانسویک ( ) سے گھری ہوئی ہے ٹھیک اسی طرح مانچوکو شمال اور مشرق کی طرف سے سوویٹ روس کی سرحد سے گھرا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایشیا کے ان ملکوں کی سرحدیں محفوظ اور قلعہ بند ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلح سپاہی جنگ کیلئے ہر وقت تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

اس متنازعہ علاقہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اور یہ سمجھنے کیلئے کہ جاپان کیلئے "یہ لقمۂ تر" کیوں اس قدر مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے اگر ہم جھیل بیاکل سے مغرب کی جانب سفر کرنا شروع کریں اور آرکٹسک ( ) سے دُنیا کی سب سے لمبی ریلوے لائن ٹرانس سائبیرین اکسپریس پر سوار ہو کر بحرِ اوقیانوس کی جانب روانہ ہوں تو سارے دن ریل جھیل کی جنوبی سمت چلتی رہے گی جس کی لمبائی ۴۰۰۰ میل ہے اور جو کسی جگہ ۴۵ میل تک چوڑی بھی ہو گئی ہے۔ یہ سارا علاقہ سوویٹ روس کے زیرِ نگین ہے۔ اس حصے کے جنوبی سمت میں منگولیا کا وہ وسیع علاقہ پھیلا ہوا ہے جو مدتوں روس اور منگولیا کے درمیان نزاع کا باعث بنا رہا۔ اس سارے سفر میں کوئی بھی شہر یا گاؤں ایسا نہیں ملے گا جو قابلِ ذکر ہو اور کچھ بھی تاریخی یا جغرافیائی اہمیت رکھتا ہو سوائے ایک سلی اودینسکا ( ) کے جو ایک پرانی وضع کا روسی شہر ہے اور ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں سے گاڑی روانہ ہو کر اور گھنے جنگلوں سے گذرتی ہوئی بولن باٹور ( ) پہنچتی ہے۔ تقریباً چار۔ چھ گھنٹے جنگلوں میں سفر کرنے کے بعد میدانی علاقے شروع ہو جاتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی سفر کرنیوالا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ روسی علاقے سے گذر رہا ہے۔ ہر چیز میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑتی نظر آتی ہے۔ چاروں طرف جدید وضع کی خوشنما عمارتیں دور تک نگاہوں کو متوجہ کئے رہتی ہیں۔ ہر چیز سے زندگی اور جوانی ابلتی دکھائی پڑتی ہے یہاں تک کہ چیتہ جنکشن پر گاڑی آکر رک جاتی ہے اور آنکھوں کے سامنے سے روسی علاقے کا سارا منظر ہٹ جاتا ہے۔

چیتہ وہ جگہ ہے جہاں سے ٹرانس سائبیرین ریلوے لائن کی ایک شاخ جنوب کی جانب میکڈن ( ) مڑ جاتی ہے جو مانچوکو ہوتے ہوئے سیدھی چین تک چلی جاتی ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو عام طور سے خشکی کے راستے یورپ سے آنیوالے سیاح

ایشیائی ممالک کیلئے اختیار کرتے ہیں۔ چیتہ سے لیکر مانچو کو تک کل مسافت تقریباً ۲۰۰۰ میل ہے لیکن ریلوے لائن بدستور ۱۰۰۰ میل تک مغرب کی جانب چلی جاتی ہے اور در اصل یہی وہ علاقہ ہے جو سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان نزاع کا باعث ہے۔

چیتہ کے آگے ایک چھوٹی سی یہودی عملداری پڑتی ہے جس کا نام کیو شہفتہ (   ) ہے اس حصہ زمین پر زراعت بہت اعلیٰ پیمانہ پر کی جاتی ہے اور ملک کا زیادہ تر حصہ وادیوں میں آباد ہے۔

کہتے ہیں کہ روئے زمین پر یہی وہ ملک ہے جو اصلی معنی میں نوجوانوں کا ملک کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہاں نوجوانوں کو ہر بات میں دخل ہے اور ان کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اس ملک کی ہر بات میں شباب کا رنگ اور جوانی کی امنگ جھلکتی نظر آتی ہے۔

روس اپنی روایات کے لحاظ سے دُنیا میں عجیب ملک ہے۔ روس میں لوگ چالیس سال کی عمر میں اتنے سنجیدہ اور بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں جتنا دراصل ان کے والدین کو بھی نہ ہونا چاہئے اسکی وجہ یہ ہے کہ روسی لوگ بہت ہی مجاہدانہ اور جفاکشی کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی جفاکشی دُنیا میں ضرب المثل ہے۔ روس کے لوگ بہت محتاط، خائف اور ہر چیز سے "پرہیز" کرنیوالے نظر آئینگے۔ اس لئے کہ ان پر بہت بڑے بڑے انقلابات آئے ہیں اور اب ان کی آنکھیں کُھل گئی ہیں۔ وہ قول سے زیادہ فعل کے قائل ہو گئے ہیں مگر برخلاف اسکے روسی نوجوانوں کا رنگ ہی نرالا ہے۔ وہ سراپا "آگ" اور مجسم زندگی نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جوانی کی حقیقت اور اس عمر کی اہمیت روس ہی میں انسان پر منکشف ہوتی ہے۔ یہاں کے نوجوانوں میں بڑی بیداری پھیل گئی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں مشرق بعید کا یہ ملک دُنیا کی سیاسیات میں ایک بڑی جگہ حاصل کرے گا۔

واضح رہے کہ وہ عظیم الشان ریلوے لائن جو اس وسیع ملک کے اس پار سے اُس پار تک چلی گئی ہے۔ مانچو کو کی سرحد کے
۱۰۴ متوازی برابر چلی جاتی ہے اور خبراوسک (   ) جو مشرق بعید میں سُرخ پوشوں کا مرکزی مقام ہے پہنچ جاتی ہے اسی جگہ دریائے پسوری جنوب کی طرف سے آکر دریائے آمور سے مل جاتا ہے۔ یہاں سے جب ریل چلتی ہے تو دو میل کا ایک لمبا پل پڑتا ہے جس کے اُس پار روس کے بحری علاقے کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور اس جگہ سے ریلوے لائن جنوب کی طرف مڑ جاتی ہے اور پھر سیدھے ویلاریووسٹک تک چلی جاتی ہے۔

سوویٹ روس کے بحری مراحل میں جب ہمارا گذر ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں کہ لوگ یہاں کس قدر مصروف اور مشغول نظر آتے ہیں۔ ہزاروں مرد و عورت کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں سڑکیں بن رہی ہیں تو کسی جگہ پل تعمیر کیا جا رہا ہے کسی جانب ریلوے لائن نکالی جا رہی ہے تو دوسری طرف کارخانے قائم ہو رہے ہیں غرضیکہ چاروں طرف چہل پہل اور کام کی افراط نظر آتی ہے۔ ہندوستان کی طرح بے روزگاری اور بیکاری کے دل ہلا دینے والے مناظر کہیں دیکھنے میں نہیں آتے۔

"اخلاق" و "مذہب"

کیا اخلاقی زندگی بغیر مذہب کے بن سکتی ہے؟

(ایک فلسفیانہ علمی مباحثہ)

(جو مابین پنڈت گوپی ناتھ سنہا و ساغر نظامی ..... ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈ کاسٹ کیا گیا)

سنہا:۔ (کمرہ میں داخل ہوکر) آداب عرض

. . . . (صدائے برنخاست)

______ اللہ اکبر، بڑی محویت ہے!؟

ساغر:۔ (چونک کر اور کھڑے ہوکر) ارے! آپ ہیں آداب عرض، آپ کب تشریف لائے!؟

سنہا:۔ بیٹھے بیٹھے، آپ تو مطالعہ میں بالکل کھوئے ہوئے تھے!

ساغر:۔ جی ہاں، کتاب سے زیادہ میں اسکے موضوع میں ڈوب گیا تھا۔ مصنف کا خیال ہے کہ بغیر مذہب کے انسانی اخلاق باقی نہیں رہ سکتا۔

سنہا:۔ اور آپ کا ______؟

ساغر:۔ میرے خیال میں اخلاق کے لئے مذہب کی قید بالکل غیر ضروری ہے۔

سنہا:۔ مجھے بھی اس بحث سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو اخلاقیات کے لئے مذہب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

ساغر:۔ بہت خوب، مگر آپ کے ہم خیال ابتک اپنے دعوٰی کی کوئی ایسی گہری اور زبردست دلیل پیش نہیں کر سکے جس سے دماغی انسان کی تسکین ہو سکے (کتاب سنہا صاحب کے سامنے پھینک کر) یہ کتاب دیکھئے، چار سو صفحے اس شخص نے سیاہ کر ڈالے مگر میرے خیال کو بدل نہیں سکا،

سنہا:۔ ساغر صاحب! ایسی باتوں سے تو ہم قیامت تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ پہلے آپ "مذہب" کی تعریف فرما دیجئے۔

ساغر:۔ زندگی کا لائحہ عمل!

سنہا:۔ اس لائحہ عمل کا بنانے والا کون ہے؟

ساغر:۔ خود انسان!

سنہا:- تو میں سمجھوں کہ مذہب سے خدا کا کوئی تعلق نہیں۔

ساغر:- آپ کو اختیار ہے!

سنہا:- میں مذہب کو خدا کا قانون مانتا ہوں ـــ آپ اس سے انکار کرتے ہیں؟

ساغر:- بحث اُلجھ جائیگی اس لئے کہ ایک خدا سے مختلف و متضاد مذاہب پیدا کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

سنہا:- تو میں یہ سمجھوں کہ ہر اک مذہب کا خدا جداگانہ ہے اور اگر آپ کا مفہوم یہی ہے تو اس بحث میں جس مذہب کا ذکر ہے وہ کون سے خدا کا مذہب ہے؟

ساغر:- مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ کیا سمجھیں، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے مذاہب جن میں اصولی اختلافات موجود ہوں کسی ایک خدا سے منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ غالباً اب سوال کے دوسرے حصے کا جواب میرے لئے ضروری نہیں ہے۔

سنہا:- میں سمجھا! آپ سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے۔ مہربانی فرما کر "اخلاقیات" کی تعریف کر دیجئے اور یہ بھی فرما دیجئے کہ اخلاقیات کو بھی آپ کسی دستور العمل کے تابع سمجھتے ہیں یا نہیں؟

ساغر:- "اخلاقیات" انسانوں کی مختلف سوسائٹیوں کے ان مقررہ اوصاف کو کہتے ہیں جن کی پابندی سوسائٹیوں نے اپنے ہر فرد پر لازم کر دی ہو۔ اور یہ "اخلاقیات" اس دستور العمل کے ماتحت ہوتے ہیں جو سماج اپنے لئے بنائے، خواہ اس سماجی قانون کی کچھ ہی نوعیت کیوں نہ ہو۔

سنہا:- "مذہب" کی تعریف آپ نے یہ فرمائی کہ مذہب انسان کا بنایا ہوا لائحہ عمل ہے۔ اور "اخلاقیات" کی تعریف بھی آپ یہی فرماتے ہیں کہ یہ سوسائٹی کا بنایا ہوا دستور العمل ہے۔ تو پھر مذہب اور اخلاقیات میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟!

ساغر:- کچھ نہیں۔

سنہا:- گویا مذہب اور اخلاقیات آپ کے نزدیک ایک ہی چیز ہیں تو پھر آپ کو اس موضوع سے کیا اختلاف ہے۔

ساغر:- موضوع سے اختلاف کی وجہ مذہب کی تعریف ہے میرے نزدیک مذہب اور اخلاقیات کا کام اس دُنیا تک محدود ہے۔

سنہا:- اگر سوسائٹی کا کوئی فرد کوئی اخلاقی جُرم کرے اسکی سزا اس فرد کو کون دیگا؟

ساغر:- حکومت۔

سنہا:- اور اگر کوئی مذہب کی خلاف ورزی کرے تو اس کی سزا کون دے گا؟

ساغر:- مذہبی حکومت ـــ اگر وہ موجود ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے ذہن میں مذہب کی کوئی مخصوص تعریف ہے، ذرا آپ تو مذہب کی تعریف فرمائیے۔

سنہا:- میں سمجھا، آپ اخلاقیات کی تعریف فرمانے سے بھی گریز فرماتے ہیں۔ اس لئے الزامی جواب دے رہے ہیں، میں تعمیل ارشاد کروں گا۔

میں مذہب کو خدا کا بنایا ہوا قانون اور لائحہ عمل سمجھتا ہوں، جو خدا نے وقتاً فوقتاً انسان کی رہنمائی کے لئے پیغمبروں اور رشیوں کے ذریعہ دُنیا کو عطا فرمایا میرا یہ عقیدہ ہے کہ دُنیا میں نیکی اور بدی کے درمیان متواتر اور مسلسل جنگ ہوتی رہتی ہے، اور جس وقت بھی بدی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا انسان کی رہنمائی فرماتا ہے اور ایک نیا مذہب وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں مختلف مذہب ہیں لیکن تمام مذاہب کا بُنیادی اصول ایک ہے، جس کو "موکش" یا "نجات" کہتے ہیں۔

ساغر:- اچھا ہوا، بحث ایک نقطے پر سمٹ آئی۔ شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ اخلاقیات کی میں مفصل تعریف پہلے کر چکا ہوں۔ اب مذہب کی تعریف آپ نے فرما دی،

میں غالباً آپ سے مذہب کی تعریف نہ کراتا، اگر مذہب کے متعلق میرے خیال اور آپ کی رائے میں اختلاف نہ ہوتا۔ اب یہاں سے اصل بحث شروع ہوتی ہے!

میں کہتا ہوں اخلاق کو برقرار رکھنے کے لئے کسی ایسے آسمانی مذہب کی ضرورت نہیں ہے جس کی آپ نے ابھی تعریف فرمائی ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو کسی آسمانی مذہب کے پیرو نہیں ہیں ان کے بھی اخلاقیات ہیں، اور ان کا مروجہ قانون ان سے ان اخلاقیات کی پابندی کراتا ہے، خود مذہبی طرزِ حکومت میں بھی برائیوں سے بچانا اور بھلائیوں پر عمل درآمد، قانون اور اسکی عدالتوں کے ذریعہ ہی کرایا جاتا ہے، فرض کیجئے کہ آپ کا بتایا ہوا کوئی مذہب موجود نہ ہو تو ایسی حالت میں انسانی سوسائٹی کا کوئی اخلاق ضرور ہوگا، اور اس پر عملدرآمد بھی ہوگا، اس میں مذہب کی کیا شرط ہے۔

تنہا:- جناب یہ مذہبی حکومت کیا چیز ہے؟ اور اگر کوئی مذہبی حکومت ہے جس نے مذہبی احکام کی پابندی کا فرض اپنے ذمہ لیا ہے، تو یہ مذہبی حکومت داورِ محشر کو برطرف نہیں کرسکتی، انسان خدا کے سامنے اپنے افعال کا جوابدہ ہے اور اس جواب دہی سے کوئی دُنیاوی حکومت انسان کو عہدہ برآ نہیں کراسکتی۔

ساغر۔ مذہبی حکومت اس حکومت کو کہتے ہیں جو کسی مذہبی شریعت کے ماتحت چلائی جائے۔ میں نے کب انکار کیا ہے کہ مذہب داورِ محشر کے تخیل کو دماغ سے نکال سکتا ہے میرا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ داورِ محشر کو نہ ماننے والی سوسائٹی کے افراد کو اخلاقی برائیوں سے کونسی طاقت روکتی ہے؟

تنہا۔ بجا ہے، مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی بحث میں ضد کا زیادہ حصہ ہے، بہرحال میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ بغیر سوالات کئے ہوئے اپنا مفہوم آپ پر واضح کردوں

میں پھر آپ کو موضوع کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موضوع کے ہر لفظ سے ظاہر ہے کہ مذہب جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس کا مطلب خدا کے بنائے ہوئے قانون سے ہے اور اخلاق جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس کا تعلق انسانی دستور العمل سے ہے اور مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اخلاق کی پابندی کے لئے مذہب ایک ضروری چیز ہے یا نہیں؟

"اخلاقیات" کی ضرورت انسانی سوسائٹی کو کیوں محسوس ہوئی، اسکی وجہ بالکل ظاہر ہے، انسان فطرۃً خودغرض واقع ہوا ہے اور ہر قوی انسان ہر کمزور ہم جنس پر ظلم و جور کرکے اپنا فائدہ اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرنی چاہتا ہے، انسان کی اس فطرت کو روکنا انسانی سوسائٹی کے نظام کے لئے نہایت ضروری محسوس ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ انسانی سوسائٹی نے اپنے ماحول کی مطابقت میں دستور العمل مرتب کیا اور سوسائٹی کے ہر فرد پر اسکی پابندی لازم قرار دی، میں اس سلسلے میں ایک بات اور بھی عرض کردوں، اور وہ یہ ہے کہ کسی قانون یا کسی پروگرام پر عمل درآمد نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس قانون یا اس پروگرام کی پشت پر ایک ایسی قوت نہ ہو جو سوسائٹی کے افراد کو مجبور کرسکے کہ وہ قانون کی پابندی کریں۔ اور سوسائٹی کے ہر فرد کو یہ خوف ہو کہ وہ اگر قانون کی خلاف ورزی کرے گا، تو وہ قوت جو اس قانون کی پشت پر ہے اس سے بازپرس کریگی، اخلاقیات کی پشت پر اخلاقیات کا اجتماعی ضمیر ہوتا ہے جو افراد کو دستور العمل کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے، میں اخلاقیات کے یہی معنی سمجھتا ہوں اور اسکے بعد آپ کو یہ غور کرنا ہے کہ انسان کو راہِ راست پر رکھنے کیلئے سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کافی ہے یا اسکو علاوہ اسکے کسی اور طاقت کی بھی ضرورت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اسکے لئے ہرگز کافی نہیں ہے،

انسانی افعال ہمیشہ کھُلم کھُلا اور روز روشن ہی میں سرزد
نہیں ہوتے۔ اور خاصکر ایسے افعال جو اخلاق کے خلاف
ہوتے ہیں قدرۃً انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس
قسم کے افعال کو عوام کی نگاہ سے بچا کر کرے، اور میں
سمجھتا ہوں کہ انسانی سوسائٹی کے لئے جس قدر یہ ضروری
ہے کہ اخلاقی قانون کے ذریعہ اسکے ان افعال پر پابندی
عائد کی جائے جو علانیہ سرزد ہوتے ہیں اس سے کہیں
زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کے ان افعال
پر بھی پابندی عائد کی جائے جو رات کی تاریکی اور مضبوط چار دیواریوں
کے اندر کئے جاتے ہیں اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان افعال کی روک تھام
کیلئے سوسائٹی کا مجموعی ضمیر قطعی ناکافی ہے لہذا ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے
جس کی نگاہوں سے بچنا ان کیلئے قطعی ناممکن ہو جائے اور میں سمجھتا ہوں
کہ مذہب کے بغیر یہ ناممکن ہے۔

ساغر شکریہ، میری ضد نے کم از کم اتنا تو کیا کہ آپ نے اپنا
مفہوم بالکل واضح کر دیا، آپ کی تمام تقریر میں ایک
استدلال یقینی وزنی ہے کہ جب قانون کی آنکھ انسان
کے اعمال کی نگران نہیں ہوتی تو وہ کونسی طاقت ہے جو
تاریکی میں انسان کو گناہوں سے بچاتی ہے۔!؟

تنہا شکر ہے کہ آپ کو ایک استدلال تو وزنی معلوم ہوا۔

ساغر مگر اس وزنی استدلال کے جواب میں ایک ہلکے سے
جواب پر بھی غور فرما لیجئے!
ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کونسی طاقت انسانوں کو
تاریکی میں بھی گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے۔
یہ ایک نفسیاتی چیز ہے، اور اس کا تعلق ہر شخص کی
ذاتی نفسیات سے ہے، ظاہر ہے کہ انفرادی نفسیات
زیادہ تر ماحول و وراثت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ برائی اور
بھلائی میں تمیز کرنے والا ضمیر بھی بچپن ہی سے ایک خاص
ماحول میں پرورش پاتا ہے اور اسکی بُری یا بھلی سیرۃ
اسی ماحول کے اثر سے بنتی ہے۔
آپ کہتے ہیں، رات کی تاریکی میں مذہب انسان کو
گناہوں سے باز رکھتا ہے، میں کہتا ہوں یہ غلط ہے
حقیقت میں نفسیاتی ضمیر ہی ہر انسان کو نیک و بد کا
احساس کراتا ہے۔ مذہب کی اس میں کوئی قید نہیں
بچپن ہی سے دماغوں میں بُرائی اور بھلائی کے فرق کا
گہرا اثر موجود ہوتا ہے۔ جو نتیجہ ہوتا ہے ماحول کا مگر
ماحول ہی اس اثر کو مٹا بھی دیتا ہے یعنی اچھے ماں باپ
اور اچھی سوسائٹی کے اثرات ایک شخص کو بُرائی سے
محفوظ رکھتے ہیں اور بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر بُرے
لوگوں کی سوسائٹی میں پھنس کر وہی شخص بُرائی کو
بھلائی سمجھنے لگتا ہے۔

تنہا مگر بہت سے لوگ بُری سوسائٹی کے باوجود بھلے رہتے ہیں

ساغر صرف مستثنیات! اور اگر بھلے رہتے ہیں تو یہ دلیل ہے ان
پختہ سیرت کی جس کی جڑیں ماحول اور تربیت میں مضبوط
ہو چکی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہائی اور تاریکی
میں گناہوں سے بچتا ہے تو اسکی حقیقی وجہ اس کا ذاتی
چال چلن ہوتا ہے جو ایک مخصوص ماحول میں بنتا ہے
مذہب کے خوف سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ورنہ
محض خوف کی بنیاد پر بُرائی سے بچنا اور بھلائی کرنا یہ
انسانی فطرت کی بڑی توہین ہے، اور بالواسطہ
یہ کوئی قابلِ تعریف بات بھی نہیں!
میں آپکے سامنے ایک اور مثال پیش کرتا ہوں
شاید اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا، کہ دنیا کے ہر
شہر اور ہر قصبے میں مضبوط چار دیواریوں سے گھرے
بدکاریوں کے اڈے موجود ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں
جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ وہاں نہیں جاتے۔ جانے
اس لئے جاتے ہیں کہ رائج الوقت قانون انہیں نہیں
روکتا اور نہ جانے والے اس لئے نہیں جاتے کہ سوسائٹی
کا اجتماعی ضمیر ان کے خلاف ہے۔ جانے والے اور
نہ جانے والوں پر مذہب کا کوئی اثر نہیں۔

آپ کی رائے میں اجتماعی ضمیر بد اخلاقیوں کو نہیں روکتا میں کہتا ہوں کہ اجتماعی ضمیر روکتا بھی ہے اور نہیں بھی روکتا، جس طرح مذہب کا خوف ہوتا ہے اور جس حد تک مذہب بد اخلاقی کا سدباب کرتا ہے۔ اسی حد تک اجتماعی ضمیر بھی کرتا ہے اس لئے کہ ان دونوں کی بنیاد خوف پر ہے۔ جہاں اجتماعی ضمیر نہیں روکتا وہاں مذہب بھی نہیں روک سکتا، تو نتیجہ یہ نکلا کہ علانیہ بد اخلاقیوں کو وہ دُنیا دی قانون روک سکتا ہے جو یا مذہب کا آلۂ کار ہو یا اجتماعی ضمیر کا اور پوشیدہ بد اخلاقیوں کو اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف انسان کا انفرادی ضمیر ہے، نہ کہ مذہب یا اجتماعی ضمیر!؟

ایک بُنیادی بات اس سلسلے میں اور کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ آپ نے کہا کہ خوف خدا لوگوں کو بد اخلاقی سے روکتا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مذاہب کو قانونِ تعزیرات بنانے کی کیوں ضرورت پڑی!؟ ظاہر ہے کہ خود اہلِ مذہب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اخلاق کا قیام محض روحانی دباؤ سے ممکن نہیں، اس کے لئے مضبوط اور ٹھوس پنجے کی ضرورت ہے۔

تنہا ساغر صاحب! معاف فرمائیے، میں نے کب کہا ہے کہ مذہب کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی یا نہیں ہوتی۔ بھلائی اور بُرائی کی مسلسل جنگ سے بھی آپ انکار نہیں فرمائینگے۔ تو سوال یہ ہے کہ جب شیطان جس کا دوسرا نام انسانی خود غرضی ہے مذہب اور اخلاق کے خلاف بغاوت کی متواتر ترغیب دیتا ہے تو کونسی طاقت ہے جو انسان کو معصیتوں سے بچاتی ہے۔؟

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ خوف تعزیر سے متاثر ہو کر بُرائیوں سے بچ سکتا ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ "انفرادی ضمیر" کی پشت پر کونسا خوف کار فرما ہے ؟

ساغر۔ بُرائی اور بھلائی کی مسلسل جنگ ابتک ایک معمّہ ہے، بحث طویل ہو جائیگی اس لئے میں اس میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ تسلیم نہیں کہ محض خوف تعزیر ہی انسان کے اعمال کا محرک ہوتا ہے۔ اسکے اعمال کا محرک ایک خاص جذبہ ہوتا ہے، جو اگر عقل تمئیزی پر غالب آجائیگا تو خلاف عقل باتیں سرزد کرا دیتا ہے، قتل کی سزا موت ہے، پھر بھی انسان کسی جذبہ سے مشتعل ہو کر دوسرے انسان کو قتل کر بیٹھتا ہے۔

تاریکی میں گناہ کا بھی یہی حال ہے، معصیت کا ارتکاب ایک خاص جذبہ کے ماتحت ہوتا ہے اگر وہ جذبہ عقل پر غالب ہو گیا تو انفرادی ضمیر اس کو روک سکتا ہے اور نہ مذہب، تو ظاہر ہوا کہ خوفِ تعزیر بحیثیت مجموعی انسان کے اعمال کا محرک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

درحقیقت انسان کی عقل تمئیزی اور اسکی مضبوط سیرۃ ہی حتی الامکان اس کو بُرائی سے روکتی ہے، مذہب کا اثر کوئی بُنیادی اثر نہیں محض ایسا ہی اثر ہے جیسا کسی قانونی تعزیرات کا۔

انسانی جذبات اسکے اعمال کے محرک ہیں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان میں اعتدال اور توازن قائم رکھنا عقل تمئیزی کا کام ہے اور عقل تمئیزی کا نشو و نما تعلیم و تربیت پر موقوف ہے، اس تعلیم و تربیت کا نظام سماج کا کوئی بھی ادارہ بنا سکتا ہے اسکے لئے مذہب ضروری نہیں۔

سب سے بڑی دانشمندی یہ ہے کہ انسان بے غرضی سے اچھے کام کرے۔

کب آؤگی تم !؟

("اُن کے" انتظار میں)

(محمد ضیاء الاسلام صاحب- بی- ایس سی- پی سی- ایس)

(نظم تصویر کے متعلق)

کب تک یوں ترساؤ گی تم؟
کب تک دل برماؤ گی تم؟
جلوہ کب دکھلاؤ گی تم؟
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

پیاری پیاری باتیں ہے ہے
رنگین رنگین گھاتیں ہے ہے
اُف وہ مہکتی راتیں ہے ہے
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

کالی کالی گھٹائیں آئیں
دل پر غم بن بن کر چھائیں
ذوقِ نغمہ و مستی لائیں
کب آؤگی؟ کب آؤگی؟

کھوئی ہوئی سی باتیں میری
سونی سونی راتیں میری
دل سے ہردم باتیں میری
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

آہ وہ کافر مست نگاہیں
آہ وہ گوری گوری باہیں
آہ وہ میرے دل میں راہیں
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

موجیں لینا وہ ساری کا
طوفاں سا اک گل کاری کا
حکمِ رنگیں مے خواری کا
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

سلہ اس بند کی تصویر ایشیا کے اسی نمبر میں شائع کی جا رہی ہے۔ میں ضیا صاحب کے ذریعہ اُس آرٹسٹ کی بارگاہ میں اس لطیف نقش کے لئے شکریہ پیش کرتا ہوں۔ جنکے کمال کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دُنیا کو اپنا نام بھی نہیں بتانا چاہتے۔
ساغر

آؤ، آؤ، جلدی آؤ
آکر اپنا روپ دکھاؤ
روپ دکھا کر دل لے جاؤ
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

تم کو میں دل میں بٹھلاؤں!
تم کو سُندر گیت سُناؤں
خود روؤں تم کو بھی رُلاؤں
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟

یاد تمہاری آفتِ جاں ہے
نام تمہارا لب پہ رواں ہے
یہی وظیفہ وردِ زباں ہے
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی؟
کب آؤ گی؟ کب آؤ گی!؟

خطباتِ زرتشت

حصّہ اوّل

باب (۱)

تینوں جنم

(از فریڈرک نٹشے مترجمہ عبدالسلام صاحب رامپوری)

روح کے تین جنم میں تمہیں بتاتا ہوں۔ روح اونٹ اور اونٹ سے شیر اور شیر سے آخرکار بچہ بنتی ہے۔ ۱۲۳

روح کے لئے، قوی اور باربردار، روح کے لئے جو ادب و احترام کا مسکن ہے بہت سی بھاری چیزیں ہیں۔ اُسکی طاقت گراں اور گراں ترین کی متقاضی ہے۔

"گراں کیا ہے"؟ باربردار روح سوال کرتی ہے۔ اور اونٹ کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ کر خوب لدنا چاہتی ہے۔

"سورماؤ! گراں ترین چیز کیا ہے" باربردار روح دریافت کرتی ہے" تاکہ میں اُس کو اُٹھا کر اپنی طاقت سے لطف اندوز ہوؤں"

کیا وہ یہ نہیں ہے؟ غرور کو ٹھیس لگانے کیلئے اپنے آپ کو ذلیل کر لینا؟ عقل کی تضحیک کیلئے حماقت کا مظاہرہ کرنا؟

یا یہ ہے: جب فتح منانے کا وقت آئے تو مقصد سے دست بردار ہو جانا، ورغلانیوالے کی ترغیب کیلئے پہاڑ پر چڑھنا۔

یا یہ ہے: علم کے برگ و ثمر پر بسر کرنا، صداقت کی جستجو میں روح کی بھوک برداشت کرنا۔

یا یہ ہے: بیمار ہونے پر دلاسہ دینے والوں کو رخصت کر دینا اور اُن بہروں سے دوستی گانٹھنا جو مطلقاً التجا نہ سُن سکیں۔

یا یہ ہے: صداقت کے گندے پانی میں گھس جانا اور سرد و گرم کی پرواہ نہ کرنا۔

یا یہ ہے: نفرت کرنے والوں سے محبت کرنا، جس وقت بھوت ڈرانا چاہے تو اُسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدینا۔

باربردار روح ان سب گراں ترین چیزوں کو برداشت کرتی ہے، جیسے اونٹ لد چکنے کے بعد سیدھا ویرانے کی طرف بڑھتا ہے ایسے ہی روح اپنے ویرانے کی طرف تیز گام ہو جاتی ہے۔ اس انتہائی سنسان ویرانے میں دوسرا جنم بدلتا ہے۔ یہاں روح شیر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے لئے ویرانے میں آزادی اور خداوندی کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ وہ یہاں اپنے پچھلے خداوند کی تلاش کرتی ہے اُسکی

اور پچھلے خدا کی دشمن بننے کیلئے وہ اسی بڑے اژدہے پر فتح پانے کی جدو جہد کرنا چاہتی ہے۔

وہ بڑا اژدہا جسے اب روح خدا اور خداوند کہنے پر مائل نہیں کیا ہے؟ اس بڑے اژدہے کا نام ہے "تجھے کرنا ہوگا" لیکن شیر کی روح کا تقاضا ہے "میں چاہتا ہوں"۔

"تجھے کرنا ہوگا" سونے سے جگمگاتا اُس کے راستہ میں پڑا ہے۔ ایک سفنہ دار جانور جس کے ہر ہر سفنہ پر "تجھے کرنا ہوگا" سنہری حرفوں میں چمک رہا ہے۔ ہزار سالہ قدریں ان سفنوں پر چمک رہی ہیں اور عظیم ترین اژدہے کا یہ کہنا ہے "اشیاء کی تمام قدریں —— وہ مجھ پر چمکتی ہیں تمام قدریں پیدا کی جا چکیں اور تمام پیدا کی ہوئی قدریں وہ میری ذات ہے۔ یقیناً اب "میں چاہتا ہوں" کی گنجائش نہیں" اژدہا کہتا ہے۔

برادران! روح کو شیر کی کس لئے ضرورت ہے؟ باربرداری کا باادب جانور جو دست بردار ہو جاتا ہے، کیوں کافی نہیں؟

جدید قدروں کو پیدا کرنا —— گو یہ شیر بھی نہیں کرسکتا، مگر جدید تخلیق کیلئے آزادی پیدا کرنا —— شیر کی طاقت یہ کرسکتی ہے۔

آزادی پیدا کرنے کے لئے اور فریضے میں بھی ایک مقدس "نہیں" کردینے کے لئے بھائیو! شیر درکار ہے۔

جدید قدروں کا حق خود حاصل کرلینا، باربرداری اور باادب روح کے لئے بہت ہولناک ذمہ داری ہے۔ حقیقۃً یہ صید افگنی ہے اور کام ہے درندہ کا۔

"تجھے کرنا ہوگا"، کو مقدس ترین چیز سمجھ کر وہ ایک زمانہ میں محبت کرتی تھی، مگر اب وہ مقدس ترین چیزوں میں بھی فریب اور مطلق العنانی کے احساس پر مجبور ہے۔ وہ اس محبت سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے، اسکے حاصل کرنیکے لئے شیر کی ضرورت ہے۔

لیکن میرے بھائیو! مجھے بتاؤ کہ ایک بچہ وہ کون سی چیز کرسکتا ہے جس کو شیر نہیں کرسکتا؟ شکاری شیر کو بچہ بننے کی بھی کیوں ضرورت ہے؟ بچہ ایک معصومیت ہے، بھول ہے، ایک نئی ابتدا ہے، ایک کھیل ہے، ایک پہیا ہے خود گردان، ایک پہلی حرکت ہے
اور ایک مقدس "ہاں" ہے۔ ۱۱۴

ہاں آفرینش کے کھیل کیلئے بھائیو! زندگی کو مقدس "ہاں" کی ضرورت ہے:۔ روح اب اپنا عزم چاہتی ہے، دُنیا کی راندہ اپنی دُنیا جیتنا چاہتی ہے:۔

روح کے تینوں جنم میں نے تمہیں بتادئے:۔ روح، اونٹ، اونٹ سے شیر اور آخر میں بچہ کیسے ہوئی۔

زرتشت نے یہ تقریر کی اور وہ اس وقت ایک شہر میں سکونت رکھتا تھا جس کو بقر ابلق کہتے ہیں۔

باب (۲)

خوبی کی علمی مسندیں

لوگوں نے زرتشت سے ایک شخص کی تعریف کی کہ وہ نیند اور خوبی پر اچھا خطبہ دینا جانتا ہے لوگ اُس کا اسی وجہ سے احترام کرتے ہیں اور انعام سے نوازتے ہیں جوان اسکی مسند کے سامنے بیٹھتے ہیں۔

زرتشت گیا اور جوانوں کے حلقہ میں اسکی مسند کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس دانشمند نے کہا۔

"احترام اور حیا نیند کے حضور میں پہلی چیز ہے، بدخوابوں اور شب بیداروں کا راستہ چھوڑ دینا چاہئے۔ چور تک نیند سے شرم کرتا ہے، رات میں ہمیشہ دبے پاؤں چوری کرتا ہے۔ مگر رات کا چوکیدار بے حیا ہے جو بے حیائی سے

سکے لئے پھرتا ہے ۔ سونا کوئی حقیر فن نہیں ۔ اسکے انتظار میں دن بھر جاگنا ضروری ہے ۔

دن میں دس مرتبہ تمہیں اپنے اوپر غالب آنا چاہئے اس سے اچھی تکان پیدا ہو جاتی ہے جو جان کیلئے افیون کا پھول ہے ۔

پھر دس ہی مرتبہ صلح کرنا چاہئے کیونکہ غالب آنا تلخی ہے، جو صلح نہیں کرتے بُری طرح سوتے ہیں ۔

دن بھر میں دس صداقتوں کو دریافت کر لینا چاہئے ورنہ تو رات میں دریافت کریگا تیری جان بھوکی ہوگی ۔

دن بھر میں دس مرتبہ ہنسنا اور خوش ہونا چاہئے ورنہ تکلیف کی جڑ تیرا معدہ تجھے رات میں بیچین کرے گا ۔

بہت کم لوگ واقف ہیں (لیکن یہ حقیقت ہے) کہ میٹھی نیند کے لئے ہر قسم کی خوبیوں کی ضرورت ہے ۔ کیا میں دروغ بیانی کرونگا؟ ناجائز تعلق کا مرتکب ہوؤں گا؟ ہمسایہ کی خادمہ کی خواہش کرونگا؟ یہ سب چیزیں میٹھی نیند کی ضد ہیں ۔

باوجود ہر قسم کی خوبیوں کے ایک چیز کی پھر بھی ضرورت ہے یعنی صحیح وقت پر خوبیوں کو بھی سُلا دینا ۔

تاکہ کہیں یہ نیک بخشیں باہم جنگ نہ شروع کر دیں! اور اے افسردہ انسان وہ بھی تیرے لئے!

میٹھی نیند خدا اور ہمسایہ سے امن و آشتی کی متمنی ہے، نیز ہمسایہ کے شیطان سے بھی آشتی، ورنہ رات کو وہ تجھ پر مسلط ہوگا ۔

میٹھی نیند کے لئے ضرورت ہے کہ حکومت کا احترام اور اُس کی اطاعت کی جائے ۔ حتیٰ کہ کج حکومت کی بھی، میٹھی نیند کا یہ تقاضا ہے ۔ میں کیا کروں کہ طاقت کو کج پاؤں پر چلنے کا شوق ہے ۔

115

میرے نزدیک بہترین چرواہا وہ ہے جو اپنی بھیڑیں شاداب ترین چراگاہ میں لیجاتا ہے، یہی میٹھی نیند کے موافق ہے نہ میں بہت سے اعزاز چاہتا ہوں نہ بڑے خزانے، یہ چیزیں مزاج کو بگاڑتی ہیں ۔ مگر نیک نامی اور معمولی دولت کے بغیر نیند خراب ہوتی ہے ۔

میں احباب کی ایک چھوٹی سی صحبت کو بڑی صحبت سے زیادہ خوش آیند سمجھتا ہوں، مگر اُن کی آمد و رفت صحیح اوقات پر ہونی چاہئے ۔ میٹھی نیند کے یہ موافق ہے ۔

ہاں! کم عقل بھی مجھے بہت پسند ہیں، وہ نیند کو تقویت دیتے ہیں، یہ لوگ بابرکت ہیں، خصوصًا اگر بالالتزام اُن کی تائید کی جائے اس طریقہ سے نیک آدمی کا دن گزر جاتا ہے ۔ پھر رات کے وقت میں اچھی طرح اُس کا لحاظ رکھتا ہوں کہ نیند کو طلب نہ کیا جائے نیند خوبیوں کی سرتاج طلب کئے جانے کو ناپسند کرتی ہے ۔ بلکہ میں جائزہ لیتا ہوں کہ دن بھر میں نے کیا کیا، اور کیا سوچا، میں گائے کی طرح جُگالی کرنے میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں "تیری دس فتحیابیاں کیا تھیں"؟ تیری دس صلحیں کیا تھیں؟ دس صداقتیں اور دس ہنسیاں کیا تھیں جن سے میں لطف اندوز ہوا؟"

چالیس خیالوں کے غور و فکر کے گہوارے میں خوبیوں کی سرتاج، نیند دفعتًہ بلا طلب مجھ پر طاری ہو جاتی ہے ۔ نیند میری آنکھیں تھپکتی ہے ۔ اور وہ بھاری ہو جاتی ہے، نیند ہمارے مُنہ کو سہلاتی ہے، اور وہ کھلا رہ جاتا ہے ۔ دبے پاؤں یہ محبوب ترین چور آتا ہے اور میرے خیالات چرا لیجاتا ہے ۔ میں اس علمی مسند کی طرح بالکل احمق رہجاتا ہوں ۔ میں زیادہ دیر اس حالت میں نہیں رہتا، میں اسی وقت لیٹ جاتا ہوں ۔

زرتشت اُس عقلمند کی یہ تقریر سُن کر دل میں ہنسا، کیونکہ اس کی وجہ سے ایک (نئی حقیقت) اسپر روشن ہوگئی۔ اُس نے دل میں کہا یہ عقلمند مع اپنے چالیس خیالوں کے احمق معلوم ہوتا ہے۔ مگر مجھے یہ یقین ہے کہ سونا خوب جانتا ہے۔

مسرور وہی ہے جو اس عقلمند کی صحبت میں رہے، ایسی نیند متعدی ہوتی ہے، یہ موٹی دیواروں کے پار بھی اثر کر جاتی ہے۔

اسکی مسند میں بھی جادو ہے۔ خوبی کے داعی کے پاس جوانوں کی نشست بیکار نہیں۔

اچھی طرح سونے کی خاطر بیدار رہنا اس کی عقلمندی ہے، واقعی اگر زندگی میں کوئی معنی نہ ہوں اور مجھے بھی مہملیت کا انتخاب کرنا پڑے تو سب سے زیادہ پسندیدہ میرے لئے بھی یہی مہملیت ہوگی۔

اب صاف صاف میری سمجھ میں آیا کہ داعیانِ خوبی کی تلاش میں لوگ سب سے زیادہ کس چیز کی تلاش کرتے تھے۔ اُنہیں میٹھی نیند کی تلاش ہوتی تھی، اور اسکی تقویت کے لئے افیونی خوبیوں کی اُن سب لوگوں کیلئے جنہوں نے علمی مسندوں کے مُقلد کی تحسین کی ہے، عقلمندی نام ہے بغیر رویا کی نیند کا۔ اُنہیں زندگی کا اس سے بہتر کوئی مقصد معلوم نہیں تھا۔ گو اس خوبی کے داعی جیسے کچھ لوگ ابھی تک باقی ہیں۔ اگرچہ سب اتنے ایماندار نہیں، اُن کا دور گذر چکا، وہ زیادہ دنوں تک کھڑے نہیں رہ سکتے، وہ فوراً ہی لیٹ جائینگے۔

مبارک ہیں اونگھتے ہوئے لوگ، اس لئے کہ یہی بہت جلد جھونکا کھا جائینگے۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۳)

مردانِ آخرت

116

زرتشت نے مردانِ آخرت کی طرح ایک مرتبہ انسان کی ذات سے بلند خیال دوڑایا، مجھے دُنیا ایک مصیبت زدہ، دردرسیدہ خدا کی صنعت معلوم ہوئی۔ اُس وقت دُنیا، خدائی ـــــ خواب ـــــ اور افسانہ معلوم ہوئی۔ ایک الوہی غیر مطمئن ذات کی آنکھوں کے سامنے رنگین بخارات۔

یہ خیر و شر، شادی و غم، من و تو ـــــ خلاق آنکھوں کے سامنے مجھے رنگین بخارات نظر آئے۔

جوں ہی خالق نے نظریں اپنے آپ سے ہٹانا چاہیں۔ اُس نے دُنیا پیدا کردی۔

درد سے نظریں اُٹھالینا، اپنے آپ کو کھو دینا دردرسیدہ کیلئے نشہ آور شادمانی ہے۔ ایک زمانہ میں مجھے دُنیا مست کردینے والی شادمانی، خود فراموشی نظر آئی تھی۔ دائمی غیر مکمل، دائمی تناقض کی مجسمہ صورت، اور غیر مکمل صورت، اپنے غیر مکمل خالق کیلئے نشہ آور شادمانی۔ ایک زمانہ میں مجھے دنیا اس طرح کی معلوم ہوئی تھی ایک مرتبہ میں نے بھی انسان کی ذات سے بلند خیال دوڑایا تھا۔ تمام مردانِ آخرت کی طرح یقیناً انسان سے بلند۔

بھائیو! خدا جس کو میں نے ہی پیدا کیا تھا، دوسرے تمام دیوتاؤں کی طرح انسانی عمل اور انسانی جنون تھا۔ وہ ایک انسان تھا اور محض "انسان" اور "من" کا ایک حقیر ٹکڑا۔ وہ بھوت میری ہی راکھ اور تپش میں سے نکل کر میرے پاس آیا تھا اور یقیناً دوسری دُنیا سے نہیں آیا تھا

بھائیو! کیا ہوا؟ میں نے اپنے آپ، ایک دردمند، پر غالب آگیا، میں اپنی راکھ پہاڑ پر لے گیا، میں نے دیکھتے ہوئے شعلہ کیلئے جدوجہد کی اور لو! فوراً ہی بھوت میرے پاس سے کھسک گیا۔

میرے لئے جو صحت پاچکا ہے ایسے بھوت پر اب بھی عقیدہ رکھنا درد اور تکلیف ہے۔ اب یہ میرے لئے غم ہے اور ذلت ہے۔ مردانِ آخرت سے میں نے کہا وہ تکلیف اور ناقابلیت تھی جس نے مردانِ آخرت کو پیدا کیا۔ وہ مسرت کا مختصر جنون تھا جس کا تجربہ فقط انتہائی

دردمند ہی بکتا ہے۔

ماندگی کی ایک ہی جست سے، موت کی جست سے، منتہی پر پہنچنے کی خواہشمند..... بےکس، جاہل، ماندگی نے جس کو ایک بار بھی اب عزم کی خواہش نہیں۔ تمام دیوتاؤں اور تمام مردانِ آخرت کو پیدا کیا ہے۔

بھائیو! یقین کرو، وہ جسم تھا جو جسم سے مایوس ہو گیا۔ اُس نے دیوانی روح کی انگلیوں سے آخری دیواریں ٹٹولیں۔

بھائیو! یقین کرو، وہ جسم تھا جو زمین سے مایوس ہو گیا ——— اُس نے ہستی کے بطن کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سُنا۔ اور پھر وہ سر کے بل ——— بس سر کے ہی بغیر ——— آخری دیواروں میں سے اُس دُنیا میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ دُنیا، انسانیت سے خارج دُنیا، غیر انسانی دُنیا، ایک سماوی لاشئے۔ انسانوں سے اچھی طرح چھپی ہے۔ اور ہستی کا بطن انسان سے بجز انسان ہونے کے بالکل مخاطب نہیں کرتا حقیقۃً پوری ہستی کو ثابت کرنا مشکل ہے، اُس سے بات کرا لینا سخت ہے، بھائیو! بتاؤ کیا سب سے زیادہ ثابت، سب سے زیادہ عجیب چیز نہیں؟ ہاں، یہ "من" خلاق باعزم، اشیاء کی قدریں معین کرنے والا "من" جو تمام چیزوں کا پیمانہ ہے ہر چیز کی قدر ہے؛ بایں تناقض و ابہام اپنی ہستی کے متعلق پھر بھی سب سے زیادہ راستبازانہ گفتگو کرتا ہے۔ یہ بہت ہی راست باز ہستی "من" ——— جسم کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اور ابھی تک جسم پر ہی دلالت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ محو ہوتا ہے، ہذیان بکتا ہے، اور شکستہ بازوؤں سے پھڑپھڑاتا ہے۔

"من" پیہم زیادہ ایماندارانہ گفتگو سیکھتا رہتا ہے، اور جتنا سیکھتا ہے، اُتنے ہی زمین کے القاب اور اعزاز اُس پر منکشف ہوتے ہیں۔ میرے "من" نے مجھے ایک نئی خودداری سکھائی ہے۔ وہی میں لوگوں کو سکھاتا ہوں۔ اب اپنا سر سماویات کے ریگ میں مت گاڑو اور اُس کو، ایک ارضی سر کو جو زمین میں معنی پیدا کرتا ہے بالکل آزاد لئے پھرو۔

میں ایک نیا عزم سکھاتا ہوں اُس پگڈنڈی کو اختیار کرو جس پر انسان آنکھیں بند کئے چلا ہے اور اُسی کو اچھا سمجھو۔ اور اب بیماروں اور
17 فنا ہونیوالوں کی طرح اُس سے مت بھٹکو۔

وہ بیمار اور فنا ہونے والے ہی تھے جنہوں نے جسم اور زمین سے نفرت کی، سماوی دنیا اور کفارہ کے قطرات لہو کو اختراع کیا مگر یہ شیریں اور المناک زہر بھی اُنہوں نے جسم اور زمین ہی سے حاصل کیا۔

انہوں نے اپنی بدبختی سے نکل بھاگنا چاہا، ستارے دور تھے، چنانچہ انہوں نے آہ سرد بھر کر کہا، کاش سماوی راستے ہوتے جن سے وہ چُپکے سے دوسری ہستی اور دوسری مسرت میں چلے جاتے۔ اور انہوں نے اپنے لئے غیر معروف راستے اور قطراتِ لہو ایجاد کئے۔

انہوں نے، اِن ناشکر گزار لوگوں نے اپنے آپ کو جسم اور زمین کی فضا سے علیحدہ تصوّر کیا، مگر اس علیحدگی کے کیف اور جذبہ میں بھی وہ کس کے مشکور ہیں؟ اپنے اور اسی جسم اور زمین کے۔

زرتشت ناتوانوں کے ساتھ نرم ہے، وہ اُن کی تسکین اور ناسپاسی کے طریقوں پر ناراض نہیں۔ کاش وہ صحتیاب اور فاتح ہو سکیں اور اپنے لئے بلندتر اجسام پیدا کر سکیں۔

زرتشت اُس صحتیاب شخص پر ناراض ہے، جو خود فریبیوں کو شفقت سے دیکھے اور آدھی رات کو اپنے خدا کی قبر پر چُپکے سے جائے ہاں اُسکے آنسو ابھی تک میری نظر میں بیماری اور ایک بیمار رفالب ہیں۔

اُن لوگوں میں ہمیشہ بہت سے ناتواں ہیں جو محو رہتے ہیں اور خدا کے لئے فنا ہوئے جاتے ہیں، وہ اہلِ بصیرت سے اور جدید ترین خوبی سے جس کا نام ہے راستبازی، سخت بغض رکھتے ہیں۔

وہ ہمیشہ پیچھے، تاریک دور کی طرف ٹکٹکی لگائے رہتے ہیں۔ اُس دور میں حقیقۃً خود فریبی اور عقیدہ دو مختلف چیزیں تھی۔ دماغی ہذیان تشبہ

باللہ تھا اور شک و شبہ گناہ ۔

ان مشابہ باللہ لوگوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ اُنہیں اپنے اوپر عقیدہ رکھے جانے کا اصرار ہے، اور شک و شبہ گناہ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ خود سب سے زیادہ کس چیز کے معتقد ہیں۔ وہ حقیقۃً آخرت اور قطرات لہو کے معتقد نہیں، بلکہ جسم کے ہی سب سے زیادہ معتقد ہیں خود اُن کا جسم اُن کے لئے فی نفسہٖ شئی ہے۔ مگر یہ اُن کیلئے ایک بیمار چیز ہے۔ اور وہ اپنی کھالوں سے بخوشی نکلنے کیلئے تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موت کے داعیوں کا وعظ سُنتے ہیں اور خود آخرت کی دعوت دیتے ہیں۔

بھائیو! بہتر ہے کہ تندرست جسم کی آواز سُنو۔ یہ زیادہ سچی اور صاف آواز ہے۔ صحیح، مکمل اور تندرست و توانا جسم سچی اور صاف آواز میں بولتا ہے۔ یہ زمین کے معنی کو بتاتا ہے۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۴)

جسم کی تحقیر کرنیوالے

مجھے اُن لوگوں سے بات کرنا ہے جو جسم کی تحقیر کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ از سرِ نو کوئی چیز سیکھیں۔ یا کوئی نئی چیز سکھائیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے جسموں کو الوداع کہیں —— اور ساکت ہو جائیں۔

"میں جسم و جان ہوں" بچہ کہتا ہے اور آدمی بچوں کی سی باتیں کیوں نہ کرے۔

مگر ایک ذی ہوش اور ذی فہم شخص کہتا ہے "میں جسم ہی ہوں اور اسکے علاوہ کچھ نہیں۔ جان صرف جسم سے متعلق کسی چیز کا نام ہے ۱۱۸
جسم ایک عظیم شعور ہے۔ ایک کثرت ہے بسیط حاسہ کے ساتھ، ایک جنگ و صلح، ایک گلہ اور گلہ بان۔

تیرا چھوٹا شعور بھی جس کو تو روح کہتا ہے، برادر! ایک آلہ ہے تیرے ہی جسم کا۔ تیرے بڑے شعور کا ایک چھوٹا سا آلہ اور کھلونا تو کہتا ہے "من"! اور تجھے اس لفظ پر فخر ہے۔ مگر وہ عظیم تر چیز جس کا تو یقین نہیں کرنا چاہتا —— تیرا جسم ہے اور اُسکا عظیم شعور۔

جو "من" کہتا نہیں بلکہ کرتا ہے۔

حاسہ جن چیزوں کا احساس کرتا ہے، روح جن چیزوں کا ادراک کرتی ہے اُنکا فی نفسہٖ کوئی مقصد اور منتہیٰ نہیں۔ مگر حاسہ اور روح بہت شوق سے تجھے (یہ سمجھنے کی) ترغیب دیتے ہیں کہ تمام چیزوں کا منتہیٰ ...... وہ ہیں۔ یہ اس قدر بر خود غلط ہیں۔

حاسہ اور روح آلات اور کھلونے ہیں۔ اُن کے عقب میں بہر کیف خودی ہے۔ یہی خودی حواس کی آنکھوں سے تلاش کرتی ہے اور روح کے کانوں سے سُنتی ہے۔ یہی موازنہ کرتی ہے، قابو پاتی ہے، فتح کرتی ہے، اور برباد کرتی ہے، یہی حکومت کرتی ہے اور یہی "من" پر حکمراں ہے۔ برادر! تیرے خیالات اور تیرے احساسات کے عقب میں ایک طاقت ور آقا ہے۔ ایک نامعلوم عاقل ہے اس کو خودی کہا جاتا ہے۔ وہ اس جسم میں ہے۔ وہ تیرا جسم ہے۔

تیرے جسم میں تیری بہترین دانش سے زیادہ شعور ہے پھر معلوم نہیں کہ تیرے جسم کو خاص طور سے بہترین دانش ہی کی کیوں ضرورت ہے! خودی تیرے "من" اور اُسکی فخریہ جست و خیز پر ہنستی ہے "میرے سامنے ان جولانیوں کی اور خیالات کی ان روانیوں کی کیا ہستی ہے؟" وہ اپنے آپ ہی کہتی ہے "میرے مقصد کا ایک غیر معروف راستہ ہے "من" کی مہار اور اُسکے خیالات کی محرک میں ہوں"۔

خودی "من" سے کہتی ہے "یہاں درد محسوس کر" وہ اسی وقت مبتلا ہوجاتا ہے اور غور کرتا ہے کہ کس طرح نجات پائے۔ اور اُس کے غور و فکر کا یہی مقصد ہے۔ خودی کہتی ہے "لذّت اندوز ہو" من اُسی وقت خوش ہونا شروع کر دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کون سے طریقے ہیں جن سے وہ اکثر خوشی حاصل کرے اور اُسکے غور و فکر کا یہی مقصد ہے۔

میں ان لوگوں سے جو جسم کی تحقیر کرتے ہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کی تحقیر کا سبب توقیر ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس نے توقیر، تحقیر، قدر، اور عزم پیدا کئے؟ خلاّق خودی نے ہی اپنے لئے تحقیر اور توقیر پیدا کی۔ اُس نے اپنے واسطے رنج و راحت بنائے۔ اور جس کو بطورِ آلۂ عزم، خلاّق جسم نے اپنے لئے پیدا کیا۔

جسم کی تحقیر کرنے والو! تم تحقیر اور حماقت میں بھی خودی کے ہی خادم ہو۔ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ مرنا اور زندگی سے مُنہ موڑنا تمہاری اس خودی ہی کی خواہش ہے۔

اب تمہاری خودی اپنے محبوب ترین کام کے۔ اپنے آپ سے ماوراء کسی تخلیق کے قابل نہیں۔ اُسکی سب سے بڑی خواہش یہی ہے۔ اُس کی پوری سرگرمی یہی ہے۔

مگر اس کے لئے اب ایسا کرنا بعد از وقت ہے:۔ جسم کی تحقیر کرنیوالو! اس طرح تمہاری خودی فنا ہونا چاہتی ہے۔

تمہاری خودی فنا ہونا چاہتی ہے اور یہ وجہ ہے تمہارے جسم کی تحقیر کرنے کی۔ کیونکہ اب تم اپنے سے برتر کی تخلیق کے قابل نہیں رہے زندگی اور زمین سے تمہاری ناراضگی کی یہی وجہ ہے، تمہاری نفرت کی انعطافی نظر ایک غیر شعوری رشک کی حامل ہے۔

جسم کی تحقیر کرنیوالو! مجھے تمہارا راستہ چلنا نہیں۔ مافوق البشر کیلئے تم میر اُپل نہیں۔

زرتشت نے یہ تقریر کی:۔

باب (۵)

شادمانیاں اور ولولے

بھائی! تجھ میں کوئی خوبی ہے اور وہ تیری ذاتی ہی ہے۔ تو پھر وہ تجھ میں اور کسی دوسرے میں عام نہیں۔

تو یقیناً اُسے کسی نام سے موسوم کرنے گا، پیار کرے گا اور کھیل میں اُسکے کان کھینچے گا اور اُس سے دل بہلائے گا۔

اور دیکھ! کہ نام رکھنے میں ہی تیرا عوام سے اشتراک ہوگیا اور تو عوام کے گلّے کا فرد بن گیا۔

تیرے لئے یہ کہنا بہتر ہوتا جو میری جان کیلئے الم اور حلاوت ہے، میرے احشاء کی اشتہا ہے، ناقابل بیان اور بے نام ہے، تیری خوبی ناموں کے اختلاط سے کہیں برتر ہونی چاہئے، اگر اُسکے متعلق کچھ کہنا پڑے تو لکنت سے شرم نہ کرنی چاہئے۔

اس طرح کہو اور لکنت کرو "یہ میری خوبی ہے" مجھے اس سے محبّت ہے۔ وہ اس حیثیت میں مجھے کلیۃً پسند ہے۔

مجھے فضیلت اسی حیثیت میں مرغوب ہے۔

خدائی قانون کے ماتحت مجھے اُس کی خواہش نہیں نہ میں انسانی قانون یا انسانی ضرورت کے ماتحت اُس کا خواہشمند ہوں۔ مجھے یہ بطور عالم بالا کی یا بہشت کی راہنما کے درکار نہیں۔

جس سے میں محبت کرتا ہوں ارضی خوبی ہے۔ اس میں دُور اندیشی کم ہے اور عام سمجھ سب سے کم۔
چونکہ اس پرندے نے میرے قریب اپنا نشیمن بنایا ہے، لہذا مجھے اس سے محبت ہے اور میں اُسے دل سے لگائے رکھتا ہوں۔
اب وہ میرے قریب ہی اپنے زریں انڈوں پر بیٹھتی ہے۔
اس طرح تمہیں لکنت کرنا چاہئے اور اپنی خوبی کی تحسین کرنی چاہئے۔
ایک زمانے میں تجھ میں ولولے تھے جنہیں تو ذلیل کہتا تھا۔ مگر اب تجھ میں صرف خوبیاں ہیں جو تیرے ولولوں میں سے ہی پھوٹ نکلی ہیں۔
تو نے انہیں کے قلب میں بلند نصب العین رکھا اور وہ خوبیاں اور شادمانیاں بن گئیں ہیں۔
اگرچہ تو نسلاً گرم مزاج، نفس پرست، متعصب یا کینہ پرور تھا؟
مگر آخر میں تیرے تمام ولولے خوبیاں اور تیرے تمام شیاطین فرشتے ہو گئے۔
ایک زمانہ میں تیری کوٹھری میں وحشی کُتے تھے لیکن آخر میں وہ چڑیاں اور دلکش گائنیں بن گئے۔
زہر کو تو نے بلسان بنالیا۔ تیری افسردگی کی گائے جسے تو دوہتا تھا، اب اُسکے تھنوں کا تو شیریں دودھ پیتا ہے۔
خوبیوں کی کشمکش سے پیدا ہونیوالی بدی کے علاوہ تجھ میں بدی پیدا نہیں ہوتی۔
برادرِ من! اگر تو خوش نصیب ہے تو بس ایک خوبی رکھے گا، ایسی صورت میں پُل سے بسہولت گذر جائیگا۔
بہت سی خوبیاں بیان کرلینا تابناک سہی، لیکن ایک سخت قسمت ہیں۔ بہت سے لوگ خوبیوں کی جنگ اور اُن کے میدان جنگ بننے سے تنگ آکر صحرا میں نکل گئے اور اپنے آپ کو ہلاک کرلیا!
برادرِ من! کیا جنگ اور معرکے بدیاں ہیں؟ بہرکیف یہ بدی ضرور ہے۔ حسد، بے اعتمادی اور چغلخوری خوبیوں میں ناگزیر ہے۔
دیکھ! تیری ہر خوبی بلند ترین مقام کی کیسی حریص ہے۔ وہ تیری پوری روح کو اپنا ہراول بنانا چاہتی ہے۔ وہ غضب، کینہ اور محبت میں (بلا شرکت غیر) تیری پوری طاقت چاہتی ہے۔
ہر خوبی دوسری خوبیوں سے رشک کرتی ہے اور رشک خوفناک چیز ہے۔ خوبیاں بھی رشک کے ہاتھوں فنا ہو سکتی ہیں۔
جب رقابت کا شعلہ کسی پر محیط ہو جاتا ہے تو آخر میں بچھو کی طرح زہر کا بھرا ڈنک خود اپنے ہی مار لیتا ہے۔
برادر! کیا تو نے خوبی کو کبھی اپنی ہی چغلی کھاتے اور اپنے ہی ڈنک مارتے نہیں دیکھا؟
انسان ایسی چیز ہے جس سے ترقی کرتا ہے اور اسی وجہ سے تجھ کو اپنی خوبیوں سے محبت کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ تو ان کی خاطر فنا ہوگا۔
زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۶)

زرد رو مجرم

ججو! اور قربانی کرنے والو! تم اس وقت تک قتل کرنا نہیں چاہتے جبتک جانور اپنا سر نہ جھکا دے؟ لو! زرد رو مجرم نے اپنا جھکا دیا۔ اُسکی حقارت بھری آنکھ کہتی ہے: "میرا 'من' یہ ایسی چیز ہے جس سے ترقی کرنا ہے، انسان سے میری بڑی حقارت میرا"

ہے .... اس آنکھ کے ذریعہ سے وہ یہ کہتا ہے -

"وہ اس کا اعلیٰ ترین لمحہ تھا جب اُس نے خود فیصلہ کیا تھا کہ اُس کو پھر پستی میں نہ جانے دو"

اُس آدمی کو جو خود اپنی ذات سے تکلیف اُٹھا رہا ہو، ایک تیز گام موت کے سوا نجات نہیں۔

جج و! تمہارا قتل رحم ہونا چاہئے، نہ کہ انتقام، اور قتل کرو تو اس کا اطمینان کر لو کہ تم خود بھی زندگی کو حق بجانب ثابت کرتے ہو۔

محض اُس سے مصالحت ہی کافی نہیں۔ جسے تم قتل کر رہے ہو۔ تمہارے تاسف کو مافوق البشر کی محبت ہونا چاہئے۔ تم اس طرح خود اپنی محبت کو جائز بنا سکو گے۔

"دشمن" کہو "بدمعاش" نہیں "مریض" کہو، لیکن "مردود" نہیں "احمق" کہو، لیکن "گنہگار" نہیں۔

اور اے سُرخ جج! اگر تو وہ سب کچھ آواز سے کہدے۔ جس کا تو تخیل میں ارتکاب کر چکا ہے تو ہر شخص چلا اُٹھے گا "اس نجاست اور زہریلے کیڑے کو دور کرو"

لیکن خیال ایک چیز ہے، عمل دوسری چیز اور عمل کا تصور ایک علیحدہ چیز ہے۔ ان میں علت و معلول کا چکر نہیں گھومتا۔ تصور اُس زرد شخص کو زرد بناتا ہے۔ عمل کرتے وقت تو وہ عمل کیلئے موزوں تھا۔ لیکن ہو چکنے کے بعد اُسکے تصور کو برداشت نہ کر سکا۔

اب وہ متواتر اپنے آپ کو مرتکب جرم سمجھتا ہے۔ میں اس کو جنونی کہتا ہوں۔ استثنا اُسکے لئے اُلٹا قانون بن گیا۔

لکیر مرغی کو مسحور کرتی ہے۔ اُس کی لگائی ہوئی ضرب نے اُسکی کمزور سمجھ کو مسحور کر دیا۔ میں اس کو جنون بعد از عمل کہتا ہوں۔

جج و! سنو، علاوہ ازیں ایک جنون اور بھی ہوتا ہے اور یہ قبل از عمل ہے۔ آہ! تم جان کی گہرائیوں میں کافی حد تک نہیں پہنچے۔

سُرخ جج کہتا ہے "اس مجرم نے قتل کیوں کیا؟ یہ تو لوٹنا چاہتا تھا" میں تم سے کہتا ہوں اسکی جان خون کی پیاسی تھی نہ کہ غنیمت کی۔

۱۲۱ وہ خنجر زنی کی مسرت کا پیاسا تھا۔ لیکن اُس کی کمزور فہم اُس جنون کو نہ سمجھی اور اس کو ترغیب دی۔

"خون میں کیا اہمیت ہے" اُس نے کہا "کم از کم تم اس سے مال غنیمت کا انتقام لینے کے تو خواہاں نہیں؟"

اُس نے اپنے کمزور فہم کی بات مان لی۔ یہ الفاظ اُسکے لئے سیسہ کی طرح وزنی تھے۔ قتل کر چکنے کے بعد اُس نے فوراً لوٹ لیا۔ وہ اپنے جنون پر نادم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اب پھر اُس پر اُسکے جُرم کا بار ہے۔ اور پھر اُسکی فہم ٹھٹھرائی ہوئی، مفلوج اور موٹی ہو گئی ہے۔

وہ اپنے سر کو فقط ہلا سکتا تو اُسکا بوجھ لڑھک جاتا، لیکن سر ہلائے کون؟

یہ آدمی کیا ہے؟ بیماریوں کی ایک پوٹ، جو روح کے ذریعہ دُنیا میں پہنچتی ہے اور یہاں اپنا شکار کرتی پھرتی ہے۔ یہ آدمی کیا ہے؟ جنگلی سانپوں کی ایک ڈھیری، جو بہت ہی کم آشتی سے رہتے ہیں، وہ متفرق طور پر نکل پڑتے ہیں اور دُنیا میں شکار تلاش کرتے ہیں۔ اسی بیچارہ جسم کو دیکھو۔ اس نے جو تکلیف برداشت کی اور جو آرزو کی جان نے خود بخود اُسکی ترجمانی کی۔ اُس نے قاتلانہ خواہش اور شوق خنجر زنی کے بھیس میں ترجمانی کی۔ اُس شخص پر جواب نڈھال ہوا چاہتا ہے، اُس بدی کا غلبہ ہے جو اب بدی ہے۔ وہ اُسی چیز سے تکلیف دینا چاہتا ہے، جو اُسے تکلیف دیتی ہے۔ لیکن دوسرے دور بھی گزر چکے اور دوسری قسم کے خیر و شر بھی۔

ایک زمانہ میں شک اور عزم للنفس شر تھا۔ اس زمانہ میں مریض ملحد یا ساحر کہلائے جاتے تھے اور ملحد یا ساحر کی حیثیت میں تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اور تکلیفیں پہنچانا چاہتے تھے۔

لیکن یہ تمہارے کانوں میں نہیں پہنچے گا۔ "یہ تمہارے نیک لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے" تم کہتے ہو، مگر مجھے تمہارے نیک لوگوں سے کیا سروکار۔

تمہارے نیک لوگوں کی بہت سی باتوں سے مجھے گھن آتی ہے۔ لیکن وہ باتیں اُن کی بدیاں نہیں، کاش اُن میں ایک جنون ہوتا جس کے ہاتھوں وہ اُس زرد مجرم کی طرح فنا ہو جاتے۔

میری تمنا ہے کہ کاش اُن میں صداقت، وفاداری، یا انصاف کا جنون ہوتا۔ لیکن اُن کی خوبی کا مدار تو زیادہ زندہ رہنے پر اور منحوس خاطر جمعی پر ہے۔ میں سیلاب کے کنارہ ایک بارجہ ہوں جو پکڑ سکتا ہے پکڑے، میں تمہاری بیساکھی نہیں۔

زردشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۷)

نوشت و خواند

تمام لکھی ہوئی چیزوں میں مجھے صرف وہ پسند ہیں جنہیں کوئی اپنے خون سے لکھتا ہے، خون سے لکھ اور تجھے تجربہ ہو جائیگا کہ خون روح ہے۔

غیر مانوس خون کو بسہولت سمجھنا ممکن نہیں۔ مجھے آرام طلب پڑھنے والوں سے نفرت ہے۔

جو پڑھنے والے کو جانتا ہے۔ پڑھنے والے کیلئے کچھ اور نہیں کرتا۔ پڑھنے والوں کی ایک صدی اور۔۔۔

اور خود روح میں سے تعفن اُٹھنے لگے گا۔

ہر شخص کو پڑھنا سیکھنے کی اجازت آخر میں نہ صرف تحریر کو بلکہ تفکر کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔

ایک زمانہ میں روح خدا تھی پھر انسان ہوگئی۔ اور اب یہ عامی تک ہوئی جاتی ہے۔

خون سے تمثیلیں لکھنے والا یہ نہیں چاہتا کہ اُن کو پڑھا جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اُن کو حفظ کیا جائے۔

پہاڑوں میں قریب ترین راستہ چوٹی چوٹی ہے۔ لیکن اسکے لئے لانبے لانبے پاؤں چاہئیں۔ تمثیلیں چوٹیاں ہونی چاہئیں اور مخاطبین بڑے اور لانبے۔

فضا نادر اور صاف، خطرہ قریب۔ اور روح، پُر لطف شرارت سے پُر چیزیں اس طرح خوب میل کھاتی ہیں۔ میں اپنے گرد خبیث روحیں چاہتا ہوں، کیونکہ میں جری ہوں۔ جو جرأت بھوتوں کو ڈرا بھگاتی ہے وہ اپنے لئے خبیث ارواح پیدا کر لیتی ہے۔ وہ ہنسنا چاہتی ہے۔

اب میرا تمہارا ساتھ نہیں، یہ کالے کالے، بھاری بادل جنہیں میں اپنے نیچے دیکھتا ہوں اور جن پر میں ہنستا ہوں، تمہارے لئے وہ طوفانی بادل ہیں۔ جب تمہیں رفعت کی خواہش ہوتی ہے تم اوپر دیکھتے ہو اور میں نیچے۔ اس لئے کہ میں ارفع ہوں۔

تم میں کون بیک وقت ہنس سکتا ہے اور بلند ہو سکتا ہے؟

جو سب سے اونچے پہاڑوں پر چڑھ جاتا ہے وہ ہر قسم کے المناک کھیلوں اور المناک حقائق پر ہنستا ہے، بے دھڑک، پُر تحقیر، شدید عقل ہمیں ایسا چاہتی ہے۔ وہ عورت ہے اور ہمیشہ جنگجو سے محبت کرتی ہے۔

تم مجھ سے کہتے ہو "زندگی برداشت کرنا مشکل ہے۔" لیکن تمہاری صبح کی خودداریاں اور شام کی دست برداریاں کس کام کی ہیں؟ زندگی برداشت کرنا سخت ہے۔ میرے سامنے اتنی نزاکت مت جتاؤ۔ ہم سب اچھے خاصے بار برداری کے گدھے اور گدھیاں ہیں، ہم میں اور گلاب کی اُس کلی میں کیا مناسبت، جو شبنم کے ایک ہی قطرہ سے لرزنے لگتی ہے؟

یہ سچ ہے کہ ہم زندگی سے محبت کرتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ ہم زندہ رہنے کے عادی ہیں بلکہ اس لئے کہ محبت کے عادی ہیں محبت میں ہونا کچھ نہ کچھ جنون ہوتا ہے۔ لیکن جنون میں بھی عموماً کچھ نہ کچھ ہوشیاری ہوتی ہے۔

اور مجھے بھی جو زندگی کا قدرشناس ہے تتلیاں صابون کے بلبلے، اور ہم میں کی ان جیسی چیزیں سب سے زیادہ مسرت ہی سے لطف اندوز معلوم ہوتی ہیں۔ ان سبک، سادہ لوح، نازک اور زندہ دل، ننی ننی روحوں کی ادھر اُدھر چہل پہل زرتشت کو گریہ و نغمہ پر مائل کرتی ہے۔

میں تو صرف ایسے خدا کا قائل ہونگا جو رقص کرنا جانتا ہو۔

اور جب میں نے اپنے شیطان کو دیکھا اُسکو سنجیدہ، کامل گہرا، رسم پرست پایا، وہ روح تھا متانت کی۔

اُسکی وجہ سے ہر چیز گر جاتی ہے۔ غصہ نہیں بلکہ مضحکہ قتل کرتا ہے۔ آؤ متانت کی روح کو قتل کردیں۔

میں نے جب سے چلنا سیکھا، دوڑتا رہا، جب سے اُڑنا سیکھا۔ حرکت میں دوسروں کے ڈھکیلنے کا محتاج رہا۔

اب میں سبک ہوں۔ اب میں دوڑتا ہوں۔ اب میں اپنے آپ سے نیچا معلوم ہوتا ہوں۔ اب میرے اندر ایک خدا رقصاں ہے۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب (۸)

پہاڑی کا درخت

زرتشت کی آنکھ نے تاڑ لیا تھا کہ ایک جوان اس سے اپنی جان چھپا رہا ہے۔ ایک روز شام کو وہ یکہ و تنہا "مقر ابلق" کو محیط پہاڑیوں پر جا رہا تھا کہ دفعۃً راہ میں وہ جوان ایک درخت کے سہارے بیٹھا تھکی نظروں سے وادی کو تکتا ہوا نظر پڑا۔ ۱۲۴

زرتشت نے اُس درخت کو پکڑ کر جسکے پاس وہ جوان بیٹھا تھا کہا "میں اپنے ہاتھوں سے اس درخت کو ہلا دوں، ممکن نہیں لیکن ہوا جسے ہم نہیں دیکھتے اس کو پریشان کرتی ہے اور جدھر چاہتی ہے جھکا دیتی ہے۔ ہم غیر مرئی ہاتھوں سے بہت بری طرح جھکائے جاتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں۔

وہ جوان گھبرا کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا "مجھے زرتشت کی آواز آرہی ہے اور ابھی ابھی میں اُسی کا خیال کر رہا تھا۔"

زرتشت نے جواب دیا۔

"اس سے ڈرتا کیوں ہے؟ مگر انسان کی حالت بھی درخت کی سی ہے۔

جتنا زیادہ وہ بلندی اور روشنی میں اُٹھنا چاہتا ہے اُتنی ہی زیادہ شدت سے اُس کی جڑیں زمین کی طرف جدوجہد کرتی ہیں۔ پستی کی طرف، تاریکی اور گہرائی میں۔ بدی میں۔"

"ہائیں، بدی میں؟" جوان چلا اُٹھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ تو میرے نفس کو پا گیا؟"

زرتشت مسکرا کر بولا "انسان اکثر نفوس کو تخلیق کئے بغیر دریافت نہیں کر سکتا۔"

"ہائیں، بدی میں!" جوان پھر چلا اُٹھا۔

"زرتشت تو نے سچ کہا۔ جب سے میں نے بلندی پر پہنچنا چاہا۔ نہ خود مجھے اپنے اوپر اعتماد رہا اور نہ دوسروں کو یہ کیوں؟

میں بہت تیزی سے بدل رہا ہوں میرا "امروز" "دیروز" کی تردید ہے۔ میں اکثر چڑھنے میں سیڑھیاں پھلانگ جاتا ہوں۔ اور اس کو کوئی سیڑھی معاف نہیں کرتی۔

میں اونچا ہوتا ہوں تو ہمیشہ اپنے آپ کو یکہ و تنہا پاتا ہوں۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ تنہائی کا پالا مجھے کپکپا دیتا ہے۔ آخر اوپر میرا کیا کام؟

میری تحقیر اور آرزو ساتھ ساتھ بڑھتی ہیں میں جتنا اونچا چڑھتا ہوں اُتنا ہی چڑھنے والے کی تحقیر کرتا ہوں۔ آخر اوپر اُسکا کیا کام؟؟؟

میں اپنے چڑھنے اور ٹھوکر کھانے سے کتنا شرمندہ ہوں، میں بُری طرح سانس پھول جانے کا کس قدر مضحکہ اُڑاتا ہوں۔ میں اُڑنے والے سے کتنا جلتا ہوں۔ میں بلندی پر کس قدر ماندہ ہوں"

یہاں جوان خاموش ہو گیا، زرتشت نے اُس درخت کا دھیان کر کے جس کے قریب وہ کھڑے تھے کہا:۔

"یہ درخت یہاں پہاڑی پر یکہ و تنہا کھڑا ہے۔ یہ انسان اور جانوروں سے بہت اونچا اُگا ہوا ہے۔

اور اگر یہ بات کرنا چاہے تو بھی یہاں اُسکی بات سمجھنے والا کوئی نہیں۔ یہ اتنا اونچا اُگا ہے:۔

اب یہ پیہم انتظار کرتا ہے۔ کس کا انتظار؟ یہ بادلوں کے مستقر سے بہت ہی قریب رہتا ہے۔ غالباً یہ پہلی برق کا منتظر ہے؟"

زرتشت یہ کہہ چکا تو وہ جوان بھڑک کر چلا اُٹھا "ہاں زرتشت تو سچ کہتا ہے۔ میری خواہش عروج، خواہش تھی میری تباہی کی اور جس کا مجھے انتظار تھا وہ تو ہے۔

دیکھ جب سے تو نے ہم میں ظہور کیا ہے میں کیا ہو گیا؟ یہ تجھ سے میرا رشک ہے جس نے مجھے برباد کر دیا"

جوان یہ کہہ کر زار زار رونے لگا، زرتشت نے اپنا بازو اُس کے گرد ڈال دیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔

اور جب وہ کچھ دیر ساتھ ساتھ چل چکے۔ زرتشت نے کہنا شروع کیا۔

یہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ تیری آنکھیں تیرے خطروں کا الفاظ سے بہتر اظہار کرتی ہیں۔

ابھی تو آزاد نہیں۔ تجھے ابتک آزادی کی تلاش ہے۔ تیری جستجو نے تجھے بہت بے خواب اور شب بیدار بنا دیا ہے تو کھلی بلندی پر پہنچنا چاہتا ہے، بلکہ تیری جان ستاروں کی پیاسی ہے، لیکن تیرے بُرے میلانات بھی آزادی کے پیاسے ہیں۔

تیرے وحشی کتے آزادی چاہتے ہیں۔ تیری روح تمام قیدیں توڑنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنی کوٹھریوں میں خوشی سے بھونکنے لگتے ہیں

میرے نزدیک تو اب تک قیدی ہے۔ جو آزادی کی تدبیر سوچتا ہے آہ! ایسے قیدیوں کی جان تیز ہو جاتی ہے لیکن مکار اور شریر بھی جس کی روح رہا ہو چکی ہے اس کو بھی اپنا تزکیہ ضروری ہے۔ اُس میں ابھی تک قید خانے کا بہت کچھ اثر اور پھپھوندی باقی ہے، اُسکی آنکھ ابھی تک صفائی کی محتاج ہے۔

ہاں! میں تیرا خطرہ سمجھتا ہوں، لیکن تجھے میری محبت اور امید کا واسطہ، محبت اور امید کو مت چھوڑ۔ اب تک تو اپنے آپ کو شریف معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی جو تجھ سے عداوت رکھتے ہیں اور قدسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب تک تجھے شریف سمجھتے ہیں۔ یاد رکھ کہ شریف ہر ایک کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔

یاد رکھ کہ شریف ہر ایک کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔

شریف آدمی نیکوں کے راستے میں بھی حائل ہوتا ہے اور وہ اس کو نیک کہتے بھی ہیں تو اُن کا مقصد اُس کو ایک طرف کرنا ہوتا ہے۔

شریف آدمی جدید چیزوں کی اور جدید خوبی کی تخلیق کرتے ہیں۔

نیک آدمی قدیم چیزوں کا تحفظ چاہتا ہے۔

شریف آدمی کا نیک ہو جانا خطرہ نہیں بلکہ گستاخ، طعنہ زن اور تباہ کن ہو جانا خطرناک ہے۔

آہ! میں ایسے شریف آدمیوں سے بھی واقف ہوں جو اپنی اعلیٰ آرزوؤں کو ضائع کرنے تمام بلند امیدوں کو بدنام کرنے لگے اور وقتی لذت میں بے شرمی سے بسر کرنے لگے۔ "امروز" سے آگے مشکل سے ہی اُن کا کوئی نصب العین ہوتا ہے۔"

"روح بھی نفس پرستی ہے" یہ کہکر انہوں نے اپنی روح کے بازو توڑ ڈالے۔ وہ اب رینگتی پھرتی ہے اور جسپر دانت لگاتی ہے نجس کر دیتی ہے۔ کسی زمانہ میں اُن کو سورما بن جانے کا خیال تھا لیکن آج وہ نفس پرست ہیں اور وہی سورما اُن کیلئے تکلیف اور دہشت ہے۔

لیکن تجھے میری محبت اور امید کا واسطہ، اپنی روح کے سورما کو علیحدہ مت کر۔ اپنی اعلیٰ امید کو مقدس سمجھ۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

(باقی) (جملہ حقوق محفوظ)

کیفِ ابدی

(شیخ حسام الدین صاحب حسام لکھنوی)

۱۲۵ نہ خطائے دیدۂ شوق ہے نہ دخیل کوئی نقاب ہے — سببِ قصورِ مشاہدہ فقط اعتبارِ حجاب ہے

میں اگر ہوں چپ تو ہے کیا برا مری خامشی کو ہو کیوں گلہ — مری بے نیازئ مدعا تری غفلتوں کا جواب ہے

غم یاس دہر کی تلخیاں، گئیں جوشِ عشق میں رائگاں — جو خمار سے نہ ہو آشنا مرے جام میں وہ شراب ہے

جو شباب حسن ہو مضطرب، تو ہے پردہ کوشش رائگاں — جو عیاں رہا وہ جمال ہے جو ہٹا رہا وہ نقاب ہے

غم ہجر و عشق کی کشمکش کہ خلش ہے موت و حیات کی — مری صبح روزِ الست ہے، مری شام روزِ حساب ہے

وہ حسام وحشئ باوفا کبھی جس سے تم کو بھی انس تھا\
تمہیں یاد تک جو نہیں رہا یہ وہی تو خانہ خراب ہے

محبّت کے نامے ـــــ بنامِ محبت!؟

زہے فیضِ کیفِ تمامِ محبّت — عداوت ہے مجھ کو پیامِ محبّت

یہ دُنیا زمانوں کی قیدی نہیں ہے — نہ صبحِ محبّت، نہ شامِ محبّت

نگاہیں پیامی، ادائیں ہیں قاصد — دیئے جا رہے ہیں پیامِ محبّت

یہ کس کی نگاہوں سے جنّت سی برسی — مہک دے رہا ہے مشامِ محبّت

کلیمِ محبّت ہیں نمناک آنکھیں — ہیں نازک سے آنسو کلامِ محبّت

مری آرزوئیں وفا کی شکاری — پرستاریاں میری دامِ محبّت

محبّت ہمیشہ محبّت رہے گی — نہ بدلا، نہ بدلے نظامِ محبّت

خدا کیلئے آؤ، گھل مل بھی جاؤ — عداوت نہیں انتقامِ محبّت

وہ لغزیدہ لغزیدہ آنا کسی کا — بہکتا ہوا سا خرامِ محبّت

کنکھیوں سے تجدیدِ پیمانِ الفت — وہ نیچی نظر سے سلامِ محبّت

شرابی تبسّم، چھلکتی سی آنکھیں — مجسّم ہیں ساغر وہ جامِ محبّت

(مارچ ۱۹۳۹ء)

ساغر

بادِ جنوب

جنوبی ہند کی ایک شاعرہ کے لطیف جذبات

FRIENDSHIP

(For Asia)

The sacred flame of friendship lights
Life's lovely darkend deapths,
T'is the vital spark of life
That shines in life's eternal strife.
How deep and sweet a friends caress,
A balm to those who face distress
Each kindly word a ray of hope.
To those whose hands in darkness grope,
T'is again a friend's true love,
That lifts our souls to God above,
To tune our lives to friend's concord
The greatest blessing of the Lord.
Scorn not therefore a loyal heart
That nobly loves its friend throughout.

2nd November 36
P. R. Paru Kutty Amma.

(از محترمہ مس پارو کٹی اَماں)

(ترجمہ)

دوستی

دوستی کا مقدس شعلہ حیات کی تاریک گہرائیوں
کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ زندگی کی قوی چنگاری ہے
جو حیات کی ابدی کشمکشوں میں چمکتی ہے۔ دوست
کی محبت کس قدر اثر پذیر اور لطیف ہوتی ہے۔ یہ مرہم
ہے اُن دلوں کا جو مصیبت سے مجروح ہوں۔ ہر
مہر آگیں لفظ اُن لوگوں کیلئے جو تاریکیوں میں غلطاں
ہوں امید کی ایک کرن ہے۔ یہ محض دوست کی سچی
محبت ہے جو ہماری روح کو خدا سے ملا دیتی ہے
دوست سے زندگی کی ہم آہنگی خدا کی عظیم ترین
قسمت ہے۔ اس لئے اس وفا پرور دل کی تحقیر
نہ کرو جو اپنے دوست سے محبت کرتا ہے۔

(یحییٰ)

WAIT.

The rippling sound of waves,
The soft cool breeze that blows
The bright red sun that sets,
The fading twilight veil,
The deep dense gloom of dusk
That keeps each soul spell bound,
The warbling cry of birds,
The calm of blooming buds,
Teaches each this soul to wait,
Wait till death for love,
From there where first I laid,
My true bnt silent love.

P. R. Paru Kutty Amma.

(۲)

(ترجمہ)

انتظار

سمندر کی موجوں کی سرسراہٹ، بادِ نسیم کا
تموّج، غروب ہونے والا روشن سرخ آفتاب،
غائب ہو جانے والی نقابِ شفق، جھٹ پٹے کی
مسحور کن تاریکیاں، طیور کی زمزمہ سنجی اور
شگفتہ کلیوں کا سکوت ان میں سے ہر ایک
انتظار کی تلقین کرتا ہے تاکہ انتظار کئے جائیں۔
محبت کیلئے موت تک اس جگہ سے جہاں میں نے
اپنی سچی مگر خاموش محبت کی ابتدا کی۔

ہزار داستان

بادۂ مشرق



ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء
جنوری۔ فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء
(مشترکہ نمبر)

اردو ادب کی مقبول ترین کتاب
جسکا اردو ایڈیشن ۵۰۰۰ ہزار کی
تعداد میں فروخت ہوچکا
اور ہندی ایڈیشن زیر طبع ہے

مایا

(از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

(بطور خاص "ایشیا" کیلئے)

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ سُرگباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ بی اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ رادھا جو پرانے خیال کی ماں تھی اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی۔ جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو کہتی "دونوں ابھی ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہیں۔ بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ عیش و آرام کیلئے ابھی ساری عمر پڑی ہے"۔ چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام سکھا رہی تھی اور پاربتی کا سارا دن رسوئی اور بھنڈار خانہ اور ٹھاکر جی ہی کے گھر میں گزرتا تھا۔ رات کو بھی رادھا اپنی بہو کو اپنے پاس سُلاتی تھی جیسے کوئی لاپرواہ مالی گنّے کا رس خوب چوس چوس کر پئے اور بچہ دور سے دیکھ کر للچائے۔ وہی حال بسنت کا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی بیوی کا رس گرہستی کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اُس میں جرأت نہ تھی۔ مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ سعادتمندی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی۔ آخر ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ بسنت اپنے کمرہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یکبارگی اُس کے کانوں میں آواز آئی۔

"گئیاں برجائے ایسی ہوری اُن بن دیکھے جبرت موری"

گاؤں میں اُس نے اکثر لوگوں کو پھگوا گاتے سُنا تھا مگر اِس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت۔ "گئیاں برجائے ایسی ہوری ان بن دیکھے جبرت موری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا گیت میں لڑکیاں اُس کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ پھر دوسری ہولی شروع ہوئی۔

"ہوری آئی سجن ناہیں آئے دیکھو شیام ہمارے پردیسوا میں چھائے رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیا سنگ ہنس ہنس گر دا لگائے سو نہ آوے یاد بلم کی عبیر و گلال نہ بھائے ہوری آئی سجن"

اب وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا لیکن اُسے پینے کی اجازت نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہ کر سکتا تھا۔ ماں تو پرانے خیال کی ہے لیکن وہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اور پھر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اُس کی ماں سو رہی تھی بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں۔ وہ رسوئی گھر میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اُس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بُلایا۔ اُس نے سوچا" پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے" مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی۔ لیکن آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی ——— " آج ان کو کیا ہو گیا ہے ——— مجھے کیوں بُلاتے ہیں ——— ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں ——— اگر میں ان کا حکم نہ مانوں گی تو وہ ناراض ہو جائیں گے ——— اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اُٹھیں تو ——— پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا۔ اُس نے کہا" اجی سُنتی ہو یا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ ——— " یہ کہتا ہوا بسنت چھت پر چلا گیا ——— پاروتی سہمی ہوئی اٹھی اور ساس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہنچ گئی۔

" کھڑی کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

" جی ———"

" میں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم جی! جی! کی رٹ لگا رہی ہو۔"

" اگر ماں جی جاگ اٹھیں اور انھوں نے مجھ کو یہاں دیکھ لیا تو بڑی بُری بات ہوگی۔"

" یعنی مجھ سے ملنا بُری بات ہے۔ کیا خوب کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہو نا آخر دیہاتن؟

" لیکن اب تک نہ ملے یہ کس کی بیوقوفی تھی۔ میں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا۔"

بات معقول تھی لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے انھوں نے کہا" خیر فضول بحث کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ سُنو اور غور سے سُنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا۔ لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب میں چاہتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو اور میرا دل بہلاؤ۔" اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھا لیا۔ ۱۳۴

گونا ہونے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو۔ شرم و لجاجت کے ڈر سے وہ کانپنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا ——— ٹھیک اُسی وقت رادھا جو جاگ اٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اوپر پہنچی۔ کمرے کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی رادھا کچھ اس طرح چونک اٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو ——— دوپہر کو روشنی میں یہ نظارہ دیکھ کر نئی روشنی سے متنفر خیالات پر جان دینے والی ماں سناٹے میں آگئی۔ اور چپ چاپ اُلٹے پاؤں نیچے اُتر گئی ——— وہ دل میں سوچ رہی تھی ——— " رام! رام! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی۔ مگر میں نے تو ایسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا۔ کلجگ کا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔"

(۲)

ہوا اور آگ کا میل ہو گیا۔ ادب اور لحاظ سب کچھ محبت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ بیوی کی تربیت ہی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا۔ لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی۔ اب پاروتی دن رات بسنت کے کمرے میں رہنے لگی۔ پاروتی یتیم تھی۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ خیال تھا کہ سسرال میں اُسے آرام ملے گا۔ مگر یہاں آتے ہی رادھا نے اُسے گرہستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا۔ اُس کا حسن و شباب شاید مرجھانے والا تھا مگر بسنت نے ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو محبت کی آبیاری سے شاداب کر دیا۔ اس کی ناز برداریوں سے پاروتی کے

دل کا باغ لہلہانے لگتا۔

پاروتی حسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو دیہاتی لڑکی پڑھنے سے گھبرائی مگر پھر مجبوراً اُس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا۔ جب دیکھئے کمرے میں سر ہلا ہلا کر پڑھتی رہتی تھی۔ ادھر ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔ بیچ بیچ میں ترچھی نظروں سے شاگرد کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی کتاب بند کر کے یکبارگی پکار اُٹھتے ــــــ "پاروتی" ــــــ پاروتی چونک اُٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس وقت اسکی ہرنی کی سی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوتیں کہ بسنت بے تاب ہو جاتا اور کہتا ــــــ "اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس...... تو لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو؟" پاروتی گھبرا جاتی کہ کہیں ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں۔ کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم اُمید ہوا کرتی تھی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی اتنا ہی کالے کالے حروف چیونٹیوں کی قطار کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے نکلتے جاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کے بُلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لیکر جاتی۔ بسنت ایک ہاتھ اس کی کمر میں اس طرح ڈالدیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے پھر دوسرے ہاتھ میں کتاب لیکر کہتا........ "اچھا بتاؤ آج کتنا پڑھا ہے" پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی اُنگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ "او ہو بہت پڑھ ڈالا۔ مجھ کو دیکھو میں تو کچھ نہیں پڑھ سکا"

بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ "تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے"

بسنت اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ــــــ "میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا اور وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی ــــــ"

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی۔ مگر لاج کے مارے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی۔ کبھی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو ٧٥ موقع پاکر پاروتی پڑھنے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آکر پیچھے سے اُس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا ــــــ "اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟" اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی ــــــ "واہ جی! واہ۔ میں جان گئی۔ بس اب آنکھیں کھول دو۔ آپ میرے پرمیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چٹکیاں لینے لگتی۔ اور کوشش کر کے یکبارگی کھڑی ہو جاتی۔ اس طرح سے اُس کی آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اِس "جنگ عظیم" میں پاروتی کے رخسار بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہو جاتے۔ کتاب دور گر جاتی اور ساڑھی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گزر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آجاتا اور وہ روٹھ جاتی۔ بس "جنگ عظیم" فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔ پاروتی کے پڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کر کے کہتی "تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں ــــــ" "تو تمہاری کرپا سے میں ہی کون پنڈت ہوا جاتا ہوں" یہ سُنکر پاروتی اُٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی "اچھا اب میں سمجھ گئی۔ میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے اب میں یہاں نہ بیٹھو نگی لو جاتی ہوں ــــــ"

بسنت اُس کا ہاتھ تھام کر بٹھا لیتا اور کہتا ــــــ "اس کا حال تم کیا جانو۔ مجھ کو چھیڑ کر تو تم بآسانی پڑھنے لگتی ہو مگر تم کو چھیڑ کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے ــــــ"

"اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی۔"

"یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا۔

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ تمہارا جی پڑھنے میں لگ جائیگا تو پھر تم مجھے بھول جایا کروگی۔"

"واہ! واہ! کیا بات بنائی ہے۔"

اسی قسم کی نوک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی۔ اس کے بعد کنوار کی ہلکی بارش کی طرح رونا دھونا شروع ہو جاتا تھا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر بند ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا۔ روتی بھی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی۔

(۴)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلا میں پھنسے تھے۔ اور رادھا گرہستی کے کاموں میں پسی جا رہی تھی۔ اس کو کسی وقت آرام نہ ملتا تھا۔ اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی ——— "رہنے دو بہورانی! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو۔ بسنت دیکھ لیگا تو خفا ہوگا جاؤ جاؤ آرام کرو۔ پڑھ لکھ کر پنڈتائن بن جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ بڈھی ہوں تو کیا میں اب بھی گرہستی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں جیتے جی بھگوان مجھ کو تمہارا محتاج نہ بنائے۔" یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح لگتے۔ ان الفاظ میں کتنا زہر بھرا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی مگر سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اُس کے اشارے پر چلے۔ مگر اب یہ محال تھا۔ پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی۔ وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام دیتا۔ بوڑھی اور کمزور رادھا محنت، رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی۔ شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مہلک بیماری کی شکل اختیار کر لی۔ اور رادھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرلوک سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دور ہو گیا۔ اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ دقت پیش آئی کہ گرہستی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی۔ چوکا برتن تو کہاری کر دیتی تھی لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا۔ کچھ دن تک اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا لیکن پھر بیمار پڑ گئی۔ اب بسنت گھبرا گئے اُن کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے بسیڑھی میں اس کی ایک بچپن کی سہیلی بال ودھوا بہن مایا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بسیڑھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اُسی گاؤں میں مایا ناامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اُس بیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی۔ ماں لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو یاد کیا اور بسنت سے کہا کہ اگر کہو تو مایا کو میں یہاں بلا لوں۔ بڑی نیک لڑکی ہے اُس سے مجھ کو بڑی مدد مل جائے گی۔"

بسنت۔ "بھلا تمہارے چچا اُس کو یہاں آنے کی اجازت کیوں دیں گے؟"

پاروتی۔ "میری بیماری کا حال سُن کر وہ مایا کو ضرور بھیج دیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اُس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائیگی۔"

بسنت نے دوسرے دن ہی مایا کو بلوا بھیجا اور وہ رانی پور آ گئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اُتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اُس وقت بسنت کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پاروتی پلنگ پر پڑی تھی۔ مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر اٹھ بیٹھی ——— آؤ جیجی! اچھی تو رہیں۔ تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی۔

مایا۔ "بس رہنے دے باتیں نہ بنا یہ تو کہتی نہیں کہ سسرال میں آ کر ہم غریبوں کو بھول گئی۔ اُلٹا مجھے الزام دیتی ہے ——— خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی یہ تو بتا کہ تیرا کیا حال ہو گیا۔ جیجا سے اچھی طرح بنتی ہے نہ؟

پاروتی نے مسکرا کر کہا "ہاں خوب پرماتما کا ہزار شکر ہے" "وہ" "مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ وہ گئی میری بیماری تو بچی بات یہ ہے کہ ساسوجی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ اِن کے مرنے کے بعد سے گھر کا کام مجھ کو سنبھالنا پڑا۔ کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑ گئی"۔ "جیجی!" "میں نے اس وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے کہ تم میرا گھر سنبھال لو۔ مجھ اکیلی جان سے گھر ہستی کا کام نہیں سنبھل سکتا۔ اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی ——— مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو بُرا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلایا ہے کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا ———"

مایا نے منہ بنا کر کہا ——— "واہ ری پگلی! بھلا اس میں کون بُرا ماننے کی بات ہے کسی غیر کا تو کام ہے نہیں یہ تو اپنا کام ہے۔ دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آ گئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہو گئی ———"

پاروتی نے بسنت سے کہا ——— "یہ لو میری جیجی آ گئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی۔"

بسنت نے مُسکرا کر کہا ——— "ضرور ——— کہو جیجی اچھی تو رہیں!"

مایا نے کچھ شرما کر جواب دیا "ہاں بھیا!"

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو اُن کے کمرے سے کچھ دور پر تھا رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی ہوئی مایا بہت جلد نندیا دیوی کی گود میں سو گئی۔

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح موقع نہ ملا تھا۔ صبح کو اُس نے دیکھا کہ گھر بہت ردّی حالت میں ہے۔ صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے۔ رسوئی گھر میں کوئی چیز سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی۔ بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اُس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی۔ پاروتی بھی بہن کی تعریف سُن کر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ پھر آزاد ہو گئی۔ اسے کوئی ۱۳۷
کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ اس نے بھنڈار خانہ کی کنجی مایا کو دیتے ہوئے کہا ——— "جیجی! اب میں بے فکر ہو گئی۔ اب تم میرا گھر سنبھال لو گی ———"

مایا نے کنجی واپس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے"

پاروتی:- "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ کنجی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مجھ کو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو ———؟"

مجبوراً مایا نے کنجی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی۔ اُس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا۔ وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے لیکن مایا صبح سویرے ہی اُٹھ کر اُن کے کمروں کو صاف کر آتی۔ بسنت کی کتابیں جو اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے پڑی رہتی تھیں اُن کو ٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی۔ ایک دن پاروتی نے مایا سے کہا "جیجی تم اُن سے شرماتی کیوں ہو۔ اُن سے خوب کھل کر باتیں کیا کرو ———"

مایا اس کے جواب میں مُسکرا کر چپ ہو گئی۔ اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آ گئے۔ اور انھوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا اُن سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بے تکلف ہو گئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں پاروتی اور بسنت ہنستے بولتے تھے۔ روکنے سے بھی نہ ٹھہرتی تھی۔ لیکن اب وہ اُن کے ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا بُرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بسنت کی نگاہوں میں مایا کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ اب اُسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ پھول تھی۔ لیکن ایسا پھول جو عموماً دوپہر کے وقت کھلتا ہے دھوپ سے مرجھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرے پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہے۔ جن پر صبح کی شبنم سے نہائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشۂ شباب سے سُرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سہاگ کی لکیر نہ تھی۔ اب وہ بیوہ تھی۔ ایک ایسی بدنصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے حُسن وشباب پر خزاں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس طرح پودا مرجھانے لگتا ہے لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اُٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہوا جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہوئی تو اس کا غنچۂ دل کھل اُٹھا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی۔ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اُڑا دی اور پھول نکھر کر خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برکھا رت کی اندھیری رات تھی۔ زمینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ واپس ہونے میں اُسے بہت دیر ہوئی۔ مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ پاروتی نے کہا۔ "رات زیادہ ہوگئی ہے۔ آسمان گھرا ہے۔ پانی برسنے والا ہے۔ مگر وہ اب تک واپس نہیں آئے۔"

مایا:۔ "آتے ہی ہوں گے۔"

پاروتی:۔ "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں تو اب سوتی ہوں۔ وہ آئیں تو بھوجن پروس دینا۔ تکلیف تو ہوگی۔"

"نہیں نہیں تکلیف کس بات کی ہے اچھا تم آرام کرو۔" یہ کہکر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب پاروتی تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا۔ اب پانی بھی برسنے لگا تھا۔ مایا نے رسوئی گھر سے نکل کر کہا۔ "پاروتی دیدی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر کے سوگئی۔ کہئے بھوجن پروس دوں۔" "اُوہو تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو۔" مایا کے رنگیلے رسیلے ہونٹ اس کا جواب دینے کیلئے پھڑک اُٹھے لیکن وہ صرف "جی ہاں" کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر چمکی۔ سفید دھوتی میں مایا کا جسم جگمگا اُٹھا۔ بسنت کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بسنت نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں وہیں بھوجن کروں گا۔ کمرے میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں۔"

بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس عرصہ میں جلدی جلدی مایا نے آگ جلا کر گرم گرم پوریاں تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اُس نے آسن بچھا کر بھوجن پروسا۔ اور بسنت کے سامنے رکھدیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "مایا! اُف مایا! کتنی ہُنرمند، سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو جادو بھرا ہے۔"

بسنت نے نظر اُٹھا کر مایا کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بسنت کی زبان سے بیخودی میں نکل گیا ــــ "مایا" مایا نے سر اُٹھایا۔ بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں لڑ گئیں۔ مایا کانپ اٹھی۔ بسنت کا دل مچل اٹھا۔ اس کی زبان سے نکلا "آہ! تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو۔ اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمہاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ــــ" مایا نے شرما کر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کرسکی۔ "اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ــــ" یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے اُس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اُس کے لئے معیوب تھیں ــــ مگر اس وقت مایا چاہتا تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت منہ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس کی انگلی کو دبا دیا۔ مایا کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا بچھو نے ڈنک مار دیا اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور رسوئی گھر سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی۔ تمام صحن میں پانی بھرا تھا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ بسنت نے جلدی سے دوڑ کر اُسے اٹھا لیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے لگیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بسنت نے کہا "کہیں چوٹ تو نہیں لگی" "نہیں" کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی غیرت۔ شرم و لحاظ۔ ڈر۔ رُسوائی یا اپنی بے کسی پر؟ یہ معلوم نہیں۔ اُدھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی سے گزری "کیا میں نے کوئی پاپ کیا ہے ——؟ وہ گر پڑی تھی اُس کو اُٹھانا کیا میرا فرض نہ تھا ——؟ —— مگر کیا میں پاروتی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں —— کہیں مایا میری شکایت پاروتی سے نہ کر دے —— اُف! پھر تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گا —— مگر اُونہہ شکایت بھی کر دیگی تو میرا کیا ہوگا ——" بسنت کی ساری رات اِسی اُدھیڑ بُن میں گزری۔

(۵)

اِس کے بعد کئی دن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے پاروتی سے اس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش ہوا اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی لیکن جتنا وہ مایا کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا مایا اُتنی ہی اُس سے دور بھاگتی۔ مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں جب ندی جوش پر آتی ہے تو اس کی تھاہ نہیں ملتی۔ پھر بھی ملاح تھاہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھاہ لے رہی تھی۔ وہ عورت تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ جو سماج کی ستائی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دل میں محبت کے جذبات نہ تھے یا اُس کا دل محبت سے خالی تھا۔ وہ پریم کی پیاسی تھی اُس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے۔ لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اس کا موقع ہی نہ ملتا تھا وہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا تو اس کے دل سے محبت کا دریا پھوٹ نکلا۔ اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہنچی جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شراب محبت کا پیالہ پیش کیا۔ وہ انکار نہ کر سکی۔ جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمک اٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و لحاظ اور خوف و رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا۔

بسنت کا عجیب حال تھا۔ اب اس کو مایا کا لب و لہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اس پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی مایا کے ایک ایک لفظ میں بسنت نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھالی پاروتی کی پریم رس میں بھری ہوئی باتیں اسے پھیکی معلوم ہونے لگیں۔ سچے موتی کی آب و تاب کو جھوٹے موتی کی چمک نے ماند کر دیا۔ شرابی نشہ کے درمیان خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے تاکہ رنگ جما رہے۔ مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی۔ بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا۔ اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا عین اس خمار کی حالت میں جب مایا نے پُرانی شراب نئے رنگین پیالے میں بھر کر ایک عجیب انداز سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہو گیا اس کا سر ساقی کے قدموں پر جھک گیا۔ مگر بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈگمگا دیا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ نہ سنبھل سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہو گئی۔ سرد رُت تھی۔ صاف شفاف دن تھا۔ آسمان نیلگوں تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں پاروتی سو رہی تھی۔ مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی۔ اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے سر پر کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک نیم آستین اور ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی۔ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی

اور یہ آستین بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرے کی طرف نکل گیا۔ سوانتی کو دیکھ کر متوالا بن پیدا کیے میں رہے یہ محال ہے۔ مایا کے پلنگ سے دو قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ سب بناؤ اسی کے تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اِس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔ "اُف! مایا اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو۔" یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے۔ مایا گھبرا کر اٹھی اور بسنت سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی خوف اور شرم سے اُس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونے والے آفتاب کیطرح سُرخ ہو گیا۔ اس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا "مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھہر جاؤ۔ صرف تھوڑی سی دیر کے لئے ٹھہر جاؤ۔ مایا کے قدموں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈالدی۔ بسنت کی محبت آمیز آواز سُن کر پاؤں ہی نہیں بلکہ سارے جسم نے ایک بُت کی سی شکل اختیار کر لی۔ بسنت نے جرأت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کانپتے ہوئے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ بسنت کے چھونے سے مایا کے دونوں گال سُرخ اور پیشانی پسینہ سے ہو گئی۔ اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلابی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا—— "کیا مجھ سے خفا ہو۔"

"نہیں——"

"تو پھر مجھ سے کیوں دور بھاگتی ہو مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"مجھسے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجھ کو میرے حال پر پڑا رہنے دیجئے۔ اگر آپ کا یہ منشا ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے میں کل بسیرے ہی چلی جاؤں گی اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"میں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور ہوں مایا۔"

"ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لیجا رہا ہو۔" یہ کہکر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ ۱۴۰
اپنے کندھوں سے ہٹا دیا۔ اور کسی قدر ہٹ کر بولی۔ آپ کا کیا بگڑے گا۔ آپ مرد ہیں مگر میں دُکھیا تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ سماج میں کہیں مجھے جگہ نہ ملے گی۔"

اونہہ" سماج کا کیا ذکر سماج کو میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس کو ہمارے تعلقات کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا——"

"جی ہاں پتہ نہ چلنے پائیگا۔ یہ خوب کہی۔ آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں۔ مگر میرے حال پر کرپا کیجئے۔ اور فوراً یہاں سے چلے جائیے کہیں پاروتی آگئی تو میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں گی۔"

بسنت نے گویا کچھ سُنا ہی نہیں۔ اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو——"

زور سے جھٹکا دیکر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(۶)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا۔ وہی پاروتی جس کو وہ کسی وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا وہی پاروتی جس کے لئے اُس نے اپنی ماں کی بھی پرواہ نہ کی تھی اب وہ دن رات اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اُس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت پاروتی سے اب بہت کم بولتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا لیکن پھر اُس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گزرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف

سُنکر خوش ہوا کرتی تھی وہی اب مایا کی تعریف سُنکر جلنے لگی۔ اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہوگئی۔ مرد کے دل کو کس طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کئے بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔ اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا بلکہ اس کی ناتجربہ کاری نے اُسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔ بسنت کو سنبھالنے کے بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہوگئی۔ اَب وہ اٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنہ دینے لگی۔ لیکن مایا نے کچھ بُرا نہ مانا۔ اُس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سُنا اور خاموش رہی پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بُری معلوم ہوئی اور اُس نے پاروتی کو بہت لعنت ملامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔ اب وہ ہر کام مایا ہی کے اشارے پر کرتا۔ مایا ہی کی خاطر داری اور ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہو گیا۔ اَب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا ہی ہوتا۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سُنائیں۔ مایا جواب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سُنکر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکی اُس نے کہا۔

"زبان سنبھال کر بات کر"

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔" پاروتی نے مُنہ بنا کر کہا۔

"کیسی؟"

"خود اپنے دل سے پوچھ لو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھی۔"

"سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے۔"

141 "تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ۔ میں تو تمہاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی۔ اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے سیدھی بھیجدو۔ یہ روز روز کے طعنے شکوے اَب مجھ سے نہیں سُنے جاتے۔"

"میں نہ کہوں مگر دُنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے صلہ میں تم میرے پتی کو مجھ سے چھین لوگی اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بُلاتی۔"

"مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "پاروتی تمہارا خیال غلط ہے پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل ابتک پاک ہے۔ تمہارا سوامی تمکو مبارک ہے۔"

"جھوٹی باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہاری چال کو خوب سمجھتی ہوں۔ پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمہارا سوامی تم کو مبارک ہے۔ واہ ری مایا!" مایا کی بھویں تن گئیں۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ "پارو! سچ کہتی ہو عورتوں کی ذات ہی مایاوی ہوتی ہے مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں مگر میں واقف ہوگئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی۔ میں نے کچھ جان کر اور کچھ بن جان کر پھندا ڈالا ہے مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا۔ ہماری جاتی کا دھرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا اچھی بات ہے اَب ہوشیار ہو جاؤ۔ میں اب بتادوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے ———"

اتنا کہہ کر عزور غصہ اور نفرت کی شکست سے مایا رو پڑی۔ وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی۔ جلدی سے اٹھی اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اس کے سامنے آئے اُسے کاٹ کھاتی ہے اس طرح غصہ سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اگر اُسے سُکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کو جو اُس کی راہ میں کانٹا ثابت ہوگا جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔

اس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کہارن سے دریافت کیا اس نے پہلے تو چھپانا چاہا لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا " وہ اپنی کوٹھری میں ہیں ملکن سے کچھ بات ہوگئی ہے مگر کون بات ہوئی ہے۔ مجھ کو نہیں معلوم رام جانیں"۔

بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے پاروتی سے جاکر غصہ میں پوچھا " مایا کہاں ہے ؟"

" واہ ری مایا ! مایا ہی سب کچھ ہے۔ میں کچھ نہیں۔ بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر ! سچ۔ ہے مرد کی ذات بڑی بیوفا ہوتی ہے ــــــ" یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے تڑپ کر جواب دیا۔" میں کیا مایا کے پیچھے پھرا کرتی ہوں تمہارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی رہتی ہے اسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے ؟"

غصہ کے مارے بسنت کا برا حال ہوگیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ مرد ہوکر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کیلئے تیار نہ تھا اس نے بھی جل کر کہا ــــــ" مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پرماتما جانتا ہے۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جا رہی ہو۔ اس کی خوبیاں تمہاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کرسکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو ــــــ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی اس کے سوا اور کیا ہوگا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہوگیا۔ یاد رکھنا اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا ــــــ" اتنا کہکر بسنت مایا کے کمرہ میں پہنچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھل گئیں۔ نتیجہ کا خیال کرکے وہ کانپ اٹھی۔ بات اتنی بڑھ جائے گی یہ اس نے نہ سوچا تھا۔ اس وقت بسنت کی دھمکی سنکر وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا۔ اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچ کر مایا کے کمرہ کی طرف چلی۔ فتح ہوگی یا شکست یہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ مگر مایا کی یہ بات کہ " ہم عورتوں کی ذات ہی مایاوی ہوتی ہے" ۱۴۲
اسے یاد آگئی۔ پاروتی بھی عورت تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہوگی۔ پاروتی بھی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہوگئی۔ مایا کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھی۔ پاروتی دروازہ ہی پر چھپ کر کھڑی ہوگئی کہ بسنت اسے نہ دیکھ سکے۔ مایا نے کروٹ لی۔ بسنت نے کہا " مایا " محبت بھری آواز سنکر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا۔

وہ لہریں لطیف تھیں۔ ان سے رگوں میں محبت کا رس دوڑ گیا۔ مایا نے سر اٹھاکر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اور منہ چھپا لیا۔

بسنت نے عاجزانہ لہجے میں کہا ــــــ" مایا سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ کیا پاروتی نے تم کو کچھ کہا ہے"۔ مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر رو پڑی۔ بسنت نے بیتاب ہوکر کہا " مایا ! مایا ! مت روؤ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا۔ میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سننی پڑتی ہیں۔ لیکن اب آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ پاروتی بیوقوف ہے نالائق ہے میں اس کو ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی۔ تم کو رنج کرنے کی ضرورت نہیں ہے لو بس اٹھو ! میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے......... " اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا۔ پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی۔ وہ بڑی مشکل سے اتنا رک رک کر کہہ سکی " جیجی ! مجھے معاف کر دو۔ اب میں تمہارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی......... مجھ سے غلطی ہوئی......... تم میری بڑی بہن ہو میری رکھشا کرو"۔

مایا گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ پتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دکھ کی جلتی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک بھگتی پیدا ہوگئی یا رنج و غم کے

ملے ہوئے پانی میں نہائی ہوئی۔ بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانہ کی دیویوں کی طرح اپنے من کو مار دیا۔ اب وہ معمولی عورت نہیں تھی۔ بلکہ ستی ساوتری عورتوں کی طرح ہو گئی تھی۔ وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی۔ جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ پاروتی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ مایا نے اُسے زور سے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ مایا کا جال آناً فاناً ٹوٹ گیا۔ یہ مؤثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھہرا گیا۔ وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ مایا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں پاروتی کے کمرہ میں پہنچی۔ وہاں پہنچکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے دل کو سنبھالا۔ اور بھنڈار خانہ کی کنجی پاروتی کے آنچل میں باندھ دی۔ ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر دروازہ کھولا اور گھر سے باہر ہو گئی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غیر مانوس تاریکی میں صرف سیاہ رنگ کا پردہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ عجیب و غریب اسرار سے بھی بھرا رہتا ہے۔ اس کے اندر جتنی چمک نظر آتی ہے وہ ایک اجنبی اور غیر مفہوم زبان میں ہمکلام ہوتی ہے جس سے نہ کوئی بولتا ہے نہ جانتا ہے۔ باغ کی گھنی پتیوں سے لدے ہوئے درختوں کی خاموشی اور چٹیل میدان کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں نے بھادوں کی اندھیری رات میں دھندلی سی شکلیں اختیار کر کے مایا کو چاروں طرف سے گھیر لیا—— وہ بسنت کے یہاں بڑے آرام میں تھی۔ اچھے سے اچھا کھانا اور عمدہ کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ وہ بے فکر تھی آزاد تھی۔ لیکن اس کی قسمت میں عیش نہ لکھا تھا۔ پرائے مال پر اس کا کیا اختیار۔ مالک کے سوا کسی غیر کو باغ میں پھول توڑنے کی اجازت نہیں ہوتی جو غیروں کے باغ میں گھس کر رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے دیکھ کر للچا اٹھتے ہیں یہ اُن کی غلطی ہے اسی قسم کی غلطی یا بھول مایا سے بھی ہوئی۔ وہ بھی بسنت کے گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی۔ اُسے گھر کی اصلی ملکہ کا خیال ہی نہ رہا لیکن جب وہ اس بھید کو سمجھ گئی تو پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بسنت کے گھر کو چھوڑ دے۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچ کر وہ اس تاریک رات میں بسنت کے گھر سے نکل پڑی۔ لیکن اب جائے کہاں؟ یہ اُس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ زمانہ کی ستائی اور سماج کی ٹھکرائی عورت کو کون پناہ دے سکتا ہے اس وقت اس کو اپنے وطن کا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا یاد آیا—— گھر کے سامنے کا پرانا تالاب جس میں بکثرت کائی جمی ہوئی تھی—— وہ نیم کا پیڑ جس میں وہ جھولا جھولا کرتی تھی—— بوڑھے باپ کی شکل—— بچپن کی سہیلیاں—— سب یاد آگئیں—— اپنی شادی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا—— سہاگ اُجڑنے کی منحوس ساعت یاد آگئی—— وہ ایک بیخودی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام کی جانب قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی کہ یکبارگی بادل گرجا بجلی چمکی اُس کا سر چکرایا کسی چیز کی ٹھوکر لگی—— وہ بیہوش ہو کر زمین پر گری۔ قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے قید ہستی سے آزاد ہو گئی۔ تمام رات پانی برستا رہا۔ رات کی تاریکی ماں کے آنچل کی طرح مایا کے جسم کو ڈھانپے رہی۔ صبح کو جب مایا کی لاش جنگل میں ملی تو تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ وہی بسنت جو کبھی مایا کے لئے اپنی جان قربان کرنے کیلئے تیار رہتا تھا اب اس کو مایا کی کِریا کرم کرنے میں بھی غیرت معلوم ہوئی۔ مگر اندر سے اس کا دل ملامت کر رہا تھا—— سماج نے بھی مایا ہی کو قصوروار سمجھا کسی نے اصلیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کی—— سماج کی نظروں میں ایک بیکس بیوہ عورت کی ہستی وقعت ہی کیا رکھتی ہے وہ تو ایک بیکار شے سمجھی جاتی ہے۔ پھر کسی کو کیا ضرورت تھی کہ بیکس بیوہ کی موت پر کوئی آنسو بہائے یا ہمدردی کا اظہار کرے۔ بیوہ کا فنا ہو جانا ہی سماج کے ٹھیکیداروں کے لئے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اعظم کریوی

ہوا اور احساس

جس طرح ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چراغ کو بُجھا دیتی ہے۔ اُس کا دوسرا فعل یہ بھی ہے کہ چراغ کو بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے شعلوں کو تیز اور بلند کر دیتی ہے۔

اسی طرح انسان کے قلب کی آگ اور اس کی حرارت صحیح کو سرد اور گرم کرنے کے لئے ____ قلب کے پردے احساس کے پنکھے ہوا کا کام دیتے ہیں۔ جس طرح ہوا عفونت اور گندگی کو اڑا کے پھینک دیتی ہے۔ خود پاک اور ذات پاک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح احساس اس کام کو انجام دیتا ہے۔ اسی سے جذبات کی دُنیا میں آگ لگتی ہے اور یہی مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ ذہنیت کی گندگی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ خیالات کی پاکیزگی کو یہی جِلا دیتا ہے۔ اور اب ہم اس کو "احساس لطیف" کہیں گے۔ اور اسی کو "جذبہ صادق"

....

صادق جذبہ کا کام یہ ہے کہ وہ جذب حرارت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ اور گندہ ذہنیت کے ناپاک جراثیم کو مار کر دماغ سے کثافت کو دور کر کے احساس میں لطافت کی قوت بخشے۔ اور طلب صادق کا حقیقی جذبہ پیدا کرے۔

اِس چیز کے حاصل ہونے کے بعد اَب آپ کام کیجئے۔ اُس میں مضبوطی ہوگی۔ استحکام ہوگا۔ اثر ہوگا۔ اثر اور استحکام کا نام ہی اصل میں کام ہے۔ اسی کو کام سمجھئے یا کام کا اچھا انجام۔

عبدالحلیم انصاری

آرٹسٹ سرکارِ عالی

وطن پرستی

(لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی)

افرادِ ڈرامہ

مقام ———— پیپنگ
زمانہ ———— آخر جولائی ۳۷ء

لی شوئنگ (عمر ۲۰ سال) ———— ایک آزاد سیرت کی بلند حوصلہ لڑکی
لی شوچنگ (لی شوئنگ کی چھوٹی بہن) ———— ایک نہایت ذہین اور ذرا کمزور کردار لڑکی
مسز لی (عمر تقریباً ۴۰ سال) ———— ان لڑکیوں کی سوتیلی ماں جو گھر ڈال لی گئی تھی
چنانگ چن (عمر تقریباً ۲۰ سال) ———— یونیورسٹی کا طالب علم جو پیپنگ کی مغربی پہاڑیوں کی گریلا جنگ میں شامل ہے
سن چے یوان (عمر تقریباً ۵۰ سال) ———— ایک غدّار وطن
دونگ ما ———— خادمہ
جاپانی سپاہی ———— ایک فوجی افسر
الف ———— ایک چینی
ب ———— دوسرا چینی

سین

جس گھر میں مسز لی اور اس کی دونوں سوتیلی لڑکیاں رہتی ہیں اس کا ایک بڑا کمرہ ہے۔ بائیں جانب ایک میز پر کشیدہ کا میز پوش پڑا اور اس پر چند مختلف چیزیں چُنی ہیں۔ ایک ٹیبل لیمپ ہے ایک ٹائم پیس ہے، ایک چینی کا گلدان ہے، ایک دوات ہے۔ فرش پر پیپنگ کا بنا ہوا ایک قیمتی قالین بچھا ہے اور جا بجا آرام دہ کوچ اور کرسیاں لگی ہیں۔ کمرہ میں آنے کا دروازہ داہنی طرف ہے اور بائیں طرف سونے کے کمرے میں جانے کا دروازہ ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو مس لی شوچنگ بیٹھی خط لکھ رہی ہے، اور مسز لی کرسی پر اُداس بیٹھی ہے۔ دور توپوں کی دھون دھان سنائی دیتی ہے۔ لی شوچنگ قلم رکھ دیتی ہے اور مسز لی سراسیمہ ہو کر کھڑی

ہو جاتی ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔

مسز لی۔ یہ کیا؟ پھر گولہ باری ہونے لگی؟

لی شوچنگ۔ اور کہیں پاس ہی معلوم ہوتی ہے!

مسز لی۔ سن چے یو آنگ، پینگ سے چلے گئے ہیں؟ اب جنگ جاری رہنے کے کیا معنی؟ (بیٹھ جاتی ہے) چچا سن یہاں نہیں آئے وہ آتے تو ٹھیک خبر ملتی!

لی شوچنگ۔ ان کو تو میں نے تیسرے پہر موٹر میں جاتے دیکھا تھا بہت ہی اہم شخص نظر آرہے تھے، ان کی موٹر پر جاپانی جھنڈا لگا تھا اور قنصل خانے کی طرف جارہے تھے۔ ان سے بھلا کیا خبر ملیگی!

مسز لی۔ موٹر پر جاپانی جھنڈا لگا ہونا کوئی بات نہیں، کوئی مصلحت ہوگی۔ اور جب تک کوئی سچ مچ غدّاری نہ کرے ـــــــ

لی شوچنگ۔ تو وہ غدّار نہیں؟ معلوم ہو جائے گا!

مسز لی۔ (کھڑی ہو جاتی اور خفا نظر آتی ہے) تم طالب علموں میں یہی تو خرابی ہے۔ ہر آدمی کو غدّار اور وطن فروش سمجھ لیتے ہو۔ چچا سن سے ہمارے خاندان کے پرانے تعلقات ہیں؛ تمہارے باپ ان کو بھروسہ کا آدمی سمجھتے تھے، اور میں بھی ان سے خوب واقف ہوں۔ وہ کسی دن بڑا کام کر دکھائینگے

لی شوچنگ۔ بڑا کام! بہن (شوئنگ) کہتی تھی کہ وہ ہر وقت متسوئی کے پیچھے کتّے کی طرح پھرا کرتے ہیں۔ اُنھیں بس ایک کام یعنی جاپانیوں کو "کاؤٹاؤ" (چینی زمین بوسی کا طریقہ) کرنا خوب آتا ہے!

مسز لی۔ یہ متسوئی کیا جاپانی سفیر ہے؟

لی شوچنگ۔ نہیں، ملٹری اٹاچی!

مسز لی۔ شوئنگ کا کہنا اعتبار کے قابل نہیں۔ چچا سن ایک ملٹری اٹاچی کو "کاؤٹاؤ" کر سکتے ہیں؟ سفیر کی بات دوسری ہوتی! (اچانک چُپ ہو جاتی ہے)

لی شوچنگ۔ تمھیں شاید خبر نہیں۔ جاپان فاشیت کا ملک ہے جہاں سفیر کو بھی ملٹری اٹاچی کا حکم ماننا پڑتا ہے!

مسز لی۔ نہ جانے شوئنگ یہ سب ہفوات کہاں سے سُن آتی اور تمھیں سُناتی ہے، وہ سخت لیفٹ (LEFT) ہے!

لی شوچنگ۔ (تمسخرانہ) معلوم نہیں ـــــــ

مسز لی۔ (شوچنگ کے شانے کو تھپک کر نرم لہجے میں) تمھی اپنی بہن کی ذرا دیکھ بھال رکھو، صبح سے نکلی ہے اور ابھی تک نہیں پلٹی۔ اس زمانہ کے طلباء سیاست میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں! حالانکہ طالبعلموں کے لئے ـــــ کیا کہوں ـــــ احتیاط کرنا بہت ضروری ہے!

لی شوچنگ (کچھ بیتابی سے گردن کو ہلا کر) میں اسے سمجھتی ہوں، مگر شوئنگ ـــــ

(دونگ ما خادمہ تریل میں چائے کی دو پیالیاں لیکر آتی ہے)

دونگ ما۔ اللہ! ابھی ابھی گلی میں کیسی گڑبڑ تھی! لوگ کہہ رہے تھے کہ جاپانی فوج شہر میں گھس آئی ہے! سارا بازار بند ہے، چاروں طرف رکشائیں اور موٹریں بھاگی پھر رہی ہیں!... ...مس شوئنگ ابھی نہیں پلٹی...... خدا خیر رکھے! کھانا تیار ہی پڑا ہے!

مسز لی۔ (دروازہ کی گھنٹی سنکر) یہ کون آیا؟

دونگ ما۔ (تریل میز پر رکھ کر) مس شوئنگ ہوں گی، دیکھتی ہوں۔

(دونگ ما جاتی ہے پھر مس شوئنگ داخل ہوتی ہے)

لی شوئنگ۔ اوہو! (کوچ پر بیٹھتے ہوئے) تم کیا جانو مجھ پر کیا گزر گئی! سر پھٹا جارہا ہے!

مسز لی۔ اتنی دیر کہاں لگائی، شوئنگ؟ تم نے مناہی کے ڈکر فیوآڈر حکم کا بھی خیال نہ کیا؟

لی شوئنگ۔ (طنز کے لہجے میں) مناہی کا حکم! کیسی مناہی؟ کس بات کی مناہی؟ پینگ اب بالکل محفوظ مقام ہے! تم نے سُنا نہیں؟ گلیوں کے موڑوں پر بالو کی بوریاں ہٹا دی اور خندقیں بھر دی گئی ہیں؟ اب مناہی جاری رکھنے سے فائدہ ... شوچنگ، میری جو حالت ہے تم جان نہیں سکتیں!

لی شوچنگ۔ چُپ ہو جاؤ شوئنگ، بک بک سے اور جان ہلکان کر رہی ہو؟

آج جو کچھ ہوا، اس سے ہر شخص متاثر ہے، پر اب کیا
ہو سکتا ہے!
لی شوئنگ۔ سچ ہے، اب کیا فائدہ ہو گا! ...... پر تم کیا لکھ رہی تھیں
...... تعجب ہے، یہاں بیٹھی تم لکھ کیسے سکتی ہو۔ گویا بڑے
امن و امان کا وقت ہے!
لی شوچنگ۔ میں بھیا کو خط لکھ رہی تھی ......
لی شوئنگ۔ سمجھتی ہو تائکنگ خط پہنچ جائے گا؟ ہوش میں آجاؤ، تمام
رسل و رسائل موقوف ہو گئے! پیپنگ ہانکو اور پیپنگ
سوئیاں لائنیں بند ہو گئیں، اور یہ اب ایک مُردہ شہر ہے
اب تو قتلِ عام کا انتظار کرو!
لی شوچنگ۔ خدا کے لئے بہن غصّے سے جی نہ جلاؤ (توپوں کی دھوں
دھاں پھر سُنائی دیتی ہے) وہ دیکھو پھر گولے برسے!
لی شوئنگ۔ (ایک دم سے کھڑی ہو کر) ٹھیک کہتی ہو! مگر موقع آگیا ہے
کہ جاپانی فوجوں پر حملہ کر دیا جائے۔ گولہ باری بھی زیادہ
قریب ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس وقت
ہزاروں جاپانی سپاہی بھونے جا رہے ہیں ......
کم از کم میری خواہش یہ ہے!
(ونگ ما چائے کی ایک اور پیالی لاتی اور شوئنگ کو دیتی ہے)
مس شوئنگ اب تم ذرا لیٹ رہو۔ کوئی کام نہ ہو تو آپ
بھلے اور اپنا گھر! باہر بڑا خطرہ ہے۔ ابھی ابھی ......
لی شوئنگ۔ بس چُپ رہو، میں کچھ سُننا نہیں چاہتی!
مسز لی۔ (سخت لہجے میں) کرم کر کے ونگ ما کو اس طرح تو نہ جھڑکو
وہ تو تمہارے بھلے ہی کی کہہ رہی ہے، اور بازاروں
میں جا کر چندہ اکٹھا کرنا اور کیمپوں میں جا کر سپاہیوں کی
دیکھ بھال اور ان کے آرام کی فکریں کرنا ...... میں
پوچھتی ہوں، اس سے ہو گا کیا؟ پیپنگ ہاتھ سے گیا،
اب تم کر بھی کیا سکتی ہو؟ کچھ بھی نہیں! پھر تمہاری اکیلی
وطن پرستی سے کیا کام بنے گا۔ تم گھومتی پھرتی ہو ...
..... کوئی گولی آ لگی تو؟ ......

لی شوئنگ۔ (سوتیلی ماں کی باتوں پر دھیان نہ دھرتے ہوئے چھوٹی
بہن سے) کیا بجا ہو گا؟
لی شوچنگ۔ آٹھ بجکر دس منٹ ہوئے ہیں۔
لی شوئنگ (اپنی گھڑی کو کوکتے ہوئے) گھڑی بھی بند ہو گئی۔ وقت
گزرنے ہی میں نہیں آتا (گھڑی ہو جاتی ہے اور بے خیالی
کی حالت میں سگرٹ سلگاتی ہے) توبہ! کتنا بُرا مزا ہے!
لی شوچنگ۔ تمہارے سر میں تو درد ہے! سر کے درد میں سگرٹ مفید
نہ ہو گا!
لی شوئنگ۔ سگرٹ نہ پیوں تو درد بڑھ جائے گا (ماں سے) کیا تم
مجھے ایک چینی نہیں سمجھتیں جو یہ اُمید کرتی ہو کہ جاپانی
ہمارے ہزاروں بھائیوں کو ذبح کر رہے ہوں، اور
میں گھر میں بیٹھی رہوں؟ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہو گا! میں الگ
تھلگ بیٹھی رہوں تو پاگل ہو جاؤں گی! جاپانیوں کا
غلام بنجانے کے بدلے مجھے جان دیدینا پسند ہے لہ
مسز لی۔ (نہایت سکون اور شانتی سے) جاپانی اب اور ظلم نہ کریں گے
ہم اگر چُپ چاپ بیٹھے رہیں تو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔
(پھر گھنٹی بجتی ہے اور مسز لی اُٹھتی ہے)
مسز لی۔ اب کے تو مہمان معلوم ہوتے ہیں۔
(ونگ ما داخل ہوتی ہے)
ونگ ما۔ کوئی مسٹر چنانگ آتے ہیں، کہتے ہیں رشتہ دار ہیں۔
مسز لی۔ (مایوسی سے) مسٹر چنانگ! چنانگ کیا؟ کیا رشتہ ہے
بتایا نہیں؟ (ونگ ما چپ رہتی ہے) پوچھا نہیں؟
لی شوئنگ۔ ان سے ہم خود پوچھیں تو زیادہ مناسب ہو گا (ونگ ما سے)
جاؤ بلا لاؤ۔
(شوئنگ سگرٹ بجھا دیتی ہے۔ ونگ ما جاتی
اور چنانگ چن کے ساتھ آتی ہے)
چنانگ چن۔ مس لی شوئنگ؟
لی شوئنگ۔ میرا نام ہے ——
چنانگ چن (بہت نرم لہجے میں) اوہ! آپ شاید مجھے نہ پہچانیں میرا

نام چنانگ چن ہے، میرے والد چانگ ینگ چن ہیں۔۔۔۔
۔۔۔۔ آپ کی ماں میری خالہ تھیں۔۔۔۔۔۔

لی شونگ۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔۔۔ نانکنگ میں بھیا نے تمہارا ذکر تو کیا تھا۔ بیٹھئے بھائی! (مسز لی سے تعارف کراتے ہوئے) یہ ہماری دوسری ماں ہیں (چنانگ چن گردن خم کرتا ہے) یہ میری بہن لی شوچنگ ہے (چنانگ چن دوبارہ گردن خم کرتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے) (مسز لی سے) چیانگ بھائی نانکنگ میں رہتے ہیں۔

مسز لی۔ اوہ! ۔۔۔۔۔۔۔

لی شونگ۔ گھر پر تو سب خیریت ہے؟ وہ لوگ تو پیپنگ آچکے ہیں؟

چنانگ۔ سب اچھے ہیں، شکریہ۔ حال میں والد آنے والے تھے پر والدہ کی تندرستی خراب رہتی ہے اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔

لی شونگ۔ تم یہاں کب آئے؟

چنانگ۔ کچھ دن ہو گئے۔۔۔۔۔۔ میں نیشنل پیکن یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں۔ جب یہاں پہنچا تو سنا کہ خالو کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ آپ لوگ دکن چلے گئے ہوں گے اور پڑھائی میں بھی لگا رہا میرے دریافت نہ کرسکنے اور اب سے پہلے نہ آنے کی یہ وجہ ہو گئی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس غلطی کو معاف کر دیا جائیگا۔

مسز لی۔ یونیورسٹی تو یہاں سے بہت قریب ہے نا؟

چنانگ۔ جی ہاں، دُور نہیں!

لی شونگ۔ یونیورسٹی میں، بھائی کوئی خاص خبر آئی؟

چنانگ۔ نہیں کوئی خاص خبر تو نہیں ملی۔ رات واقعات اچانک رونما ہوئے۔ ہم لوگ تو آج صبح سے پہلے بالکل بے خبر تھے! طلبا ر چلے جانے کی فکروں میں ہیں ـــــــ

لی شونگ۔ تو کیا ریلیں چل رہی ہیں؟

چنانگ۔ پہلے سُنا گیا تھا کہ سوئیاں لائن مانگٹو تک جاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بھی بند ہو گئی۔

مسز لی۔ (بیچ میں دخل دیکر) شہر کے دروازے تو سب بند ہیں۔۔۔۔۔ کیوں نا؟ پیپنگ سے جانے کی تو اَب صورت ہی نہیں!

لی شونگ۔ بھائی تمہارا یونیورسٹی میں رہنا خطرے کی بات تو نہیں؟

چنانگ۔ کہا نہیں جا سکتا ـــــ آج صبح حکام یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ سب اپنی واپسی کی جلد تیاری کرلیں اور یونیورسٹی طلبا کی سلامتی کی ذمّہ دار نہیں! اسی لئے میں یہاں آیا کہ اگر دو دن کیلئے یہاں ٹھہر سکوں تو ـــــ ریل کھل گئی تو میں چلا جانا چاہتا ہوں۔

لی شونگ۔ (مسز لی سے) ہمارا خالہ زاد بھائی یہاں نہ ٹھہر یگا تو اور کہاں ٹھہرے گا! میں شوچنگ کے کمرہ میں اُٹھ جاؤں گی یہ میرا کمرہ لے سکتے ہیں ـــــ حالات ہی ایسے ہیں!

لی شوچنگ۔ ایسے حالات میں یونیورسٹی میں رہنا خطرناک ہوگا؟ بھائی جلدی کرو اور یہاں اُٹھ آؤ۔

چنانگ۔ شکریہ، بہن بہت بہت شکریہ! مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے سبب آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، اور کمرے کی تو مجھے ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ کسی جگہ بھی سو رہونگا ۔۔۔۔۔۔ فرش پر سو رہوں گا!

لی شوچنگ۔ تم فکر نہ کرو بھائی، سب ٹھیک ہے، آج ہی آجاؤ گے نا؟

چنانگ۔ (اُٹھتے ہوئے) جی ہاں، اَب میں جا کر سامان لے آتا ہوں۔

لی شونگ۔ ٹھیک ہے، جلدی آنا، اندھیرا ہو چکا ہے اور دنا ہی کا گھنٹہ قریب ہے۔

چنانگ۔ مجھے معلوم ہے، لیکن میں نے آپ سب کو پریشان کیا، خدا حافظ!

(چنانگ جاتا ہے)

مسز لی۔ (خفگی کے لہجے میں) تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟ اس لڑکے کو ایسے وقت میں بلا رہی ہو! خدا خیر ہی کرے۔۔۔۔ پہلے ہی کیا کم پریشانی ہے!

لی شونگ۔ ہے تو خالہ کا بیٹا، ایسے وقت پناہ نہ دینا بُرا ہوگا اُد

کس منہ سے انکار کیا جاتا!

مسز لی۔ میں بُرائی کب کہتی ہوں، یہ زمانہ نہ ہوتا تو کوئی بُرائی نہ تھی، پر آج کل ہے...... مشکلات کو خود دعوت نہ دینا چاہیئے۔

لی شوئنگ کیا وہ کوئی ڈاکو ہے؟...... (بلند آواز کرکے) یا ایسے کوئی غدّار سمجھتی ہو؟

لی شوچنگ۔ خدا کے لئے لڑو تو ہو مت، وہ زیادہ دن تو ٹھہرنے والا بھی نہیں، جیسے ہی ریلیں چلنے لگیں، رخصت ہو جائے گا۔ اس نے خود ہی کہا ہے۔

مسز لی۔ (بہت خفا ہو کر) تم بکواس کر رہی ہو، آخر اس گھر کی مالک کون ہے؟ کوئی آکر گھر کی تلاشی لے تو کیا کروگی؟ تمہیں جو اپنی سی کرنا ہے اور اُسے یہاں ٹھیرانا ہے تو میں چلی جاؤنگی تمہیں جو دیکھے سو کرنا (گھڑی ہو جاتی ہے گویا سچ مچ اپنے کہے پر عمل کرنا چاہتی ہے) لیکن ٹھیک اسی گھڑی میں سن سے یونگ ایک اہم شخصیت بنائے، اٹاچی کیس ہاتھ میں لئے داخل ہوتا ہے۔ مسز لی اسے دیکھ کر مُسکرانے لگتی ہے)

سن۔ اوہو، یہاں کتنا سکون ہے! میں تو سمجھا تم لوگ گھر میں نہیں، ہا! ہا! ہا!

مسز لی۔ چچا سن! آپ آئے تو، کہاں رہے، ہم ہر وقت راستہ دیکھتے رہتے تھے!

سن۔ ہا! ہا! شکریہ! میں خوش ہوں کہ مجھ سا بوڑھا ابھی تک خوش آمدی سُن سکتا ہے۔

لی شوئنگ۔ (مصنوعی زور کی ہنسی ہنسکر) چچا آج تو بہت مصروف رہے ہوگے؟

سن۔ (بیٹھتے ہوئے) ہاں، یوں ہی سا، حالت یہ ہے کہ کوئی آدمی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں، میرے اوپر زبردستی بوجھ ڈالا گیا ہے۔ پندرہ لاکھ پیپنگ نواسیوں کی بھلائی کے خیال سے میں اپنی جان تو بچا نہیں سکتا تھا، ہا! ہا! ہا!

لی شوئنگ۔ ان پندرہ لاکھ پیپنگ والوں کا جو ذبح ہونے والے تھے اب کیا ہوگا؟

مسز لی۔ شوئنگ، چچا کو ذرا دم تو لینے دو...... ملکی باتیں چھیڑ کر انھیں پریشان نہ کرو۔

سن۔ کوئی حرج نہیں، سب ٹھیک ہے، بعض وقت خیالات کا ظاہر ہو جانا نتیجہ خیز ہوتا ہے، اب ضروری سوال تو یہ ہے کہ تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟

مسز لی۔ (سن کے قریب پہنچکر اور اس کے شانے پر ہات رکھکر) تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ تازہ خبر کیا ہے؟

سن۔ خبر؟...... صبح تڑکے جاپانی فوجیں شہر میں داخل ہو جائیں گی، اور رات میں گڑبڑ کا بڑا امکان ہے۔ تم یہاں سب عورتیں ہو اس لئے چند روز کے لئے میرے یہاں چلی چلو، موقعہ خطرے کا ہے، جاپانی سپاہی تند مزاج ہوتے ہیں، ان کا کوئی کام خلاف اُمید نہ ہوگا!

(وونگ ما چائے لیکر آتی ہے)

وونگ ما۔ یہ بہت اچھی بات ہے (سن سے) مسٹر سن ہم لوگوں کو آپ کا بڑا سہارا ہے، ہم اگر نانکنگ پہلے جاتے تو ــــــ

سن۔ آخر خاندانی تعلقات ہیں، میرا فرض ہے کہ ہر ممکن امداد کروں! مس شوئنگ میری تجویز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

شوئنگ۔ شکریہ چچا سن، لیکن میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو یہیں ٹھہرنا چاہیئے ــــــ

سن۔ مس شوئنگ، شاید تم نے موقعہ کی نزاکت کو نہیں سمجھا چینی پولس خالی بندوقیں لئے پھر رہی ہے، چینی فوج شہر چھوڑ کر گئی تو ساری گولی بارود بھی ساتھ لے گئی، اور باتیں تو کیا بتاؤں ــــــ اگر چوریاں ہی ہونے لگیں؟

لی شوئنگ۔ میں یہیں رہوں گی، شوچنگ تم چلی جاؤ۔

لی شوچنگ۔ اس محلّہ میں ہم اکیلے تو ہیں نہیں اور پھر یہ کیسے یقین ہے کہ چچا کے یہاں محفوظ ہوں گے؟

سن۔ اوہ...... تم نے میرا مطلب ہی نہیں سمجھا (گھنٹی بجتی ہے) یہ کون آیا؟

(دونگ ما جاتی اور پھر چیانگ چن کیساتھ واپس آتی ہے)

لی شو ننگ۔ میں تعارف کرادوں۔ یہ چچا سن چے یوانگ ہیں' والد کے پرانے دوست' یہ ہمارے خالہ زاد چیانگ چن ہیں۔

چیانگ۔ (گردن کو خم کر کے اور سامان رکھ کر) چچا سن ۔۔۔۔

سن۔ بیٹھئے مسٹر چیانگ کہاں سے آرہے ہو؟

چیانگ۔ یونیورسٹی سے ۔۔۔۔۔ دو دن یہاں ٹھیروں گا۔

سن۔ (گردن سے اشارہ کرکے) تمہاری یونیورسٹی ۔۔۔۔۔

چیانگ۔ نیشنل پیکن یونیورسٹی!

سن۔ (چیانگ کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) اس زمانہ میں طلباء کو بہت شانت رہنا اور اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہئے۔

لی شو ننگ۔ بھائی چچا سن امن سبھا کے ممبر بھی ہیں!

چیانگ۔ او ہو' مجھے کیا خبر تھی کہ میں ایک بڑی اور اہم ہستی سے مخاطب ہوں! پھر بھی' چچا سن میں جاننا چاہتا ہوں' کہ بیپنگ نواسیوں کو آپ کیسے امن میں رکھ سکیں گے؟

سن۔ بیشک' بیشک (گلا صاف کرتے ہوئے) شہر کو پُرامن رکھنے کے لئے پلی کرتی اور کمیونسٹوں سے شہر کو پہلے پاک کرنا ہے!

چیانگ۔ جاپانیوں سے نہیں؟

سن۔ اوہ! اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔ جو کام ہوپی چہار پولیٹکل کونسل نہ کر سکی وہ ہم کر دکھائیں گے! (توپوں کی دھوں دھاں پھر سنائی دیتی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتا اور سب چپ رہتے ہیں)

لی شو ننگ (خموشی دور کرتے ہوئے) کتنے زور کی آواز ہے ۔۔۔۔۔

لی خوچنگ (ہیجانی حالت میں) جتنی زور کی ہو اتنا ہی اچھا ہے!

لی شو ننگ۔ چچا سن یہ توپیں تو ہماری جاپانیوں پر چل رہی ہیں نا؟

سن۔ ہا! ہا! ہا! بچے بچے ہو! چینی جاپانیوں کو روک کیسے سکتے ہیں؟ ایک جاپانی افسر نے مجھے بتایا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ چینیوں کو ہوانگھو کے جنوب تک دھکیل دیں گے۔ ہا! ہا! ہا! تم افواہوں پر یقین نہ لایا کرو۔ کل اخباروں میں تم نے بھی پڑھا ہوگا کہ چینیوں نے فینگٹائی' منگفان' اور ٹنگ چاؤ چھین لئے' یہ چینی پروپگنڈا ہے اور کچھ بھی نہیں!

چیانگ۔ چچا سن' آپ کی امن سبھا اس بارے میں کیا کرنے والی ہے کہ جاپانیوں نے چین کا بڑا علاقہ لے لیا ہے اور ہزاروں چینیوں کو آج بھی ذبح کر رہے ہیں؟

سن۔ (فخریہ) تم نے بہت بڑا سوال کر دیا! تم تو جانتے ہوگے کہ نانکنگ گورنمنٹ نے ہوپی کو فوج بھیجکر ہوامیٹسو کا معاہدہ باطل کر دیا قصور نانکنگ گورنمنٹ کا ہے اور ہم جاپانیوں کو الزام نہیں دے سکتے۔ درحقیقت امن سبھا اس حالت میں کچھ نہ کر سکے گی۔

لی شو ننگ (بے چینی سے ہاتھ مل کر) چچا سن' آج مٹسوئی سے ملاقات کا نتیجہ تو اطمینان بخش ہوگا؟

سن۔ (ٹالنے کے طور پر) میری ملاقات ڈپلومیٹک اغراض سے تھی' میں پھر سمجھتا ہوں کہ افواہوں پر یقین نہ کرلیا کرو۔

لی شو ننگ۔ میں نے افواہ تو کوئی سُنی نہیں' البتہ اکثر لوگ چرچا کر رہے تھے کہ بعض چینی مٹسوئی کی دُم سے لگے پھرتے اور اُسے کاؤٹاؤ (زمین بوسی) کرتے پھر رہے ہیں' اور وطن فروشی میں اوّل نمبر رہنا چاہتے ہیں! ایسے غدار چینیوں کو چچا آپنے مٹسوئی کے پاس ضرور دیکھا ہوگا؟

سن۔ ایسی کوئی بات میں نے نہیں سُنی (اور مصنوعی حیرت ظاہر کرتے ہوئے) کیا طلباء کو معلوم ہو گیا ہے کہ جاپانی فوجیں صبح شہر میں داخل ہوں گی؟

لی شو ننگ (بہت نرم اور ٹھنڈے لہجے میں) چچا' سب ہی چینی غدّار نہیں!

لی خوچنگ (پرہیجان آواز میں) غدّار تو ایک دو ہی بہت ہوتے ہیں' اگر زیادہ ہوتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔

سن۔ (اُٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہے ۔۔۔ اوہو میں بھول گ

گیا تھا۔ ایک نہایت ضروری کام رہ گیا ـــــ اب میں جاؤں گا!
آپ لوگ معاف کریں، اور چونکہ مکان تبدیل کرنے کا مسئلہ
طے نہیں ہوا ہے، دوسرے وقت گفتگو کر لیں گے (مسز لی سے)
مسز لی آپ شوننگ اور شوچنگ کو سمجھائیے کہ ضد چھوڑ دیں

مسز لی۔ چچا سن، میں نے طے کر لیا ہے (کھڑی ہوتے ہوئے) میں
آپ کے آنے سے پہلے ان سے یہی کہہ رہی تھی کہ یہ جو چاہیں
کریں، میں یہاں نہ ٹھیروں گی، مہربانی کر کے ذرا ٹھہریئے۔ میں
آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔

سن۔ (بہت خوش ہو کر) بہت خوب، تم میرے ساتھ چلو اور ان
کے لئے کل موٹر بھیج دوں گا۔

لی شوننگ۔ چچا میں آپ کی کامیابی کے لئے دُعا کروں گی!

(مسز لی اور سن چلے جاتے ہیں)

لی شوچنگ (تیز اور بلند آواز سے) غدّار! غدّار!! غدّار!!!

چنانگ۔ (چُپ کرنے کی کوشش میں) بہن وہ ابھی گئے نہیں ـــــ
سُن لیں گے!

لی شوننگ (دانت پیس کر) ایسے غدّار ایک کتے سے بھی بُرے ہیں!

لی شوچنگ۔ اوہ، بہن! مجھے نہیں برداشت ہوتا! میں ـــــ

(بیچ بیچ کر رونے لگتی ہے)

چنانگ۔ شوچنگ، عزیب! اسے کیا الزام دیا جا سکتا ہے ـــــ
کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا، آج شام کو میں نے ہی
شمین کے دروازے پر جاپانی جھنڈے اُڑتے دیکھے تو
مکڈین میں ۱۸ ستمبر کا دن یاد آگیا اور مجھ سے بھی اس وقت
ضبط نہ ہو سکا۔

لی شوننگ۔ خالی رنج کرنے سے کچھ کام نہیں بنتا، ہمیں کچھ کرنا ہے سہی
کہ ہم کوئی بڑی خدمت نہیں بجا لا سکتے، لیکن وطن کی چھوٹی
خدمت بھی بڑی خدمت ہے! (شوچنگ کوچ پر بیٹھ کر
سر کو دونوں ہاتھوں میں رکھ لیتی ہے، پھر ذرا چُپ رہنے
کے بعد ہینڈ بیگ سے سگرٹ کی ڈبیا نکال کر چنانگ کی
طرف بڑھاتی ہے) پیتے ہو؟ (چنانگ سر ہلا دیتا ہے)
میں تو پیونگی! (دیا سلائی کے لئے کھڑی ہوتی ہے تو
سن کا اٹاچی کیس دیکھ کر جھلا جاتی ہے اور غصہ میں اٹھا کر
سونے کے کمرے میں پھینک دیتی ہے) غدّار کا اٹاچی کیس!
ـــــ مجھے اس کی صورت زہر لگتی ہے!

لی شوچنگ۔ بہن، اب رہنے دو، تم نے بہت سگرٹیں پی ہیں! یہ شاید
بارہویں ہوگی! سو نہ سکو گی۔

چنانگ۔ ہاں، اب ہمیں بہت ٹھنڈے مزاج رکھنے کی ضرورت ہے،
جذبات کو ذرا دبانا چاہیئے، اور سوچ کر کوئی راستہ
نکالنا چاہیئے!

لی شوننگ۔ ٹھیک ہے، مگر میں ـــــ

(اسٹیج سے الگ زور کا شور غل سُنائی دیتا
ہے اور یہ تینوں گھبرا کر ایک دوسرے کو
دیکھتے ہیں)

لی شوننگ۔ سنو! کون ہے؟

لی شوچنگ۔ وونگ ما نے دروازہ کھلا تو نہیں چھوڑ دیا ـــــ

چنانگ۔ مہربانی کر کے چُپ ہو رہو (دروازے تک جا کر پکارتا ہے)
کون ہے؟ کون ہے؟

(ایک جاپانی فوجی افسر نشے سے ڈگمگاتا ہوا
بڑھتا ہے جس کے پیچھے دو چینی غدّار بھی ہیں،
افسر چنانگ کو بُری نظر سے دیکھتا ہے)

جاپانی افسر (چنانگ کے مُونھ پر تمانچہ رسید کر کے) گھناؤنے سور!
(چنانگ پیچھے کی طرف ڈگمگا جاتا ہے) کیا چیخ رہا ہے؟
(پھر پستول نکال لیتا ہے، مگر لڑکیوں کو دیکھ کر بدنیتی سے
دانت بھینچ لیتا ہے) ہا! ہا! کیسی پیاری صورتیں ہیں!
(بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لینا چاہتا ہے۔ چنانگ روکنا چاہتا
ہے، مگر دونوں چینی اُسے پکڑ لیتے ہیں)

چینی الف۔ خبردار سوّر جو قدم بڑھایا!

چنانگ۔ (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) تم کون ہو؟ کیا
چاہتے ہو؟

جاپانی افسر۔(دونوں چینیوں سے) اسے پکڑ کے تلاشی لو!
(چنانگ کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لیجایا جاتا
ہے جاپانی افسر لڑکیوں سے دست درازی کرتا ہے)
جاپانی افسر۔(شوئنگ سے) آؤ، میری چینی گڑیا! (شوئنگ اس کے
منہ پر تھپڑ لگاتی ہے اور وہ غصہ میں اسے مارنے کو لپکتا ہے)
لی شوچنگ۔دوڑو! بچاؤ! بھائی!
جاپانی افسر۔(ہنسی میں دانت دکھاتے ہوئے) تم کیا چیختی ہو؟ (شوچنگ
کو چپٹا لینا چاہتا ہے)
شوچنگ۔(ہاتھا پائی کرتے اور چیختے ہوئے) تم ——— تم ———
(دوسرے کمرے سے چنانگ نکل کر آتا ہے۔ ایک
چینی غدار کے ہاتھ میں سن کا اٹاچی کیس ہے)
جاپانی افسر۔(دونوں چینیوں کو غصے کی نظر سے دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟
چینی الف۔کپتان صاحب، یہ شخص جاپان کا دشمن ہے! اس کے پاس
ایسے بہت سے کاغذ ہیں!
جاپانی افسر۔دکھاؤ! (چینی اس اٹاچی کیس سے کاغذ نکالتا ہے تو کچھ نام
کے کارڈ گر پڑتے ہیں) ١٥٢
چینی الف۔(ایک کارڈ اٹھا کر پڑھتا ہے) مسٹر سن چے یوانگ ممبر ان سبھا
(پھر حیرت سے) اوہ، یہ کیس بوڑھے سن کا ہے! (چنانگ کی
طرف دیکھ کر) تم اُسے جانتے ہو؟
چنانگ۔میرے رشتہ دار ہیں!
غدار الف۔اوہ! (جاپانی افسر سے) کپتان صاحب ہم سے بھول ہوئی
یہ لوگ مسٹر سن چے یوانگ کے دوست ہیں!
جاپانی افسر۔(غصہ سے جل کر) سن چے یوانگ کون ہے؟ (غدار الف
کے طمانچہ مار کر)
غدار الف۔زیادہ عاجزی کرتے اور مسکراتے ہوئے) کپتان صاحب
مسٹر سن کرنیل مشوئی کے گہرے دوست ہیں! اس کارڈ
کو دیکھئے!
جاپانی افسر۔اوہ! مشوئی کے! اچھا! مشوئی کے صدقے میں ———
آؤ چلیں!

(جاپانی فوجی افسر اور اس کے چینی ساتھی چلے
جاتے ہیں۔ لی شوچنگ ابھی تک رو رہی ہے،
چنانگ اس کے پاس کھڑا ہے مگر نہیں سمجھتا کہ کن
لفظوں میں اُسے سمجھائے)
لی شوئنگ۔اب بس موت ہی کا انتظار ہے!
چنانگ۔نا شوئنگ، اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو!
لی شوئنگ (بہن سے لپٹ کر) نا بہن روؤ مت! اکیلے ہماری ہی
توہین نہیں کی گئی ہے۔ شہر میں ہم سے ہزاروں کو ان ظالم
جاپانیوں نے ذلیل کیا ہوگا۔ ہمیں اس توہین کا بدلہ لینا ہے
(چنانگ سے) سنو، رات بہت جا چکی ——— بارہ
بج گئے ہوں گے ———
چنانگ۔اوہو! اب مجھے جانا چاہئے!
لی شوئنگ۔ٹھیرو، میں ساتھ چلتی ہوں!
لی شوچنگ (بہن کا بازو پکڑ کر) بہن تم کہاں چلیں؟ (چنانگ کی طرف
دیکھتی اور پھر اپنی بہن کو دیکھتی ہے) شوئنگ کیا تم بھائی
سے پہلے کبھی مل چکی ہو؟
لی شوئنگ (کچھ پریشان ہو کر) بہن، تم ———
چنانگ۔شوچنگ، میں اصلی بھید بتاتا ہوں، میرا نام تو چنانگ ہی
ہے پر میں تمہارا رشتہ دار نہیں، شوئنگ کو البتہ میں بہت
دن سے جانتا ہوں۔ آج جب یہ خبر ملی کہ جاپانی یونیورسٹی
کی تلاشی لیں گے تو میں نے رشتہ داری کا حیلہ تراش کر
یہاں چھپ رہنا چاہا تھا...... اصل میں پچھان کی
پہاڑیوں میں گریلا فوج میں داخل ہوں، جیسے ہی جاپانی
فوجیں شہر میں داخل ہوں گی ہم حملہ کر دیں گے۔ اس وقت
ایک بجے ہمارے بہت سے ساتھی شہر سے نکل جانے کی
صورتیں اختیار کریں گے اور اپنی گریلا فوج میں جا ملیں گے
(اپنی گھڑی دیکھ کر شوئنگ سے) اب مجھے جانا چاہئے۔ بارہ
بجکر چالیس منٹ ہو گئے!
لی شوئنگ۔چنانگ، میں تمہارے ساتھ چلوں گی!

چنانگ۔ نہیں، شوئنگ، تم نہیں جاسکتیں!

لی شوئنگ (ہیجانی حالت میں) کیوں نہیں؟ تم نے کہا تھا، تمہارے پاس دو پستول ہیں ـــ ایک مجھے دیسکتے ہو، میں لڑکی ہوں، مگر میں موت سے نہیں ڈرتی!

چنانگ۔ شوئنگ تم ...... (بندوقوں کے کئی فیر سُنائی دیتے ہیں) اوہ، خدا جانے کیا واقعہ ہوا؟ تم..... یقین کرتی ہو کہ میرے ساتھ جانے کے لئے دل بچتا ہے؟ جان کو وطن پر قربان کردینے کے لئے تیار ہو؟

لی شوئنگ۔ وطن پر جان کی قربانی؟ بڑی آسانی سے! خوشی خوشی!

چنانگ۔ خوب! (اپنا سوٹ کیس کھول کر دو پستول نکالتا ہے)

لی شوچنگ (بہن کو روک رکھنے کی کوشش میں) کیا کرنا چاہتی ہو بہن؟ کہاں جاؤ گی؟

لی شوئنگ (تسلّی دیتے ہوئے) شوچنگ، ڈرو مت، تمہیں ہمارے جانے پر خوش ہونا چاہئے کہ ہم چین کے دشمنوں کو فنا کرنے جارہے ہیں! چاہتی ہو تو تم بھی چلو۔

لی شوچنگ۔ بہن، میں بھی چلوں؟

لی شوئنگ۔ کیوں، تم کیا چینی نہیں! چلو! ہماری توہین آنسوؤں سے نہیں دھوئی جاسکتی! وہ جاپانیوں کے خون سے دُھلیگی!

لی شوچنگ۔ بہن.......

چنانگ۔ شوچنگ، اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا جاسکتا، کرنے کا وقت ہے!

لی شوئنگ۔ بولو شوچنگ، چلوگی؟

لی شوچنگ۔ شوئنگ...... (کانپتی ہوئی آواز میں) اچھا سوچ لوں (بندوقوں کے فیر پھر سُنائی دیتے ہیں)

چنانگ۔ شوئنگ جلدی! وہ لوگ انتظار نہ کریں گے! (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

لی شوئنگ (بہن کو پیار سے چمٹاتے ہوئے) خدا حافظ، پیاری شوچنگ! جاپانیوں کو شکست دیکر پھر آملیں گے، خدا حافظ۔

چنانگ۔ (دروازہ پر پہونچ کر شوئنگ کا منتظر ہے) شوچنگ خدا نے چاہا تو جنگ کے بعد آملیں گے!

لی شوئنگ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) خبرداری سے رہنا، شوچنگ، خدا حافظ!

(چنانگ اور لی شوئنگ چلے جاتے ہیں اور شوچنگ تذبذب کی حالت میں دو چار قدم ٹہلتی ہے، پھر یکایک دوسرے بندوقوں کے فیر سنکر)

۳ لی شوچنگ۔ (دروازہ کی طرف پکارتی ہوئی لپکتی ہے) بہن ٹھیرو، میں بھی چلتی ہوں ـــ وطن پر میں بھی قربانی چڑھاؤں گی!

(پردہ)

(ماخوذ)

ل۔ احمد

”سروہی“

ایک شاہکار مزاحیہ شذرہ

(جناب منظر تھانوی)

عرصہ ہوا کہ کسی شاعر کا یہ شعر نظر سے گزرا تھا ؎

ذرا تو اے شوقِ کشتنی تھم ؎ ذرا تو لیلے چھری تلے دم
ابھی وہ دامن اٹھا رہے ہیں ؎ ابھی سروہی سنبھل رہی ہے

شعر کا مطلب صاف تھا۔ عاشق صاحب بہ رضا و رغبت خود قتل ہونے پر آمادہ ہیں، اور ذبح ہونے سے قبل بہ ثباتِ ہوش و حواس ”شوقِ کشتنی“ کو بطور وصیت تلقینِ صبر و ضبط فرما رہے ہیں۔ ”ذرا تو لیلے چھری تلے دم“ ایک محاورہ ہے اور اس مقام پر برائے بیت جہاں تک نفسِ قتل کا سوال ہے یہ امر خلافِ واقعہ بھی ہے، اور قانونِ شہادت کی رو سے ایک امرِ غیر متعلقہ بھی۔

قاتل کوئی کم سن چھوکرا ہے، اور آلۂ قتل ”سروہی“ نامی کوئی وزنی ہتھیار ہے جو سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ وجہِ قتل غالباً عاشق صاحب کی کوئی والہانہ لیکن غیر فطری حرکت، دامن چونکہ عبا قبا اور شیروانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ کرتہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اور کرتہ ایک لباسِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ”ابھی وہ دامن اٹھا رہے ہیں“ کتابت کی غلطی ہو، اور دراصل ”ابھی وہ دامن اٹھا رہی ہیں“ ہو۔ ایسی صورت میں قاتلہ ایک کم سن چھوکری ہوگی، اور وجہِ قتل ظاہر ہے کہ شاردہ ایکٹ کی خلاف ورزی۔

اِس شعر میں میرے لئے جو عجیب اور انوکھی شے تھی۔ وہ ”سروہی“ تھی۔ عشاق جن اشیا سے عموماً قتل ہونے کے عادی ہیں وہ یہ ہیں:۔ ابروئے خمدار، نگاہِ ناز، جنبشِ لب، انکارِ وصل کبک رفتاری، محشر خرامی، وغیرہ وغیرہ۔ پولیس کی اکتیس [31] سالہ ملازمت کے دوران میں مجھے ایسے آلاتِ قتل دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جن سے ایک غیر عاشق بھی قتل کیا جا سکتا ہے، مثلاً ریوالور، طمنچہ رائفل، بندوق، چھری، چھرا، چاقو، پیش قبض، خنجر، کرپان، تلوار لاٹھی، لٹھ، گنڈاسہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے انتہائی ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ ”سروہی“ میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ حال میں مجھے ریاست سروہی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں یہ معلوم ہوا کہ سروہی کی تلوار مشہور ہے، اور سروہی اُسی تلوار کو کہتے ہیں جو سروہی میں تیار ہوئی ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سروہی میں اب بھی ایسی تلواریں بنتی ہیں جو لوہا کاٹ سکتی ہیں اور اس درجہ لچکدار ہوتی ہیں کہ پیٹی کی طرح کمر سے لپیٹی جا سکتی ہیں۔ اس سے نہ صرف سروہی کی حقیقت منکشف ہوگئی بلکہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت عاشق علیہ الرحمۃ نے تکمیلِ شوقِ شہادت کے لئے سروہی ہی کو کیوں منتخب فرمایا تھا۔ ہر ایک عاشق سمجھ کا پتلا ہوتا ہے۔ جانِ عالم بھی ایک سمجھدار شخص تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ چونکہ وہ عاشق ہے لہذا سخت جان بھی ضرور ہوگا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ آلور، جے پور، جودھپور یا اودے پور کی تلوار سے کام نہ چلے گا۔ اور ممکن ہے کہ معمولی تلوار اُس کے گلے پر پڑے اور اُچٹ کر کم سن قاتل یا قاتلہ کی پیشانی چوم لے۔ اُف۔ رشک نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔

ہمارے شعرا نے معشوقوں کو بلا کسی فیس کے اکثر یہ قانونی مشورہ دیا ہے کہ وہ قتلِ عشاق پر ہمیشہ کمربستہ رہیں۔ میں اَب تک یہ سمجھتا تھا کہ "کمربستہ" ایک استعارہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ غریب عاشق کو قتل کرنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ رہنا چاہئے۔ لیکن اَب معلوم ہوا کہ "کمربستہ" کے لغوی معنی مراد ہیں، اور شعرا یہ چاہتے ہیں کہ "سروہی" پیٹی کی طرح ہر ایک معشوق کی کمر سے ہر وقت لپٹی رہے۔

اللہ! اللہ!! ہمارے شعرا کا کلام بھی کس قدر حقائق و معارف سے لبریز ہے لیکن اپنی کوتاہ فہمی کو کیا کہا جائے ؎

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

نیرنگِ بہار

آہ اُس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں — صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں
جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یارب — ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں
جس کو ایک اِک ساعت زندگی کی بھاری ہے — اُس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں؟
دل میں عیشِ رفتہ کی یاد تک نہیں باقی — اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجئے حرماں
آپ کی کہانی ہے، آپ ہی سُناتے ہیں

حرماں خیرآبادی

ٹالسٹائی کا سب سے پہلا افسانہ

حملہ

(مترجمہ جناب سہیل عظیم آبادی)

مسلسل

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں اپنے ایک ملاقاتی اڈجوٹنٹ کو یہ کہنے گیا کہ وہ جرنیل کو میرے ارادوں کی خبر کر دے۔ راستہ میں میں نے بہت سی ایسی چیزیں دیکھیں جن کے قلعہ ن — میں دیکھنے کی امید نہ تھی۔ ایک پُر شوکت فٹن پیچھے سے آئی اور میرے پاس سے گزر گئی۔ اس کے اندر میں نے ایک ہیٹ دیکھا اور فرانسیسی زبان میں خوش گپیوں کی آواز سُنی۔ کمانڈر کے مکان کی کھلی ہوئی کھڑکی سے پیانو کے نہایت ہی بے سُرے راگ کے ساتھ گانے کی آواز آرہی تھی۔ شراب خانہ میں جس کے پاس سے میں گزرا میں نے چند کلرکوں کو دیکھا جو سامنے بیر کے گلاس رکھے اور ہاتھوں میں سگرٹ لئے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کو یہ کہتے سُنا "معاف کیجیے گا۔ ...... لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے میریا گریگوریونا ہمارے لیڈر ہیں"۔ ایک یہودی جس کی کمر جھک گئی تھی اور چہرہ پر مردنی چھائی تھی پھٹا پرانا کوٹ پہنے ایک خالی ٹوٹا ہوا پیپا لڑھکائے لئے جا رہا تھا اور اس کی گھڑگھڑاہٹ تمام مکانوں سے ٹکرا کے زور سے گونج رہی تھی، دو عورتیں سر میں ریشمی رومال باندھے ہاتھوں میں شوخ رنگ کے تھیلے لئے سرسر کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ ایک نیچے چھوٹے سے گھر کے دروازے کے سامنے دو لڑکیاں ننگے سر کھڑی تھیں۔ ایک کا ملبوس گلابی رنگ کا تھا اور دوسرے کا نیلا بناوٹی ہنسی ہنس کے وہ کھلکھلا رہی تھیں۔ غالباً ادھر سے گزرتے ہوئے فوجی افسروں کو لبھانے کے لئے۔ فوجی افسر نئے کوٹ، اُجلے دستانے اور زرق برق لباس پہنے بانکی چالوں سے سڑکوں پر اور گلیوں میں اٹھلا رہے تھے۔

میرا ملاقاتی جرنیل کے مکان کی نچلی ہی منزل میں مل گیا میں جو کچھ چاہتا تھا صرف وہی سمجھانے پایا تھا اور وہ جواب میں اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ یہ بڑی آسانی سے ہو جائے گا۔ کہ ایک شاندار گاڑی جسے میں پھاٹک پر دیکھ چکا تھا اس کھڑکی کے نیچے سے گزری جس کے پاس ہم بیٹھے تھے۔ ایک لمبا قد آور آدمی پیدل فوج کی یونیفورم پہنے اور میجر کا تمغہ لگائے گاڑی سے اُترا اور جرنیل کی طرف گیا۔

"اچھا ذرا معاف کرنا" اڈجوٹنٹ نے اُٹھتے ہوئے کہا

"میں جنرل کو خبر کردوں؟"

"کون آیا ہے؟" میں نے پوچھا

"کاؤنٹس" اس نے جواب دیا اور اپنے کوٹ کا بٹن لگاتا ہوا اوپر کی منزل پر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک پست قد لیکن نہایت ہی خوبصورت آدمی بغیر تمغے کا کوٹ پہنے صلیب کاج میں لگائے باہر نکل کے سیڑھی پر آیا، اس کے پیچھے میجر، اڈجوٹنٹ اور دو دوسرے افسر آئے۔ جنرل کی چال ڈھال، آواز اور ہر انداز سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو اپنی بڑی اور اہم شخصیت کا احساس ہے۔

"آداب عرض ہے مادام کاؤنٹس" اس نے گاڑی کی کھڑکی میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

نہایت نفیس نرم چمڑے کے دستانہ سے ڈھکا ہوا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس ہوا اور پیلے ہیٹ کے سایہ میں دمکتا ہوا ایک حسین متبسم چہرہ گاڑی کی کھڑکی پر نظر آیا۔

بات چیت کئی منٹ تک ہوتی رہی لیکن میں جنرل کو مسکرا کے صرف یہی کہتے ہوئے سن سکا!

"واؤسیوزکوئی جیئی نے واؤدی کتیری لاانفادلس پہ نزدونک گاردی دے لا دیو نیر؟"

گاڑی میں نرم قہقہوں کے ہچکولے سے پیدا ہوئے۔

"خدا حافظ جنرل"

"ہاں خدا حافظ دوسری ملاقات تک"، جرنیل نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کہا۔

گاڑی چلی گئی۔

گھر واپس جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا: "اس آدمی کو بھی وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جن کی ایک روسی کو تمنا ہو سکتی ہے مرتبہ دولت، عزت ——— اور اس لڑائی کے شروع ہونے کے وقت جو خدا ہی جانتا ہے کس طرح ختم ہوگی، وہ ایک حسین عورت سے مذاق کر رہا ہے، اور دوسرے دن اس کے ساتھ چائے پینے کا وعدہ کر رہا ہے جیسے کہ وہ اس سے کسی رقص گاہ میں ملا ہو!"

اڈجوٹنٹ کے گھر پر میری ایک اور آدمی سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے اور زیادہ حیران کر دیا۔ وہ ک رجمنٹ میں لفٹنٹ تھا وہ بالکل ہی نوجوان تھا اور اس میں عورتوں جیسی نرمی اور شرمیلا پن تھا۔ وہ اڈجوٹنٹ کے پاس ان لوگوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے آیا تھا، جنھوں نے اس کے خیال میں آنے والے معرکہ میں اس کو کوئی حکم ملنے کے خلاف سازش کی تھی، اس نے کہا کہ اس طرح کی حرکت قابلِ نفرت ہے۔ اس سے ساتھیوں کا یہ کمینہ پن تھا وہ اسے کبھی نہیں بھولیگا وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کے چہرہ پر آتے اور جاتے ہوئے رنگ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور آواز خوب دھیان سے سن رہا تھا اور میں یہ یقین کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ یہ سب کچھ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ سرکشیوں پر گولی چلانے اور اپنے آپ کو ان کی گولیوں کا نشانہ بنانے کا حکم نہ پا کے وہ بیحد مایوس ہوا تھا اور اسے دلی تکلیف پہنچی تھی، وہ اس لڑکے کی طرح تلملایا ہوا تھا، جیسے بے قصور سزا دی گئی ہو...... میں یہ سب بالکل نہ سمجھ سکا۔

فوجیں رات کو دس بجے روانہ ہو جانے کو تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کے جنرل کے گھر پر گیا۔ لیکن چونکہ میں نے خیال کیا کہ وہ اور اڈجوٹینٹ مشغول ہوں گے اس لئے سڑک پر انتظار کرنے لگا۔ میں نے گھوڑے کو احاطہ کی دیوار سے باندھ دیا اور خود اسی پر بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ جیسے ہی جنرل باہر نکلے میں اس کے پیچھے ہو لوں۔

دھوپ کی گرمی اور تیزی کے بدلے اب رات کی ٹھنڈک اور نئے چاند کی دھیمی روشنی تھی۔ چاند ستاروں بھرے گہرے نیلے آسمان پر روشنی کے پیلے نصف دائرے میں جڑا ہوا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیوں اور مٹی کے گھروں کے شگافوں سے روشنی چھن چھن کے باہر آنے لگی تھی۔ اُجلے اُجلے گھروں کے چھپروں پر چاندنی کھیل رہی تھی اور یہ پس منظر باغ میں کھڑے ہوئے پرشوکت شیشم کے درختوں کو اور زیادہ لانبا اور کالا دکھلا رہا تھا، مکانوں، درختوں اور احاطہ کے لمبے سائے روشن گرد بھری سڑک پر عجیب عجیب طرح سے پڑ رہے

تھے...... دریا کے کنارے مینڈک مسلسل ٹرّا رہے تھے۔ سڑکوں پہ تیز تیز قدم اور سرگوشیوں کی آہٹ مل رہی تھی کبھی کبھی گھوڑے کے ٹاپ کی آواز یا دور سے کسی لڑھکتے ہوئے خالی پیپے کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دے جاتی اور پھر پیانو کی دلدوز موسیقی کے ساتھ مہین اور بھاری بھدی اور نازک آوازیں گاتی ہوئی!

میرے تخیلات اس وقت کیا تھے یہ میں نہیں لکھوں گا سب سے پہلے تو اس لئے کہ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم معلوم ہوگی کہ باوجود اس کے کہ میرے چاروں طرف ہنسی خوشی، قہقہے اور نغمے تھے میرے دل پر عجیب اداس اور بھیانک باتیں لگاتار اپنا سایہ ڈال رہی تھیں۔ دوسرے اس لئے کہ ان کا میری اس کہانی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں اپنے خیالات میں اتنا گم تھا کہ میں نے یہ بھی نہ محسوس کیا کہ گھنٹے نے گیارہ بجادئے۔ اور یہ بھی نہ دیکھا کہ جنرل مع اپنے اسٹاف کے میرے پاس سے گزر گئے۔ صف کا پچھلا سپاہی قلعہ کے دروازہ پر تھا۔ توپ، بندوق، سامان، اور افسروں کی چیخ کے درمیان میں بڑی مشکل سے پل پر راستہ پا سکا۔

فوج سڑک پر ایک لمبی قطار بنائے اندھیرے میں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ پھاٹک سے باہر ہوتے ہی میں نے گھوڑا دوڑا دیا اور جنرل کو جا لیا۔ مسلح تیر اندازوں اور سواروں کی لمبی قطار کے اوپر توپوں، بندوقوں، افسروں اور سپاہیوں کے اوپر اس گمبھیر دھیمی یکسانیت کو چیرتی ہوئی ایک جرمن آواز بلند ہوئی۔

"انٹی کرائسٹ مجھے مشعل دو!" اور ایک سپاہی نے جلدی سے پکارا "شیو چنکو! لفٹنٹ صاحب روشنی مانگ رہے ہیں!"

آسمان کا زیادہ حصہ لمبی لمبی مٹیالی بدلیوں سے ڈھکا ہوا تھا بیچ بیچ میں سے اکا دکا ستارے جھانک رہے تھے۔ داہنی طرف کالے پہاڑوں کے افق میں چاند ڈوب چکا تھا اور ان کی چوٹیوں پر ہلکی تھرتھراتی روشنی ڈال رہا تھا جو ان کے دامن پر چھائے ہوئے گہرے اندھیرے کے مقابلہ میں ایک عجیب تضاد پیدا کر رہا تھا، ہوا گرم تھی اور بالکل تھمی ہوئی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھاس کی ایک پتی بھی بدلی کا ایک ٹکڑا ابھی نہیں ہل رہا ہے، اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، سڑک کے کنارے مجھے چٹان، جانور، اور آدمیوں کی عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتیں لیکن جب ان کی سرسراہٹ سُنتا اور ان پر تازہ جمی ہوئی اوس کو محسوس کرتا۔ تب مجھے معلوم ہوتا کہ یہ جھاڑیاں ہیں، میرے سامنے گہرے اندھیرے کا ایک ٹکڑا اٹھا اور اس کے پیچھے چند ایک دھبے۔ یہ سواروں کا دستہ تھا۔ جن کے پیچھے جنرل مع اپنے اسٹاف کے چل رہے تھے، اسی طرح کا ایک اور کالا ٹکڑا ہمارے بیچ میں چل رہا تھا، لیکن پہلے ٹکڑے سے کچھ نیچا تھا، یہ پیدل فوج تھی۔ پوری فوج پر ایسی مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ آدمی رات تمام ملی جلی آوازیں ان کی پراسرار دلکشیوں کے ساتھ صاف سُن سکتا تھا۔ دور سے آتی ہوئی گیدڑوں کی روتی چیخیں جو کبھی مایوسی کی دلدوز آہ کی طرح ہوتیں، اور کبھی گھٹتے ہوئے قہقہہ جیسی، جھینگر، مینڈک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی تیز بے کیف یکساں پکار، ایک مبہم نزدیک آتی ہوئی بھنبھناہٹ جس کی وجہ سمجھ میں نہ آسکتی تھی۔ اور فطرت کی وہ سب محسوس کی جانے والی رات کی چالیں جنھیں سمجھنا یا جن کی تشریح کرنا ناممکن ہے یہ سب چیزیں مل جُل کر ایک پُر موسیقی آواز بن گئی تھی جسے ہم رات کا سناٹا کہتے ہیں۔ صرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی ٹپ ٹپ اور بھاری فوجی قدموں تلے مسلاتی ہوئی گھاس کی سرسراہٹ اس سناٹا کو توڑ رہی تھی نہیں بلکہ اس سناٹے میں ملی جا رہی تھی۔

صرف رہ رہ کے بھاری توپوں کی گھڑگھڑاہٹ، سنگینوں کی کھڑکھڑاہٹ دبی دبی آوازیں یا گھوڑوں کے نتھنوں کی فرفراہٹ کی آواز سُنی جا رہی تھی۔

ساری فطرت پر سکون وہ طاقت اور حسن چھایا ہوا تھا۔

کیا اس سندر سنسار میں اس لاانتہا ستاروں بھرے آکاش کے نیچے امن سے رہنے کے لئے انسان کو کافی جگہ نہیں؟ اس مست کر دینے والی فطرت کے سایہ کے نیچے بھی غصہ، انتقام یا اپنے ہم جنسوں کو قتل کرنے کی خواہش انسان کے دل میں کیسے بچ رہی ہے؟ آدمی تو یہ خیال کرنے پر مجبور ہے کہ اس فطرت کے اثر سے جس میں نیکی اور حسن کا براہ راست اور بہترین اظہار ہوتا ہے انسان

کی روح کی تمام برائیاں دور ہو جانی چاہیئے تھیں۔

ہم دو گھنٹے سے زیادہ چلتے رہے تھے۔ مجھے جاڑا لگ رہا تھا اور نیند آ رہی تھی۔ وہی غیر واضح اور مبہم چیزیں اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگیں تھوڑی دور پر وہی کالی دیوار انھیں حرکت کرنے والے دھبوں کے ساتھ میرے نزدیک ہی ایک اُجلا گھوڑا اپنی دُم تیزی سے گھماتا چل رہا تھا۔ ایک کالا سایہ اُجلا کوٹ پہنے جس سے کالی رائفل اور پستول کی اُجلی نال لگی ہوئی صاف نظر آ رہا تھا۔ سگریٹ کی روشنی میں ریشمی مونچھیں رواں دار کالر اور اُجلے دستانہ سے ڈھکا ہوا ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔

آنکھیں بند کئے میں اپنے گھوڑے کی گردن پہ جُھکا ہُوا تھا کچھ دیر کے لئے اپنے کو بالکل کھو دیتا یہاں تک کہ کوئی مانوس سرسراہٹ یا ٹپ ٹپ یکایک چونکا دیتی۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے میں چُپ چاپ کھڑا تھا اور کالی دیوار جو میرے سامنے تھی میرے اوپر چلی آ رہی تھی یا یہ کہ وہ دیوار چپ چاپ کھڑی تھی اور اَب میں اس سے ٹکرا جانے والا ہی تھا، اسی طرح ایک مرتبہ جاگنے پر وہ سمجھ میں نہ آسکنے مسلسل بھنبھناہٹ جواب نزدیک تر آتی جا رہی تھی بہت ہی زور سے سُنائی دی، یہ پانی کی آواز تھی۔ ہم ایک گہرے نالے میں داخل ہو گئے تھے اور اس وقت ایک پہاڑی ندی کے نزدیک تھے جو اپنے ساحلوں سے اوپر ہو کے زور و شور سے بہ رہی تھی۔ آواز تیز ہوتی گئی۔ بھیگی گھاس گھنی اور اونچی تھی، جھاڑیاں اور گنجان تھیں اور افق اور زیادہ تنگ ہو رہا تھا ادھر ادھر پہاڑوں کے اندھیرے پس منظر پہ تیز آگ یکایک بھڑک اٹھتی اور فوراً ہی غائب ہو جاتی۔

"یہ روشنی کیا ہے، تم جانتے ہو؟" میں نے ایک تاتاری سے دھیرے سے پوچھا جو میرے برابر ہی چل رہا تھا۔

"کیوں؟ تم نہیں جانتے؟" اس نے دریافت کیا

"نہیں، میں نہیں جانتا"

"یہ پہاڑی کا کام ہے۔ اس نے ایک کھمبے میں پیال باندھ لکھا ہے اور چاروں طرف آگ گھما دیگا" اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں جواب دیا۔

"آخر کس لئے؟"

"تاکہ ہر شخص جان لے کہ روسی آ رہے ہیں۔ دیہاتوں میں" اس نے ہنستے ہوئے کہا "عجیب گڑبڑ مچ جائے گی۔ ہر شخص اپنی اپنی چیزیں چھپانے لگے گا"

"ایں! تو کیا پہاڑیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ فوج آ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، بے شک وہ جانتا ہے! وہ ہمیشہ جانتا ہے! ہمارے لوگ ایسے ہی ہیں!"

"کیا شامیل بھی لڑنے کی تیاری کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "شامیل لڑنے کے لئے سامنے نہیں آئے گا۔ شامیل اپنے سرداروں کو بھیجے گا۔ اور خود اوپر سے بیٹھا دیکھتا رہے گا"

"کیا وہ بہت دور رہتا ہے؟"

"نہیں، دور نہیں، سامنے بائیں ہاتھ کو یہاں سے صرف چند میل"

"تم کیسے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا "کیا تم وہاں گئے ہو؟"

"میں گیا ہوں، ہم میں سے ہر شخص پہاڑوں میں گیا ہے۔

"اور کیا تم نے شامیل کو دیکھا ہے"؟

"بش! شامیل کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ سینکڑوں ہزاروں سپاہیوں کا پہرہ اس کے چاروں طرف رہتا ہے اور شامیل بالکل بیچ میں کھڑا رہتا ہے!" اس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شامیل کا رعب اس کے دل پر بیٹھا تھا، اور اس کے سامنے وہ اپنی کمتری محسوس کرتا ہے۔

آسمان صاف ہو چلا تھا، نگاہیں اوپر اٹھا کے دیکھنے سے پورب کی طرف روشنی معلوم ہو رہی تھی۔ ستارے جھلملا کے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن اس نالے کی گہرائی جہاں ہم چلے جا رہے تھے اندھیرا تھا اور نمی۔

یکایک ہمارے تھوڑا آگے کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں جھلملا اٹھیں

لگیں، اور ساتھ ہی ساتھ بندوق کی گولیاں تیزی سے بھنبھناتی ہمارے پاس سے گزریں اور اپنے چاروں طرف کے سناٹے میں ہم نے دور پر بندوقوں کی آوازیں سنی اور ایک دلدوز چیخ۔ یہ دشمن کی فوج کا اگلا دستہ تھا۔ اس دستہ میں تاتاری تھے۔ وہ چیختے اور یوں ہی بلانشانہ کئے بندوقیں چلاتے اور ہر طرف منتشر ہو جاتے۔

تمام خاموشی تھی۔ جنرل نے ترجمان کو بلایا۔ ایک تاتاری اجلا کوٹ پہنے گھوڑے پر سوار آیا اور آہستہ آہستہ طرح طرح سے اشارے کر کر کے بہت دیر تک کسی چیز کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

"کرنیل ہسنو۔ اسکاؤٹوں کے دستہ کو حکم دو کہ اور کھلی صف بنا کے آگے بڑھیں۔" جنرل نے دھیمی لیکن بہت ہی صاف آواز میں کہا۔

فوج دریا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ کالے پہاڑ جو نالے میں دونوں طرف سے گھیرے ہوتے پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ روشنی ہونے لگی، آسمان جس پر پہلے دھندلے ستاروں کا نقش بھی مٹتا جا رہا تھا۔ اب اونچا ہو گیا تھا۔ صبح کی لال دمک پورب کے آسمان پر کانپ رہی تھی چبھتی ہوئی ہوا پچھم سے چلنے لگی اور کانپتا ہوا کہاسا پُرشور دریا کے اوپر بھاپ کی طرح اُٹھ رہا تھا۔

راہنما نے گھاٹ بتلایا۔ سوار اور جنرل معہ اپنے ہمرکابوں کے آگے بڑھے۔ پانی گھوڑوں کی چھاتی تک آگیا۔ اُجلے پتھروں میں سے ہو کے جو کہیں کہیں سطح سے اوپر نمایاں تھے، پانی اتنے زور سے بہہ رہا تھا کہ گھوڑوں کے پیروں کے چاروں طرف جھاگ دار بھنور سا بن جا رہا تھا۔ پانی کی آواز سے گھوڑے چونک کر سر اونچا کرتے اور کان کھڑے کرتے لیکن دھارے کے خلاف ناہموار سطح پر آہستہ آہستہ قدم جمائے آگے بڑھ رہے تھے۔ سواروں نے اپنے پیر اور رانیں اوپر اٹھا لیں۔ پیدل سپاہی جو سوائے قمیص کے تقریباً کچھ نہیں پہنے تھے اپنی بندوقوں پر اپنے کپڑے رکھ کے انھیں اوپر اُٹھائے تھے بیس بیس آدمیوں کی قطار بنا کے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ چل رہے تھے اور ان کے چہروں کے رنگ سے اس محنت اور مشقت کا پتہ لگ رہا تھا جو دھارے کے خلاف چلنے میں انھیں کرنی پڑ رہی تھی، سواروں نے چیخ کے اپنے گھوڑوں کو پانی میں دوڑانا چاہا۔ بھاری توپیں جن سے پانی ٹکرا رہا تھا پتھریلی تہ پر گھڑگھڑا رہی تھیں لیکن مضبوط کو سبک گھوڑے زور لگا کے پانی میں جھاگ بناتے بھیگی دمیں اور ایال لئے دوسرے کنارے پر نکل آئے۔

دریا کے اس پار ہوتے ہی یکایک جنرل کے چہرہ پر سنجیدگی اور سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے اپنا گھوڑا گھمایا اور سواروں کے دستہ کے ساتھ ایک کھلے میدان میں چلا جو ہمارے سامنے پھیلے ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ کاسک رسالہ کے جاسوس جنگل کے کنارے کنارے منتشر ہو گئے۔ ہم نے جنگل میں ایک آدمی کو دیکھا جو سرکیشین کوٹ اور ٹوپی پہنے تھا اور پیدل تھا پھر ایک دوسرا بھی دیکھا۔۔۔ ۔۔۔۔ اور تیسرا۔ ایک افسر نے کہا۔

"وہ تاتاری ہیں"۔ تب ایک درخت کے پیچھے سے دھواں کا بھبکا اٹھا۔۔۔۔۔ بندوق چلائی گئی۔۔۔۔۔۔ اور پھر ایک اور ہماری بندوقوں کی باڑ نے دشمن کی بندوق کی آواز دبا دی صرف رہ رہ کے کوئی گولی زن زناتی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز پیدا کرتی ہمارے پاس سے گزر جاتی۔ جس سے پتہ چلتا کہ صرف ہماری طرف سے بندوقیں نہیں چل رہی ہیں۔ تب پیدل سپاہی دوڑتے ہوئے اور توپخانہ تیزی سے مخبروں کی صف سے آگے گزر گیا ہم نے توپوں کی بھاری گڑگڑاہٹ کارتوسوں کے نکال کر پھینکے جانے کی جھنجھناہٹ، گولوں کی سنسناہٹ اور بندوقوں کی تڑاتڑ سنی سوار، پیدل، اور توپخانہ اس میدان کے ہر طرف دکھائی دے رہا تھا توپوں، گولوں، اور بندوقوں کا دھواں درختوں کی سبزی میں پگھل کے کہاسے مل رہا تھا۔ کرنل ہسنو جنرل کے پاس گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور تیزی سے رک کے سلام کرتے ہوئے بولا۔

"حضور والا، سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دیجئے جھنڈے دکھائی دے رہے ہیں۔" اور اس نے اپنے ہنٹر سے چند تاتاریوں کی طرف اشارہ کیا جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے آگے دو آدمی گھوڑوں پر سوار ڈنڈوں میں لال اور نیلے جھنڈے لئے ہوئے تھے۔

"بہت اچھا ایوان میہائیلو وچ" جنرل نے کہا
کرنل نے فوراً اپنا گھوڑا گھما لیا اور تلوار ہوا میں ہلاتے ہوئے چلایا۔

"ہُرّا!"

"ہُرّا! ہُرّا! ہُرّا!" ہر طرف سے گونج اٹھا اور رسالہ اس کے پیچھے دوڑا۔

ہر شخص بڑی بے قراری اور اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ ایک جھنڈا دکھائی دیا پھر ایک اور، پھر تیسرا، چوتھا......

دشمن نے حملہ کا انتظار نہیں کیا وہ جنگل میں غائب ہو گئے اور وہیں سے بندوقیں چلانے لگے، گولیاں اور تیزی سے آنے لگیں۔

"کوئل شارمانت کو دو دل؟" اپنے کالے سپتلے پیروں والے گھوڑے کی زین پر اُچھلتے ہوئے کہا۔

"شارمانت" میجر نے جواب دیا اور اپنے گھوڑے کو مہمیز مار کے جنرل کے قریب لایا۔ "سئت اوں ورائی پلیسیر کوئی لا گیری داں اوں اوسی بو ہینز" اس نے کہا۔

"اے سرتا ؤ ایں یونی کمپین" جنرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میجر نے سر جھکا لیا۔

اس وقت ایک تیز ڈرا دینے والی سنسناہٹ کے ساتھ دشمن کی طرف سے ایک گولی آئی اور کسی چیز میں لگی، پیچھے کی صف سے ایک آدمی کی کراہ سنائی دی۔ اس کا مجھ پر ایسا عجیب اثر ہوا کہ یکبارگی اس جنگ کے منظر کی ساری دلکشی میرے لئے ختم ہو گئی لیکن میرے سوا اس کا کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔ میجر اور زیادہ زور سے ہنسنے لگا ایک دوسرے افسر نے جو کچھ بول رہا تھا اپنا جملہ بڑے اطمینان سے ختم کیا۔ جنرل نے دوسری جانب دیکھا اور نہایت ہی پُر سکون تبسّم کے ساتھ فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔

"کیا ہمیں بھی ان کی گولیوں کا جواب دینے کا حکم ملتا ہے؟" توپخانہ کے افسر نے جنرل کے پاس آ کے پوچھا۔

"ہاں انھیں تھوڑا ڈرا دو" جنرل نے سگریٹ جلاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

توپخانہ درست کیا گیا اور گولے چلنا شروع ہوئے۔ زمین کراہ اٹھی روشنی بجلی کی طرح مسلسل چمکنے لگی اور دھواں جس میں توپ چلانے والے چھپ گئے تھے آنکھوں کو دھندلی بنانے لگا۔

تاتاری گاؤں پر گولہ باری ہوئی۔ کرنل پھر جنرل کے پاس آیا اور اس کا حکم لے کے گاؤں میں گھس پڑا۔ جنگ کی پکاریں گونج رہی تھیں۔ اور رسالہ اپنے پیچھے گرد کا ایک بادل اٹھاتا غائب ہو گیا۔

منظر بلا شبہ شاندار تھا میں جنگ میں کوئی حصّہ نہ لے رہا تھا ایسی چیزوں کا عادی نہ تھا، لیکن میرے نزدیک ان تمام اثرات کو ایک بات زائل کر رہی تھی۔ بھاگ دوڑ، چیخیں اور کھلبلی مجھے بالکل بیکار معلوم ہو رہی تھیں۔ میں بے اختیار ایک آدمی کا خیال کرنے لگا جو ہاتھ میں کلہاڑا لئے ہوا میں وار کر رہا ہو۔

تاتاری گاؤں پر ہماری فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اور جب جنرل معہ اپنے ہمرکابوں کے (جن میں میں نے بھی اپنے کو شامل کر لیا تھا)
۶۱ گاؤں میں داخل ہوا تو دشمنوں کا ایک آدمی بھی اس میں نہ تھا۔

لمبی ستھری جھونپڑیاں جن کی سطح چھتیں مٹی کی تھیں اور جن میں خوبصورت چمنیاں لگی تھیں ناہموار چٹانوں پر بنی ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں کے بیچ سے ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی تھی۔ ایک طرف ناشپاتی اور بیر کے سرسبز اور شاداب باغ تھے جو روشن دھوپ میں چمک رہے تھے دوسری طرف عجیب عجیب سایے تھے قبرستان کے لمبے عمودی پتھر اور لکڑی کے لمبے کھمبے جن کے سروں پر گنبد اور مختلف قسم کے رنگین جھنڈے لگے تھے (یہ جنگجوؤں کی قبریں تھیں)

پھاٹک کے پاس فوج صف بنا کے کھڑی ہو گئی اور پھر سوار کاسک اور پیدل سپاہی گلیوں اور تنگ راستہ میں منتشر ہو گئے اور فوراً ہی خالی گاؤں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کہیں پر چھپر توڑی جا رہی ہے کہیں پر سے کلہاڑی سے کواڑ توڑنے کی آواز آ رہی ہے دوسری جگہ پر پیالوں کے ڈھیر میں آگ لگی ہوئی ہے کوئی جھونپڑی جل رہی ہے اور دھواں کے گہرے بادل صاف ہوا میں اٹھ رہے تھے

کہیں کوئی کاسک ایک بوری آٹے کی اور ایک کمبل اٹھائے لا رہا تھا۔ کوئی سپاہی کسی جھونپڑی سے چیزیں نکال رہا ہے دوسرا ہاتھ پھیلا کے دو مرغیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو زور زور سے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ تیسرے نے کہیں سے دودھ بھرا ہوا ایک بڑا سا جگ پا لیا تھا۔ اس نے اس میں سے تھوڑا پیا اور پھر برتن کو زمین پر پٹک دیا۔

جس دستہ کے ساتھ میں قلعہ ن ــــ سے آیا تھا وہ بھی گاؤں میں موجود تھا۔ کپتان ایک جھونپڑے کے چھپّر پر بیٹھا ایک چھوٹی سی پائپ پی رہا تھا۔ وہ ایسے لاپرواہ بے خود انداز میں بیٹھا تھا کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میں بھول گیا کہ میں دشمن کے گاؤں میں تھا بلکہ ایسا محسوس کیا کہ اپنے گھر میں ہوں۔

"ارے تم بھی یہاں ہو!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

طویل القامت لفٹنٹ روسنکرانز گاؤں میں تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ وہ لگاتار چیخ چیخ کے حکم دئے جا رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بات کے لئے بے حد پریشان ہو۔

میں نے اسے ایک جھونپڑی سے فاتحانہ انداز سے نکلتے دیکھا۔ اس کے پیچھے دو سپاہی ایک بوڑھے تاتاری کو لئے ہوئے تھے جس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ بوڑھا آدمی پھٹی چٹی قمیص اور گدڑی بنتا ہوا پاجامہ پہنے تھا۔ اس کے کاندھے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ نکلے پڑ رہے ہیں، اس کے ننگے مڑے ہوئے پیر بڑی مشکل سے حرکت بھی کر سکتے تھے۔ اس کے چہرہ اور اس کے گھٹے ہوئے سر پر بھی جھریاں پڑ گئیں تھیں۔ اس کا منہ جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کھونٹی جیسے بال تھے مسلسل حرکت کر رہا تھا جیسے وہ کچھ چبا رہا ہو۔ لیکن اس کی سرخ بے پلک کی آنکھوں میں اب تک ایک چمک تھی جن سے ایک بوڑھے آدمی کی زندگی سے نفرت کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔

روسنکرانز نے ترجمان کے ذریعہ سے اس سے پوچھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ گاؤں چھوڑ کے کیوں نہیں گیا۔

"میں جاتا کہاں؟" اس نے بڑے اطمینان سے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کے کہا۔

"یہاں دوسرے گئے،" کسی نے جواب دیا۔

"جیگیت روسیوں سے لڑنے گئے ہیں لیکن میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں۔"

"کیوں تمہیں روسیوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

"روسی میرا کیا کریں گے؟ میں بوڑھا ہوں،" اس نے کہا اور اپنے چاروں طرف لاپرواہی سے نگاہ ڈالی۔

واپس جاتے ہوئے میں نے اسی بوڑھے کو دیکھا ایک کاسک کی زین کے پیچھے جھٹکے کھاتا جا رہا ہے، سر پر ٹوپی ندارد تھی، دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اسی بے پرواہانہ انداز سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے قیدیوں کے تبادلہ کے لئے رکھ لیا گیا تھا۔

میں چھپّر پر چڑھ کے کپتان کے نزدیک بیٹھ گیا

"معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔" میں نے اس سے کہا۔ میں ان سب واقعات کے بارے میں اس کا خیال معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"دشمن؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "نہیں تو۔ ایک بھی نہیں تھا کیا انھیں تم دشمن کہو گے؟ شام تک انتظار کرو اور دیکھو کہ ہم یہاں سے کیسے چلے جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ وہ کیسے ہیں گھر تک پہنچانے کسی وہ تمام سے ابل پڑیں گے!" اس نے اپنی پائپ سے اس جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے نزدیک سے ہو کر صبح ہم گزرے تھے

"وہ کیا ہے؟" میں نے گھبرا کر کپتان کا قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا اور چند ڈان کاسک کی طرف اشارہ کیا جو ہم لوگوں سے تھوڑی دور پر کسی چیز کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

ان کے درمیان میں سے کسی بچّے کے رونے کی سی آواز آئی اور یہ باتیں سنائی دیں۔

"چھُرا مت مارو! ٹھہرو...... وہ دیکھ لیں گے..... تمہارے پاس چاقو ہے' ایوستیگنیج؟ لاؤ چاقو دو۔"

"ارے یہ بدمعاش کچھ کر رہے ہیں!" کپتان نے بڑے اطمینان

سے کہا۔

لیکن اسی وقت علم بردار خوفزدہ تمتمایا ہوا چہرہ کیساتھ دوڑا آیا اور ہاتھ ہلاتا ہوا کاسکوں کی طرف دوڑا۔

"اسے مت چھوؤ ؟ اسے مت مارو!" وہ بچوں جیسی آواز میں چیخا۔

ایک افسر کو دیکھ کے کاسک الگ ہو گئے اور ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ دکھائی دیا۔ نوجوان علمبردار ہکا بکا رہ گیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بولا اور شرمایا ہوا وہیں پر رک گیا

کپتان کو اور مجھے چھپر پر دیکھ کے اس کا چہرہ شرم سے اور سُرخ ہو گیا اور وہ ہماری طرف دوڑا آیا۔

"میں نے سمجھا وہ کسی بچّہ کو قتل کئے ڈال رہے ہیں" اس نے شرمیلی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جنرل رسالہ کے ساتھ آگے جا چکے تھے۔ جس بلٹن کے ساتھ میں قلعہ ن ـــــ سے آیا تھا وہ اس وقت موخر الجیش تھی۔ کپتان لوپوا اور لفٹنٹ روسنکرانز کے فوجی دستے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

کپتان کی پیش گوئی بالکل ٹھیک ثابت ہوئی۔ جیسے ہم لوگ اس جھاڑی میں داخل ہوئے جس کا تذکرہ کپتان نے کیا تھا سڑک کے دونوں طرف سوار اور پیدل پہاڑی بار بار دکھائی دینے لگے۔ وہ اتنے نزدیک آجاتے کہ میں ان میں سے بعض کو بالکل صاف صاف ہاتھ میں بندوق لئے جھک کے ایک درخت سے درخت کی اوٹ میں جاتے دیکھتا۔ کپتان نے اپنی ٹوپی اُتاری اور بڑے احترام سے صلیب کا نشان بنایا۔ بہت سے پُرانے سپاہیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہم نے جنگل میں چیخیں اور نام لے لے کے پکارنے کی آوازیں سُنیں۔ بندوق کی تڑاتڑ بھی سُنائی دی اور گولیاں دونوں طرف سے سنسناتی ہوئی آنے لگیں۔ ہمارے آدمی بھی بالکل خاموشی سے گولیاں چلا رہے تھے۔ صرف کبھی صف میں سے کوئی بول اٹھتا۔ "وہ کدھر سے گولیاں چلا رہے ہیں؟" جنگل میں انھیں بڑا اطمینان ہے!" "ہمیں توپیں چلانی چاہئیں!" ـــــ وغیرہ وغیرہ

توپیں صف میں درست کی گئیں اور دو ہی تین گولے کے بعد معلوم ہوا جیسے دشمن کمزور پڑ رہے ہیں لیکن فوراً ہر ہر قدم پر چیخیں اور گولیاں اور تیزی سے اور مسلسل آنے لگیں۔

ہم لوگ گاؤں سے سو گز سے زیادہ نہ گئے ہوں گے کہ دشمن کی توپ کے گولے ہمارے سروں پر سیٹیاں بجانے لگے۔ میں نے ایک سپاہی کو زخمی ہو کے مرجاتے دیکھا...... لیکن اس بھیانک منظر کی تفصیل کیوں لکھوں۔ جب کہ میں خود اس کے بھولنے کے لئے کیا کچھ نہیں دیسکتا؟

لفٹنٹ راسنکرانز اپنی بندوق چلا رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چپ نہ ہوئے۔ بھاری پھنسی ہوئی آواز میں چیخ چیخ کے سپاہیوں کو حکم دیتے اور بے تحاشہ ایک صف سے دوسری صف میں گھوڑا دوڑاتے پھرتے۔ ان کا چہرہ کچھ پھیکا معلوم ہو رہا تھا۔

خوبصورت علمبردار عجیب طرح کے جوش میں تھا۔ اس کی حسین کالی آنکھوں میں ہمّت کی چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم
تھا وہ مسلسل کپتان کے پاس جاجا کے جنگل میں گھس پڑنے کی ۶۴۳
اجازت مانگ رہا تھا

"ہم لوگ انھیں مار بھگائیں گے،" وہ کہے جا رہا تھا، "یقینی ہم انھیں بھگا دیں گے!"

"اس کی ضرورت ہی نہیں،" کپتان نے کہا "ہمیں پیچھے ہٹنا ہے۔"

کپتان کے دستے نے جنگل کے کنارے مورچہ قائم کر لیا اور لیٹ کر گولیاں چلانے لگے۔ کپتان لٹکتی ہوئی ٹوپی اور فرسودہ کوٹ پہنے لگام ڈھیلی کئے اپنے اُجلے گھوڑے پر چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ رکاب چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کا پاؤں مڑا ہوا تھا۔ سپاہی اپنا کام اتنی اچھی طرح جانتے اور کرتے تھے کہ انھیں حکم دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف کبھی کبھی وہ زور سے ان آدمیوں کو پکار دیتا تھا جو اپنا سر اٹھا دیتے تھے۔ کپتان کی وضع قطع فوجی نہ تھی لیکن اتنا کھرا پن اور اتنی سادگی تھی کہ مجھ پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا۔

یکایک میرے دل میں خیال ہوا "یہ ہے سچی بہادری!"

وہی بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں اسے برابر دیکھتا رہا تھا۔ نقل و حرکت کا وہی مطمئن انداز، وہی دھیمی پُرسکون آواز، اس کے سادہ لیکن کھلے ہوئے چہرہ پر وہی بھولا پن صرف اس کی نگاہوں کے غیر معمولی چوکنا پن سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ اپنے کام میں چُپ چاپ مستعدی سے مشغول ہے "ہمیشہ جیسا" کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن دوسرے لوگوں میں کتنی ہی تبدیلیاں میں نے دیکھی اور محسوس کی ہیں کوئی معمول سے زیادہ پُرسکون ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے کوئی زیادہ درشت ہونے کی، اور کوئی بہت ہشاش بشاش معلوم ہونے کی لیکن کپتان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکتا کہ کیوں کوئی کچھ اور ظاہر ہونے کی کوشش کرے۔

تاریخ میں کتنے ہی بہادروں کے قصّے ہیں۔ انھوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں جو رہتی دُنیا تک انسانوں کے لئے مشعل راہ رہیں گی لیکن ان کی بہادری اور کپتان کی بہادری میں یہ فرق تھا۔ اگر کسی موقع پر کوئی قول زرّیں میرے ہیرو کی روح کو ابھارتا بھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ اُسے زبان پر نہ لاتا۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ ڈرتا کہ کہیں اس قول زرّیں کو زبان پر لا کے وہ اس عظیم الشان کارنامہ کی اہمیت کم نہ کر دے۔ دوسرے جب کوئی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی بڑا کام کرنے کی طاقت اس میں موجود ہے تو پھر الفاظ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں یہ روسی شجاعت کی عجیب اور بلند خصوصیت ہے اور پھر جب یہ حالت ہو تو اپنے نوجوان افسروں کی زبان سے تاریخ کے فرسودہ واقعات اور گزرے ہوئے ہیروؤں کے پامال جملے سُن کے کوئی روسی دل میں بغیر ایک چبھن محسوس کئے کیسے رہ سکتا ہے؟

یکایک اس طرف جدھر خوبصورت علمبردار کھڑا تھا خوشی اور جوش کی ایک چیخ کی آواز آئی۔ اس طرف مڑ کے دیکھا تو تقریباً تیس سپاہی نئے جُتے ہوئے کھیت میں ہاتھوں میں بندوقیں اور کاندھوں پر تھیلے لئے بڑی مشکل سے دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن پھر بھی چیختے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے ان کے آگے نوجوان علمبردار تلوار گھماتا گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔

وہ سب جنگل میں غائب ہو گئے۔

چند لمحے کی چیخوں اور بندوقوں کے چلنے کے بعد ایک خوفزدہ گھوڑا نکلا اور پھر سپاہی بھی مرے ہوؤں اور زخمیوں کو لئے ہوئے جنگل میں سے باہر آئے۔ زخمیوں میں علمبردار بھی تھا۔ دو سپاہی اس کے بازو پکڑے ہوئے اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ روما کی طرح اُجلا ہو رہا تھا اور اس کا حسین چہرہ جس پر اب جنگی جوش کا ایک سایہ سا جھلملاتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے کاندھوں پر منھ سینہ پر جھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی اجلی قمیص پر کھلے ہوئے کوٹ کے نیچے ایک چھوٹا سُرخ داغ نظر آ رہا تھا۔

"آہ! صد افسوس!" میں نے کہا۔ خود بخود میری نگاہیں اس طرف سے ہٹ گئیں۔ میں اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکا۔

"ہاں بیشک صد افسوس" میرے نزدیک کھڑے ہوئے ایک اداس سپاہی نے کہا۔ "وہ کسی چیز سے نہ ڈرتا تھا، کیسے کوئی بھی ایسا کر سکتا ہے؟" وہ زخمی لڑکے کی طرف غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ "اتنا بچپن اور بیوقوف ـــــــ اور اسی کی سزا اسے ملی"

"کیوں، تم ڈرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بلاشبہ!"

چار سپاہی علمبردار کو اسٹریچر پر لئے ہوئے تھے۔ قلعہ کا ایک سپاہی پیچھے پیچھے ایک دُبلے خستہ حال گھوڑے کو لئے ہوئے تھا جس پر دو بڑے بڑے ہرے بکس تھے جن میں دوائیں اور جراحی کے سامان تھے۔ ڈاکٹر کا انتظار تھا۔ افسر اسٹریچر کے پاس آئے اور زخمی نوجوان کو ہمت دلاتے اور تسلّی دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تسلّی اور تشفی کے جملے خوبصورت علمبردار کی ہمت بڑھائیں گے اور اس کو سنبھالیں گے لیکن اس کے سرد اور مغموم چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے۔

کپتان بھی اس کے پاس گیا۔ وہ غور سے زخمی نوجوان کو دیکھتا رہا اور اس کے عام طور سے مطمئن پرسکون چہرہ پر بھی سچی ہمدردی کی جھلک تھی۔

"عزیزنا ناتول ایوانووچ" اس نے ایسی نرم اور محبت بھری آواز میں کہنا شروع کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہی خدا کی مرضی تھی۔"

زخمی نوجوان نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرہ پہ تبسم کی روشنی جھلملائی۔

"ہاں میں نے آپ کا حکم نہیں مانا۔"

"بہتر ہے کہ اسے مشیت ایزدی کہو۔" کپتان نے پھر کہا۔

ڈاکٹر آگیا۔ اپنے ماتحت سے پٹیاں اور دوسرا سامان لیا۔ اور آستین چڑھا کے مسکراتا ہوا زخمی کی طرف بڑھا۔

"اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مضبوط جسم میں دشمنوں نے سوراخ کر دیا ہے۔" اس نے مذاقاً کہا۔ "دیکھیں۔"

علمبردار نے دکھلایا۔ لیکن جس نظر سے اس نے پُرمذاق ڈاکٹر کی طرف دیکھا اس میں حیرت اور ملامت جھلک رہی تھی لیکن ڈاکٹر نے اُسے نہ دیکھا۔ اس نے زخم کو تمام ہر طرف سے دیکھا بھالا لیکن آخرکار بے صبر ہو کر زخمی نوجوان کراہا اور اس کا ہاتھ دھکیل کر ہٹا دیا۔

"چھوڑ دیجیے" اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے مرنا ہی ہے۔"

یہ کہہ کے وہ لیٹ گیا۔ اور پانچ منٹ بعد جب اس جماعت کے پاس پہنچا جو اس کے چاروں طرف جمع تھی اور ایک سپاہی سے اس کی حالت پوچھی تو اس نے جواب دیا۔

"وہ گزر گیا۔"

دن ڈھلنے پہ فوج چوڑی صف بنائے گاتی ہوئی قلعہ کی طرف چلی۔ برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سورج ڈوب گیا تھا اور اپنی آخری گلابی کرنیں پتلی ہلکی بدلیوں پہ ڈال رہا تھا جو صاف نتھرے ہوئے افق سے چمٹی ہوئی تھیں۔ برفیلے پہاڑوں پہ دھند پڑتا جا رہا تھا۔ غروبِ آفتاب کی سُرخ چمک کے پس منظر پہ صرف ان کی انتہائی بلندی عجیب شاندار صفائی سے سر اونچا کئے ہوئے تھی شفاف چاند جو دیر سے نکلا ہوا تھا آسمان کی گہری نیلاہٹ کے سامنے اجلا ہوتا جا رہا تھا۔ گھاس اور درختوں کی سبزی سیاہ اور شبنم کی نمی سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

سرسبز چراگاہ سے ہوتی ہوئی فوج مُستقل قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ ڈھول، جھانجھ، قرنا اور گانے کی آواز ہر طرف سے آ رہی تھی۔ چھٹے دستہ کا گانے والا اپنی پوری آواز سے گا رہا تھا اور اس کی گہری بھاری آواز جوش اور جذبات سے پُر شام کی لطیف نتھری ہوا میں دور دور تک تیر رہی تھی۔

(ختم)

دعوتِ عمل

محروم ہے عینِ باریابی ہو جا　　آزادِ صراحی و گلابی ہو جا
ہو ولولۂ عمل سے اتنا سرشار　　بے منتِ جام و مے شرابی ہو جا "عسکری"

خانۂ خدا

افراد

ایک سرمایہ دار	اس کی بیوی
تعلیم یافتہ نوجوان	بوڑھا بھکاری

(طبع زاد از شاکر علی)

(منظر) بازار، دونوں طرف کپڑے، جوتوں، اور کھانے پینے کی دوکانیں ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک کشادہ سڑک ہے جس پر موٹر، ٹرام، تانگے اور سائکلوں کا تانتا بندھا ہے۔ فٹ پاتھ پر گاہکوں اور تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ اس بھیڑ میں ننگے اور بھوکے گداگروں نے بےروزگار نوجوان بھی روٹی اور کپڑے کی تلاش میں ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں۔ ایک نوجوان ایک دوکان سے سر ڈالے آہستہ آہستہ قدموں سے نکلتا ہے اور باہر آکر ایک طرف لوگوں کے اس سیلاب سے بچکر کھڑا ہو جاتا ہے)

(موسم نے ایک دم رُخ بدلا۔ کالے کالے بادل اُمڈ آئے، بجلی کی چمک اور سرد ہوا کی شائیں شائیں گاہکوں اور تماشائیوں نے گھروں کی راہ لی۔ رات بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ دوکانیں بھی بڑھنا شروع ہو گئیں لیکن وہ نوجوان اور اس جیسے اور بھی وہیں موجود تھے۔ ایک بڈھا بھکاری سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کمبل کے ٹکڑے سے جسم کو چھپاتا لکڑی ٹیکتا نوجوان کے سامنے سے گزرتا ہے)

نوجوان اس کو سر اُٹھا کر دیکھتا ہے۔

بھکاری۔ ایک پیسہ بابوجی!

نوجوان مُسکرا کر سر جھکا لیتا ہے۔

بھکاری۔ دجل کسی غریب کی مدد سے رہے اور اس کی حالت پر ہنستے بابا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔

نوجوان۔ بڑے میاں، تم پر نہیں زندگی کی ستم ظریفی پر ہنستا ہوں کہ مفلس خود مفلس سے بھیک مانگ رہا ہے۔

بھکاری۔ (اس کا مُنہ حیرت سے تکتا ہے) تمہاری وضع قطع سے تو میں سمجھا بابوجی! کہ تم اُن میں سے ہو جو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے اپنی دولت تجوری میں بند رکھتے ہیں لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ میری طرح تم بھی قسمت کے ستائے ہوئے ہو۔

نوجوان۔ قسمت کا ستایا ہوا؟ میں سماج کا ستایا ہوا ہوں، اُن سرمایہ داروں کا ستایا ہوا ہوں (اونچی اونچی دوکانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) جنھوں نے اپنی گردن بچانے کے لئے تقدیر کا ڈھونگ کھڑا کیا۔ اور دُنیا کے ہر اچھے بُرے کا اس کو ذمہ دار ٹھیرایا تاکہ ہم سب اپنی حالت پر مطمئن رہیں اور وہ ٹٹی کی آڑ میں ہمیں بیسا کریں۔

بھکاری۔ بیٹا صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ہماری پکار ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔!

نوجوان۔ صبر! ـــ یہ سبق بھی سرمایہ داری کا پڑھایا ہوا ہے۔ جب وہ دھن دولت کے ہوتے ہوئے بھی صبر نہیں کرتے اور غریبوں کا خون چوسنے کے لئے طرح طرح سے ستم ایجاد کرتے ہیں تو پھر ہم اپنی روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر کیوں قناعت کریں؟ تقدیر، قناعت، صبر، یہ سب الفاظ ہمیں بہلانے کے لئے ہیں، ہمیں دھوکہ دینے کے لئے گھڑے گئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

بڈھا خاموش کھڑا نوجوان کی باتیں سن رہا تھا۔ جب نوجوان خاموش ہوا تو جدھر جا رہا تھا چل دیا۔ نوجوان بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

بھکاری۔ تم کدھر جا رہے ہو؟!

نوجوان۔ جاتا کہاں تمہارے ساتھ ہوں، ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں!

بھکاری۔ (حیرت سے) میرے ساتھ! میرا نہ گھر دا نہ در دا۔ تمہارا میرا کیا ساتھ؟!

نوجوان۔ (مسکرا کر) اگر تم بے گھر رہے ہو تو میں کون سا محل رکھتا ہوں جب تک جیب میں پیسے تھے تو دن میں روزگار کی دُھن میں چکر لگاتا اور رات کو سرائے میں پڑ رہتا۔ جیب کے سارے پیسے بھٹیارے کی نذر ہو گئے مگر نوکری نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اب کیا کیا جائے؟ خودکشی کر لیتے لیکن (ہنس کر) وہ بھی تو مذہب میں حرام اور قانون میں جرم ہے!

بھکاری۔ (آہ بھر کر) دُنیا بڑی ظالم ہے!

(یہ دونوں کشادہ سڑکوں اور پھر تنگ گلیوں میں سے گزرتے ہیں جہاں اعلیٰ اور متوسط طبقے کی اونچی نیچی حویلیاں ہیں، دروازے اور کھڑکیاں سردی اور پانی کے خیال سے بند ہیں۔ چلتے چلتے بڈھا ایک دومنزلہ حویلی کے سامنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

نوجوان۔ (تعجب سے) کیوں بڑے میاں رُک کیوں گئے؟ کیا تھک گئے؟!

بھکاری۔ نہیں تھکا تو نہیں ہوں (ٹھنڈی سانس لیکر) اس مکان کو دیکھتا ہوں! جب میں جوان تھا تو راج گیری کیا کرتا تھا۔ بہت سے مکان بنائے، یہ سامنے والا مکان بھی میرا ہی بنایا ہوا ہے جب میں ان مکانوں کے سامنے سے گزرتا ہوں تو اس بےفکری کے زمانہ کی یاد سے میرا دل بھر آتا ہے۔ جب کھانے پینے کی کمی نہ تھی اور اب یہ بوڑھی ہڈیاں اور یہ جاڑے کی راتیں!!"

نوجوان۔ "تو تم کبھی راجگیری بھی کرتے تھے۔ اس پر یہ حالت؟ ظلم ہے سراسر ظلم۔ تمہاری محنت سے دوسرے آرام پا رہے ہیں اور خود تم......؟ اندھیر ہے، اندھیر"

بھکاری۔" اندھیر اور ظلم کیا میاں؟ میں نے جو محنت کی تھی اسکی مزدوری حاصل کر کے خرچ بھی کر چکا۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟"

نوجوان۔ "مزدوری تمہیں دی تو گئی تھی لیکن اوّل تو وہ تمہاری محنت کی نسبت بہت کم تھی دوسرے وہ برائے نام مزدوری بھی جس ہاتھ سے تمہیں دی گئی تھی پھر لے لی گئی۔ تمہاری محنت کی وہ قیمت آج تمہارے پاس موجود نہیں لیکن وہ تمہاری اور تمہارے جیسے اور مزدوروں کی محنت سے ابھی تک آرام پا رہے ہیں اور اس کے بعد ان کی اولاد ـــــ"

اتنے میں ایک موٹر اس مکان کے سامنے آ کر رُکتی ہے جس میں سے ایک عورت اور ایک مرد اُترتے ہیں۔

مرد۔ (آسمان کی طرف دیکھ کر) "کیسی تاریکی ہے؟"

عورت۔" بجلی کی کڑک اور ہوا کی شائیں شائیں سے دل ہلا جاتا ہے ایسے جاڑے پالے میں بھلا انسان کے باہر نکلنے کا کیا کام ہے!"

(یہ کہتے اور ان مصیبت زدہ ہستیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ دونوں اپنی محل سرا میں گھس جاتے ہیں)

(بڈھا اور نوجوان ساتھی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں، اور پھر چل پڑتے ہیں)

بھکاری۔ (کوئی دس قدم چلنے کے بعد) "یہ سب کچھ میرے کئے کا بھگتان ہے۔ اگر میں اپنی کمائی میں سے تھوڑا بہت بھی رکھتا تو آج بڑھاپے میں یہ حالت نہ ہوتی۔"

نوجوان: "اچھا ہوا جو تم نے یہ بُری عادت اختیار نہ کی۔ اسی کا تو سارا فتور ہے ہم اس طرح دربدر پھر رہے ہیں، اور کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ ساری دُنیا کی دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہو گئی ہے۔"

بھکاری۔ (حیرت سے اس کا منہ تکنے لگتا ہے) "ہماری اتنی عمر ہو گئی ہم نے تو یہی دیکھا اور سُنا کہ جو کوئی اس بات کا خیال رکھتا ہے کبھی ننگا بھوکا نہیں رہتا۔"

نوجوان۔ تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے بڑے میاں، اس کے تو حلوے مانڈے کہیں نہیں گئے لیکن اپنے بھائیوں کو ننگا اور بھوکا بنا دیتا ہے۔"

بھکاری سر جھکا لیتا ہے

بھکاری۔ (تھوڑی دیر کے بعد) "بھئی ہماری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں"

نوجوان مُسکرانے لگتا ہے

(تنگ گلی میں سے ہو کر یہ دونوں ایک کشادہ سڑک پر نکلے۔ دوکانیں بند ہیں، پان سگریٹ والوں کی دوکانیں کہیں کہیں کھلی نظر آتی ہیں فٹ پاتھ پر کہیں کہیں لوگ ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں، ایک آدھ تانگہ ادھر اُدھر آ جا رہا ہے، بالا خانوں پر روشنیاں چمک رہی ہیں (تیز تیز قدم رکھ کر یہ اس سڑک سے گزر جاتے ہیں)

بھکاری۔ "خدا انھیں غارت کرے، خدا کی مخلوق کو پھانسنے کیلئے کیسے کیسے جال پھیلائے ہیں؟"

نوجوان: "خدا اور خدا کی مخلوق!۔۔۔۔ خدا اس مخلوق کو غارت نہ کرے جس کی ہوس کاریوں کا وہ شکار ہوئی۔ جنھوں نے ان کے حُسن پر ان کی جوانی پر ڈاکے ڈالے اور پھر خود ہی منصف بن کر ان کو سماج کا مجرم قرار دیا۔ مذہب نے بھی اُلٹا ان ہی کو جہنمی ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ جب وہ بھوکی مر رہی تھیں تو کیا کرتیں مجبور ہو کر اسی لٹی ہوئی دولت سے پیٹ پالنا شروع کر دیا پیٹ بُری بلا ہے جب اس کو نہیں ملتا تو پھر خدا اور سماج کا بھی خوف جاتا رہتا ہے (تھوڑی دیر کے بعد) یہ تو سوچو وہ کسے پھانسیں گی جو پہلے جال میں خود پھنسی ہوئی ہیں۔ وہ کسے شکار کریں گی جو خود مذہب اور سماج کی بے رحمی کا شکار ہیں ان میں سے اگر کوئی اس گڑھے سے نکلنا بھی چاہتی ہے تو سماج کے وہی اجارہ دار جنھوں نے ان کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔ راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

بھکاری۔ (کئی مرتبہ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے) "خدا مجھے معاف کرے اپنی جوانی میں میں نے بھی اس کوچے کی بہت خاک چھانی ہے"

(کالے بادل گھرے ہیں، بجلی کڑک رہی ہے۔ بہت تاریکی ہے، اندھیرے میں یہ دونوں سردی سے کپکپاتے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے جا رہے ہیں) دونوں کی کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور اسی کے ساتھ کسی کے کراہنے کی آواز آئی)

آواز۔ ہائے نصیبا! کبھی وہ دن تھا کہ میں پھولوں کی سیجوں پر سویا کرتی اور لوگوں کی گودوں میں لوٹا کرتی تھی مگر آج جاڑے کی اس اندھیری رات میں بھوکی پیاسی سڑک کے سرد پتھر پر پڑی ہوں، اس پر بھی راہ گیر چین نہیں لینے دیتے ٹھوکریں مارتے چلتے ہیں۔"

(وہ دونوں رُک جاتے ہیں جھک کر دیکھا تو ایک بھکارن ایک دوکان کے آگے فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ جسم سے کوڑھ چو رہا ہے، ہاتھ پاؤں کی اُنگلیوں پر دھجیاں لپٹی ہوئی ہیں اور بدن پر چیتھڑے لگے ہوئے ہیں، سردی سے ٹھٹھر رہی ہے)۔

نوجوان۔ معاف کرنا مائی ہم نے دیکھا نہیں تھا۔"

بھکاری۔ "ارے تم سردی میں اس طرح پڑی ہو (اپنے کمبل کا ٹکڑا اُتارتے ہوئے) لو یہ کمبل کا ٹکڑا اپنے اوپر ڈال لو کچھ تو گرمی آئے گی اور یہ کچھ روٹی کے ٹکڑے تو اسے بھی میا۔"

بھکارن۔ "کمبل کا پھٹا ہوا ٹکڑا اس وقت میرے لئے ریشمی لحافوں سے بڑھ کر ہے اور یہ روٹی کے سوکھے ٹکڑے لذیذ غذاؤں سے بہتر ہیں (کچھ دیر سوچ کر) لیکن میں ان کی قیمت کس طرح ادا کر سکتی ہوں

اب نہ تو میرے پاس حسن ہے اور نہ جوانی کی گرمی، تمہیں دعائیں دیدیتی لیکن آسمان بہت اونچا ہے"

(وہ ہنستی ہے)

بھکاری اور نوجوان (ایک زبان ہو کر) "نہیں ہمیں کچھ نہیں چاہئے!"

بھکارن۔ (کمبل کے ٹکڑے اپنے گرد لپیٹتی ہوئی کھڑی ہو جاتی ہے)

"جاؤں اپنے گناہوں کی اُس یادگار کو بھی دیکھوں کہاں رہ گیا ان ظالموں نے میرے بھیک کے ٹکڑوں میں بھی تو ایک ننھی سی جان کو شریک بنا دیا۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ خود کھاؤں اور وہ بھوکوں مرے۔ آخر ہے تو میرا ہی لخت جگر۔"

بھکارن کراہتی ہوئی گرتی پڑتی تاریکی میں ایک طرف چلدیتی ہے۔

نوجوان۔ "رات کہاں بسر کروگے؟"

بھکاری۔ "کسی دوکان کے آگے پڑ رہیں گے"

نوجوان۔ "مگر سردی تو غضب ڈھا رہی ہے، رات کیسے کٹے گی؟"

بھکاری۔ "تو پھر بتاؤ کیا کریں؟"

نوجوان۔ (دوسری طرف رُخ بدل کر) سامنے وہ عالیشان مسجد ہے چلو وہیں چلیں۔

بھکاری۔ (حیرت سے) مسجد میں!"

نوجوان۔ (تیزی سے) "ہاں مسجد میں، جب اُس میں کھجور کی چٹائیوں مٹی کے بدھنے، اور استنجے کے بے شمار ڈھیلے سما سکتے ہیں تو کیا ہم اللہ کے دو بندے نہیں سما سکتے۔"

بھکاری۔ "خیال تو مجھے بھی کئی بار ہوا مگر ہمت نہ پڑی۔"

نوجوان۔ "مگر ہمت نہ پڑی!"

(نوجوان اور کچھ کہے بغیر بڈھے کا ہاتھ پکڑ کر مسجد کی طرف چل دیتا ہے، سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جب یہ دونوں اس کے دروازہ پر پہنچتے ہیں تو اس کا پھاٹک بند ہو چکا تھا بجلی کی چمک اور بادل کی گرج اور تیز ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ پانی کی موٹی موٹی بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ یہ دونوں پانی اور سردی میں مسجد کے پھاٹک کے آگے اسی طرح سر ڈالے کھڑے بھیگ رہے تھے۔

کھڑے کھڑے بڈھے بھکاری کا چہرہ ایکدم سُرخ ہو جاتا ہے۔ اس کی گردن کی رگیں اُبھر آئیں، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ لکڑی پھینک کر وہ سرو قد کھڑا ہو جاتا اور آگے دوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مسجد کے پھاٹک کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخ کر کہتا ہے۔

" یہ اور خانۂ خدا!"

پھر دونوں ایک دوسرے پر حسرت بھری نگاہیں ڈال کر سر جھکا لیتے ہیں۔ بادل اور تیزی سے کڑکتا ہے۔

شہید

ایک ایکٹ کا مزاحیہ

(ترجمہ از چیخوف)

کردار

مُرشکن ———— ٹالکشو و کا دوست

ٹالکشو و ———— ایک بال بچوں والا آدمی

(مرشکن کے مطالعہ کا کمرہ گدّے دار فرنیچر سے آراستہ مرشکن لکھنے کی میز پر بیٹھا ہے۔ ٹالکشو و داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھوں میں لیمپ کا گلوب، ایک کھلونا بائیسکل تین ٹوپی کے ڈبے، کپڑوں کا ایک بڑا بنڈل، ایک مچھلی نما بکس جس میں بیئر کی بوتلیں ہیں اور کئی چھوٹے چھوٹے بنڈل ہیں، وہ اپنے چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے اور ایک صوفہ پر اس طرح گر جاتا ہے جیسے تھک کر چور ہو رہا ہو)

مرشکن۔ ہلو، ٹالکشو و، بڑی خوشی ہوئی، کہاں سے آرہے ہو؟

ٹالکشو و۔ (لمبی سانس لیتے ہوئے) پیارے دوست ..... مجھے تم سے ایک عنایت کی درخواست کرنی ہے ..... میں تم سے التجا کرتا ہوں ...... مجھے کل تک کے لئے ایک ریوالور عاریتہً دیدو ...... اتنا تو حق دوستی ادا کرو!

مرشکن۔ ایں؟ ریوالور کی تم کو کیا ضرورت پڑ گئی؟

ٹالکشو و۔ ہے ایک ضرورت ...... یا اللہ ..... ذرا پانی پلواؤ۔ ..... جلدی کرو، پانی! ہاں مجھے ضرورت ہے ..... آج رات کو مجھے ایک تاریک جنگل سے گزرنا ہے اور اس لئے ...... ہر خطرہ کے لئے تیار رہنا ہے، بھئی تم بڑے اچھے آدمی ہو، بس ریوالور دیدو!

مرشکن۔ اُہ یہ کیا بیہودہ باتیں ہیں ٹالکشو و۔ یہ تاریک جنگل کی کیا بکواس ہے؟ معلوم ہوتا ہے تمہارے سر پر کچھ سوار ہے کیوں؟ تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت نیک نہیں، لیکن آخر بات کیا ہے بھئی؟ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟

ٹالکشو و۔ ذرا ٹھہرو، مجھے سانس لینے دو ..... یا خدا۔ اتنا تھکا ہوا ہوں جیسے ایک کتا، سر اور پورے جسم میں ایسی سنسنی ہے جیسے مجھے خوب پیٹا گیا ہے۔ اب زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ دوست ہو تو سوالات مت کرو تفصیل

مت پوچھو۔۔۔۔ بس ایک ریوالور دیدو! میں منت کرتا ہوں!

مرشکن۔ ارے رے ٹالکشود یہ کیسی کمزوری ہے تم بال بچوں والے آدمی ہو، کونسل کے ممبر ہو! تمھیں شرم آنی چاہئے!

ٹالکشود۔ میں بال بچوں والا آدمی ہوں! میں شہید ہوں، شہید، میں بار برداری کا جانور ہوں، غلام ہوں، بزدل ہوں کہ بجائے ہمت کے ساتھ دوسری دُنیا کی راہ لینے کے موت کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ میں ایک چیتھڑا ہوں، گڑھ مغزا ہوں، احمق ہوں، میں آخر کیوں زندہ ہوں؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ (اچک کر کھڑا ہو جاتا ہے) بتائیے جناب والا میں کس لئے جئے جا رہا ہوں؟ دماغی اور جسمانی مصائب کا یہ سلسلہ کیوں برداشت کر رہا ہوں؟ ایک عقیدہ کی خاطر جان دیدینا میری سمجھ میں آتا ہے لیکن اپنی جان کو گھلائے جانا خدا جانے کس مقصد کے لئے، لیمپ کے گلوب کیلئے یا عورتوں کے پیٹی کوٹ کے لئے نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا نہیں ہوسکتا ہر گز نہیں۔ یہ کافی کر چکا! کافی!

مرشکن۔ اتنی زور سے مت بولو۔ پڑوس کے لوگ سُنینگے!

ٹالکشود۔ پڑوس کے لوگ سُنا کریں مجھے کچھ پروا نہیں۔ اگر تم مجھے ریوالور نہیں دوگے تو کسی اور سے مل جائیگا۔ کسی نہ کسی طرح میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہونگا یہ تو طے ہے۔

مرشکن۔ ٹھہرو۔ تم نے میرا بٹن توڑ ڈالا۔ سکون کے ساتھ باتیں کرو۔ میں ابتک نہیں سمجھ سکا کہ تمھاری مصیبت کیا ہے؟

ٹالکشود۔ مصیبت کیا ہے؟ تم پوچھتے ہو مصیبت کیا ہے؟ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ ضرور بتاؤں گا ممکن ہے کہ دینے سے کچھ طبیعت ہلکی ہو ...... آؤ بیٹھ جائیں۔ تو سُنو ..... اُف سانس لینا مشکل ہو رہا ہے ..... مثال کے لئے آج ہی کو لو۔ تم جانتے ہو کہ دس بجے صبح سے ۴ بجے شام تک دفتر میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ دفتر کمبخت گرمی سے تنور بنا رہتا ہے، حبس، مکھیوں کی بھنبھناہٹ، ایک عجیب انتشار اور اُلجھن رہتی ہے، اس پر طرہ یہ کہ سکریٹری صاحب چھٹی پر ہیں، ہارلو بیاہ کرنے گئے ہوئے ہیں ماتحت ملازمین ہفتوں سے ڈھیلے پڑے ہیں کسی پر محبت کا بھوت سوار ہے، کسی کو تھیٹر کا شوق چرایا ہے ...... سب پژمردہ ہیں، اونگھتے رہتے ہیں اور اتنے مضمحل کہ ان سے عقل سے کام کرنے کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔ سکریٹری کے فرائض ایک ایسے بزرگ انجام دیرہے ہیں جو محبت میں بائیں کان سے بہرے ہوگئے ہیں جو لوگ دفتر میں تشریف لاتے ہیں معلوم ہوتا ہے حواس کہیں گم کر آئے ہیں۔ ہمیشہ جلدی میں رہتے ہیں اور بے چین ۔۔۔۔ کبھی غصہ کرتے ہیں۔ کبھی دھمکی دیتے ہیں۔ الغرض دفتر ایسا مچھوا بازار بنا رہتا ہے کہ جی چاہتا ہے مدد کے لئے چیخیں۔ انتشار اور اُلجھن۔ اور کام بھی عجیب جہنمی قسم کا ہے۔ روز ایک ہی قسم کا۔ وہی انکوائری وہی حوالے۔ ایسے یکساں جیسے سمندر کی لہریں۔ جلتے ہوا آنکھیں سر سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ ذرا پانی دو ...... دفتر سے باہر آئیے تو چولیں ڈھیلی ہو چکی ہوتی ہیں اور جسم چور ...... اب چاہئے تو یہ تھا کہ کھا پی کر اچھی طرح آرام کرتے لیکن جی نہیں، یاد رہے آج کل گرمی کی چھٹیاں ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک غلام ہیں، چیتھڑے ہیں، جانور ہیں، آپ کو فرمائشوں کی تعمیل میں جوزوں کی طرح دوڑتے رہنا ہے۔ ہماری دیہاتی سوسائٹی میں ایک نہایت ہی عمدہ رواج ہے، اگر کوئی بیچارا شہر کی طرف جارہا ہو تو نہ صرف اس کی بیوی کو بلکہ ہر مرد و دچھٹی منانیوالے کو یہ حق ہوتا ہے کہ اسکے سر پر فرمائشوں کا انبار رکھدے، بیگم صاحبہ کا اصرار ہے کہ درزی کے ہاں جاکر اسے خوب ڈانٹوں کیونکہ اس نے بلاؤز کا باڈس بہت ڈھیلا اور کندھے بہت تنگ بنائے ہیں۔ سونچکا کے جوتے بدلنا، سالی صاحبہ کو ۵ رکا گہرے سُرخ رنگ کا ریشم درکار ہے

جو نمونہ کے مطابق ہو اور ڈھائی گز لیں ..... بلکہ ٹھہرو میں تمہیں پڑھ کر ہی سنائے دیتا ہوں (اپنی جیب سے ایک پرزہ نکالتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے) لیمپ کے لئے ایک گلوب، آدھا سیر سموسہ، ۵ آنہ کا لونگ اور جائفل، منّا کے لئے ریڈی کا تیل، دس سیر دانہ دار چینی، مکان سے تانبے کی پتیلی، اور چینی باریک کرنے کے لئے کھرل، کاربالک ایسڈ، کیڑے مارنے کا سفوف، ۱۰ ارکا چھرے کا پاؤڈر۔ ۲۰ بوتل بیئر، سرکہ، میڈم موائیزل۔ شانسو کے لئے ۸۲ نمبر کا انگیہ ..... اوہ، اور مکان سے منّا کا لمباکوٹ اور برساتی جوتہ، یہ تو میری بیگم صاحبہ اور خاندان والوں کی فرمائشیں ہیں اب ذرا میرے پیارے دوستوں اور عزیز پڑوسیوں (خدا ان سے سمجھے) کی فرمائشیں بھی سُنئے، واٹسن کے گھر والے کل وولوڈیا کی نام کھائی منا رہے ہیں، اسکے لئے ایک بائیسکل لانی ہے، لفٹنٹ کرنل صاحب کی بیگم صاحبہ آج کل بڑی دلچسپ حالت میں ہیں اور اس لئے اس خاکسار کو روزانہ دایہ کے گھر جاکر تشریف لے چلنے کے لئے خوشامد کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میری جیب میں پانچ فہرستیں ہیں اور رومال میں یہاں سے وہاں تک صرف گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس طرح جناب والا دفتر کے بعد سے ٹرین کے وقت تک اس خاکسار کو شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک زبان نکالے ہوئے کُتے کی طرح دوڑتے پھرنا —— دوڑتے پھرنا اور اپنی زندگی کو کوسنا۔ بزاز کے یہاں سے دواخانہ، دواخانہ سے درزی کے یہاں۔ درزی کے یہاں سے قصائی کی دکان پر اور وہاں سے پھر واپس دواخانہ، کہیں گرتے گرتے بچتا ہوں، کہیں روپیہ گم ہو جاتا ہے کہیں قیمت ادا کرنی بھول جاتا ہوں اور دکان والے گالیاں دیتے ہوئے پیچھا کرتے ہیں اور چوتھی جگہ کسی خاتون کی ساری پر پیر پڑ جاتا ہے ....

اوہ —— اس قسم کی ورزش آدمی کو نکما اور اتنا چور کر دیتی ہے کہ رات بھر ایک ایک ہڈی دُکھتی ہے اور خواب میں مگرمچھ دکھائی دیتے ہیں۔ خیر کسی طرح کام ختم ہوا اور تمام چیزیں خریدی جاچکیں ...... تو جناب والا ذرا یہ بتائیے کہ ان تمام خرافات کو پیک کیسے کیا جائے؟ مثلاً آپ ایک بھاری تانبے کی پتیلی اور وزنی کھرل کو لیمپ کے گلوب کے ساتھ یا کاربالک ایسڈ کو چاء کے ساتھ کس طرح باندھینگے؟ بیئر کی بوتلوں اور بائیسکل کا کس طرح جوڑ بیٹھے گا؟ اس محنت کیلئے تو رستم کی ضرورت ہے، یہ ایک مسئلہ ہے ایک معمہ۔ اپنے دماغ کو جتنا چاہو ٹٹولو نتیجہ صرف اتنا ہوگا کہ یا تو کوئی چیز ٹوٹ جائیگی یا کوئی چیز چھلک کر گر جائیگی اور اسٹیشن پر اور گاڑی میں اس طرح کھڑا رہنا ہوگا کہ ٹانگیں پھیلی ہوئی بازو نکلے ہوئے، کسی گٹھری کو ٹھوڑی سے سنبھالے ہوئے کسی طرف مچھلی نما ٹوکری لٹک رہی ہے اور کہیں گتے کے ڈبے ہوا میں ڈول رہے ہیں اور جب گاڑی چلنے لگے تو مسافر گٹھریوں کو اپنی جگہوں سے کھسکانا شروع کرتے ہیں اس لئے کہ بیٹھنے کی تمام جگہوں پر گٹھریاں چپکی رہتی ہیں۔ کوئی شور مچاتا ہے کوئی گارڈ کو پکارنے لگتا ہے، کوئی ڈبہ سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتا ہے لیکن میں کر ہی کیا سکتا ہوں، صرف کھڑا ہوا پٹے ہوئے گدھے کی طرح کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ اب سُنئے کہ اسکے بعد کیا ہوتا ہے۔ گھر پہنچتا ہوں۔ اب تمہیں بتاؤں دن بھر کی محنت کے بعد اتنا تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ پیٹ بھر کے کھانا کھاؤں اور جی بھر کے کچھ پیوں دم بھر کے لئے ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ ہے کہ نہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کام بھی نہیں کر سکتا۔ بیگم صاحبہ کی نظر عنایت اس خاکسار پر ذرا زیادہ رہتی ہے۔ آپنے ابھی ایک لقمہ بھی نہیں نگلا ہوگا کہ ایک مرتبہ بیگم صاحبہ

آپ پر جھپٹیں گی اور بس آپ کو چپکے سے کسی تھیٹر یا ناچ گھر کی طرف چل پڑنا ہوگا۔ کیا مجال کہ آپ چوں بھی کر سکیں آپ تو شوہر ہیں اور چھپٹیوں کی لغت میں شوہر کے معنی ایسے بے زبان جانور کے ہوتے ہیں جس کو جس طرح چاہے ہنکائے اور جتنا چاہے اس پر بوجھ لادنے کے لئے انجمن انسداد مظالم جانوران کی جانب سے کسی مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ آپ تھیٹر میں جا کر شریف خاندان کے ساز، یا موشیا، ملاحظہ فرمائیں اور اگرچہ آپ کی کمزوری اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ سانس اُکھڑ جانے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے لیکن بیگم صاحبہ کے اشارہ پر تالیاں بجانا بھی بالکل ضروری ہے۔ اسکے بعد کلب جا کر ناچ میں شرکت کیجئے بیگم صاحبہ کیلئے ایک مناسب رفیق تلاش کیجئے اور کوئی نہ ملے تو خود ناچیے۔ آدھی رات کو ایسی حالت میں کہ آپ بجائے انسان کے مری ہوئی بھیڑ ہو رہے ہوں مکان واپس آئیے لیکن خیر۔ بالآخر وہ وقت آ ہی پہنچا جس کا بڑی دیر سے آپ کو انتظار تھا۔ اب آپ کپڑے بدل کر بستر میں گھستے ہیں۔ بہت خوب۔ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے میٹھی میٹھی نیند کے مزے لے سکتے ہیں۔ آہا۔ جانتے ہو یہ کتنی پُر سکون کیفیت ہے۔ نہایت شاعرانہ اور سکون بخش۔ نہ تو ساتھ کے کمرے سے بچوں کے چیخنے کی آواز آتی ہے نہ بیگم صاحبہ وہاں تشریف رکھتی ہیں اور آپ کی روح کو پورا اطمینان حاصل ہے کہ اس سے بہتر حالت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔ نیند آ جاتی ہے کہ یکایک ...... بھن بھن بھن مچھر .... (کو دیکھتا ہے) خدا کی پناہ مچھر۔ خدا ان کو غارت کرے (مٹھی ہلاتا ہے) مچھر۔ یہ موذی پلیگ کو بھی مات کرتے ہیں۔ زمانہ وسطیٰ کی مذہبی عدالتوں کے مظالم سے بھی ان کی تکلیف بڑھی ہوئی ہے۔ یہ حضرات مچھر ان اتنی درد بھری آواز میں اتنے پُرسوز غمگین لہجے میں اپنے راگ الاپتے ہیں گویا آپ مداخلت کی معافی مانگ رہے ہیں لیکن مردود اس بُری طرح کاٹتے ہیں کہ آپ گھنٹوں کھجلاتے ہی رہ جائیں نیند تو ہوا ہو گئی۔ اب آپ سگریٹ سلگائیے، مچھر ماریئے سر کو چادر کے اندر گھسا کر سونے کی کوشش کیجئے لیکن نیند کہاں۔ ابھی مچھروں کے کاٹے پر صبر بھی نہیں آیا ہوگا کہ ایک دوسری مصیبت سر پر نازل ہو جاتی ہے بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں گانے کی مشق شروع کر دیتی ہیں دن بھر آرام فرماتی ہیں اور رات کو محفل سرود گرم کرتی ہیں معاذ اللہ یہ راگ کچھ کے ہوتے ہیں، مچھر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ (گاتا ہے) .... ظالم یہ راگ میرے جسم سے روح کھینچ نکالتے ہیں۔ آواز کی گنگناہٹ کم کرنے کے لئے میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ کنپٹی پر اپنی انگلیوں سے ٹھوکے دیتا ہوں اور اسی طرح اس وقت تک دئے چلا جاتا ہوں جبتک کہ بیگم صاحبہ ۴ بجے صبح چلی نہ جائیں اخ۔ ارے بھائی ذرا ایک گلاس پانی اور منگاؤ ..... میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ..... خیر رات بھر آنکھ جھپکائے بغیر صبح چھ بجے بستر سے اُٹھ جانا پڑتا ہے ــــ اور بس فوراً اسٹیشن چلے جائیے ...... دوڑتا ہوں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ راستہ بھر کیچڑ، کھاسے، سردی ــــ برسات ــ شہر پہنچتا ہوں تو پھر وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ یہ میری زندگی ہے میں کہتا ہوں یہ زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے میں اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے لئے بھی ایسی زندگی کی خواہش نہیں کر سکتا۔ جانتے ہو، ان پریشانیوں نے مجھے بیمار کر ڈالا ہے۔ دمہ اختلاج، ہر چیز کے متعلق ایک وحشت معدہ کام نہیں کرتا، آنکھیں دھندلی ہو گئی ہیں ...... تم یقین نہیں کرو گے کہ میں مستقل طور پر کمزوریٔ اعصاب کا مریض ہوں (اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے) لیکن یہ میں صرف تم سے کہہ رہا ہوں، ارادہ ہے کہ ڈاکٹر سینیشوٹ یا

مرز ہیدسکی سے مشورہ کردں ۔ بھائی اکثر ایک قسم کا خوف طاری ہو جاتا ہے جب بھی ذرا طبیعت جھنجلاتی ہے مچھروں کے کاٹنے یا راگ کی تکلیف دہ آواز سے غصہ آتا ہے تو اچانک آنکھوں کے سامنے دھندلکا ہو جاتا ہے میں کو دپڑتا ہوں، گھر میں چاروں طرف خون، خون، خون، میں خون کا پیاسا ہوں، چلاتا ہوا دوڑنے لگتا ہوں، گویا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور ایسے موقع پر سچ مچ جی چاہتا ہے کہ کسی کو چھری بھونک دوں یا کرسی سے کسی کا سر توڑ دوں۔ دیکھو بھلا یہ چھٹیاں کیا کیا مصیبتیں سامنے لاتی ہیں اور میری حالت پر کسی کو رحم نہیں آتا، میرے درد دل کو کوئی محسوس نہیں کرتا ...... سب لوگ اس کو روز مرّہ کا معمول سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو ہنستے ہیں لیکن خیال کرو کہ میں ایک جاندار مخلوق ہوں اور زندہ رہنا چاہتا ہوں، یہ مذاق نہیں بلکہ ٹریجیڈی ہے۔ خیر اگر تم ریوالور نہیں دو گے تو کم از کم تھوڑی سی ہمدردی تو کر سکتے ہو۔

مریشکن۔ مجھے واقعی تم سے ہمدردی ہے۔

ٹالکشود۔ میں جانتا ہوں تم کو کتنی ہمدردی ہے ..... خدا حافظ اب چلنا چاہئے۔ سمو سے لے آؤں ...... ابھی ٹوتھ پاؤڈر بھی لانا باقی ہے۔ پھر اسٹیشن بھی جانا ہے۔

مریشکن۔ چھٹیوں میں تم رہتے کہاں ہو؟

ٹالکشود۔ پیوٹردربور میں۔

مریشکن۔ (خوش خوش) واقعی؟ ارے بھئی تم اولگا پیولووناٹنبرگ کو جانتے ہو؟ وہ بھی وہیں رہتی ہیں۔

ٹالکشود۔ ہاں ہاں میں اُن کو جانتا ہوں وہ تو ہماری دوست ہیں۔

مریشکن۔ سچ کہو! کیا حسن اتفاق ہے۔ بڑی خوش قسمتی ہے۔ ارے بھئی بڑی مہربانی ہوگی ۔ ۔ ۔

ٹالکشود۔ کیا؟

مریشکن۔ پیارے دوست کیا تم ایک مہربانی کر سکتے ہو؟ دیکھو خفا نہ ہو۔ وعدہ کرو کہ کرو گے۔

ٹالکشود۔ ارے بات کیا ہے۔

مریشکن۔ دیکھو دوست کی حیثیت سے میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں، التجا کرتا ہوں۔ پہلے تو اولگا کو میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا میں زندہ ہوں اور اچھا اور اسکے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ اسکے لئے ایک چیز لیتے جاؤ۔ اس نے مجھ سے سینے کی دستی مشین کی فرمائش کی تھی لیکن کوئی لے جانے والا ہی نہیں ..... بھئی ذرا لیتے جاؤ۔ اور جب وہاں جا ہی رہے ہو تو یہ پنجرا اور لال بھی لیتے جاؤ .... لیکن ذرا احتیاط سے لے جانا ورنہ پنجرے کا دروازہ ٹوٹ جائیگا ..... ارے تم مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو؟

ٹالکشود۔ سینے کی ایک مشین۔ پنجرہ اور لال ....
(بے موقع اشعار گانے لگتا ہے)۔

مریشکن۔ ٹالکشود تم کو ہو کیا گیا ہے؟ تمہارا چہرہ اتنا سُرخ کیوں ہے؟

ٹالکشود۔ (پیر پٹکتے ہوئے) لاؤ دو مجھے سینے کی مشین، کہاں ہے پنجرہ؟ تم خود بھی میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میری بوٹیاں نوچ لو۔ کھا جاؤ مجھے۔ مار ڈالو (مٹھیاں بند کر لیتا ہے) خون۔ خون۔ میں خون کا پیاسا ہوں۔

مریشکن۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔

ٹالکشود۔ (اس پر جھپٹتے ہوئے) خون۔ خون۔ میں خون کا پیاسا ہوں۔

مریشکن۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) اس کا دماغ خراب ہو گیا (چلاتا ہے) پیٹروشا، میریا، کہاں ہو تم سب۔ مجھے بچاؤ۔

ٹالکشود۔ (کمرے میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے) میں خون کا پیاسا ہوں، خون کا ———

پردہ

انا کرینینا

"تلافیٔ مافات"

(ٹالسٹائی کا مشہور ادبی شاہکار اُردو میں)

(مترجمہ جناب محمود الحسن صدیقی بی اے (علیگ)

باب اوّل

(۱)

خوش و خورم خاندان تو قریب قریب سب خوش و خورم نظر آتے ہیں، لیکن وہ بدقسمت گھرانے جو رنج و غم میں مبتلا ہیں، اپنی جدا جدا خصوصیات رکھتے ہیں۔ "ابلانسکی" کے گھرانے میں عجیب گڑبڑ پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کی مالک یعنی "ابلانسکی" کی بیوی نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ان کی فرانسیسی گورنس سے اسکے شوہر کے پوشیدہ ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اس گھر میں اسکے ساتھ نہ رہے گی۔ یہ کشاکش تین دن سے جاری تھی اور شوہر، بیوی، بچے اور تمام گھر والے اس سے یکساں متاثر تھے، اور محسوس کر رہے تھے کہ اب ان کے ایک ساتھ رہنے کے کوئی معنی نہیں، اگر چند مسافر بھی اک سرائے میں ٹھہرے ہوئے آپس میں ایک جماعت سی بنا لیں، تو وہ بھی اپنی بہت سی مشترک دلچسپیاں رکھتے ہوں گے۔ لیکن اس گھر کے مکینوں کیلئے کوئی مشترک دلچسپی نہ تھی۔ بیوی صاحبہ اپنے کمرہ سے نہیں نکلتی تھیں شوہر صاحب تین روز سے گھر سے غائب تھے، بچے گھر میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ انہیں اپنا کام معلوم نہ تھا۔ گورنس نے اپنی ایک دوست کو خط لکھ رکھا تھا کہ وہ اسکے لئے دوسری ملازمت تلاش کرے۔ باورچی صاحب شام سے غائب تھے۔ باورچی کے مددگار اور گاڑیبان اپنی اپنی تنخواہ کے متقاضی تھے۔

اس جھگڑے سے تیسرے روز "پرنس اسٹیفن آرکیڈوچ ابلانسکی" جس کو اسکے دوست بلاتکلفی میں "اسٹوا" کے نام سے پکارتے تھے حسب معمول ۸ بجے صبح اٹھا، اپنی خوابگاہ میں نہیں، بلکہ اپنے مطالعے کے کمرہ میں، ایک چمڑے سے منڈھی ہوئی کوچ پر، اسپرنگ دار

کوچ پر کروٹ بدلی، تکیہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں دبایا، اور اپنا منہ اس پر رکھ کر اس نے پھر سونے کا قصد کیا، پھر معاً آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ہائیں، میں نے کیا خواب دیکھا، اور خواب کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا "ڈرامسٹڈ" میں ایک ڈنر اور "ایلیین" کی طرف سے بالکل امریکن قسم کا ڈنر، گویا معلوم ہوتا تھا کہ "ڈرامسٹڈ" امریکہ میں ہے۔ کانچ کی میزوں پر ڈنر چنا ہوا تھا، عجیب و غریب نغمے نکل رہے تھے، شاید "میونی سرو" کا گیت تھا۔ نہیں اس سے بھی دلکش کوئی چیز تھی۔ خوبصورت عورتیں ساقی گری کر رہی تھیں۔

اسٹیفن آرکیڈوچ کی آنکھوں میں اس خیال سے چمک پیدا ہو گئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنے خیال کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ "واہ کتنا پُرلطف، کتنا پُرمسرت، اپنی خصوصیات میں کیسا نرالا، الفاظ میں اسکے لطف کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا پورے طور پر خیال میں لانا بھی مشکل ہے۔" بھاری بھاری پردوں کے کناروں سے روشنی کی کرن کو کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنے سنہری خوبصورت منقش سلیپر میں پاؤں ڈالے۔ یہ سلیپر اس کی پچھلی سالگرہ پر اس کی بیوی نے ہدیۃً دیئے تھے۔ اور عادت کے موافق جو نو برس سے متواتر چلی آرہی تھی اس نے اپنا ہاتھ خوابگاہ کی کھونٹی کی طرف بڑھانا چاہا۔ جہاں اس کا گاؤن ٹنگا رہتا تھا۔ یکایک اس کو پورا واقعہ یاد آگیا کہ وہ کیوں وہاں سویا اور اپنی خوابگاہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ نہیں سویا۔ مسکراہٹ اسکے چہرے سے غائب ہو گئی۔ اور کدورت اور غصہ کے آثار پیدا ہو گئے۔

واقعہ کی تمام تفصیلات پر اس نے خیال دوڑاتے ہوئے کہا "خدایا! آخر اب کیا ہو۔ معاملہ بالکل بے قابو ہے۔ اور میرا قصور بالکل ظاہر اور مسلم۔

نہیں۔ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ اور کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ سب میرا قصور ہے۔ یقیناً میرا قصور ہے۔ لیکن میں قابلِ ملامت نہیں ہوں۔ اس ساری مصیبت کا سبب وہی واقعہ تھا۔ خدایا! اس نے مایوسانہ طور پر کہا۔ اور اس جھگڑے کی تمام ناخوشگوار روئداد اس کے سامنے آگئی۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ناخوشگوار اور تکلیف دہ لمحات اس وقت تھے جبکہ وہ تھیٹر سے واپس آکر نہایت خوش خوش اپنی بیوی کے لئے ایک سیب ہاتھ میں لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، اور وہاں نہ پاکر مطالعہ کے کمرہ میں دیکھا۔ اس کو وہاں بھی نہ پاکر بالآخر اپنی خوابگاہ میں اس نے اپنی بیوی کو پایا اور وہی منحوس خط ہاتھ میں لئے ہوئے جس نے کل واقعہ اس پر ظاہر کر دیا۔

وہ ہمیشہ مضمحل متفکر اور مصروف رہنے والی "ڈوالی" جو وہ اس کو عموماً سمجھا کرتا تھا ایک بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت خوفناک اور غضبناک نظروں سے اس کو گھور رہی تھی۔

یہ کیا ہے؟ اس نے درشتی کے ساتھ خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جب یہ منظر اسٹیفن کے خیال میں آیا تو اس واقعہ سے زیادہ تکلیف دہ اصل اسکے جواب کے خیال نے اسے دی جو اس نے اپنی بیوی کو اس موقع پر دیا تھا۔ اس موقع پر اس کا احساس وہی احساس تھا جو عموماً ایسے لوگوں کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی رکیک کام میں یکایک پکڑے جائیں۔ اس موقع کے مطابق اثرات وہ اپنے چہرہ سے ظاہر نہ کر سکا۔ بجائے بہت زیادہ ناراض ہو جانے۔ انکار کرنے۔ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے۔ یا معافی کی التجا کرنے یا بالکل غیر متعلق نظر آنے (ان میں ہر صورت اس سے بہتر ہوتی جو اس نے اختیار کی) بے اختیاری کے ساتھ (غالباً یہ اسکے دماغ کا ایک اضطراری فعل تھا) وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ جس کا وہ عادی تھا۔ اس موقع پر انتہائی احمقانہ مسکراہٹ تھی۔

اس مسکراہٹ پر وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ "ڈوالی" یہ اس کی (بیوی کا پیارا نام تھا) نے جس وقت اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ بالکل آگ بگولہ ہو گئی۔ ایک سخت جسمانی اذیت سے کانپتے ہوئے وہ اپنے مزاج کے مطابق انتہائی طور پر مشتعل ہو گئی اور جو کچھ منہ

میں آیا، کہتی ہوئی اس کمرہ سے بھاگ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سے اس نے اپنے شوہر سے ملنا بالکل ترک کر دیا۔

اگر میں اس وقت احمقانہ طور پر نہ مسکرایا ہوتا۔ اسٹیفن آرکیڈی وچ نے سوچا۔ لیکن۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس نے مایوسانہ انداز میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ لیکن اسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

(۲)

اسٹیفن آرکیڈی وچ ایک نہایت ایماندار اور باضمیر انسان تھا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ منفعل ہے، حالانکہ وہ منفعل نہیں تھا۔ اسے اس پر کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ ایک چونتیس سال کا شکیل نوجوان اپنی بیوی سے حقیقی محبت نہیں کرتا جو اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی ہے۔ اور اب تک سات بچوں کی ماں ہو چکی ہے۔ جن میں سے پانچ بچے زندہ ہیں۔ اس کو محض اس کا افسوس تھا کہ وہ اپنی حرکتوں کو اپنی بیوی سے چھپا نہ سکا۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا تمام وجود، اس واقعہ کے بعد، بیوی، بچوں اور خود اس کی حالت پر ترس کھا رہا ہے۔ اگر اس کو یہ علم ہوتا۔ کہ اس کا بیوی پر کتنا تباہ کن اثر پڑے گا۔ تو وہ اس واقعہ کو اس سے چھپانے کی اور زیادہ کوشش کرتا۔ اس نے اسپر کبھی غور نہیں کیا تھا بلکہ اس کو کچھ خفیف سا گمان یہ بھی تھا کہ اس کی بیوی اسکی بیوفائی سے واقف ہے اور اُس کو اس کی زیادہ پروا نہیں۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی اپنی موجودہ حالت میں جبکہ وہ نوجوان ہے نہ دلکش ہے نہ اور کوئی مخصوص قابلیت رکھتی ہے بلکہ محض اپنے بچوں کی سیدھی سادھی ماں ہے۔ انصافاً وہ اس معاملہ میں درگذر سے کام لے گی۔ لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس ثابت ہوئے۔

"مہیب اور کس قدر مہیب" اسٹیفن نے خیال کیا "اور کوئی چارہ کار باقی نہیں"۔ "آہ اس واقعہ سے قبل حالات کتنے بہتر تھے وہ اپنے بچوں میں کتنی مسرور و مطمئن تھی، میں اسکے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتا تھا، وہ بچوں کی تربیت اور گھر کے انتظام کے معاملہ میں بالکل آزاد تھی۔ بیشک یہ کس قدر بدنما ہے کہ میرا تعلق گھر کی خادمہ (گورنس) کے ساتھ ہو۔ کتنا نامناسب ہے۔ خادمہ کے ساتھ محبت کرنے میں کتنی دنائیت اور ذلت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن انسانی کمزوریاں "ملی رولنڈ" کی شرارت سے بھری ہوئی آنکھیں، اور دلکش مسکراہٹ، ہاں! جبتک وہ ہمارے یہاں ملازم رہی ہمارے تعلقات میں آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کا سب سے برا پہلو تو یہ ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا، ہر چیز میرے ساتھ نفرت میں اضافہ کرتی ہے۔ آخر میں کیا کروں گا۔ میں کیا کروں گا۔

لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ سوائے اس ایک جواب کے جو زندگی خود تمام پیچیدہ، اور لاینحل مشکلات کیلئے رکھتی ہے یعنی موجودہ حالات کے ساتھ ساتھ چلے چلو، یا بھول جاؤ۔

خیر دیکھا جائیگا۔ اسٹیفن آرکیڈی وچ نے اپنے دل میں کہا۔ اور کوچ سے اُٹھتے ہوئے، اس نے اپنا فاختئی رنگ کا لبادہ پہنا، جسپر ریشمین دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور پیٹی کی گرہ لگا کر اس نے، ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ پھر اپنے مستحکم قدموں کے ساتھ وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی تک گیا۔ پردہ ایک طرف کھینچا اور زور سے گھنٹی بجائی۔ جس کی تعمیل اسکے ایک پرانے خادم میتھوے نے کی اور اسکے کپڑے، بوٹ اور ساتھ ہی ایک تار لیکر حاضر ہوا۔ میتھوے کے پیچھے ہی نائی مع اپنے سامان کے داخل ہوا۔

"کیا دفتر سے کچھ کاغذات آئے ہیں"؟ اسٹیفن نے دریافت کیا۔ اور تار لیکر آئینہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

سب لوگ میز پر آ گئے ہیں۔ میتھوے نے اپنے مالک پر ایک متجسسانہ ہمدردی سے بھری ہوئی نگاہ ڈالی، اور تھوڑی دیر رک کر اس نے کسی قدر مسکراہٹ کے ساتھ جس سے چالاکی ظاہر ہوتی تھی کہا۔ ابھی ابھی ایک شخص اصطبل سے آیا تھا جہاں گھوڑے کرایہ پر ملتے ہیں۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس نے آئینہ میں میتھوے کی طرف دیکھا اور ان دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے

کو سمجھتی ہوئی آپس میں ملیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسٹیفن اپنی نگاہوں میں اسی سے کہہ رہا ہے "تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہیں حالات معلوم نہیں ہیں۔"

میٹوے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنے مالک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکے چہرہ پر جس سے اس کی نیک طینتی ظاہر ہوتی تھی بہت ہی خفیف مسکراہٹ تھی۔

"میں نے اس سے کہدیا ہے کہ، اتوار کے دن آئے، اور آپ کو بار بار پریشان نہ کرے۔"

بظاہر اس کا یہ جواب پہلے سے سوچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسٹیفن محسوس کر رہا تھا کہ میٹوے کسی قدر مذاق کے ساتھ اس کی توجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تار کا لفافہ پھاڑا۔ اور تار کو نہایت تیزی سے پڑھ گیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اس لئے میٹوے سے کہا۔

میٹوے، میری بہن اَنا آرکیڈینا کل آرہی ہیں۔

خدا کا شکر ہے۔ میٹوے نے کہا۔ صاف طور سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے مالک کی طرح اس موقع پر اَنا آرکیڈینا کے آنے کی اہمیت کو سمجھ رہا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ اسٹیفن آرکیڈی وچ کی نہایت عزیز بہن ہیں۔ دونوں میاں بیوی میں صفائی کرا سکیں گی۔

کیا وہ تنہا آرہی ہیں یا ان کے شوہر بھی ساتھ ہیں۔ میٹوے نے دریافت کیا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ اس کا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ نائی اسکی مونچھوں کے بال صاف کر رہا تھا۔ اس نے ایک انگلی اٹھا دی۔

میٹوے نے اپنے سر کو جنبش دی اور کہا، تنہا تو میں ان کے قیام کے لئے کمرہ کو درست کرلوں۔

ڈاریہ الیگزنڈرونہ سے دریافت کرو۔ وہ تمہیں بتائیں گی۔

میٹوے نے تعجب سے یہ نام دُہرایا۔

ہاں، ان سے کہو، یہ تار لیجاؤ۔ اور مجھ سے آکر کہو کہ، انہوں نے کیا کہا۔

میٹوے نے خیال کیا کہ اس سے ان کی آزمائش مقصود معلوم ہوتی ہے لیکن جواب میں اس نے صرف "بہت اچھا کہا، اور چلا گیا۔ 17

اسٹیفن آرکیڈی وچ اس عرصہ میں اپنا مُنہ دھوکر بال درست کر رہا تھا اور کپڑے پہننے ہی والا تھا کہ میٹوے اپنے جوتے کی چرچراہٹ کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا۔ تار اسکے ہاتھ میں تھا۔ نائی کمرہ سے جاچکا تھا۔

ڈیریا الیگزنڈرونہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے کہدوں کہ وہ جا رہی ہیں۔ اور جو آپ چاہیں کریں۔ یہ کہکر وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال کر اور اپنا سر ایک طرف کو جھکا کر اپنے مالک کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ بالکل خاموش تھا۔ تھوڑی دیر بعد لطف آمیز لیکن متاسفانہ مسکراہٹ اسکے خوبصورت چہرے سے ظاہر ہوئی اچھا میٹوے، اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے، جناب، وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائیگی۔"

ٹھیک ہو جائیں گی؟

"میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔"

"حقیقۃً"

اتنے میں دروازہ کے باہر ایک عورت کے کپڑوں کی سرسراہٹ سُن کر اس نے کہا یہ کون ہے؟

"میں ہوں" ایک مضبوط، لیکن خوشگوار عورت کی آواز نے جواب دیا، اور انا میٹریانہ نے اپنا چیچک زدہ چہرہ کواڑوں

میں سے نکالا۔

اچھا۔ میٹریشیا۔ کیا بات ہے اسٹیفن نے اسکی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

باوجودیکہ اسٹیفن آرکیڈی وچ جیسا کہ وہ خود تسلیم کر چکا تھا غلط راستہ پر تھا۔ لیکن گھر کا ہر آدمی یہاں تک بچوں کی اناّ بھی جو کہ بیوی کی بہترین دوست تھی اس کی طرفدار تھی۔

کہو؟ اس نے مایوسانہ طور پر پوچھا۔

جناب اسکے پاس جائیے، اور معافی چاہیئے۔ پھر سب خدا کے اختیار میں ہے۔ اُس نے اپنی حالت تباہ کر رکھی ہے۔ ایسے دیکھ کر ترس آتا ہے، گھر میں عجیب ہل چل مچی ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ آپ کو اپنے بچوں کا خیال ہونا چاہیئے۔ اُس سے معافی مانگنے کے سوا آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

"لیکن وہ مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔"

"بہت اچھا تم جا سکتی ہو" اسٹیفن نے کسی قدر جھینپ کر کہا۔ اپنا لبادہ اُتار کر پھینکتے ہوئے اس نے کہا "میرے کپڑے لاؤ۔"

میٹوے نے ایک سخت کالر اُٹھایا۔ اور اس پر سے نہ نظر آنے والی گرد کو پھونکتے ہوئے، اور ایک ظاہری اطمینان کے ساتھ وہ اپنے شکیل اور جسیم مالک کو کپڑے پہنانے لگا۔

(۳)

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کپڑے پہن کر، سینٹ لگایا۔ اپنی قمیص کے کفوں کو ٹھیک کیا۔ اور اپنی پاکٹ بک، سگرٹ کیس دیا سلائی کی ڈبیا، اور گھڑی اپنی جیب میں ڈالی، اپنے جیبی رومال کو جھٹکتے ہوئے وہ اپنے کمرہ سے باہر نکلا، باوجود خلفشار کے وہ جسمانی، اور دماغی اعتبار سے بالکل تندرست معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے کھانے کے کمرہ میں گیا۔ جہاں اسکے لئے قہوہ تیار تھا۔ اسکے خطوط اور دفتر کے کاغذ اسکے انتظار میں میز پر رکھے ہوئے تھے۔

اُس نے اپنے خطوں کو پڑھنا شروع۔ ایک خط ایک سوداگر نے بھیجا تھا جس سے وہ ایک جنگلی رقبہ کی فروخت کے متعلق خط و کتابت کر رہا تھا جو اسکی بیوی کی ملک تھا۔ اس رقبہ کا فروخت کر دینا نہایت ضروری تھا لیکن ظاہر ہے کہ جبتک بیوی سے اسکی صفائی نہو جائے، اس معاملہ کا اُٹھانا ہی ناممکن تھا۔ اسکے لئے یہ خیال نہایت رنج دہ تھا کہ مالی معاملات سے صفائی کی ابتدا کی جائے۔ کیونکہ ذاتی غرض کو شامل کر کے صفائی کی کوشش کرنا اسکے خیال میں نہایت شرمناک بات تھی۔

اس خط کو چھوڑ کر، اس نے دفتر کے کاغذات کو لیا۔ سرسری طور پر ان کو دیکھا اور ربڑی پنسل سے متعدد نشانات کئے، پھر ان کو ایک طرف ڈال کر قہوہ کی طرف متوجہ ہوا، قہوہ پیتے ہوئے اس نے ایک "روزنامہ" کو کھولا، یہ اسی وقت چھپ کر نکلا تھا، اور اتنا تازہ تھا کہ اسکی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ ہمیشہ آزاد خیال اخبارات پڑھتا تھا، یہ پرچہ بھی انتہا پسند پرچہ نہ تھا۔ بلکہ ان خیالات کی نمائندگی کرتا تھا جو لوگوں کی اکثریت کے خیالات تھے۔ خود اسٹیفن آرکیڈی وچ کو حالانکہ سائنس، آرٹ، اور پالیٹکس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ تاہم ان مباحث پر بھی وہ اکثریت کے خیال کا تابع تھا۔ اس پرچہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اکثریت کے خیال کے مطابق اپنے نقطۂ نظر میں تغیر اور تبدل کرتا رہے جب اکثریت کسی خیال کو بدل دیتی تھی تو پرچہ بھی اس خیال کو تبدیل کر دیتا تھا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ کو اپنے خیال کے تبدیل کرنے میں کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی بلکہ بالکل غیر فطری طور پر وہ خود بخود تبا ہو جاتے تھے۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ کا نقطۂ نظر آرار کے انتخاب کے متعلق بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ اپنے ہیٹ اور کوٹ کی وضع کے انتخاب متعلق ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی وضع کو اختیار کرتا تھا جو تازہ ترین فیشن سے متعلق تھی اور اسٹیفن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ وہ تما لوگ جو سوسائٹی کے لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ مجبوراً کسی نہ کسی نقطۂ نظر کو انتخاب کرنے پر اسی طرح مجبور ہیں جس طرح ہیٹ پہننے پر۔ فی الواقع اگر کوئی وجہ اس کو معتدل نقطۂ نظر اختیار کرنے کی ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ قدامت پسندی کے برخلاف یہ اسکے حالات اور کیرکٹر سے زیا قریب تھا۔ لبرل پارٹی کا خیال تھا کہ روس کی مالی حالت بہت خراب ہے اور یہ بھی واقعہ تھا کہ اسٹیفن آرکیڈی وچ اس زمانہ میں بہت مقروض تھا اور قرض کو ادا کرنے کے لئے اسکے پاس کافی روپیہ نہ تھا۔

اس جماعت کا خیال تھا کہ "شادی ایک بہت ہی کمزور اور فضول سی رسم رہ گئی ہے، اور اسکی اصلاح کرنا ضروری ہے اسٹیفن بھی اسی مناسبت سے اپنی گھریلو زندگی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا اس کو ہمیشہ اس سلسلہ میں جھوٹ اور بہانہ سازی سے لینا پڑتا تھا اور یہ باتیں اسکی فطرت کے بالکل منافی تھیں۔

اس جماعت کا خیال تھا کہ "مذہب صرف وحشی اور غیر متمدن انسانی جماعتوں کیلئے ضروری ہے۔" اور خود اسٹیفن بھی شاید ہی کبھ گرجا میں نماز کے وقت پہنچتا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "کیوں حیات بعد از موت کے متعلق لوگ اپنی فصاحت و بلاغت صرف کر ہیں۔" اسکے خیال میں تو "اسی دُنیا کی مسرتیں جینے کے لئے کافی ہیں۔"

اسٹیفن آرکیڈی وچ کبھی کبھی "ڈارون" کے نظریہ کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کا مذاق اُڑاتا تھا جو اپنے حسب و نسب پر فخر کر ہیں، انہیں وجوہ سے آزاد خیالی اس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ وہ اس اخبار کو پڑھ کر اتنا ہی لطف اُٹھاتا تھا، جتنا کہ سگار پینے یا ایک ۱۸
اچھے ڈنر پر اُٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اخبار اس کے دماغ پر ایک ابر کی طرح محیط ہو گیا تھا اس نے اس اخبار کا "افتتاحیہ" پڑھا، جس میں تذ تھا کہ قدامت پسندوں نے انقلاب پسندوں کے خلاف بڑا شور و غوغا مچا رکھا ہے اور وہ گورنمنٹ کو مجبور کر رہے ہیں کہ انقلاب کے "بھوت" کا انسداد کرے۔

"یہ کتنی غلطی ہے" اسٹیفن نے خیال کیا "دراصل انقلاب کا بھوت کوئی خوفناک چیز نہیں بلکہ وہ پُرانی، اور فرسودہ روا زیادہ خطرناک ہیں جو ملک کی ترقی روک رہی ہیں۔

اسکے بعد اس نے دوسرا مضمون پڑھا جو "مالیات" پر تھا جس میں بڑے بڑے ماہرین مالیات مِل اور بنتھم کے نظریات کا ذ کرتے ہوئے موجودہ وزارت پر دلچسپ چوٹیں تھیں۔ اپنی ذہانت سے اُس نے ان تمام اشارات کو سمجھ لیا کہ وہ مضمون کس نے لک تھا۔ اور کون کون اس سے متعلق تھے۔ اور اس مضمون کو پڑھ کر اسے حسب معمول بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی "نرس میٹریا فیلیمونہ" کی باتیں یاد آگئیں، وہ سب جو اس نے نصیحۃً کہا تھا اور گھر کی بے لطف حالت کا نقشہ اسکی نظروں میں کھنچ گیا۔

اس اثناء میں اس نے اس خبر کو پڑھا کہ "کاؤنٹ واؤن بسٹ" "ویسہ بدن" کو چلے گئے اور ان کی جگہ کسی پُرانے آدمی کی توقع نہیں پھر ایک سبک رفتار گاڑی کی فروخت کے متعلق۔ اسکے بعد ایک نوجوان عورت کے متلاشی ملازمت ہونے کی خبر، ان سب سے اس نے معمو کے مطابق کوئی دلچسپی نہیں لی۔

میخانۂ الہام

وہ مشرق



ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

جنوری فروری مارچ ۱۹۳۹ء

(مشترک نمبر)

تصویرِ جگر

(از حضرت جگر مراد آبادی)

(خاص ایشیا کیلئے)

محبت کار فرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے

ہر اک صورت ہر اک تصویر مُبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصّے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ اے حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی شورش ہے لیکن جیسے موجِ تہ نشیں کوئی
وہی دل ہے مگر آواز مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانۂ و ساقی وہی شیشہ وہی صہبا
مگر آوازِ نوشانوش مدھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن کچھ ایسا حال ہے دل کا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

جہانتک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

جہانتک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مِل مِل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اُٹھتی جاتی ہیں
مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

سازِ مشرق

(از حضرت جگر مرادآبادی)

خاص ایشیا کے لئے

نہیں ہے نہیں ہے، جوانی نہیں ہے
جوانی اگر جاودانی نہیں ہے

مقامِ تحیّر، زمانی نہیں ہے
یہاں کوئی شے آنی جانی نہیں ہے

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے
ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

یہ کیا ہے جو سحرِ جوانی نہیں ہے
کہ ہے اور پھر بدگمانی نہیں ہے

مرا قصّہ عشق فانی نہیں ہے
یہ مُردہ دلوں کی کہانی نہیں ہے

حریفانہ رکھتا ہوں رسمِ محبت
رگوں میں مری خون پانی نہیں ہے

مرا عشق زندہ، مرا عزم راسخ
مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے

مجھے اُن سے مطلب انہیں مجھ سے مطلب
کوئی واسطہ درمیانی نہیں ہے

جہاں وہ چھٹے کاش چھٹ جائے یہ بھی
مرے کام کی اب جوانی نہیں ہے

نہ سُنئے نہ سنئے غم و درد میرا
یہ ہے آپ بیتی کہانی نہیں ہے

خجل جس سے ہونا پڑے دل ہی دل میں
وہ کچھ اور ہے مہربانی نہیں ہے

محبت ازل سے مقدّر پڑی تھی
یہ افتادِ غم ناگہانی نہیں ہے

خطائیں جوانی کی یاد آچلی ہیں
جوانی مگر اب جوانی نہیں ہے

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا
حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

یہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنا
کہ طوفاں ہے برپا روانی نہیں ہے

زمانے کی چھانی تو کیا خاک چھانی
جگر خاک دل کی تو چھانی نہیں ہے

جگر کا یہ نغمہ ہے اور سازِ مشرق
یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

جنونِ بہار

(نواب جعفر علی خاں صاحب آثر بی، اے لکھنوی)

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن　　خونیں جگرانِ چاک دامن
پیغام بہار دے رہی ہے　　داغوں کی جھلک دلوں کی اُلجھن
پھولوں سے لچک رہی ہیں شاخیں　　خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن
رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر　　شبنم میں ہے گھونگرؤں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے　　مستی میں چھوا صبا نے دامن
کیا سیرِ چمن کو تم گئے تھے　　ہے بلبل و گل میں آج اَن بَن
غصّے میں بھرا ہے چُپ ہے کوئی　　یہ اس سے خفا وہ اُس سے بدظن
مانوس قفس ہو اے اسیرو　　منزل گہِ برق ہے نشیمن

85

ایک تصویر

نرگس مست خواب آلودہ　　لبِ لعلیں شراب آلودہ
دوش پر زلفِ عنبریں بکھری　　اور گریباں گلاب آلودہ
پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا　　اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ
مجھ کو دیکھا تو دیکھئے قسمت　　تھی جبیں پیچ و تاب آلودہ
یاد ہے یاد ہے آثر اب تک　　وہ نگاہِ عتاب آلودہ

یہ رم جھم رم جھم برساتیں

(از سید محمد محی الدین رنجور عظیم آبادی)

سرشار جوانی کیا کہیے، خاموش محبت کیا کہیے — یہ رم جھم رم جھم برساتیں اللہ یہ فرقت کیا کہیے
بدمست گھٹائیں پھر اٹھیں مخمور ہوائیں پھر آئیں — قدرت بہکی، فطرت جھومی اب دل کی حالت کیا کہیے
ہے ایک کہانی بلبل کا خوں ریز نگاہوں سے تکنا — پھولوں کی شکایت کیا کیجیے کلیوں کی حکایت کیا کہیے
وہ تیکھی تیکھی سی چتون، وہ نیچی نیچی سی نظریں — وہ مدھ میں ڈوبی سی آنکھیں اور ان میں شرارت کیا کہیے
وہ الجھی الجھی سی زلفیں، وہ پھیلا پھیلا سا کاجل — وہ چاند سا مکھڑا ہائے غضب، وہ چال قیامت کیا کہیے
اک زیبِ چمن، اک زیبِ گلو، اور اک پر شبنم کے موتی — صحرا میں جو کھل کر مرجھائے اس پھول کی قسمت کیا کہیے
طوفان تلاطم کا عالم، ڈھلتا ہوا دن، ٹوٹی نیا — تکنا وہ مسافر کا ہر سو، ساحل کی وحشت کیا کہیے
ٹوٹا ہوا دل پہلو میں لئے ساری دنیا کا ٹھکرایا — اک دردِ مجسم ہے گویا رنجور کی حالت کیا کہیے

سوزِ ناتمام

برسات کا آگیا مہینہ — لانا مرا سرخ آبگینہ
موجوں کی کوئی خطا نہیں ہے — خود میں نے ڈبو دیا سفینہ
یہ کس نے نقابِ رخ الٹ دی — کلیوں کو بھی آگیا پسینہ

رسوا ہوا ہے دردِ محبت کہاں کہاں — ثابت ہوئی ہے اُن کی ضرورت کہاں کہاں
آنکھیں اداس، روح پریشان، دل نڈھال — برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں

ماہر القادری

برہ کی رات

(از سید محمد عسکری طباطبائی بی اے)

یاد ہے ہاں یاد ہے اب تک وہ منظر ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ سکوتِ گریہ پرور ہائے ہائے

وہ فضا پہ ہر طرف اک بیکسی چھائی ہوئی
وہ ہوا میں اضطرابِ شوق مضمر ہائے ہائے

چودھویں کے چاند کا وہ زرد چہرہ الاماں!
چاندنی تھی یا تمنا خاک برسر ہائے ہائے

ڈوبتی امید، بڑھتی یاس کی آغوش میں
جھلملاتی شمع اور پامالِ صرصر ہائے ہائے

میری شوریدہ محبت اور کبیدہ آہ آہ!
تیری سرخوش نوجوانی اور مکدر ہائے ہائے

یاں اُلجھ کر ٹوٹنے کو تار و پودِ زندگی
واں بکھرنے کو وہ گیسوئے معنبر ہائے ہائے

اس طرف بجھتا ہوا ارمان بھرے دل کا کنول
اُس طرف چھلکے ہوئے آنکھوں کے ساغر ہائے ہائے

تیرے ماتھے کی شکن غماز میرے درد کی
میری بیتابی میں تیرا سوز مضمر ہائے ہائے

میری آہیں پھونک دیں جو خرمنوں کو برق کے
تیرے آنسو جن سے گھونگٹ کھائیں اختر ہائے ہائے

پرتوِ رُخ سے ترے سینے میں میرے جوشِ عشق!
ایک سیلِ نور اور دل کا سمندر ہائے ہائے

میری خاموشی جراحت ریز تیرے ضبط پر
تیرے اشکوں سے مرے سینے میں محشر ہائے ہائے

میری نظروں کے دھندلکے میں ترے رُخ کی چمک
خاک کی آغوش میں موجِ گُلِ تر ہائے ہائے

تیری ایک اک سانس میں فرطِ الم سے جزر و مد
وہ تلاطم میں ترے کانوں کے گوہر ہائے ہائے

وہ مرے سینے میں جوشانِ التہابِ صد جحیم
وہ ترے ہونٹوں پہ لرزاں موجِ کوثر ہائے ہائے

میری گردن تیری بانہیں، میرا آغوش اور تو!
تا گلو پہنچا ہوا وہ آبِ خنجر ہائے ہائے

تیری چتون میں جفاکاری سے توبہ کا غرور!
میری نظروں میں وفاداری کے جوہر ہائے ہائے

عشق اور آنکھوں سے دیکھے حسن کو مجبورِ غم!
وائے بدحالی و شومیِ مقدر ہائے ہائے

دردافزا لرزشِ لبہائے لعلیں حیف حیف!
روح فرسا جنبشِ چشمِ سخنور ہائے ہائے

گرم گرم، اشکِ شفق آلود و غلطاں آہ آہ!
سرد سرد انفاسِ رنگین و معطر ہائے ہائے

وہ لبِ نازک پہ موجِ نطق گھبرائی ہوئی
کرب میں اُلجھے ہوئے وہ مصرعِ تر ہائے ہائے

وہ محبت کے پیاپے دعویِ بے اختیار
وہ وفا کے عہد و پیمانِ مکرر ہائے ہائے

بار بار اُلجھن میں لینا چپکے چپکے میرا نام!!
وہ زباں کو خشک ہونٹوں پر پھرا کر ہائے ہائے

۱۸

آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کہکر "خدا حافظ" ترا
جاتے جاتے دیکھ لینا مجھ کو مُڑ کر ہائے ہائے

تجھ کو پا لینے کی میں سر تا قدم اک آرزو!
آرزو کا میری تو نقشِ مکرر ہائے ہائے

دل کے خوں ہونیکی راہیں دل کو دکھلاتی ہوئی
خاک پر وہ لوٹتی رنگین چادر ہائے ہائے

چھُٹنے ہی کو نبضِ ہستی و عنانِ کائنات!
رُکنے ہی کو گردشِ افلاک و اختر ہائے ہائے

اس طرح تیری تمنائیں مرے دل میں اسیر
جیسے آئینے میں آئینے کے جوہر ہائے ہائے

عکسِ آئینہ جدا ہو آئینے سے یا نصیب!
جان تن سے دور، دم سینے کے باہر ہائے ہائے

فردوسِ معصیت

تجلیاتِ شرارِ پا کو اسیرِ دامِ نگاہ کیجیے
پناہ لے آفتابِ محشر فضائیں اتنی سیاہ کیجیے
غریقِ موجِ شراب بھی ہے خیالِ روزِ حساب بھی ہے
گناہ کیجیے تو صدقِ دل سے کوئی مکمل گناہ کیجیے

اک انجمن کیا بہ جنبشِ یک نظر دو عالم تباہ ہونگے
نہ یہ نشیب و فراز ہونگے نہ یہ سپید و سیاہ ہونگے
یہ جامِ صد پاش پاش کیسا یہ ہاتھ میں ارتعاش کیسا
وہ جب حضورِ نگاہ ہونگے گناہ پھر بھی گناہ ہونگے؟

یہ میکدہ ہے تباہ کر کے تو اس کو خود بھی تباہ ہوگا
طلوع جب آفتابِ ساغر نہ ہوگا، عالم سیاہ ہوگا
یہ زعمِ کارِ ثواب زاہد، یہ شدتِ احتساب زاہد
شکستِ جامِ شراب زاہد شکستِ دل سے گناہ ہوگا

بلند جامِ شراب کیجیے، طلوع سو آفتاب کیجیے
حقیقتیں بے حجاب کیجیے، مشیتیں بے نقاب کیجیے
یہ فکرِ انجامِ کار توبہ! گنہ بحدِ شمار توبہ!
گناہ کیجیے تو ضد پہ روزِ حساب کی بے حساب کیجیے

بہارِ نکہت بدوش ہوگی ہزار نغمہ فروش ہوگی
چٹک چمن میں کلی کلی کی صدائے سازِ سروش ہوگی

کوئی جب آتش بجام ہوگا، نہ پوچھ کیا اہتمام ہوگا
زمانہ حیرت فروش ہوگا، خدائی آئینہ پوش ہوگی

جو رقص میں موجِ نور ہوگی، تو وجد میں پھول پھول ہوگا
فروغِ جامِ شرابِ رنگیں، فروغِ قلبِ ملول ہوگا
ہر ایک شے دلنواز ہوگی، تمام دنیا حسین ہوگی
وہ وقت ہوگا گناہ کا جب ہمارے دل پر نزول ہوگا

جو لطف اندوزِ میکدہ ہیں جھلکنے جا کر وہ کیا حرم میں
یہی تو وہ ہیں قدم سے جنکے ہیں وسعتیں دامنِ کرم میں
ہماری تر دامنی سے زاہد! ہے زہدِ خشک آب تیرا
ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں ہماری اک لغزشِ قدم میں

نگاہ ملتے ہی چشمِ ساقی سے اے دلِ ناصبور پی جا
ضرور پی جا، شرابِ رنگیں میں گھول کر برقِ طور پی جا
یہ شکوۂ اذنِ عام کب تک، یہ جذبۂ تشنہ کام کب تک
نظر جو بھٹکی ہوئی ہے اس سے جبینِ فطرت کا نور پی جا

ہمیں یہ رندانہ جرأتیں ہیں بے نیازِ حساب کر دیں
کہیں وہ فردِ عمل کو لیکر نہ غرقِ جامِ شراب کر دیں
فسانۂ یوسفؑ زلیخا، کرشمۂ بے مثال، توبہ!
ہم ایک چھینٹے سے مے کے واعظ اعادۂ عہدِ شباب کر دیں

سزا جزا پستیاں ہیں ان سے بلند تر ہے نگاہِ آدم
مقامِ روح الامیں سے بچکر گذرتی ہے شاہراہِ آدم
خیال رنگیں، جمال رنگیں، نگاہ رنگیں، گناہ رنگیں
یہی وہ فردوسِ معصیت ہے، بہار جس کی نگاہِ آدم

فیض جھنجھانوی

محبّت کی تقسیم

(حضرت حمید لکھنوی)

نگاہوں سے لیکر بلائیں تمہاری — میں خود بھول بیٹھا جفائیں تمہاری
اگر انقلاب آئے تو ایسا آئے — تغافل مرا، التجائیں تمہاری
پلٹ جائے خود کفران زاہدوں پر — اگر اک جھلک دیکھ پائیں تمہاری
جفا جو کا ہر اک جفا پر یہ کہنا — وفائیں ذرا آزمائیں تمہاری
نگاہوں میں میخانے کھلوا رہی ہیں — یہ گیسو کی کالی گھٹائیں تمہاری
ہم اپنے کو بھی بھول جائیں یہ سچ ہے — مگر یاد کیونکر بھلائیں تمہاری
بنالو بنالو مجھے بھی تم اپنا — یہ دُنیا اور اسکی فضائیں تمہاری
محبّت نے کیا خوب تقسیم کی ہے — وفائیں ہماری جفائیں تمہاری

حضرت شرف زیدی رامپوری

اب دل کا حال نہ پوچھو کچھ غم سہتا ہوں غم سہنے دو — چھڑ جائینگے پھر لاکھوں قصے یہ بات یہیں تک رہنے دو
الفت میں تو یہ بھی ہوتا ہے پتھر بھی لگیں کپڑے بھی پھٹیں — میں پاگل بھی سودائی بھی کہتی ہے جو دُنیا کہنے دو
زلفیں رُخ روشن پر چھوٹیں اندھیر نہ ہو پردہ بھی رہے — چھَنتے جو رہیں کچھ کچھ جلوے یوں چاند گہے تو گہنے دو
حالِ غمِ دل کہتے کہتے رونا جو مجھے یک دم آیا — بولے مجھے اب نیند آتی ہے کچھ کل کیلئے بھی رہنے دو
دریائے محبت میں ڈوبا جو کوئی یہ سمجھو پار ہوا — ساحل سے نہ کچھ ہاتھ آئیگا منجدھار میں کشتی بہنے دو
ان قہر کی نظروں سے منہ پر کیوں مُہر لگائی جاتی ہے — شکووں کا مزا تو اس میں ہے کچھ سُننے دو کچھ کہنے دو
جاتا ہی رہے گا دردِ جگر اے چارہ گرو گھبراؤ نہیں — روکو نہ مجھے اب رونے سے کچھ خون کے آنسو رونے دو

اچھوت

(حضرت رضا نقوی)

ہنگام سحر میں جو وہاں سیر کو پہنچا
اک جلوۂ صد رنگ تھا گنگا کا کنارا

ہر شے میں نظر آتی تھی فطرت متبسم
ہر شے تھی کسی شوخ کا رنگین اشارا

تکمہ تھا قبائے فلکِ نیلوفری پر
یا چرخ پہ تھا نور فشاں صبح کا تارا

گردوں پہ شفق تیر رہی تھی کہ رواں تھا
پھولوں کو لئے گود میں سیلاب کا دھارا

نکلا تھا نہ سورج ابھی گنگا سے نہا کر
منظر کو شعاعوں نے ابھی تھا نہ سنوارا

اشنان کا تھا وقت سمٹ آئی تھی خلقت
اک سیلِ عقیدت تھا وہ دریا کا کنارا

آئی تھیں پئے غسل بہ رعنائی و مستی
نازک بدناں، سیمبراں، انجمن آرا

کہتی تھیں ادائیں کہ ہے بچپن گوں میں
سیلاب جوانی کا مچلتا ہوا دھارا

یوں گود میں دریا کی اچھلتی تھیں وہ پریاں
"جس طرح ہرن دشت میں بھرتے ہیں طرارا"

اتنے میں دکھائی دیا اک پیکرِ افلاس
غماز تھی صورت کہ ہے تقدیر کا مارا

اوروں کی طرح دل میں جو تھی غسل کی نیت
اک گھاٹ سے کچھ دور ہی کپڑوں کو اتارا

بچتا ہوا نظروں سے بڑھا جانبِ ساحل
کھولے ہوئے آغوش تھا گنگا کا کنارا

ڈالا تھا ابھی پاؤں بھی دریا میں نہ اس نے
دیکھا اسے خلقت کی نگاہوں نے قضا را

اک شور اٹھا ایک تلاطم ہوا برپا
"پانی ہوا ناپاک" زمانہ یہ پکارا

مجمع میں شریفوں کے اچھوت آئیں نہانے
غیرت کی نظر کر نہیں سکتی یہ گوارا

پیدا ہوا سینوں میں جو غیرت کا تموج
دو چار جوانوں نے پکڑ کر اسے مارا

اک دیش کے سیوک بھی تھے اس محفل میں شامل
تھا تیز بہت آپ کے غصہ کا بھی پارا

اک مولوی صاحب بھی بڑے گالیاں دیتے
گنگا سے کہیں تیز تھا دشنام کا دھارا

یہ وہ ہیں جو ممبر پہ سکھاتے ہیں شب و روز
اسلام کی تعلیم مساوات و مدارا

جس ملک میں یہ روح کی لعنت ہو دوامی
اس ملک کو تا حشر مبارک ہو غلامی

معلوم نہیں کیوں؟

(حضرت جگر مراد آبادی)

بے تاب ہے، بے خواب ہے، معلوم نہیں کیوں — دل ماہیٔ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں
بے کیف مے ناب ہے، معلوم نہیں کیوں — پھیکی شبِ مہتاب ہے، معلوم نہیں کیوں
ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و اصرار — وہ جرعہ بھی زہراب ہے، معلوم نہیں کیوں
خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو — اک شعلۂ بے تاب ہے، معلوم نہیں کیوں
جو ساز کہ خود نغمۂ عریاں تھا اسی کو — اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں
دل آج بھی سینہ میں دھڑکتا تو ہے لیکن — کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں
بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی — بے وجہ تب و تاب ہے، معلوم نہیں کیوں
کل تک یہی دنیا سبدِ گل تھی مگر آج — بے رنگ ہے، بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں
دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا — اب تک اثرِ خواب ہے، معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

دبی چنگاریاں

(نواب احسان علی خاں احسان (باندہ))

بڑھ رہی ہیں عشق کی دشواریاں — ہیں دل آزاری میں بھی دلداریاں
پھر بھڑک اٹھیں گے شعلے ایک دن — کہتی ہیں دل کی دبی چنگاریاں
سہل ہو جانے سے مشکل عشق کی — بڑھ گئیں کچھ اور بھی دشواریاں
اُف رے حسن و عشق کے راز و نیاز — ہائے رے الفت کی پردہ داریاں
حسن کو بھی کس قدر منظور ہیں — اپنے دیوانے کی خاطر داریاں
پھر ہے شورِ آمدِ فصلِ بہار — پھر وہی وحشت کی ہیں تیاریاں

چاہیئے احسانؔ پر تو لطفِ خاص
کیجیئے غیروں سے دنیا داریاں

تین دور

(پروفیسر رگھوپت سہائے فراق ایم - اے گورکھپوری)

پہلا دور

دلوں کو چارۂ دردِ محبت بھول جاتا ہے
وہاں ہر ایک شخص اپنی ضرورت بھول جاتا ہے

حیاتِ محض ہو جاتا ہے ناکامِ محبت بھی
اذیت سے گذر جاتا ہے راحت بھول جاتا ہے

اسی سے گرم بازاری بھی قائم ہے دو عالم کی
مگر انسان اپنی قدر و قیمت بھول جاتا ہے

وہ کیفیت نگاہِ مست میں ہے دیکھ کر جس کو
ہر اک رندِ بلانوش اپنی نیت بھول جاتا ہے

یہ کیسی دلدہی ہے حسن کی کیسی دل افزائی
گناہِ عشق کچھ اپنی ندامت بھول جاتا ہے

جسے ہے باعثِ تکلیف ہمدردی زمانے کی
وہی دل تیرے جورِ بے نہایت بھول جاتا ہے

دلِ مایوس پر آتا ہے ایسا وقت بھی جس میں
محبت کو سوادِ شامِ فرقت بھول جاتا ہے

دلِ وارفتۂ دیدار کی اللہ ری محویت
تصور میں ترے وہ تیری صورت بھول جاتا ہے

اک ایسا دردِ فرقت بھی ہے اے دل جس کے اٹھتے ہی
جنونِ عشق کو بھی جوشِ وحشت بھول جاتا ہے

بسا اوقات دل کے ساتھ بارِ غم اٹھانے میں
سنا ہے حسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

کہاں کا ہوش کیسی بیخودی اس بزم میں اکثر
خود اپنے عشق کو رنگِ طبیعت بھول جاتا ہے

فراق اس وجہ کھو جانا شبِ فرقت بجا لیکن
کوئی اس طرح بھی اپنی حقیقت بھول جاتا ہے

دوسرا دور

وہ آشنا درد ہنگامِ فغاں تک یاد آتا ہے — محبت کا فسانہ درمیاں تک یاد آتا ہے

وجودِ عشق مرگِ ناگہاں تک یاد آتا ہے — عدم بھی اس نگاہِ جانستاں تک یاد آتا ہے

فسانہ ہو چکا ہے واقعہ آغازِ الفت کا — مگر تیری نگاہِ بدگماں تک یاد آتا ہے

نگاہِ اولیں یکسر پیامِ راز تھی لیکن — کچھ اندازِ اشاراتِ نہاں تک یاد آتا ہے

لبِ نازک کی جنبش جانِ پیمانِ محبت تھی — یہ قصہ بھی ترے حسنِ بیاں تک یاد آتا ہے

نہ وہ منزل نہ اب وہ رہروانِ عشق ہیں لیکن — وہ بڑھ جانا غبارِ کارواں تک یاد آتا ہے

زبانِ شعلۂ گل پر بھی پیغامِ اسیری تھا — یہ بجلی آ چکی تھی آشیاں تک یاد آتا ہے

خوشی کیا، چند موجیں تھیں تبسم ہائے پنہاں کی — یہ افسانہ بھی حسنِ شادماں تک یاد آتا ہے

وہ سوز و سازِ بزمِ ناز اب اک خواب ہے لیکن — دلِ پروانۂ آتش بجاں تک یاد آتا ہے

۹۵ یہ تو نے ذکرِ بازیٔ محبت کا کہاں چھیڑا — ہوس کو یہ سبق سود و زیاں تک یاد آتا ہے

کبھی باتوں میں چھیڑو ذکرِ آغازِ محبت بھی — یہ افسانہ تمہیں دیکھیں کہاں تک یاد آتا ہے

وہ آثارِ انقلابِ عشق کے ابتک نہیں بھولے — تری نظروں سے دورِ آسماں تک یاد آتا ہے

سرِ بزمِ محبت اہلِ دل کا سوزِ پنہاں بھی — گدازِ قلبِ شمعِ بے زباں تک یاد آتا ہے

حیاتِ عشق عمرِ جاوداں سے بڑھ گئی لیکن — یہ افسانہ بھی حسنِ مہرباں تک یاد آتا ہے

چمن اک خواب تھا حسنِ چمن بھی اک فسانہ تھا — وہ رنگا رنگ عالم بھی خزاں تک یاد آتا ہے

بہت پیچھے محبت میں مکان و لامکاں چھوٹے — مگر کچھ کچھ نشانِ بے نشاں تک یاد آتا ہے

کہاں اتنی خبر عمرِ محبت کس طرح گذری — ترا ہی درد تھا دل میں جہاں تک یاد آتا ہے

فراقؔ اب کیا ہے لیکن کاٹنے کو شامِ مہجوری — نہ تھی تیار عمرِ جاوداں تک یاد آتا ہے

تیسرا دور

ہجومِ یاس میں سوزِ نہاں بھی یاد آتا ہے
سوادِ شام کا اُٹھنا دھواں بھی یاد آتا ہے

دیا تھا جیتے جی درسِ فنا دردِ محبت نے
وہ اندازِ فراقِ جسم و جاں بھی یاد آتا ہے

ترے لطف و ستم کے نقش دھندلے ہو چلے دل میں
یونہی ہر مہرباں نامہرباں بھی یاد آتا ہے

وفا نا آشنا اتنی نہ تھی گردش نگاہوں کی
وہ کچھ بدلا سا دورِ آسماں بھی یاد آتا ہے

وہ ارمانوں کا محشر وہ بھری دُنیا محبت کی
وہ عالم کارواں در کارواں بھی یاد آتا ہے

عدم ہو، بزمِ امکاں ہو، گلستاں ہو کہ صحرا ہو
بدل جاتی ہے دُنیا تو جہاں بھی یاد آتا ہے

نہ بھولیں داستانیں انجمن کی سوزِ پنہاں کو
مگر اندازِ شمعِ بے زباں بھی یاد آتا ہے

فسانہ عشق کا کہنا نہ کہنا ایک ہے اب تو
وہ ہونا تیرا موجِ داستاں بھی یاد آتا ہے

وہ جلوہ حُسن کا ہو یا وہ شعلہ ہو محبت کا
دلوں کو ایک شورِ الاماں بھی یاد آتا ہے

ازل کے قبل سے چونکی ہوئی ہے عشق کی دنیا
مگر اک عالمِ خوابِ گراں بھی یاد آتا ہے

خبر اپنی بیاباں کو بھی مدّت سے نہیں آتی
دلِ وحشی کو لیکن تو یہاں بھی یاد آتا ہے

غبارِ کارواں کو دیکھتے رہ جاتے تھے پہروں
وہ رنگِ حسرتِ پسماندگاں بھی یاد آتا ہے

کبھی کامل بھی ہوتی ہے فراموشی محبت کی
کبھی تو دل کو بے شان و گماں بھی یاد آتا ہے

نہ کھونا ہے نہ پانا ہے خبر اسکی بھی تھی لیکن
فریبِ کاوشِ سود و زیاں بھی یاد آتا ہے

زمانے کی کشاکش میں کوئی اہلِ محبت کو
خوشی کے اور غم کے درمیاں بھی یاد آتا ہے

نصیبِ عشق کے جو دل ہی دل میں رہ گیا شاید
تجھے کچھ وہ حسابِ دوستاں بھی یاد آتا ہے

نہ تھی جب صحبتِ احباب پر افسردگی طاری
فراق اس انجمن کا وہ سماں بھی یاد آتا ہے

چھوٹی سی کُٹیا

(محترمہ محبوب صاحبہ)

اس شہر سے، گلشن سے   آفات کے مسکن سے
اس عالم رہزن سے
ہاں دُور کہیں ہوتی!
چھوٹی سی مری کُٹیا
ہنگامۂ دوراں سے   اُس فتنۂ پنہاں سے
اُس دشمنِ ایماں سے
ہاں دُور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کُٹیا

اس شور سے اور غل سے ہنگاموں کی محفل سے
اور درد بھرے دل سے
ہاں دور کہیں ہوتی !
چھوٹی سی مری کٹیا
دزدیدہ نگاہوں سے ہر وقت کی آہوں سے
ان عشق کی راہوں سے
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا
اس دردِ محبت سے اس حسنِ پُر آفت سے
اُس رشکِ قیامت سے
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا
ہر دل کی بُرائی سی اور غم کی خدائی سی
انسان کی رسائی سی
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا

سرسبز فضاؤں میں   گھنگھور گھٹاؤں میں
اور مست ہواؤں میں
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا
تنہائی کے مسکن میں   کہسار کے دامن میں
اور دور کسی بن میں
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا
تابندہ ستاروں میں   پرکیف نظاروں میں
۹۹:
جاوید بہاروں میں
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا
محبوب جہاں غم کے قصے نہ کہے جاتے
رنج و غم و آفت کے چرچے نہ سنے جاتے
ہم نغمۂ الفت سے دل کو یونہیں بہلاتے
ہاں دور کہیں ہوتی
چھوٹی سی مری کٹیا

نازک حقیقت

(حضرت اصغر شعری بھوپالی)

کسی جلوے، کسی پردے سے بہلائی نہیں جاتی
طبیعت ایسی الجھی ہے کہ سلجھائی نہیں جاتی

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے، جو سمجھائی نہیں جاتی

ترا ممنون ہوں اے حسن خلوت آشنا لیکن
کسی کی التجا اس طرح ٹھکرائی نہیں جاتی

خطائے حسن بھی پامالیٔ دل میں یقیناً ہے
محبت ہی محبت جرم ٹھیرائی نہیں جاتی

سرِ محفل کچھ اس انداز سے لوٹا گیا ہوں میں
ہجومِ عام میں بھی میری تنہائی نہیں جاتی

بہت نقشے بہت خاکے مرتب ہو چکے اب تک
مگر اس شانِ یکتائی کی یکتائی نہیں جاتی

تحیر سا تحیر ہے، تماشا سا تماشا ہے
نظر جلووں میں خاطر خواہ ٹھہرائی نہیں جاتی

سمجھ لیں آج ہی میری حقیقت دیکھنے والے
میں وہ روداد ہوں جو پھر سے دہرائی نہیں جاتی

محبت مرتعش ہستی، محبت مضطرب فطرت،
یہ ظالم خود تڑپ لیتی ہے تڑپائی نہیں جاتی

جفائے دوست بھی منظور ہے مجھ کو سر آنکھوں پر
محبت کی کوئی نعمت بھی ٹھکرائی نہیں جاتی

کسی کے آستانِ ناز سے کیا اٹھ گیا ہوں میں
یہ دنیا کل جہاں تھی اس جگہ پائی نہیں جاتی

بہا لیتا ہوں آنسو دل ہی دل میں مطمئن ہو کر
فغاں کرتا ہوں اور طرزِ شکیبائی نہیں جاتی

لگی ہیں طور کی جانب نگاہیں اہلِ عالم کی　　بہت مدت سے کوئی برق لہرائی نہیں جاتی
مکمل ہوگئی دُنیا، منظم ہوگیا عالم　　مگر اُن کی ابھی تک بزم آرائی نہیں جاتی
جہانِ عشق کی رنگینیوں پر جان و دل صدقے　　یہاں کی زندگی جنت میں بھی پائی نہیں جاتی
کسی حسن سے مانوس ہونا بھی قیامت ہے　　طبیعت لاکھ بہلاتا ہوں بہلائی نہیں جاتی

محبت اصل میں بے اختیاری چیز ہے شعری
یہ آگ اپنی طرف سے آپ بھڑکائی نہیں جاتی

میخانۂ الہام

(حضرت میکش اکبرآبادی)

۱۰

جام لا جام کہ عالمِ گزراں ہے ساقی　　کیا غمِ حشر کہ یاں ہے سو وہاں ہے ساقی
کل سُنوں گا غمِ فردا کا فسانہ تجھ سے　　لا مرا ساغرِ امروز کہاں ہے ساقی
یہ حقیقت کی جوانی یہ مے حُسنِ مجاز　　آ یہاں آ کہ یہاں ہے سو کہاں ہے ساقی
پی کے جب جھومنے لگوں میں تو ذرا دھیان رہے　　سر یہ خوکردۂ آغوشِ بُتاں ہے ساقی

تیرے میکش کو نہیں خواہشِ عیشِ دو جہاں
بادہ خود مایۂ عیشِ دو جہاں ہے ساقی

خواب میں آنیوالی سے!

(پروفیسر سید احتشام حسین رضوی۔ لکھنؤ یونیورسٹی)

چھاؤں تھی تاروں کی، میں تھا اور تمہاری یاد تھی — ہر طرح کی کوشش صبر و سکوں برباد تھی
رات آئی روح پر غم کا اندھیرا چھا گیا — ایک مدت سے نہ ملنے کا الم تڑپا گیا
ذہن میں کوئی تصور اور آتا ہی نہ تھا — دوسری جانب خیال اُس وقت جاتا ہی نہ تھا ۱۰
دور تک پھیلی ہوئی تخئیل کی زنجیر تھی — دل کے آئینے میں دُھندلی سی تری تصویر تھی
اور دل کہتا تھا یہ بھی ایک دن مٹ جائیگی — کچھ دنوں تک اور اسی صورت سے گر دوری رہی
گو یقیں تھا ہے ترا عہدِ محبت استوار — لب تک آجاتے تھے لیکن پھر بھی شکوے بار بار
تھا تقاضا دل کا مل جاؤ تو تڑپائیں تمہیں — تم نے جو حالت بنائی ہے وہ دکھلائیں تمہیں

یک بیک ٹھنڈی ہوا کی زلف لہرانے لگی — رات کی ساکن فضا میں مجھ کو نیند آنے لگی
جس کو چین آتا نہ تھا دم بھر میں غافل ہو گیا — محوِ غم آغوشِ فطرت میں پہنچ کر سو گیا

روح تک احساسِ الفت سے مری سرشار تھی — سو رہا تھا میں مگر قسمت مری بیدار تھی
خواب کے ظلمات میں پہنچا مجھے آبِ حیات — یہ مرا جذبِ محبت تھا کہ تیرا التفات
آج بیداری بھی میری روح سے شرما گئی — تو جھجکتی مسکراتی غمکدے میں آگئی
پھر تو ظلمت خانۂ دل میں تجلّی ہو گئی — مُدتوں کے تشنۂ غم کو تسلّی ہو گئی
تھا تبسم یا مداوا تھا وہ دل کے درد کا — جیسے گرمی میں کوئی جھونکا ہوائے سرد کا

چھپ کے مجھ سے مل رہی ہو اس قرینے کے نثار — خواب میں آنے کے اور تسکین دینے[۱] کے نثار
تھا لبِ تصویر تیرے قرب کا یہ پاس تھا — تھی کچھ ایسی بیخودی جس کا مجھے احساس تھا
لب تک آکر سارے شکوے دل کے زائل ہو گئے — تیرے بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے
۰۳
ایک بوسے میں ترے مجھ کو حیاتِ نو ملی — یوں شگفتہ ہو گیا دل جیسے کھلتی ہے کلی
بڑھ گئی تیری نظر میں روشنی میرے لئے — تیری آغوشِ محبت وا ہوئی میرے لئے
مل گئے چھوٹے ہوئے دو تشنہ کامانِ وفا — عشق کی تاریک دُنیا میں اُجالا ہو گیا

عالمِ الفت میں ایسی زندگی نایاب ہے — دل یہ کہتا تھا کہ بیداری سے بہتر خواب ہے
کاش رہ جاتا اسی صورت نہ آتا ہوش میں — اور وہیں سے جا پہنچتا موت کی آغوش میں

---

[۱] یہ شعر بے ساختہ ہوا تھا اس لئے ایطا، کے باوجود مجھ سے نکالا نہ جا سکا۔

افسردہ گلاب

ہے تصور میں ایک خوابِ ہنوز — یاد ہے عالمِ شباب ہنوز
جن سے رفتارِ حسن رسوا ہے — وہی فتنے ہیں ہم رکاب ہنوز
دل میں محسوس کر رہا ہوں خلش — ناوکِ غم ہے کامیاب ہنوز
دورِ دنیا نے سینکڑوں بدلے — نہیں ممکن ترا جواب ہنوز
قافلے منزلوں پہ جا پہنچے — میں ہوں اور اہتمامِ خواب ہنوز
چارۂ دردِ لا دوا معلوم! — ہوں گلہ سنجِ اضطراب ہنوز
بادہ کش[1] ہیں شکارِ تشنہ لبی — میرے ساغر میں ہے شراب ہنوز

عرقِ روئے حسن میں ہے نذیر
بوئے افسردۂ گلاب ہنوز

نذیر شیرکوٹی

---

[1] حیرت ہے کہ آپ "قصر الادب" کے فرمانِ مذہبی کے خلاف شعر میں "جام و شراب" کے ذکر سے باز نہیں آتے!؟ ساغر

کیفیاتِ وجدیؔ

(انصار الحق صاحب وجدیؔ الہ آبادی)

مجھے کیوں بے محل کرتا ہے مجبورِ سخن کوئی
حدیثِ عشق سے شایاں نہیں ہے انجمن کوئی

ابھی ہے آتشِ نمرود و خونِ کربلا باقی
کرے اے کاش زندہ پھر وہ آئینِ کہن کوئی

یکایک قلبِ مضطر میں سکوں کیوں ہو گیا پیدا
سکوتِ شب میں شاید ہو گیا ہے نغمہ زن کوئی

نویداے ذوقِ نظارہ مبارک شوقِ بے پایاں
لئے ہے اپنے دامن میں بہارِ صد چمن کوئی

نیازِ عشق سے ہے حسن سرگرمِ جفا کوشی
مٹا دے کاش اس دنیا سے یہ رسمِ کہن کوئی

بہار آتے ہی چھڑ جاتے ہیں نغمے زندگانی کے
قیامت ہے، کہ سمجھا ہی نہیں رازِ چمن کوئی

پڑیں ہنگامۂ ہستی میں جانے الجھنیں کتنی
جو رہنے دے شکن ہائے جبینِ پُر شکن کوئی

یہ عالم ہے کہ دُنیا غرقِ موجِ نور ہے یکسر
ہوا ہے آج اس عنوان سے پرتو فگن کوئی

فضا مسحور ہو جاتی ہے وجدیؔ میرے نغموں سے
ہوا کرتا ہے سازِ دل پہ جب مضراب زن کوئی

غزل نمبر۱

فریبوں ہی سے بہلایا گیا ہوں　　میں وہ دل ہوں جو ٹھکرایا گیا ہوں

مذاقِ رقصِ بسمل مجھ سے پوچھو　　ہزاروں بار تڑپایا گیا ہوں

تم اپنے گیسوئے پُرخم سے پوچھو　　میں کس اُلجھن میں اُلجھایا گیا ہوں

کہاں دُنیا کہاں محفل ازل کی　　کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

نہیں ناآشنائے محفلِ ناز　　میں ہر ہر سانس پر آیا گیا ہوں

مجھے ملنے نہ دیں آلامِ ہستی　　میں آیا کب ہوں بُلوایا گیا ہوں

مری تقدیر تھی وابستہ جن سے　　انہیں قدموں سے ٹھکرایا گیا ہوں　۱۰

جہاں کو لاؤں گا لرزش میں وجدی　　بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

غزل نمبر۲

ہم سے جو کچھ ہو سکا تا حدِ امکاں کر دیا　　یعنی خود کھو کر محبّت کو نمایاں کر دیا

تو نے یہ کیا اے نگاہِ مستِ جاناں کر دیا　　یعنی مجھ کو بے نیازِ کفر و ایماں کر دیا

اللہ اللہ ڈال کر اک پرتوِ حُسنِ لطیف　　خود مری نظروں سے تو نے مجھ کو پنہاں کر دیا

آج اک ہچکی نے وجدی توڑ کر بندِ نفس　　مرحلۂ زندانِ آب و گِل کا آساں کر دیا

نگاہیں

جناب حبیب صدیقی

"آئیے آج میں آپ کو ایسے آتش نفس مغنی سے ملاؤں، جس نے اپنے دل کو سرمدی گیتوں کا جھولا بنایا ہے اور اپنی پاکیزہ شعریت کو اظہار و رسوائی سے کوشش کر کے محفوظ رکھا ہے؛ میں تو اس انتظام اور احتیاط سے بھی بے خبر ہی رہتا اگر فروری ۱۹۳۹ء میں یکایک فتحپور جانا نہ ہوجاتا ۔!!

کامل ۱۵ سال دو مہینے ہوئے کہ پہلے پہل سرسید کورٹ میں "یارانِ کالج" کے ساتھ حبیب کو پوری محبوبیت کے عالم میں میں نے دیکھا، شعر و ادب کی مجلسوں میں وہ ایک خاموش محبوب ادا کے ساتھ بیٹھے رہتے، ان کا یہ عالم دیکھ کر ہم سب یہ تو بجا طور پر سمجھتے تھے کہ ان کا مستقبل "ڈپٹی صاحب قسم" کا ہے مگر یہ تصور بھی نہ تھا (کم از کم مجھے) یہ خموشی ایک ہنگامہ خیز شاعری کا دیباچہ ہے!؟ یہی نہیں ——— بلکہ دونوں طرف "محبوبیت" کی سرشاری (اپنی محبوبیت کا کھلم کھلا اعلان اس لئے کر رہا ہوں کہ اب مجھ میں "محبوبیت" کی ہلکی سی جھلک بھی باقی نہیں لیکن حبیب، حبیب تھے، حبیب ہیں اور ہمیشہ حبیب رہینگے) تھی؛ نے ایک دوسرے سے لاپرواہ رکھا، انجان رکھا، اور بھلا دیا، یکایک ۱۵ سال کے بعد میں اپنی محبوبیت کی دولت کو لٹا مٹا، اور گم کر کے فتحپور میں جب ان سے ملا، تو حبیب کو پہلے سے زیادہ حبیب دیکھا بلکہ محبوبیت کے جوہر میں ایسا اضافہ دیکھا جو میرے تصور میں بھی نہ تھا،

ایک طرف وہ "ڈپٹی صاحب" تھے، دوسری طرف مشاعرہ کے صدر، خیر، ڈپٹی صاحب ہونا تو کوئی بات نہیں، مگر صدر وہ اس لئے ہوئے کہ لوگوں کے علم میں وہ "ڈپٹی صاحب" تھے مگر آخر میں جب انہوں نے یہ غزل سُنائی تو ان کی محبوبیت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے اور روح و دل کو نمایاں بنا گئے ؎

طلسمِ نوازش کسی کا تبسم　　　فسونِ محبت کسی کی نگاہیں

جس وقت یہ شعر محبوبیت کی زبان سے ادا ہو رہا تھا، ماضی کے تمام خط و خال ذی حیات ہو گئے تھے۔ حبیب کی شاعری میں وہ صحیح رومانیت ہے جس سے عام طور پر ہندوستان کا شاعر محروم ہے؛

ساغر

نگاہیں

جناب حبیب صدیقی

قیامت کی چتون قیامت نگاہیں — نہ چاہیں الٰہی تو کیسے نہ چاہیں
طلسمِ نوازش کسی کا تبسّم — فسونِ محبّت کسی کی نگاہیں
رگِ جاں میں پیوست پنہاں جگر میں — حقیقت میں نشترِ نظا ہر نگاہیں
چھپائے ہوئے ہوں بلا کی حقیقت — نگاہوں کو میں کہہ رہا ہوں نگاہیں
سمجھنے میں کوشاں سمجھنے سے قاصر — محبّت کی تفسیر یعنی نگاہیں
طرب ریز گاہے غضبناک گاہے — میری زندگی کا معمّہ نگاہیں
نظارے میں شامل ہے میری نظر بھی — حقیقت سے ناآشنا ہیں نگاہیں
نہیں بھول سکتا نہیں بھولتی ہیں — محبّت پہ کچھ کچھ سی مائل نگاہیں
خرابِ محبّت کو سمجھانے والو — محبّت کی دیکھی نہیں ہیں نگاہیں
کسی کی نظر سے نظر جا ملی ہے — کسی کی نگاہوں میں گُم ہیں نگاہیں

متاعِ محبّت ہے اک داغِ حسرت
نہ اپنا ہے دل ہی نہ اپنی نگاہیں

بہاراں

(......کے نام!)

ساغرِ مستِ عشق کو درگہِ حُسن سے ملیں

۹ فکر کی یہ بلندیاں نظم کی یہ روانیاں!

تُو نہیں بہار کا رازداں، تجھے کب وقوفِ بہار ہے
جسے کہہ رہا ہے شمیم تو یہ چمن کا گرد و غبار ہے

یہ بجا کہ دورِ بہار ہے، یہ بجا کہ فصلِ بہار ہے
جو بکھر کے دوش پہ آ پڑے تو یہ ابرِ گیسوئے یار ہے

وہ چمن میں آئے ہیں جھومتے اسے توڑتے اسے چومتے
جسے پھول کہتے ہیں فصلِ گل اسی کارواں کا غبار ہے

یہ خرام ان کا چمن چمن، یہ تبسّم ان کا سمن سمن
یہ سکوت ان کا روش روش، کہ بہار محوِ بہار ہے

وہ صباحتیں وہ ملاحتیں وہ نزاکتیں وہ لطافتیں
وہ نظر میں جب سے سما ہیں مجھے آنکھ اُٹھانا بھی بار ہے

مجھے یاد ہیں وہ خرابیاں، وہ نظر نظر میں گلابیاں
وہ کسی کی زمزمہ خوابیاں مجھے اِس گھڑی بھی خمار ہے

یہ بلند قامتِ فتنہ گر، یہ لٹیں جبیں پہ اِدھر اُدھر
کہ حسین سرو کی اوٹ سے یہ طلوعِ ماہِ بہار ہے

وہ جہاں جِھجک کے ٹھہر گئے ہیں فضائیں غرقِ بہار ہیں
وہ جدھر مچل کے گذر گئے ہیں وہیں ہجومِ بہار ہے

یہ فلک پہ برقِ شرر فشاں سرِ ارض اسکی یہ شوخیاں
کبھی اصلِ قامتِ یار ہے کبھی عکسِ قامتِ یار ہے

مری بیقراریٔ عشق ہی کو شکیب کہتے ہیں دیدہ ور
مری بے سکونیٔ شوق ہی کا لطیف نام قرار ہے

مری شاعری مری زندگی، مری زندگی مری شاعری
دل و جان تو کیا ہے ترے لطف پہ مری شاعری بھی نثار ہے

ساغر

الہامات

(افکارِ عالیہ جنرل والاشان نواب معظم جاہ بہادر شہزادۂ دکن دام اقبالہٗ)

جذبات عالیہ کی ان سرمدی چنگاریوں کی تعریف کیا کی جائے جن کا رشتہ خود ملہم غیب کے لبوں سے ہے اور جن کا تعلق قلب معظم سے! شاید گرم گرم ایک بے اختیار آنسو اور ایک بیہوش خاموشی اسکی ادنیٰ ترین داد ہو سکتی ہے!؟ ——— ساغر

جبتک نہ تڑپتا رہوں راحت ہی نہیں ہے
شاید کہ سکون عشق کی فطرت ہی نہیں ہے

کیا پوچھتے ہو درد کی تم مجھ سے حقیقت
اک دل کے سوا اور حقیقت ہی نہیں ہے

جب دل ہے تو پھر دل میں محبّت ہے بہرحال
جس حال میں رکھیں وہ شکایت ہی نہیں ہے

یہ کہکے مٹایا مرا دل نیچی نظر سے
کیا آنکھ اُٹھاؤں مجھے فرصت ہی نہیں ہے

میں پرسشِ مقصودِ محبت پہ کہوں کیا
کوئی میرا مقصودِ محبّت ہی نہیں ہے

کیوں اُن سے کریں ذکرِ وفا اہل محبّت
یہ شیوۂ اربابِ محبّت ہی نہیں ہے

ہم آج یہ سمجھے ہیں کہ تو خود ہے قیامت
سب ہیں تری محفل میں قیامت ہی نہیں ہے

اب پوچھنے کیا آئے ہیں بیمار کی حالت
اب آپ کے بیمار میں حالت ہی نہیں ہے

لائے ہیں فنا بھی وہ بقا بھی مری خاطر
جی میں ہے یہ کہدوں کہ ضرورت ہی نہیں ہے

یوں پھیری ہیں دل لیکے شجیع اُس نے نگاہیں
جیسے کہ ہمیں اُس سے محبّت ہی نہیں ہے

پریتم تم نہیں آئے!

ایک گیت

(کرشن مُکٹ صاحب میرٹھی)

نئے نئے پتّے بھی آئے   کلیاں کھلیں پھول مسکائے
بَور بھی آیا آم بھی آئے
پریتم تم نہیں آئے! ___________

گرمی آئی ہے جُھلساتی   کلی، پھول، پتّے مُرجھاتی
کرشی کارنے کنوئیں چلائے
پریتم تم نہیں آئے ___________

ساون آیا، ساون آیا   رِم جِھم رِم جِھم مینہ برسایا
جُھولے پڑے گیت بھی گائے
پریتم تم نہیں آئے ___________

دِن کو تکیں تمہاری راہیں   راتوں کو میں تھی اور آہیں
رین بِتائیں دیوسی بتائے
پریتم تم نہیں آئے ___________

بیٹھے بیٹھے مَن گھبرایا   ڈیوڑھی لیپی دُوار سجایا
بِیت گئے جگ آس لگائے
پریتم تم نہیں آئے ___________

آشا گئی، نراشا آئی   بدلی سی پرکاشں پہ چھائی
بیت گئے جگ تم بِن ہائے
پریتم تم نہیں آئے ___________

ساغر

یہ ظالم ہوائیں، یہ کافر گھٹائیں
چلی آئیں تنہا انھیں بھی تو لائیں

ضرور اُن سے مس ہو گیا کوئی جھونکا
مہکتی ہوئی آ رہی ہیں ہوائیں

نہیں کوئی بابِ قبول آسماں پر
بھٹک کر کدھر جا رہی ہیں دُعائیں

ہماری عبادت تو ہے یاد اُن کی
وہ معبود ہو کر ہمیں بھول جائیں

اِسی آرزو میں بسر ہو رہی ہے
پھر اک بار تم کو کہیں دیکھ پائیں

چلو اُن کے در پر پھر اک روز ساغر
مقدرؔ کو اک بار پھر آزمائیں

خالق و کارساز تھا جذب و جنونِ بندگی
جس پہ نگاہ ڈال دی اُس کو خدا بنا دیا

ساغرؔ (نظامی)

بدائی

(حضرت نواب غازی آف گوردھاسی پی)

پیت نبھانا پردیسی

چھوڑ کے مجھ کو جاتے ہو — من کو من سے تڑاتے ہو
جیسے پیٹھ دکھاتے ہو — روپ دکھانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

بھوا ربنج جب تم کر لو — تھیلی پیسوں سے بھر لو
گٹھری کاندھے پر دھر لو — گھر لوٹ آنا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

چھجے پر چنچل ناری — تن من دھن لوٹن ہاری
نین میں مدھ پچکاری — من نہ لگانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

گاؤں کی میں الھڑ بھولی — ساڑھی مانگوں نا چولی
بیت نہ جائے ہولی — نا ترسانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

مدھ میں ڈوبی وہ راتیں — رم جھم رم جھم برساتیں
امبوا نیچے کی باتیں — بھول نہ جانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

بھگون تم کو پھر لائیں — ہم تم پھر برہا گائیں
غازی جی کی کبتائیں — مل مل گانا پردیسی

پیت نبھانا پردیسی

نقد و نظر

بادۂ مشرق



ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۳۹ء

(مشترک نمبر)

نقد و نظر

کتابوں رسائل اور اخبارات پر تبصرہ

مکتوبِ فرید

ساغر! ابھی چند دن ہوئے ایک دوست نے مجھے "اردو کے سو شعر" کا سیٹ مطبوعہ مکتبۂ جامعہ مرتبہ مولوی محمود علیخاں دکھایا۔ اسکو دیکھکر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ یہ تو طے ہے کہ محمود علیخاں صاحب اپنے ذوق اور نقطۂ نظر کے لحاظ سے قدامت پرست ہیں۔ اور برانہ مانو تو صاف کہوں کہ وہ شعراء کے معاملے میں جانبدار بھی ہیں۔ البتہ اُنکا جو قدم اُٹھتا ہے وہ دانائی کے ساتھ نفسیات کے مطابق اٹھتا ہے۔ چنانچہ اس سیٹ کا وہ دیباچہ جو ہر کتاب چہ میں شائع کیا گیا ہے یہ اثر رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں سو فیصدی ان کے لئے رحم اور نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں تک "اپنے کارنامہ" کی دہاک بٹھانے کا تعلق ہے وہ اس دیباچہ میں صفحہ ۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

> سو شعر منتخب کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن کئی ماہ کی
> مسلسل محنت مختلف تذکروں انتخابوں دیوانوں اور
> رسالوں کے مطالعہ اور متعدد احباب کی امداد کے
> بعد ہم اس اہم خدمت کو انجام تک پہنچا سکے ہیں۔

ان سطور کا اثر انسانی طبیعت کو عام طور پر مرعوب کرتا ہے۔ اور فوراً ترغیب ہوتی ہے کہ دیکھا جائے۔ انتخاب میں کیا کمال دکھایا گیا ہے بڑی محنت کا نتیجہ ہوگا جو کچھ ہوگا۔ لیکن مولوی محمود علی خانصاحب جانتے ہیں کہ انکا ذوق انکا ذوق اور انکا انتخاب انکا انتخاب ہے۔ اسلئے حفظ ماتقدم کے طور پر فرماتے ہیں۔

> "ذوق کا معاملہ بہت عجیب ہے نہ صرف یہ کہ ایک شخص
> کا مذاق دوسرے سے نہیں ملتا بلکہ خود ایک شخص کا
> مذاق مختلف عمر یا مختلف ماحول کے ساتھ بدلتا
> رہتا ہے ـــــ اسلئے یہ دعویٰ کرنا بالکل غلط ہے
> کہ جو اشعار ہم پیش کر رہے ہیں وہ بہترین ہیں"

ان سطور کے بعد لامحالہ یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ جب خود ہی اعتراف ہے تو کیا انکے کام پر رائے زنی کی جائے۔ ہٹاؤ وقت کو کسی مفید کام ہی میں صرف کریں۔ لیکن اس خط کے ذریعہ میں ناظرین پر یہ حقیقت منکشف کرنا چاہتا ہوں کہ مؤلف نے اپنے دعووں کے خلاف انتخاب کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> "لیکن یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ہر دور کے جتنے
> زیادہ سے زیادہ شعراء کی نمائندگی ہو سکے وہ اچھا
> ہے۔ اسکے ساتھ یہ لحاظ بھی رکھا ہے کہ کسی ایک
> شاعر کے اتنے زیادہ شعر نہ آجائیں کہ وہ اپنے دور
> پر چھا جائے"

اس دعوے کے ابطال میں آگے چل کر میں ثابت کروں گا کہ انہوں نے بالکل اپنے مختص ذوق کی بنا پر ہر دور پر ایک شاعر کو منڈھ دیا ہے۔ حالانکہ اس دور میں دوسرے شعراء کے اشعار لئے جا سکتے تھے مگر آخر میں یہ کہہ کر کہ۔

"لیکن یہ ہم پھر کہدینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان
اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی ہے۔"

وہ پھر نفسیاتی طور پر ہر معترض کے ذہن و دماغ کو منتقل کر دیتے ہیں اسی لئے میں نے یہ رائے غلط قائم نہیں کی ہے کہ شعر سے ان کا ذوق ناقص اور ناممکن سہی مگر ہوشیاری ان کی کنیز ہے۔ اور یہ گمبھیر پروپیگنڈسٹ کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اشعار کے ۵ انتخابات کا یہ سیٹ ۵ کتابچوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ پانچوں کتابچے ۵ ادوار پر مشتمل ہیں۔

(۱) دورِ موجدین سنہ ۱۶۰۰ء سے سنہ ۱۶۷۵ء تک
(۲) دورِ متقدمین سنہ ۱۶۷۵ء سے سنہ ۱۷۵۰ء تک
(۳) دورِ متوسطین سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۸۲۵ء تک
(۴) دورِ متاخرین سنہ ۱۸۲۵ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک
(۵) دورِ حاضر سنہ ۱۹۰۰ء سے اسوقت تک

دورِ متقدمین عام دیباچہ کے علاوہ اس میں اس دور کے بارے میں ایک دیباچہ ہے جسمیں اسکی مختصر تاریخ و تنقید ہے لیکن بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ولی دکنی وغیرہ کے کلام میں منتخب شدہ اشعار سے بہتر اشعار موجود ہیں جن میں آگ ہے اب تم ہی کہو کہ امیر خاں انجام کا یہ شعر انتخاب کے قابل تھا ؎

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

یا آصف الدولہ کا یہ شعر کہ ؎

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو
میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

انتخاب کی ایک اصولی غلطی یہ بھی ہے کہ بعض جگہ مرتب نے ایک ہی غزل سے شاعر کے دو دو شعر منتخب کر لئے مثلاً صنہ۱ پر مرزا مظہر جان جاناں کا یہ شعر انتخاب کیا گیا ہے کہ ؎

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

غنیمت شعر ہے لیکن اسی زمین میں صنہ۱ پر ایسا معمولی شعر آتا ہے جسکو پڑھ کر محمود علی خاں صاحب کی ذوقِ شعری کی پر شک ہونے لگتا ہے ؎

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں آشیاں اپنا

اس اعتراض کا یہ جواب ضرور ہو سکتا ہے کہ متقدمین کی زبان کی صفائی اور تکمیل کا اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ عنصر انتخاب کے بنیادی عناصر سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس شعر میں بہ حیثیت شعر کے کوئی خاص بات نہیں۔ ہر کتابچہ کے آخر میں شعراء کے مختصر حالات درج ہیں۔

متوسطین چند دن تو مجھے دھوکا رہا لیکن ان اشعار نے مجھے یقین دلا دیا کہ محمود علی خاں شاعری کو اسی طرح اور اسی حد تک پسند کرتے ہیں جس طرح ایک عام مسلمان پسند کر سکتا ہے۔ "دورِ متوسطین" کے دیباچہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

پھول کے ساتھ ہمیشہ کانٹے بھی ہوتے ہیں چنانچہ اس دور کی خوبیوں کے ساتھ اس میں دو مضر رجحانات بھی صاف نظر آتے ہیں اب تک اردو شاعری میں محبوب کی صنف کا تعین نہ تھا بلکہ کبھی کبھی تو امرد پرستی کا صاف صاف مظاہرہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ نے اسمیں قابلِ قدر اصلاح کی یعنی مرزا جعفر علی حسرت نے پہلے پہل "واضح طور پر" عورت کو محبوب قرار دیا۔ بات تو اچھی تھی (یہاں پھر آپ انکی ہوشیاری کا لطف اٹھا سکتے ہیں) لیکن لکھنؤ کے ماحول نے اسے ایسا بگاڑا کہ اردو شاعری میں بوالہوسی حتیٰ کہ ابتذال پیدا ہو گیا۔

حسرت کے شاگردِ جراتؔ کا اسمیں بہت بڑا ہاتھ
ہے۔ یہ رنگ داغؔ اور امیرؔ کے زمانے تک قائم رہا
لیکن اب دورِ حاضر میں معیوب اور متروک سمجھا جانے
لگا ہے"۔

یعنی یہ مُضر رجحان تھا کہ عورت کو "واضح طور پر" محبوب قرار دیا جائے؟ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا جعفر علی حسرتؔ نے یہ اقدام کرکے ہم لوگوں کے دل میں گھر بنا لیا۔ کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں اردو ادب میں اسکی ترقی یافتہ تحریک کا جہاں تک تعلق ہے وہ سراہنے کے قابل ہے۔ میرے نزدیک یہ مُضر رجحان نہیں تھا بلکہ مضر رجحان یہ تھا کہ آگے چل کر اردو شاعری پر تصوف کا غلبہ ہوگیا جس نے شاعری کو "خلائی" بنادیا۔

کسی تحریک کے نذر ابتذال ہوجانے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ بجائے خود تحریک مبتذل تھی اسمیں فضا کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن جہاں تک ابتذال کا تعلق ہے اردو شاعری میں "ضمیرِ تذکیری" نے مستقل طور پر ابتذال پیدا کیا نہ اس سے میرؔ خالی ہیں نہ سوداؔ اور نہ کوئی دوسرا شاعر لیکن محمود علی خاں صاحب کے نزدیک ابتذال اور بوالہوسی "صرف مرد" سے تعلق نہیں رکھتی۔ عورت اس کی ضامن ہے! سبحان اللہ
یہ وہی استبدادیت ہے جو ان دماغوں میں آرام کرتی ہے جو مذہبی سختیوں کے زیر اثر ہوتے ہیں

داغؔ اور امیرؔ آزادؔ حالیؔ اور اقبالؔ کے بعد میں کہتا ہوں کہ قطعی طور پر عورت کو محبوب تسلیم کیا جاچکا جسکا ثبوت دورِ حاضر کے ان شعراء کے دواین ہیں جن سے بجا طور پر یہ دور منسوب کیا جاتا ہے اور سینکڑوں نظمیں صرف عورت کے عنوان پر موجودہ ادب سے پیش کی جاسکتی ہیں اسلئے یہ قطعی غلط ہے کہ دورِ حاضر میں یہ رنگ معیوب اور متروک سمجھا جانے لگا ہے۔

حیرت ہے کہ بیسویں صدی کے انسان ہوکر موجودہ زمانے کے شاعر ضمائر کا صحیح محل استعمال قائم نہ کرسکیں اور غزل و نظم میں ضمیر تانیثی کے استعمال کو ایک نزاعی چیز بنائیں۔ واقعی بات یہ ہے کہ محمود علی خاں صاحب جس غزل کے مداح ہیں اسکی چولیں

ہل چکی ہیں اور ہر غزل گو کسی نہ کسی فارم میں نظم کی طرف رجوع ہورہا ہے ؎

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر
میرے لئے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں!؟

اس شعر کا شاعر اپنے مقام پر نہیں ہے وہ اس شعر میں ماورائے غزل نکل چکا ہے اور شعر کی یہ کامیابی اسلئے نہیں ہے کہ وہ متغزل ہے بلکہ اسلئے ہے کہ نظم اور نظم گو شعرا سے متاثر ہے۔

اچھا اب سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لٹریچر کی اشاعت سے مراد محض تفریح نہیں ہوتی اور نہ قوم کو رجعت و انفعال کی طرف لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ خاصکر ہندوستان کی موجودہ حالت اسکی متقاضی ہے کہ اسکے باشندوں کو ذی حیات اور بیدار کیا جائے اور ایسے لٹریچر کی اشاعت کی جائے جس سے رگوں میں خون گرما جائے۔ محمود علی خاں کا انتخاب کے متعلق نقطۂ نظر قطعی (.......
.........) انفعالی ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ لکھنؤ اسکول کی متصنع شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ رسیلی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ لیکن متوسطین کا اہم دور "موت" سے شروع ہوتا ہے۔

مرنا تو یہ ہو اسکے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

کل سو اشعار میں ۲۶ شعر ایسے ہیں جن میں نمایاں طور پر مرنے ہی کا ذکر ہے۔ ان اشعار کو میں نظر انداز کرتا ہوں جن میں اکمنگی اور تباہی کی داستانیں ہیں۔ اب تم ہی کہو کہ انسانی دماغ پر ان موتو کے گانوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ میں محمود علی خانصاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ آخر ہمارے سر پہ گڑھے مردے کیوں ڈالے جاتے ہیں ہم مڑ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں آگے جانا ہے۔ ہمیں ایسا زادِ راہ دو جو ہمیں ہمارے سفر میں مدد دے۔ ہماری بزمیں اجڑ چکیں ہماری تجوریاں نہ جانے کون لے گیا۔ ہماری زمینیں قرض اور کاہلی کی نذر ہوگئیں۔ یہی لوگ جب زندہ تھے تو انہوں نے ہمیں افیون کے اتنے پنڈے اشعار کی صورت میں دیئے کہ ہم آج تک انکی پینک میں ہیں۔ اب وہی گولیاں جن میں افیون کی طاقت

بھی باقی نہیں رہی کیوں ہم کو دی جا رہی ہیں۔

میں مکتبہ کے اراکین سے دریافت کرتا ہوں کہ انہوں نے جوش صاحب سے تم سے یا کسی اور شاعر حیات سے کوئی ایسا مجموعہ لکھوا کر شائع کیا جو مسلمانوں یا ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے فرض کو پورا کرتا!؟

یقیناً اس سوال کا جواب انکے پاس "ہاں" میں نہیں ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک شخص کا ذاتی نقطۂ نظر ساری قوم کے سر تھوپا جائے۔ اگر محمود علی صاحب غم کے اشعار پسند کرتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ حامد بھی غم کے اشعار پسند کرے اسلئے محمود صاحب کو انتخاب میں رنگا رنگی قائم رکھنی چاہیے تھی۔

دورِ متاخرین

اس دور کے دیباچہ میں مرتب نے لکھا ہے کہ

"اس دور کے تین رجحان قابل لحاظ ہیں

پہلا رجحان بوالہوسی کا تھا جس کی ابتداء دورِ متوسطین میں جرأت نے کی تھی اور جسکی تکمیل داغ نے کردی"

مرزا داغ پر یہ زبردست بہتان ہے کہ انکی شاعری بوالہوسی کی آئینہ دار ہے شاعری تو سماج کی پیداوار ہوتی ہے کہنا یہ چاہیے تھا کہ ایک محدود حد تک داغ نے زمانے کے مطابق شاعری کو چلایا۔ ورنہ زبان کی سادگی کے ساتھ ان کا کلام بلندی اور نفاست سے خالی نہیں۔ ان کے کلام پر اس اتہام کی اصلی وجہ انتخاب کا نہ ہونا ہے۔ اگر انکے کلام کا ایک بہتر ایڈیشن شائع ہو تو محمود علیخاں کو اسقدر آزادی سے یہ اتہام لگانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مرزا داغ کو اگر زمانہ انصاف کی نظر سے دیکھے تو موجودہ غزل محض داغ کی شاعری کا پرتو ہے۔ بڑے بڑے متغزل مرزا داغ کے ہی معتقد ہیں۔ غالب کے انداز بیان کی جن لوگوں نے تقلید کی وہ کامیاب نہیں ہوئے اور عمل کے طور پر جو اسلوب ان کا بن سکا وہ جاذبیت نہیں رکھتا۔ البتہ اقبال نے جو راہ نکالی وہ کشش رکھتی ہے۔ لیکن باقی متغزلین کے تغزل کی بنیادیں غالب کی اساس پر نہیں داغ کے رنگ ہی کی اساس پر مبنی ہیں ایک پہلو بحث کا نفسیاتی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا کس شے کو بوالہوسی کہتے ہیں۔ جہاں تک جنسیات کی ہم ربطی کا تعلق ہے جس شاعری کے نمونے پیش کئے جا رہے ہیں وہ شاعری تو محض جنسی جذبات پر مبنی تھی۔ ارے بھئی محبت کی بنیاد جنسی جذبہ پر ہے۔ لہذا غزل کی تمام شاعری بوالہوسی قرار دی جائے گی!! داغ ہی کو کیوں کوسا جائے۔ فرق صرف اسقدر ثابت ہو سکیگا کہ بعض جگہ آپ نے الفاظ کو آزادانہ استعمال کیا ہے اور دوسروں نے احتیاط کے ساتھ۔ بہر حال کسی لحاظ سے بھی مرزا داغ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں اپنے بوالہوسی کی تکمیل کی دیباچہ کے بعد اشعار کا عنوان "بادۂ دوشینہ" ہے اور اسکے نیچے صف ماتم بچھی ہوئی ہے ؎

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

دورِ متاخرین اور دورِ حاضر میں تو مرتب کو کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی موت کے خوب خوب شعر ہیں۔ داغ کے تین دیوانوں میں سے محمود علیخاں صاحب کو یہ شعر پسند آیا ؎

سرا دامستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

مومن کے کلام میں سے یہ شعر ہی ملسکے ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

حالانکہ مومن کے اس شعر کو انتخاب میں آنا چاہیے جبکہ مؤلف کو دعویٰ یہ ہے کہ ہر شاعر کے اشعار اسکے رنگ و اسلوب کے لحاظ سے دیئے گئے ہیں۔

بتخانۂ جبیں ہو گر ترا گھر   مومن ہیں تو اب نہ آئینگے ہم

اس شعر میں مومن کی انفرادیت شاید جھلکتی ہے۔

ریاض کا یہ شعر غلط چھاپا گیا ہے ؎

مرے ساقی ذرا میری شراب تلخ تولانا

مرے کی جگہ "آرے" ہے۔ نظام رامپوری کا یہ شعر کہ ؎

اندازِ اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

انتخاب کے قابل نہیں ہے۔ ادا نگاری میں وہ ماہر ہے۔ اگر ایسا ہی شعر دینا مقصود تھا تو اسکے ہاں کمی نہیں تھی۔ یہ کسقدر حیرت کی بات ہے کہ اس انتخاب میں شاد عظیم آبادی کے اشعار کا انتخاب کیا جائے اور یہ اشعار انتخاب میں نہ آئیں ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ہم دل کی حکایت جائے عجب کیا اوّل آخر اسکا کہیں
اک خاک کا تودہ لائے تھے ہم۔ صحرا لئے قیامت کیلئے چلے

مگر شعر کونسا انتخاب کیا جاتا ہے ؎

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

نظم طباطبائی کا یہ شعر کسطرح انتخاب کے قابل ہے!؟

نہ آنا اے اجل تجھکو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائگاں کر لیں

غالب کا یہ شعر مولوی صاحب کو بہت پسند معلوم ہوتا ہے کہ ؎

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی
وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

انتخاب کرنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اسکو اپنے دل میں رکھتے اور اگر جلتے مرنے ناکامی، نامرادی، تباہی بربادی آہ، نالے اسی سے انکو دلچسپی ہے تو یہ شعر انتخاب میں آسکتا تھا ؎

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
میں بھی ہوں اک عنایت کی نظر ہونے تک

کیا کیا اور کب تک میں تم کو لکھے چلا جاؤں ایسی تکلیف اس سیٹ کو دیکھکر ہوتی ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ ذوق کا یہ رسوائے عام شعر جو ہر بازاری ناول میں موجود ہے۔ انتخاب میں آیا ہے ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

صفحہ ۳۸ پر تینوں شعر غالب کے وہ انتخاب کئے گئے ہیں جنکی عمومیت مسلم ہے خیر میں اسپر معترض نہیں۔ شہرت و عمومیت بھی معیارِ انتخاب قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن بھائی بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے جب مندرجۂ ذیل شعر پر نظر پڑتی ہے کہ ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

البتہ ان کتابچوں میں ایک ہی چیز تعریف کے قابل ہے اور وہ شعراء کے حالات اختصار کے ساتھ۔

دورِ حاضر

دورِ حاضر کے دیباچہ میں غزل کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

(دورِ حاضر کو) دراصل نظم کا دور کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اسکے متعدد وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے
۲۱ تو غزل کی پچھلی کج روی نے حالی کی قیادت میں، لوگوں کو اس سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اسکے علاوہ دورِ حال کے شعراء نے غزل کے میدان کی تنگی کو محسوس کیا۔ انہوں نے سمجھا کہ غزل کے اعتبار سے غزل میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا قدما اُسے ختم کر چکے ہیں۔

. . . .

اور خارجی طور پر "مغرب کی مادیت" کا سیلاب بڑھتا چلا آرہا تھا جو غزل جیسی نازک چیز کو برداشت نہ کر سکتا تھا

اس سے آگے بھی خدا معلوم کیا کیا ہے۔ جسکا لب لباب یہ ہے کہ جسقدر نظم گو شاعر ہیں وہ جاہل اور احمق ہیں اور دورِ جدید کی غزل "الہام" ہے اور غزل گو "ملہم"۔

اس دیباچہ کے تمام خیالات ہمارے ایک مشہور شاعر دوست کے ارشادات کا پرتو ہیں۔ یہ دیباچہ بجائے خود تنقید چاہتا ہے

نہیں اور جوش کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

پنجاب کی وطن پرستی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ پنجابی مسافر کی راہ کا روڑا نہیں بنتے۔ اور یو۔ پی میں راہ چلتے راستے کا پتھر بن جاتے ہیں اور حتی الامکان سفر کو ناممکن کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاعری کے ترقی یافتہ ذوق میں پنجاب یو۔ پی سے زیادہ آگے ہے۔ میں بھی محمود علی خانصاحب کی طرح سے شاعر نہیں ہوں اسلئے اس دیباچہ پر اس تکمیل کے ساتھ تنقید نہیں کرسکتا جس تکمیل سے تم اور شاعر انقلاب کرسکتے ہو دورِ حاضر کے اشعار کا عنوان صہبائے نو ہے اور یہ خوب ہے سب سے پہلا شعر اقبال کا ہے اسکے بعد جگر صاحب کا شعر اسی زمین میں ہے جو یقیناً اچھا ہے مگر اس سے بہتر انکے دوسرے شعر ہیں۔

ایک بڑے تعجب کی بات اسی انتخاب میں نظر پڑی یعنی سوالیہ نشان کسی صاحب نے اپنا تخلص رکھ لیا ہے۔ محمود علی خاں صاحب نے سوالیہ نشان صاحب کے بھی کئی شعر انتخاب کئے ہیں مگر اس دور میں بھی محمود علی خاں صاحب کا ذوق متنائم سرت ۲

و نشاط سے نہیں بدلا ہے انتہا ہو گئی کہ شاعر انقلاب جیسے نشاطی شاعر کے بھی المناک شعر انتخاب کئے ہیں ؎

اس قدر یاس بھی دیکھی ہے کہیں دنیا میں
رو دیے ہم جو تری چشم عنایت دیکھی

دورِ حاضر میں مولوی صاحب جو دورِ جدید کی غزل کے رسیا ہیں یہ شعر انتخاب فرماتے ہیں۔

اس طرف کچھ دیکھکر رونے لگے بیماردار
اس طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے غافل ہو گیا!؟

بہر حال دورِ حاضر کے انتخابات میں بھی وہ محض لکھنوی ذوق کے ایک غزل پرست معلوم ہوتے ہیں اور زیادہ اشعار ایسے ہی انتخاب کئے ہیں۔ اول تو ہندوستان کے مردہ دل شعراہی سوائے رونے دھونے کے کوئی تخلیق نہیں کرسکتے۔ دوسرے سننے والے بیاں رونا ہی سننا چاہتے ہیں۔ ایک غلام مفلس بھوکی قوم ہے ذلتوں اور گراوٹوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز پسند نہیں کرتے۔

مکتبہ کو کوئی آئیڈیل تو قائم کرنا نہیں ہے۔ کتاب بیچنی ہے اسلئے وہ ماحول اور فضا کے مطابق چیز دینا چاہتا ہے کوئی مجتہدانہ قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ پھر اسکے منتظم اور کارکن ادب شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسلئے انہیں ان مشکلوں کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔

ان حالات میں بہتر ہے کہ وہ نثر کی کتابیں شائع کرے اور تراجم چھاپے اسے اردو پبلک کے نثری مطالعہ کے لئے معیاری سامان فراہم کیا ہے۔ جو بات دل لگتی ہوتی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ اچھا خدا حافظ دہلی جب آؤنگے اس بحث پر باقی گفتگو کروں گا۔"

ایشیا

تمہارے اور محمود علی خانصاحب کے خیال میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو کچھ تم نے اپنے خط میں ریویو کیا وہ اگر درست بھی مان لیا جائے تب بھی میں یہی کہونگا کہ کام کرنے والوں کے لئے بڑی مصیبتیں ہیں اور آجکل جو شخص بھی اردو کی خدمت کر رہا ہے غنیمت ہے۔

مگر تمہاری ایک رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ جس شخص کو جس کام میں مہارت نہ ہو اسے اس کام میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیے۔

مولوی محمود علی خانصاحب کو میں جانتا ہوں وہ بیچارے شعر سے ذوق رکھتے ہیں مگر شعر کو سمجھتے نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں اشعار کا انتخاب ان کو نہیں کرنا چاہیے۔ دورِ حاضر کے انتخاب میں انہوں نے فراق لطیف احمد۔ مجنوں اور مجید ملک صاحب سے مدد لی ہے اسلئے گذشتہ دوروں سے اس دور کا انتخاب بہتر ہے۔

اس سلسلے میں معذوری اور کامیابی دونوں کا اندازہ "ضربِ الامثال" دیکھکر ہو جاتا ہے جسمیں محمود علیخانصاحب نے محض ایسے اشعار جمع کئے ہیں جو قبول عام حاصل کر چکے ہیں

اور اتنے مشہور و بے ساختہ ہیں کہ ضرب الامثال بن گئے ہیں۔
سِٹ کا یہ کتابچہ کم از کم مجھے پسند آیا۔ حالانکہ اسمیں شدید عمومیت ہے مگر وہ چیز ہی عمومیت کی ہے۔ اور اس کی ترتیب میں مؤلف کو دقت نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس معذوری کی بنا پر کہ مؤلف کو شاعری سے فطری لگاؤ نہیں ہے انکو اشعار کی عام شہرت نے مدد دی ہے اور کامیابی کے ساتھ انہوں نے اس کتابچہ کو ترتیب دیا ہے۔

اگر ہم بنیادی طور پر یہ معلوم کر لیتے کہ قدرتی مجبوریاں ہیں تو ہمیں اتنا دکھ نہ ہوتا۔ بہرحال دورِ حاضر میں نظم گو شعراء کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تمام خیالات وہی ہیں جو ہمارے دوست حضرت جگر مرادآبادی کہا کرتے ہیں۔ سیر طریقت سے جو کچھ مولوی صاحب نے سُنا وہی لکھدیا۔

نظم نے تھوڑے ہی عرصہ میں کسقدر شاندار ترقی کی ہے اسکا ثبوت یہ ہیکہ ملک میں تقریباً نصف درجن شعراء ایسے موجود ہیں جنکو صاحب طرز کہا جا سکتا ہے اور جو اردو شاعری میں بذاتِ خود اپنی ایک جگہ رکھتے ہیں۔ اور ان سب کی انفرادیت ہے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ غزل کے دیوانوں سے زیادہ نظم کے مجموعوں کی فروخت بازار میں ہے۔ تیسرا ثبوت نظم کی کامیابی کا یہ بھی ہے کہ ہر غزل گو کسی نہ کسی حد تک نظم کی طرف رجوع ہے۔

ان مخصوص اور مشہور شعراء کے علاوہ ملک میں جو مقلد اور مبتدی شعراء ہیں۔ ان پر مولوی محمود علی خاں صاحب کا یہ اعتراض کہ "رنگین الفاظ اور ترکیبوں کی آڑ لے کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انکا مفہوم پوری طرح ادا ہوگیا حالانکہ حقیقتہً وہ نہایت تشنہ اور نامکمل رہ جاتا ہے" قطعی صادق آتا ہے آگے چلکر وہ لکھتے ہیں۔

"چنانچہ موجودہ دور کے ایک چوتھائی اشعار بالکل چیستاں ہوتے ہیں اور نصف ایسے ہوتے ہیں جنکے الفاظ کا سحر نہایت کامیاب ہوتا ہے رنگین ترکیبیں وقتی طور پر مزہ بھی دے جاتی ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو یا وہ کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں یا انہیں معنے پہنانے کی خدمت پڑھنے کے لئے مذاقِ سلیم کے سپرد کردیجاتی ہے"

یہ تمام سطریں دراصل موجودہ تقلید غزل گویوں پر صادق آتی ہیں۔ اتنا تو میرے دوست جانتے ہی ہونگے غزل کا شاعر ساری عمر عوام کو دھوکا دے سکتا ہے۔ لیکن نظم کا شاعر اپنی ایک نظم سے بھی فریب نہیں دے سکتا۔ غزل میں۔ یادہ گوئی کر جائیے۔ تصوف اور فلسفۂ الٰہیات قرار دی جائے گی۔ لیکن نظم جو ایک عنوان کے تحت لکھی جاتی ہے اور جسکی تصویر اسکے مقررہ ماحول کے مطابق کھینچنی پڑتی ہے۔ اگر وہ غلط ہو جاتی ہے تو نظم کو کوئی اچھا تو اچھا درست بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک متفرق خیال اور جذبہ کا حامل ہوتا ہے اسلئے اتنی دقت نہیں ہوتی۔ اور سہ ز ہے۔ عذر (اور بقول محمود علی خاں صاحب کے ۵، فیصدی رنگین محدود الفاظ) اِدھر اُدھر سے جمع کئے اور "تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں" کہدیا۔ اسطرح تین خدمتیں ہوگئیں (۱) شاعری، تصوف اور مرشد کی مدح۔ کیونکہ اردو غزل گو کا محبوب ڈاڑھی والا مرشد ہوتا ہے جس سے اُسکو فیض پہنچتا ہے۔ دس گیارہ عنوانات غزل کے مضامین کے ذخیرے ہیں۔ کہیں آشیاں سلگ گیا۔ کدہر نغمۂ بلبل بلند ہو گیا۔ کہیں ایک آہ۔ کہیں ایک واہ۔ کہیں دم نکل گیا (ان غزل گویوں پر زیادہ تر نزع کا عالم طاری رہتا ہے)

بہرحال محمود علی خانصاحب نے غیرواقعاتی بات لکھی اور ہم غلط سمجھے۔ یہ حالت دراصل غزل گویوں کی ہے جو اردو شاعری اور ہندوستانی قوم اور ذہن ودماغ حیات اور ترقی تمام چیزوں کے لئے ایک مصیبت ہیں۔ اور نہیں معلوم کہ قوم کا یہ کیا حشر کر کے رہینگے؟!

رباعیاتِ عرش فاروقی

سائز ۲۶×۲۰/۱۶ چھپائی کتابت کاغذ متوسط اور نظر کش مرتبہ سیّد الطاف علی صاحب بریلوی بی اے (علیگ) قیمت ۸ ملنے کا پتہ منیجر صاحب کا نفرینس مکڈپو علی گڈہ۔

یہ مجموعہ ہمارے دوست سیّد الطاف علی صاحب بریلوی نے مرتب کیا ہے۔ جو عرش صاحب فاروقی مرحوم کی رباعیات شباب پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے الطاف صاحب کا "تعارف" ہے جسمیں عرش صاحب کے خاندانی حالات لکھے گئے ہیں جو عجیب دردناک ہیں۔ اعتماد الدین احمد صاحب عرش ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کو جوانی ہی میں ۲۴ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

تعارف کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی کی تحسین کلام کے عنوان سے چند سطور ہیں۔ نواب صاحب امور مذہبی پر تو ممکن ہے ورک رکھتے ہوں لیکن میں اُسدن سے انکی شعر فہمی کے متعلق کوئی حسن ظن نہیں رکھتا ۲
جس دن اپنی کوٹھی میں ٹہلتے ہوئے غالب اور اقبال کے شاعر ہونے ہی سے انہوں نے انکار فرما دیا۔ اور اقبال کو تو سرے ہی سے شاعر ماننے سے انکار کر دیا۔ شعر کا ذوق اور اسکو سمجھنے کی فہم ایسی علم و دولت نہیں ہے کہ دولتمندوں اور زمینداروں کو بھی ودیعت ہو جائے۔ اسلئے اس تحسین کلام کے متعلق کیا لکھوں اسکے بعد جوانی کے عنوان سے تقریباً ۷۳ رباعیاں ہیں۔

جن لوگوں نے شبابیات (مطبوعہ سنہ ۱۹۲۵ء) میرا مجموعہ رباعیات دیکھا ہے اسکو مجبوراً کہنا پڑیگا کہ رباعیات عرش مرحوم کوئی طبعزاد چیز نہیں ہے۔

آیئے رباعیات عرش سے پہلے میں اپنی رباعیات ہی پر ایک نظر ڈالوں کہ بنیادی خیال بھی درست اور مناسب ہے یا نہیں۔ یاد ش بخیر وہ عہد کہ جب شعر و شاعری کا شوق جنون اور مالیخولیا کی حد سے بھی گذرا ہوا تھا اس زمانے میں جوانی پر میں نے تقریباً ایک سو رباعیاں کہی تھیں اور انکو مشاعروں میں عجیب رنگ و ادا سے پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے کہ جو تصویر رباعی میں ہوتی تھی اسکا بہت کچھ اثر خود میرے خط و خال میں موجود تھا۔ ہر جلسہ میں یہ رباعیاں بہت کامیاب ہوتی تھیں۔ ذات و صفات کی یہ ہم رنگی ایک عجیب عالم پیدا کر دیتی تھی اور مشاعروں میں جب میں غزل پڑھنے کے لئے بیٹھتا تھا تو اُنکے سُنانے کی فرمائش ضرور ہوتی تھی۔

ان رباعیات کی کامیابی نے ہر نوجوان کے دل میں تقلید و نقل کی آرزو پیدا کر دی اور متعدد حضرات نے اس قافیہ و ردیف میں جوانی کی رباعیاں کہیں جس قافیہ و ردیف میں میں نے رباعیاں تخلیق کی تھیں اسوقت مجھے بدقسمتی سے ماحول کے اثرات نے خود اعتمادی کی دولت نہیں بخشی تھی اسلئے میں جہاں اپنے بہت سے معائب کو نہ سمجھ سکا اس عیب کی طرف بھی نگاہ نہ جا سکی کہ ان رباعیوں میں ایک قسم کا نا قابل برداشت ابداع تھا اور گذری ہوئی سی خودستائی اور عدم تناسب پایا جاتا تھا۔ سنانے تک یہ محدود رہتیں تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن سنانے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ انکو "شبابیات" کے عنوان سے شائع بھی کر دیا گیا تو جوانی کے جوش اور ناعاقبت اندیش مزاج نے اس مجموعہ میں اس قسم کی رباعیاں بھی شائع ہو جانے دیں جنھیں آج میں دیکھتا ہوں تو دل ہی دل میں ہنستا ہوں ؎

جاڑوں کا گلاب ہے جوانی میری   کیلے کی شراب ہے جوانی میری
بوندوں کا شباب ہے جوانی میری   برکھا کی گھٹائیں ہیں امنگیں ساغر
پھولوں میں سنی گئی کہانی میری   پیغمبر ہُوں ہے زندگانی میری
جبریل کی نیند ہے جوانی میری   ہر سانس میں الہام کی آوازیں ہیں

لیکن اس قسم کی رباعیات کے ساتھ ساتھ اس مجموعہ میں زیادہ تر رباعیات ایسی بھی ہیں جنکو سن کر انسان تڑپ جا سکتا ہے ؎

ہنسنے لگی صبح شادمانی میری   عید آئی گئی وہ سرگرانی میری
اور مجھ سے گلے ملی جوانی میری   شیشے ہوئے ہمکنار ساغر ساغر

بہرحال کہنا یہ ہے کہ رباعیات عرش کا اصلی ماخذ تو "شبابیات" ہے شباب پر تقریباً ۷۳ رباعیات اور گیارہ دوسرے موضوعات

پر ہیں، جس طرح "شبابیات" میں شدید ترین ابداع موجود ہے، ان رباعیات میں بھی صفحہ صفحہ پر وہی رنگ ہے ؎

مستی کا پیام ہے جوانی میری　　جمشید کا جام ہے جوانی میری
آئینۂ اسرارِ معارف ہوں میں　　حافظ کا کلام ہے جوانی میری۔

بعض جگہ اس درجہ توارد خیال ہے کہ حیرت ہوتی ہے؛ کیونکہ اب عرشؔ دُنیا میں باقی نہیں ہیں، اور خود ان کے اہتمام میں یہ مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے اس لئے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن اپنے دوست الطافؔ صاحب پر حیرت کرنیکا مجھے حق ہے کہ ایک مطبوعہ اور قدیم کتاب (شبابیات) کو انہوں نے دیکھ کر اس کی ترتیب نہیں کی۔ عرشؔ کی رباعی کا آخری مصرعہ ہے کہ ؎

اک شاعرِ فطرت ہے جوانی میری

میرا مصرع ہے کہ ؎

اک شاعرِ مست ہے جوانی میری

لیکن اسکے باوجود مجموعی طور پر اس موضوع پر یہ مجموعہ بھی بہت دلنواز اور پڑھنے کے قابل ہے۔ یقیناً اگر عرشؔ زندہ رہتے تو قوم میں شاید ایک اچھے شاعر کا اضافہ ہوتا؛ بعض مصرع اور رباعیاں اس قدر پُر کیف ہیں کہ بے ساختہ مرحوم کی روح کو داد دینی پڑتی ہے۔ ایک مصرع ہے ؎

"مفلس کا چراغ ہے جوانی میری"

اور خصوصاً یہ رباعی کہ ؎

خود بینیٔ فطرت ہے جوانی میری　　آئینۂ حیرت ہے جوانی میری
جو میرے سوا کسی سے اُٹھ ہی نہ سکا　　وہ بارِ امانت ہے جوانی میری

بہرحال، میں الطافؔ صاحب کو ان کے اس حق دوستی ادا کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھیں، وہ ضرور محظوظ ہونگے۔

ہماری زبان اور اسکے مشاعرے

خطبۂ صدارت آل انڈیا مشاعرہ مچھلی شہر منعقدہ ۲۳ راکتوبر ۱۹۳۵ء از ڈاکٹر نجم الدین احمد صاحب جعفری بار ایٹ لا، ملنے کا پتہ اُردو لٹریچر کمپنی حویلی اعظم خاں دہلی۔ قیمت ۸ر

یہ اُردو زبان کے متبحر ادیب ڈاکٹر نجم الدین احمد کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے اپنے ہی وطن میں ایک آل انڈیا مشاعرہ میں دیا۔ سب سے اوّل، مشاعروں کی تاریخ انکے عروج اور پھیلاؤ کو نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا ہے اسکے بعد مشاعروں کے انعقاد اور انکے نفع و ضرر پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اسکے بعد اُردو شاعری کی ان رگوں پر نشتر زنی کی گئی ہے جن میں فاسد خون بھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ قطعی صحیح لکھا ہے کہ ایران کی تقلید کرنے کے بعد جو چیز ہم کو حاصل ہوئی، اس نے 'یعنی ایرانی محبوب کے تخیل' اور ایرانی ہندوستانی مخلوط محبوب' کے تخیل نے ایک عجیب و غریب ہیبت ناک اور مخنث محبوب کا تصور اُردو شاعری میں پیدا کر دیا، جس کے اثرات گو اب باقی نہیں ہیں لیکن جس کی یادگار کے طور پر ابھی ضمائر کا منافقانہ استعمال ضرور باقی ہے۔

اسکے بعد اُردو شاعری کی بتدریج ترقی کی تاریخ اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کی ہے مگر پنجاب اور یوپی کے جن شعراء نے شاعری کو بامِ ارتقا تک پہنچایا، ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے اصحاب کا نام بھی لکھ دیا ہے جن کو ابھی یہ کریڈیٹ نہیں دیا جا سکتا گو یہ ممکن ہے کہ آج سے دس پندرہ سال بعد وہ اسکے مستحق ہو جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کا بھی اصرار ہے کہ شاعری کو بنی نوع انسان کی مسرت ہی کا ذریعہ نہیں بننا چاہئیے بلکہ انسانیت کی تعمیر میں اسی طرح حصہ لینا چاہئیے، جس کی مثال تاریخ میں اکثر ملتی ہے، بنی نوع انسان کی تعمیر و ترقی کا پہلا ذریعہ، جذبات عالیہ ہی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تمام خطبۂ صدارت کا نچوڑ یہ ہے کہ ملک کے شعراء کا مقصدِ اعلیٰ شاعری ہونا چاہئیے نہ کہ صرف رواجی غزل۔

لیکن میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ بہ حیثیت ایک تماشائی کے میں یہ تماشہ روزانہ دیکھ رہا ہوں کہ ان آوازوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اور اعلیٰ شاعری کی تخلیق کے باوجود اُردو شاعری میں شدید قسم کا ردِّ عمل بھی شروع ہو گیا ہے اور ایک بے روح اور کمزور رواجی غزل کا پھیلاؤ ہوتا جاتا ہے۔ اس ردِ عمل کے ذمہ دار ہمارے دوست حضرت جگر مراد آبادی کے نقال اور عکاس ہیں۔ جہاں تک جگر کی غزل کا تعلق ہے وہ دلنواز اور گہری ہے۔ لیکن جو لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں ان میں زیادہ تر مہمل اور بے روح ہیں۔ یو۔ پی سے لیکر پنجاب تک میں اس رَو کو دیکھ رہا ہوں، کیونکہ اوّل تو رومانس (Romance) ہی افیون ہے، پھر غزل جو انسان کے جنسی جذبات کی پیاس بجھاتی یا دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتی ہے، اور بھی افیون ہے، موجودہ مسلمان قوم جو مفلوج و کسل مند ہونے کی وجہ سے عارضی مسرت و طاقت کی خواہشمند ہے ایسی افیون اور ایسی شراب کو پسند کرتی ہے جو اس کو ایک ہی گھونٹ میں دُنیا جہان کی تکلیفوں سے نجات دلا دے۔

مگر یاد رکھئے کہ آج شاعر، امتحان کے نہایت اہم اور خطرناک مرکز پر ہے۔ یوں تو اس کو حق حاصل ہے کہ وہ وقتی تحسین و ستائش سے مست ہو جائے اور خود کو شاعرِ کامیاب تصور کر لے، لیکن کل کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے شعر کی جگہ قوم کے زبان و دل ہو۔ نگے یا انگیٹھیاں اور دہکتے ہوئے چولہے!؟ یاد رکھئے کہ ہر وہ شخص مٹا دیا جائیگا، جو زندگی اور حقیقت کو چھپائیگا، اور وہ زندہ رہیگا جو حق کیلئے خود مٹ جائیگا۔ مستقبل میں وہی شاعر اپنی زندگی کا خود ضامن ہوگا جو حقائق کا ساتھ دے گا، جو قومی ارتقاء کا ساتھ دیگا، جو ہندوستانی قوم کا ساتھ دیگا، یعنی جو زندگی اور زندگی کے حرکتی پہلو کا ساتھ دیگا۔

آج شاعر کیلئے یہ بڑا سوال ہے کہ وہ کیا سوچے اور کیا کہے!؟ زندگی اپنے اصلی مقصد کی تلاش میں ہے۔ اس جستجو میں تم اسکی کس قدر مدد کر سکتے ہو، یہ سوال ہے جو وقت کی طرف سے برابر کیا جا رہا ہے اور بنی نوع انسان کی ہستی کا دار و مدار اس سوال کے جواب میں پوشیدہ ہے!؟ آخر شعراء کا احساس اور تاثر محض فطرت کے خوشگوار اور حسین پہلوؤں تک کیوں محدود ہے، ان کی محبت، انکے وجود تک محدود کیوں ہے؟ اگر وہ وسیع دل کے مالک ہیں، تو چلکتی ہوئی کمریں، اور ہنستے ہوئے چہرے ہی ان کو دعوتِ شعر و نغمہ کیوں دیتے ہیں۔ ایک لامحدود کراہتی ہوئی دُنیا سے وہ کیوں آنکھ بند کئے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ وہ روشنی کے رسیا ہیں، تو آخر تاریکی نے کیا گناہ کیا ہے!؟

تاریکی بھی روشنی ہی کی طرح ایک روشن حقیقت ہے۔ رسمی غم، اور رواجی واویلا سے وہ دُنیا اور انسان کو کیونکر بلند کر سکتے ہیں۔ آرٹ کا اگر ان کے نزدیک کوئی مقصد بھی نہو، تب بھی ان کے تخیل کو عام دماغوں اور ذہنوں سے بڑھ کر کوئی بات کہنی چاہئیے۔

قدیم شعراء پر اپنے ماحول اور وقتی تمدن و تہذیب کی پیداوار تھے۔ اور ان کی شاعری کی آماجگاہ امارت اور سرمایہ داری تھی۔ ایک عام ذوق تھا، ایک وسیع ماحول تھا وہ نوابوں اور امراء کے ان تقاضوں کی نمائندگی کرتے تھے جو امراء کے چونچلوں اور شوقوں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب وہ ذوق ہے نہ ماحول، مگر عوام میں بیٹھ کر شعراء وہی رٹ رٹے جاتے ہیں، جو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مثلاً رندی و سرمستی بھی زندگی کا ایک راستہ ہے لیکن کیا سماج میں ہم اس راستہ کو وسیع و عام کر سکتے ہیں!؟ ظاہر ہے کہ نہیں، تو پھر جو شخص آج اپنے شعر میں بغیر کسی بنیادی خیال کے رندی و سرمستی کی تعلیم دیتا ہے اُس سے ہر شخص دریافت کرنے کا حق رکھتا ہے کہ کیا محض رندی سے دُنیا چل سکتی ہے!؟ اگر چل سکتی ہے تو پھر وہ اپنے فلسفہ کو وضاحت سے بیان کرے۔ اور اگر وہ اپنے خیال میں ذرا بھی متزلزل اور غیر مخلص ہے تو اس کو اپنے خیالات پر غور کرنا چاہئیے۔ یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شاعری سے رندی و سرمستی کے خیالات کو

نکال دینا چاہیئے۔ زندگی میں جس قدر، مذانہ عناصر کی ضرورت ہے وہ ضرور باقی رہنے چاہئیں۔ دراصل آج محض آرٹ کا سوال نہیں ہے ہر شخص سے سماج ایک راستہ پیدا کرنے کی آرزومند ہے۔ (پیام کا لفظ بیحد فرسودہ ہوگیا ہے، لیکن اس لفظ کے کہنے کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں ہے) یعنی ہر شاعر سے سماج ایک پیغام چاہتی ہے، گویا شاعر اسکی ملک ہے اور وہ اپنی ملک سے اپنی ضرورت کے مطابق مطالبہ کرتی ہے، ان حالات میں آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ شاعر کی حیثیت کس قدر معرضِ امتحان میں پڑ جاتی ہے'!؟

ہماری دُنیا برباد اور تباہ ہوکر از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہے۔ اس دُنیا کے لئے فلسفی، شاعر، آرٹسٹ، اور ہر طبقے سے رنگا رنگ تعمیری سامانوں کی ضرورت ہے۔ جب گھر بنایا جاتا ہے تو محفوظ دولت بھی صرف کردی جاتی ہے۔ اس لئے شاعر کو آج صرف دل کا منتظر نہیں رہنا ہے بلکہ دل اور دماغ اور روح کو ہم آہنگ کر کے وہ تخلیق کرنی ہے جس سے نئی دُنیا تعمیر کی جا سکے۔

یاد رکھئے، وہ سب پیدا ہونے سے پہلے مر چکے جو شاعری کو عامی سے عامی بنائے چلے جا رہے ہیں اور محض اس لئے کہ مشاعروں کے ہنگاموں کے "ہیرو" کہلائے جا سکیں، بلند، زندہ اور پُرجوش باتیں کہنے سے احتراز کرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں جن کو عوام پسند کرتے ہیں۔ وہ عوام جن کے نزدیک شاعر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بناوٹی اور بازاری عشق و عاشقی کی کہانیاں نظم کردے اور بس'

ڈاکٹر نجم الدین جعفری نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں وہی باتیں کہی ہیں جو حالی کا معہود و مقصود تھیں، لیکن میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ شاعر واعظ بن جائے۔ میں تو شاعر سے ایک ایسی تخلیق چاہتا ہوں جو، تاثیر، کشش، سادگی، بلندی اور افادیت کے اجزا اور عناصر سے مرکب ہو، اور نئی چیز ہو جس کی بنا پر اُردو زبان کی شاعری، دُنیا کی بڑی سے بڑی شاعری کے مقابلے میں رکھی جا سکے۔ میں عاشقانہ شاعری کا مخالف نہیں۔ لیکن اُس میں واقعیت ہونی چاہیئے، میری آزادانہ رائے ہے کہ اُردو زبان کی عاشقانہ شاعری تو انسان کے جنسی جذبات کو بھی نہیں اُبھارتی، اس میں ایک سخت قسم کا مصنوعی الم پایا جاتا ہے۔ جوانی نہیں۔ اور عمق بھی نہیں، میں پھر عرض کرونگا کہ اُردو شاعری خلاقی سے عاجز ہے تو اس کو شاعری چھوڑ کر فنِ رقص میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے، گو اس میں بھی اسی قسم کی ضرورتیں پیش ہوں گی، مگر شاعرانہ خلاقی کے مقابلے میں رقاصانہ خلاقی میں کامیابی نسبتہً ممکن ہے —— !؟

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زبان کے مسئلہ پر نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے آج ہر شخص کو اتفاق ہے۔ اسکے بعد مچھلی شہر کی ادبی اور شاعرانہ افضلیت پر روشنی ڈالی ہے اور آخر یہ چھوٹی سی کتاب ایک نظم پر ختم ہوتی ہے جس کا عنوان "اتحادِ عمل" ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جعفری صاحب اور سب کچھ ہوتے ہوئے شاعر بھی ہیں —— !؟

"اخلاق" و "مذہب"

صفحہ ۱۰۵ پر "اخلاق و مذہب" کے عنوان سے جو فلسفیانہ مباحثہ اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے اسکے بالکل آخر میں صفحہ ۱۰۹ پر یہ سطور لکھنے سے باقی رہ گئی ہیں:

سہا: — انسان فطرتاً جزا اور سزا کے خیال سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

ساغر: — تو پھر وہ سچا اخلاقی بھی نہیں بن سکتا ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ۔۔۔ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

(اڈیٹر)

عطرِ عروض مؤلفہ نواب احسان علی بہادر آف باندہ منور اگنج اندور (اسٹیٹ) قیمت ۴ر علاوہ محصول ہے
یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت اور جامع رسالہ ہے جس میں فنِ عروض کی ابتدائی باتوں کو نہایت عام فہم زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف میں نواب صاحب نے جس جامعیت اور اختصار سے کام لیا ہے وہ ایسے وسیع اور نہ سمجھ میں آسکنے والے موضوع پر کتاب لکھتے ہوئے ناممکن ہی ہے۔ اپنی جامعیت اور تکمیل کے لحاظ سے یہ ضرور اس قابل ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں میں درسی کتابوں میں اس کو داخلِ نصاب کر لیا جائے۔

یہ رسالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) پہلے باب میں علمِ عروض، اصطلاحاتِ عروض، وزن، بحر، رکن، اصول، تقطیع، زحاف، سالم، غیر سالم، تعریفِ شعر، معشر، صدر، عروض، ابتدا، ضرب، حشو، اصول، سبب، وتد، فاصلہ، ارکان، وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے۔

(۲) دوسرا باب زحاف، ازالہ، حب، شکل، وقف، اضمار، جدع، طے، تخنیق، حذف، قبض، تسبیغ، قصر، تسکینِ اوسط، خرب، تشعیث، خرم، ثرم، کف، ثلم، شتر، نحر، وغیرہ کی تعریف پر مشتمل ہے۔

اور اسی طرح باقی تین ابواب میں بھی عروض کے ضروری مبادیات نہایت قابلیت کے ساتھ اختصار کے ساتھ درج ہیں۔

آئیے میں آپ کو نواب احسان علی بہادر سے ملاؤں۔ احسان صاحب باجی راؤ پیشوا کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور نواب آف باندہ کے پوتے ہیں۔ لیکن اندور ہی میں پیدا ہوئے اور اندور ہی میں قیام فرما ہیں۔ تمام خاندان کو شعر و ادب سے گہرا ذوق ہے۔ شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ اسی نمبر میں کسی جگہ آپ ان کے ارشادات سے مستفید ہوں گے، عام طور پر غزل فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی کہتے ہیں لیکن ان کا اصلی میدان غزل ہی ہے۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ غزل میں تصوف اور فلسفہ نہیں کہتے۔ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

ان کی شاعری کا تمدن قدیم ہے، جس طرح ان کے اخلاق و اطوار اور زندگی میں قدیم وضعداری کی شان ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری قدیم شاعرانہ وضعداریوں کی آئینہ ہے۔ اس سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ خصوصیات بلند اور ناپسندیدہ ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ باتیں ۲
نئے آدمیوں میں نہیں ہیں جو بیحد قدر کے قابل ہیں۔ اگر نواب صاحب قدامت کے بعض اصولوں کو نہ مانتے ہوتے تو فنِ عروض پر رسالہ لکھنے کی کوشش کیوں فرماتے!؟ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ شاعری کیلئے ہرگز عروض سے واقف ہونے کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص اس بکھیڑے میں پڑے گا اس کو کبھی شعر کہنا نہیں آئے گا۔ یہ تمام باتیں ایسی تو ضرور ہیں کہ شاعر ان سے واقف ہو۔ مگر ایسی ہرگز نہیں کہ ان کو شاعری کی بنیاد قرار دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی علم اور فن سے واقف ہونا کوئی بری بات نہیں ہے، وقوف تو جہل کے مقابلے میں بہرحال مبارک ہے! لیکن میں اُن حضرات سے قطعی اتفاق نہیں رکھتا جو شاعری کی بنیاد علمِ عروض کے جاننے پر قائم کرتے ہیں، اور اس نظریہ پر مصر ہیں کہ جو شاعر عروض نہیں جانتا وہ شاعر ہی نہیں ہے۔ ایک حقیقی شاعر کیلئے عروض جاننے کی مطلق ضرورت نہیں، اسکی روح کا فطری ترنم اُسے وزن و بحر سے واقف کرا دے سکتا ہے۔ بلکہ حقیقی شاعر نئے اوزان اور نئی بحریں ایجاد کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اسکی قدرتی دلیل یہ ہے کہ جھرنوں، چڑیوں، ہواؤں اور جھینگروں کو کس نے فنِ عروض سکھایا ہے۔ کہ ان شعرائے فطرت کے اشعار میں آجتک سکتہ اور ایطا واقع نہیں ہوا!؟

بلکہ آلو کو چناروں کے درختوں میں گونجتا ہوا سنئے۔ اسکے نغمہ میں ایک بحر ہے، ایک وزن ہے۔ ایک دُھن ہے اور ازل سے اس وقت تک وہ بغیر عروض جانے ہوئے موزوں گائے جا رہا ہے۔ اس کی آتش نفسی بغیر کسی اُستاد اور بغیر کسی عروض کے جاری و ساری ہے۔!؟

ان دلائل کی بنا پر دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ حقیقی شاعر کیلئے عروض کا ماہر ہونا کوئی شرطِ لازمی نہیں۔

قطع نظر اسکے "عطرِ عروض" اپنے موضوع پر اُردو زبان میں سب سے مکمل اور جامع مختصر اور سمجھ میں آنے والی کتاب ہے۔ اس لئے جو حضرات

عروض کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہئے۔ یقیناً یہ "رازِ عروض" وغیرہ کتابوں سے بہت مفید اور کہیں بلند ہے۔

کشتگانِ فریب

مصنفہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی، ملنے کا پتہ درزی چوک بریلی۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶۸ صفحے۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت مجلد ۱۰/ غیر مجلد ۸/

یہ ایک ناول ہے جس میں ایک پیر کی داستانِ ظلم تحریر کی گئی ہے۔ قتل، تباہی، غارتگری کے واقعات سے اس کو "سنسنی خیز" بنایا گیا ہے۔ پلاٹ عبرتناک ضرور ہے۔ زبان بھی پُرجوش اور زوردار ہے، لیکن لوچ نہیں ہے۔ اور ساری کتاب کو تحلیلِ نفسی سے کوئی تعلق نہیں ظاہر ہے کہ اب اُردو ناول نگاری، ان منازل سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ ادب میں واقعیت نگاری اور نفسیاتی تحلیل کا دور دورہ ہے۔ اب ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ نئے ادب کو پیشِ نظر رکھ کر قلم اُٹھائے۔ ورنہ محض طباعت کی آسانیوں سے فائدہ اُٹھانا تو ادب کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ پھر ہر افسانہ کے سازوبرگ کی قدامت اور جدت کا خیال رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کتاب میں زورِ بیان اور شیرینیٔ زبان تو موجود ہے، مگر خیالات تمام کے تمام پُرانے ہیں، اگر ہمیں پیری و مریدی کے خلاف آواز بلند کرنی ہے تو اسکی جڑوں پر ضرب لگانی چاہیے۔ محض ایک پیر کی سیہ کارانہ سیرت نگاری سے مرض دور نہیں ہوسکتا۔ اسکے علاج کے لئے اس سسٹم کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی جس کی ایک شاخ پیری مریدی بھی ہے۔

درسِ عمل

ایک مختصر مسدس ہے جس کے ناظم میرے قدیم دوست ہادی صاحب مچھلی شہری ہیں۔ نظم کی اساس وہی خیالات ہیں جو حالی اور پیروانِ حالی کے تھے، ماضی کی کہانیوں کو دہرا کر مسلمانوں کو گرماتا اور حال کی تباہیوں کی تصویر کھینچ کر قلب و دماغ کو متاثر کرنا، مگر حال یہ ہے کہ ایک طرف مسلمان پہلے سے زیادہ غافل ہوگئے ہیں اور پھر اس "بانگِ درا" کا گلا بھی بیٹھ گیا ہے، بہتر ہے کہ کوئی نیا طرز ایجاد کیا جائے، جدت اور رنگارنگی بہرحال جاذب ہوتی ہے۔ جہاں تک ہادی صاحب کی شاعری کا تعلق ہے تو اس باب میں کچھ عرض کرنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

یہ نظم ہادی صاحب سے الہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ حضرت ہادی مچھلی شہری، وکیل الہ آباد

سرورِ کونین

مصنفہ مؤلفہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۶ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- چوک درزی بریلی۔ قیمت نامعلوم۔ کتابت و طباعت معمولی۔

یہ کتاب بھی حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کی تصنیف و تالیف ہے، سب سے اول، بعثت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قبل کی حالت دکھائی گئی ہے، اسکے بعد دوسری قوموں اور مذہبی کتب میں رسول اکرمؐ کی پیدائش و ظہور کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں، ان کو یکجا کر دیا ہے اور اسکے بعد پیغمبر اسلام کی سیرت سے بحث کی گئی ہے۔ سب سے آخر میں ہر قوم اور ہر مذہب کے مخصوص افراد کی آراء اور اعترافات جمع کردئے ہیں، گو چھوٹی سی کتاب ہے مگر کاوش سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس کو سیرت کمیٹی بریلی نے شائع کیا ہے۔

یادگارِ محشر

کلامِ محشر بمبئی مرحوم۔ مرتبہ اشفاق حسین خاں صاحب گورکھپوری۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۲ صفحے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی تمام اجزا اعلیٰ اور نفیس جلد خوبصورت و مضبوط اور سُنہری ڈائی سے مزین۔ مصنف کی دو تصویریں بھی زینت کتاب ہیں۔

سب سے اوّل ہمارے دوست حضرت مجنوں گورکھپوری نے "مرنے والے کی یاد" کے عنوان سے چند صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ اسکے بعد حضرت محشر مرحوم کی مختصر سوانح حیات ان کے باپ غلام مرتضیٰ صاحب نے سپردِ قلم کئے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۳۰ تک احباب اور متعلقین کے وہ مضامین اور نظمیں ہیں جو مرحوم کی ذات سے گہری محبت اور عقیدت کو واضح کرتی ہیں، ان نظموں کے بعد ۳۲ سے ۸۴ صفحے تک محشر مرحوم کا کلام ہے، جس کے متعلق اپنے دیباچہ میں مجنوں صاحب فرماتے ہیں:-

"محشر نہ صرف ایک ہونہار طالبِ علم تھے بلکہ شاعری کا پورا ذوق اپنے اندر رکھتے تھے اور اگر ان کی عمر ان کو فرصت دیتی اور زمانہ ان کی صلاحیتوں کی یاوری کرتا اور وہ خود اپنے ذوق اور صلاحیتوں کی تہذیب و تکمیل کی طرف اسی طرح متوجہ رہتے تو وہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے، اس وقت بھی جو مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے اس میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جو نہ صرف بے عیب ہیں بلکہ ایک خاص شاعرانہ آنچ کا پتہ دیتے ہیں ....

....

اس کا ماتم جس قدر کیا جائے کم ہے کہ محشر کو زندگی نے اتنا موقع نہیں دیا، کہ وہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو پوری تربیت دے کر ہمارے سامنے لاتے، پھر بھی اتنا بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کر سکے اور ان سے جو کچھ یادگار باقی ہے اسکی عام خصوصیت خلوص اور تاثیر ہے ان کا کوئی شعر صداقت اور اثر سے خالی نہیں ہے۔ ان کے ہر شعر میں کچھ نہ کچھ ندرت و تازگی کے ساتھ ساتھ ایک وہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جو کبھی ریا اور تصنع سے نہیں پیدا ہو سکتی۔"

بلاشک جب اس شعر پر نظر پڑتی ہے کہ ؎

برسے گی آسمان سے فصلِ بہار میں | ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

تو مجنوں کے الفاظ کی زبردست تائید ہوتی ہے۔

یہ بزمِ حُسنِ دوست ہے یا تابشِ تمام | ہر ذرّہ آفتاب ہے اس بارگاہ کا

اللہ رے فریبِ تماشائے رنگ و بو | دُنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا

زندگانی ہے ازل کی اک صدائے بازگشت | سُن رہا ہوں میں جیسے وہ دور کی آواز ہے

کہتا ہے چھا کے ابرِ سیہ خانقاہ پر | کچھ احترامِ شیشہ و پیمانہ کیجئے

ان اشعار کو پڑھ کر جن میں ترقی اور فروغ کے تمام امکانات نظر آتے ہیں، دلی رنج ہوتا ہے۔ اگر ان اشعار کا کہنے والا زندہ رہتا تو دنیائے شاعری میں ایک نہایت اچھے شاعر کا اضافہ ہوتا اور دُنیا جذبات و خیالات سے مستفید ہو سکتی، مگر افسوس کہ وہ ہم میں نہیں ہے اور اب ہمارے لئے صرف یہی چارۂ کار ہے کہ اسکی یادگار کو غنیمت جانیں، محشر کے کلام پر اصغر گونڈوی کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔

بادۂ فطرت

مصنفہ ابوالفطرت میر زیدی جسے اشرف بکڈپو لاہور نے دو حصوں میں شائع کیا ہے۔ پہلے حصہ کا حجم ۱۴۴ صفحات ہے اور دوسرے کا بھی ۱۴۴ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہر حصہ کی قیمت ۶ر علاوہ محصول۔ کاغذ لکھائی چھپائی معمولی۔

مجھے اپنے دوست زیدی صاحب کی خدمت میں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کو شائع کرنے میں عجلت اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے۔ اگر وہ انتخابِ کلام ایک جلد میں خوبصورتی کے ساتھ شائع کرتے تو اس کا اثر دنیائے شعر و ادب پر اس سے قطعی مختلف پڑتا؛ لیکن اپنا تمام و کمال کلام شائع کر کے انہوں نے اپنی ترقی کو ۱۵ برس پیچھے ڈال دیا ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے۔ اس نمبر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنا مشکل بھی ہے اور غلط بھی، مگر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری میں ترقی اور فروغ کے امکانات ضرور ہیں، لیکن اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ آج ہر شاعر کو سخت احتساب اور فکر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ سامعین اور ناظرین کا مذاقِ شعری بہت نازک اور ناقدانہ ہوگیا ہے اور کوئی جوہری پرکھ کی اہلیت سے خالی نہیں ہے؛ بازار میں اہلِ نگاہ چل پھر رہے ہیں اور وہ جنس کا مول تول مقابلہ اور ذوق کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔

بادۂ فطرت میں ہر قسم کے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ وطن پرستی، اسلامی خیالات، رومانی تاثرات، غرضکہ شاعر نے کوشش کی ہے کہ کوئی صنف اس سے چھوٹ نہ جائے۔ مزدوری، اور مزدور پر بھی نظمیں ہیں، شاعر اور شاعروں پر بھی نظمیں ہیں؛ بعض موسموں اور تہواروں پر بھی نظمیں ہیں۔ اور جوانی کے تاثرات بھی بہ حیثیت ایک نوجوان کے مصنف نے نظم کئے ہیں۔

اکثر نظمیں، موجودہ شعراء کے اندازِ بیان کی تقلید کے طور پر بھی نظر آتی ہیں؛ مثلاً "نوجوانانِ وطن سے خطاب" میں روشؔ صدیقی کی ایک نظم کا اسلوب پایا جاتا ہے، مگر یہ نظم اس کتاب کی چند اچھی نظموں میں سے ایک اچھی نظم ہے۔

زیدی صاحب کو اپنی ان تمام نظموں پر نظرِ ثانی لازمی تھی۔ کیونکہ اکثر جگہ اغلاط پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

وطن آزاد نہیں ہے، وطن آزاد کریں

"وطن کو آزاد کریں" ہونا چاہیئے۔ لیکن ان اغلاط کے ساتھ ہی اس نظم میں اس قسم کے نادر اور زوردار بند بھی ہیں جن کی تعریف نہ کرنا یقیناً ہٹ دھری ہوگی ؎

ہم اگر چاہیں تو گلزار پہ چھا سکتے ہیں
اپنے رستے سے پہاڑوں کو ہٹا سکتے ہیں
اپنے قدموں پہ مقدر کو جھکا سکتے ہیں
ہم اگر چاہیں تو مزدور کو سلطاں کر دیں

"افسوس تم نہیں ہو"۔ "بھادوں کی برسات میں آجا" قسم کی رومانی نظمیں کافی جاندار ہیں۔ اور میرا ناچیز مشورہ زیدی صاحب کے لئے یہی ہے کہ وہ ابھی رومانی نظمیں ہی لکھا کریں۔ "قومیات" بغیر فکر کے محض بے روح رہتی ہیں؛ قومی نظمیں کہنے کے لئے جبتک شاعر کی فکر مکمل نہ ہو، ناممکن ہے کہ کوئی تخلیق ہو سکے۔

بہرحال، بہ حیثیت ایک نوجوان شاعر کے ہمارا فرض ہے کہ ہم زیدی کا خیر مقدم کریں اور ان کی ذات سے وہ نیک توقعات قائم کریں جو ایک ہونہار شاعر سے قائم کی جا سکتی ہیں۔

نغمۂ بیداری

از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی ؔ۔ قیمت فی جلد ۸ آنے ۔

یہ ایک مسدس ہے جس میں بہ لحاظ خیالات وشاعری حالی اسکول کا تتبع کیا گیا ہے۔ لیکن آج بڑا سوال یہ ہے کہ کیا "حالی کا قومی تخیل"، کوئی نوعیت رکھتا ہے۔ اور محض مذہب، ماضی یا اسی قسم کے اخلاقی سہاروں پر مسلمانوں کو میدانِ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ؎

کئے اسلاف نے جو کام وہی کر تو بھی
ہے مسلمان تو بن خالد و بوذر تو بھی

تو یہ بھی تو سوچئے کہ خالد و بوذر بننے کے لئے کوئی ماحول بھی موجود ہے۔ !؟ ایک فوج کو آپ کسی نہ کسی طرح لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں تو اس جنگ کے مقصد سے بھی تو آگاہ کیجئے۔ حاجی صاحب نے یہ تو کہدیا کہ ؎

قافلے والوں سے پہلے ترا محمل پہونچے
وہ دن آئیں کہ مسلماں سرِ منزل پہنچے

لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ "منزل" مقصود کونسی ہے کیا ہے اور کدھر ہے ——— !!؟

آئیے ہم آپ کو بتاؤں کہ مسلمان کی منزلِ مقصود کیا ہے، اور کیا ہوسکتی ہے !؟

اسلام نے دُنیا میں آکر سب سے بڑا جو اعجاز دکھایا، وہ انسانی آزادی کی بحالی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ تمام بنی نوعِ انسان ایک ہیں۔ توحید کے معنی مسلمان صرف یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ایک ہے نہیں، انسان بھی ایک ہے، یہ تھا وہ درس جو اسلام نے دیا، اور دُنیا میں بڑی حد تک انسانی مساوات قائم کرکے اُس نے دکھادیا کہ وہ کتنے بڑے پیغام کا حامل ہے۔ ہر قسم کی غلامی کو اُس نے مٹادیا۔ اور عالمگیر اخوتِ انسانی کی تعلیم دی۔ دوسری تعلیم تھی جہاد، یہ روحِ جہاد، صرف جہاد فی سبیل اللہ سے ہی تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس کا بہت بڑا تعلق انسانی دنیا سے ہے۔ ظلم، غلامی، سامراج اور اسی قسم کی قیدوں کے خلاف اسلام نے جہاد کی تعلیم دی۔ اور موقع موقع سے اس کو محدود بھی کیا۔ اسلامی تعلیمات کی یہ دو اہم شقیں تھیں جنھیں مسلمانوں نے خود اپنے ہاتھ سے سپرد زمین کردیا۔ اور آج کوئی شاعر یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کا سب سے پہلا فرض اس غلامی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے جس نے صدیوں سے ان کو گھیر کر مفلوج و مقید کردیا ہے اور اس طاقت کے خلاف جہاد کرنا ہے جس نے اس کو غلام بنایا ہے، اسلام کو سب سے بڑا نقصان سرمایہ داری اور غلامی نے پہنچایا۔ آج ضرورت آپڑی ہے کہ مسلمان اگر اسلام کو پھر اسکی اصلی صورت میں زندہ اور بحال کرنا چاہتے ہیں تو وہ اوّل اپنی اجتماعیت کے رگ و ریشے سے سرمایہ داری کے فاسد خون کو نچوڑیں اور اس کے ساتھ سامراجی قوتوں کو فنا کرنے کے لئے اٹھیں۔

اس جد و جہد میں ان کو جس کی امداد کی ضرورت ہو، اُس کی امداد حاصل کریں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے راہِ عمل بالکل کھلی ہوئی ہے اور وہ صاف و روشن راہِ عمل صرف یہ ہوسکتی ہے کہ وہ نڈر ہوکر کانگریس سے متحد ہوکر دُنیا میں انگریزی قوت کو مٹادیں، تاکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالمِ اسلامی یورپ کے سامراجی پنجے سے آزاد ہوجائے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ مسدس اچھا ہے، مگر آپ اس قسم کی نظمیں اگر فکر سے خالی ہوں گی تو اپنا اثر قائم نہیں کرسکتیں۔ محض اوٹ پٹانگ تو عیظ کا زمانہ بیت گیا۔

التحقیق الجدید علیٰ تصنیف الشہید

مصنفہ حافظ حکیم عبدالشکور صاحب مرزا پوری۔ ناشر سید اشارت علی صاحب مالک دارالتالیف والاشاعت اندرکوٹ شہر میرٹھ۔

مجلد قیمت ایک روپیہ۔ چھپائی۔ کاغذ۔ کتابت۔ خوبصورت و متوسط۔

یہ ۲۰×۲۶ سائز پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" مولانا محمد اسمٰعیل شہید حنفی محدث دہلویؒ کی تصنیف نہیں ہے۔ اور نہ صرف یہ انکار ہے۔ بلکہ محرّف و غیر معتبر بھی ہے۔

دیباچہ کے بعد حضرتِ شہید کی تصانیف کی فہرست ہے۔ بعدہٗ ان میں سے بعض کا اجمالی تذکرہ، اور اسکے بعد جن چار کتابوں پر شبہ ہے ان کا تذکرہ ہے۔ اور مؤلف کا دعویٰ ہے کہ صراطِ مستقیم۔ تنویر العینین۔ ایضاح الحق اور تقویۃ الایمان مولانا شہید کی تصنیف نہیں ہیں۔

مذہبی مباحث مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب دلچسپ ثابت ہو سکتی ہے۔

جوئبار

مصنفہ محمد حسین صاحب ظفر ادیب ناظم انجمن اربابِ ادب ملتان (چھاؤنی)

کاغذ۔ کتابت۔ طباعت نفیس و اعلیٰ۔ ملنے کا پتہ۔ قصر اردو ملتان (چھاؤنی) قیمت ایک روپیہ۔

جوئبار ظفر صاحب کی نظموں۔ گیتوں۔ اور غزلوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے سب سے اوّل انتساب ہے۔ اس کے بعد مصنف کی تصویر۔ تصویر کے بعد اعتراف۔ اعتراف کے بعد ہمارے ایک ماہرِ اقتصادیات دوست ن۔ م راشد

۲۲۳ ایم اے کا مقدمہ ہے۔ اور اس کے بعد احسان دانش صاحب کا تعارف نامہ۔

سب سے پہلے جو چیز ظفر صاحب کی شعریت پر دلالت کرتی ہے۔ وہ انتساب ہے جو انکی صحیح نسبت کا پتہ دیتا ہے۔ اور جسے انہوں نے اپنی شاعری کے موضوع کے نام معنون کیا ہے۔

اعتراف بھی ظفر کے مشتعل احساس پر دلالت کرتا ہے۔ اور نہایت پُرغم ہے۔ ہم ہر شخص سے لامحدود توقعات قائم کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی غور نہیں کرتے کہ وہ جو کچھ اور جتنا کر رہا ہے۔ وہ کس ماحول میں کر رہا ہے۔؟ ظفر کا اعتراف اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ نہایت نامساعد حالات میں انہوں نے اپنے ذوقِ شاعری کو جاری رکھا ہے۔ اور ہمیں ان کی شاعری میں ان اثرات کو دیکھنا چاہیئے۔ جو انکے ماحول کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔

آخر میں ظفر صاحب نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے جوئبار کی نظموں پر اصلاح دی ہے۔ لیکن خدا معلوم ان کو معنی آفریں الفاظ کیوں نہ ملسکے۔ ان سطور سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے حالانکہ مطلب کچھ اور نہیں ہے۔

ہمارے دورافتادہ اور فراموش کار دوست راشد صاحب گو ماہرِ اقتصادیات ہیں۔ لیکن حقیقی طور پر وہ اقتصادی ہی نہیں شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ اور جوئبار پر جو سطور بطورِ مقدمہ راشد صاحب نے سپردِ قلم فرمائی ہیں۔ وہ نہایت قیمتی ہیں۔ اور ان کے بلند و نازک ذوقِ تنقید پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ظفر کی نظموں کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"اس مجموعہ میں اوّل الذکر قسم کے خیالات کا ہلکا ہلکا اثر بھی ہے۔ اور قدیم غزل گوئی کسی قدر اپنا چولا بدلکر بھی اپنا حسن دکھا رہی ہے۔ بیشک ظفر کی شاعری میں مقصد کی وحدت نہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ آنے والی نسلوں کی نسبت اپنے

پیشروؤں سے زیادہ قریب ہیں۔ پھر بھی ایک قسم کا وجدان انکی ہر نظم کا محرک ہے۔ ان کی ہر نظم میں زندگی کے ساتھ وسیع عشق کا ثبوت ملتا ہے۔ جو خود کہیں منہ چھپائے آہنگ و ترنم کے تاروں کو لرزا رہا ہے۔"

میں راشد کے لفظ لفظ سے متفق ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلقی طور پر ظفر کا مزاج رومانی واقع ہوا ہے۔ ان کا تمام مجموعہ دیکھنے کے بعد میری رائے یہی ہے۔ کہ "وہ خیالات اور عقائد" کے شاعر نہیں۔ بلکہ عشق و محبت کے شاعر ہیں۔ اور رومانیت سے انکے مزاج شاعرانہ کا خاص تعلق معلوم ہوتا ہے۔ راشد نے بالکل بجا لکھا ہے۔ کہ:-

"فکر کا ارتقا ان کی شاعری کے لائحہ عمل میں نہیں ہے۔ وہ چند تصویریں پیدا کر کے ایک لرزتا ہوا تار۔ ایک مجموعی تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔"

اسکے علاوہ ایسا نہیں ہے۔ کہ انکی نظموں میں خلوص نہیں پایا جاتا۔ آگے چل کر راشد صاحب کہتے ہیں، کہ:-

"اس مجموعہ میں غزلیات کی بھی کمی نہیں۔" ظفر صاحب نے بھی اپنے پیشروؤں سے اپنی غزلوں کا مخصوص نظام ورثے میں پایا ہے لیکن انکی غزل میں محبتوں کی سی سختی نہیں۔ بے شک وہ اپنے محدود چوکھٹے سے باہر نکلکر ناچتی۔ دوڑتی نظر نہیں آتیں لیکن جانچتی اور زندگی پر مسکراتی اور لسبورتی ضرور ہیں۔

انکی غزلوں میں ان ذہنی بیماریوں کا پتہ نہیں۔ جو داغ سے پہلے کی نسل کے شاعروں کے جنسی انحرافات نے ہمارے ادب میں پھیلا رکھی تھیں۔ ان کا ذہن جوانوں کی طرح توانا ہے۔"

راشد نے ان کے مختصر سے مجموعہ پر کافی گہری نظر ڈالی ہے۔ خود میری رائے یہ ہے کہ ظفر کا تخیل بیحد غزل پسند ہے اور اسکی وجہ غالباً ان کی "فطری رومانیت" ہے۔ وہ اگر غزل کی شاعری کی طرف توجہ کریں۔ تو اس میں شاید نظموں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں

مری رندی کا مقصد بیخودی ہے — پلا دے یا یونہی مدہوش کر دے

چشم حجاب سوز ہے درکار اے ظفر — ہر ذرہ ہے جہانِ تماشا لئے ہوئے

زندگی ہو چکی تباہ ظفر — عاشقی اب گراں نہو جائے

دبا ہے دل میں غموں کا تلاطم — مگر اک نغمہ کو ڈھونڈتا ہوں

بدل رہی ہیں امیدیں تصورات کا رنگ — الٰہی حسن کو بھی عشق کے قرینے دے

ان اشعار میں کافی جان اور کافی کیف ہے۔ یہ روح اور یہ کیف انکی غزل کے مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ رومانی نظموں میں صفحہ ۶۱ پر "وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے" کا اسلوب نہایت مترنم اور دلنواز ہے۔ یہ نظم بہت خوب ہے۔

بہرحال ظفر صاحب اس درجہ کے شاعر نہیں ہیں کہ ہم ان سے مایوس ہو جائیں۔ ان کی شاعری کی موجودہ روش جو زمانے کے تقاضات سے متاثر ہے۔ ہمیں توقعات قائم کرنے کا حق دیتی ہے۔

راشد صاحب کے مقدمہ کے بعد احسان دانش صاحب کا تعارف نامہ ہے اس میں وہ صفحہ ۲۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ جناب ساغر سیمابی (۱۹!) نے جناب جوش ملیح آبادی اور جوش ملسیانی اور دیگر حضرات کی موجودگی میں بسلسلۂ گفتگو فرمایا تھا۔ کہ شاعر بطنِ مادر سے شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اور اُسے اُستاد کی ضرورت نہیں ہوتی"

مجھے ان کے پہلے فقرہ سے اتفاق ہے۔ اور دوسرے اختلاف ہے۔ کیوں کہ میں نے کئی حضرات کو ایسا پایا ہے کہ انھیں فطرت کی طرف سے ذوقِ شعری عطا ہونے کے باوجود شاعر بننا نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ اپنے محدود حلقے تک " ہم چو ما دیگرے نیست " کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ لیکن وہ حقیقی شعراء کی صف میں شامل ہونے کے اہل نہیں۔

جوئبار پر اظہار رائے کرنے کے سلسلے میں یہ بڑی دلچسپ بحث پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس ذکر کا محل کیا تھا۔ اور جناب احسان نے اس کو کیوں چھیڑا۔ ۹۱ - اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔

"بہیم سین ظفر میں فطری شاعری کے آثار کی فراوانی دیکھکر میں نے پوچھا کہ تم اصلاح کس سے لیتے ہو۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے۔ پھر دبی زبان سے فرمایا۔ کہ اول تو کسی سے اصلاح لی نہیں۔ اور اگر ایک دو حضرات سے مشورہ لیا بھی تو میرے ذوق کی تشنگی بجھ نہیں سکی۔ آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ از راہِ ادب نوازی میری رہنمائی فرمائیں"

آخر میں تعارف نامہ " اب دعا کے لئے اُٹھاؤ ہاتھ " پر اس طرح ختم ہوتا ہے کہ :-

"میری دُعا ہے کہ خدا اس نوجوان کی اس ادبی کاوش کو اہلِ نظر طبقے میں مقبول کرے۔

والسلام"

۲۵ یعنی اس تعارف نامہ سے صرف مقصود یہ تھا کہ ظفر صاحب احسان دانش صاحب کے شاگرد ہیں۔ بجائے اس کے کہ جس طرح راشد نے نہایت قابلیت کے ساتھ بحیثیتِ نقاد اس کی شاعری کی زریں اور کامیاب الفاظ میں تحلیل و تنقید کی تھی۔ احسان صاحب نے صرف کافی سمجھا کہ اپنی نسبت کا اظہار کر دیں۔

شاعری میں شاگردی اور اُستادی کے متعلق میں نے تو صرف ایک فقرہ ہی کہا تھا۔ لیکن اس جلسے کے ایک حاضر شاعر و ادیب جناب جوش ملیح آبادی نے دیوانگانِ شاعری کے حملوں سے متاثر ہو کر۔ کلیم میں کئی صفحے اس موضوع پر تحریر کئے ہیں۔ یہاں ان کو نقل کرنا یقیناً برمحل ہوگا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا ذاتی تجربہ کی بناء پر کہا تھا اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ شاگردی و اُستادی کا مسئلہ اعتقادی نہیں بلکہ " اقتصادی " ہے۔ (ماہرِ اقتصادیات داد دیں!) ہندوستان میں جو شاعر یہ ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں وہ اپنی ٹولی بنانے اور جلبِ منفعت کے اس ذریعے سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اس کا قائل ہے ورنہ شعر میں کوئی کسی کا اُستاد نہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے " کلیم " مطبوعہ جنوری ۱۹۳۹ء میں اس مسئلے پر تحریر فرمایا ہے کہ :-

(۱) میرا کوئی " حلقۂ تلامذہ " نہیں ہے۔ شاگرد بنانے کی طرح میں نے اب تک کسی کو بھی شاگرد نہیں بنایا ہے۔

شاگردی اور اُستادی اپنی مروج اور معروف حیثیت سے، میرے نزدیک، ایک قابلِ مضحکہ حد تک مہمل بات ہے۔ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا —— شاعری وہبی چیز ہے۔ اکتسابی نہیں —— اور جو شے ناممکن الاکتساب ہے، اس کے کسب کرنے کی خاطر کسی قسم کی سعی، یا کسی اُستاد کی خدمات حاصل کرنا ایک بے معنی سی بات ہے —— یہی وجہ ہے کہ ہمارے بھولے ہندوستان کے علاوہ یہ شاگردی اور اُستادی کی ناکارہ رسم، دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائی جاتی ہے۔

وہ شخص جسے عظیم قدرت نے شاعر بنا کر نہیں پیدا کیا ہے، اگر تمام عالم کے سرمایہ داروں کے خزانوں کا ایک ایک سکّہ اور تمام روئے زمین کے اُستادوں کے قوائے شاعری کی ایک ایک قوّت اس پر صرف کر دی جائے، پھر بھی قطعی طور پر امکان سے خارج ہے کہ وہ شخص شاعر بنا دیا جا سکے۔ جب صورتِ حال اِس حد تک یاس انگیز ہے، تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ لوگ کسی کی شاگردی کیوں قبول کرتے ہیں ـــ اور ہم سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ اُن "شعرائے کرام" پر جو اپنے ناتجربہ کار نوخیزوں کو اپنے "حلقۂ تلامذہ" کے فریب میں داخل کرکے، اپنے تمہاں "استاد" اور "حکمت گرد" ہونے کا ڈھول پیٹا کرتے ہیں۔

"استاد" بننا اور اپنی استادی کے ڈھول پیٹتے پھرنا کیسی عامیانہ بے شعوری ہے ـــ کیا بے شعور آدمی، شاعر ہو سکتا ہے؟ بہت ممکن ہے بعض قدامت نواز احباب جو شاگردی، اُستادی کی رسم سے بہت مانوس ہو چکے ہیں۔ اور جو، ہر قدیم شے کو کلیجے سے لگائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس رسمِ کہن کو بحال رکھنے کی خاطر یہ ارشاد فرمائیں کہ اس میں تو ہمیں بھی شک نہیں کہ استاد کسی غیر شاعر کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ لیکن اتنا تو ضرور کر سکتا ہے۔ کہ شاگرد کو فنّی اور لسانی نکات سے بہرہ ور کرکے اُس کے طرزِ بیان کو پختگی و شیرینی سے ہم آغوش کر دے۔

بیشک میں اسے تسلیم کرتا ہوں، اور اس بات کو مانتا ہوں، کہ اگر کسی شاگرد کو ایک ایسا معقول اُستاد مل جائے۔ جو زبان و فن پر کامل دستگاہ رکھتا ہو۔ تو وہ فنّی اور لسانی امور پر، دوسروں کی بہ نسبت، جلد جوہر حاصل کر سکتا ہے ـــ لیکن افسوس کہ متذکرۂ بالا امر کے تسلیم کر لینے کے بعد بھی میں کسی کو کسی کا شاگرد ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اِس لئے کہ اس فنّی و لسانی لیاقت حاصل کرنے میں شاگرد کو جو نقصان پہونچتا ہے، مرتے دم تک اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ وہ نقصان کیا ہے میں عرض کرتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ ہر شاعر، خصوصیت کے ساتھ، ایک انفرادی تخیّل، ایک انفرادی تفکّر، ایک انفرادی سیرت و شخصیت، ایک انفرادی طرزِ بیان و طرزِ فکر، اور ایک انفرادی مزاج لیکر اس دنیا کے مطلع پر طالع ہوتا ہے۔ اور یہی وہ بنیادی و اساسی اہم ترین شے ہے۔ کہ اگر اسے درمیان میں چھیڑا اور چھوا نہ جائے۔ تو یہی شے، یعنی شاعر کی یہی انفرادیت آہستہ آہستہ کمانی کی طرح کھلکر، اُسے شاعرانہ مجلس میں ایک امتیازی مقام اور ایک نمودار شخصیت کا مالک بنا دیتی ہے ـــ لیکن نہایت قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ شاگردی استادی کی رسم سے شاگرد کی اسی بنیادی خصوصیت کو شدید ترین اور ناقابلِ تلافی نقصان پہونچتا ہے۔ اور "استاد" "شاگرد" کی اس انفرادی روح کو ایک نامعلوم و ہیبتناک تسلسل کے ساتھ ہمیشہ چھیڑتا، چھوتا، کاٹتا، چھانٹتا اور توڑتا مروڑتا رہتا ہے۔

شاگرد کی انفرادی روح کو چھیڑنا، قتلِ عمد کے برابر جرم ہے۔ لیکن ہم اس مجرمانہ مشقِ پیہم کے باوجود استاد پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، کیوں کہ اس مجرمانہ مشقِ پیہم پر وہ قدرت کے قوانین کی بنا پر مجبور و مامور ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ شاگرد کی طرح اُستاد بھی قدرت کی طرف سے ایک خاص انفرادی تخیّل، ایک خاص انفرادی تفکّر، اور ایک خاص انفرادی طرزِ بیان وغیرہ لیکر پیدا ہوتا ہے، اور جب وہ شاگرد کو اصلاح دینے بیٹھتا ہے۔ تو یہ ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادی روح ہی کے تحت اصلاح دیتا ہے، کیوں کہ صرف وہی نہیں، بلکہ دنیا کا کوئی شخص بھی اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنی ذات کو اپنی انفرادیت سے علیحدہ کر سکے ـــ جس کے یہ معنی ہیں کہ اُستاد جس وقت شاگرد کے کلام پر اصلاح دیتا، اس کے مصرعے یا شعر کاٹ کر، اپنے مصرعے اور اپنے اشعار و الفاظ داخل کرتا ہے۔ تو وہ ایک ایسا بظاہر دل خوش کن اور بباطن خطرناک لمحہ ہوتا ہے، جس وقت استاد کی انفرادی روح، شاگرد کی انفرادی روح پر ابرِ غلیظ کی طرح مسلّط ہو کر اُسے دھندلا کرتی ہوتی ہے۔ اور انہیں لمحوں کی تکرار آخر کار وہ منحوس گھڑی لے آتی ہے۔ کہ استاد کی انفرادیت کی مسلسل و مستقل یورشوں سے پامال ہو کر،

ردکی انفرادیت قطعی طور پر مفقود و معدوم ہوکر رہ جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی انفرادیت کی دولت سے محروم ہوکر ایک طرف تو
گرد استاد ہی کے دماغ سے سوچتا، استاد ہی کے قلم سے لکھتا۔ اور استاد ہی کی زبان سے بولنے لگتا ہے —— اور دوسری طرف
تاد شاگرد کی انفرادیت کی لاش کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے۔ اور اس لاش کی نمائش کر کر کے مخلوق سے داد کا
ج حاصل کرتا رہتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی اچھا سودا ہے؟ میں دریافت کرتا ہوں۔ کیا یہ کوئی مفید کاروبار ہے۔ کیا واقعی چند فنی و لسانی
د کو حاصل کر کے اپنی عظیم الشان انفرادیت سے دستبردار ہو جانا کوئی عاقلانہ تجارت ہے۔

ممکن ہے اس موقع پر کوئی اُکتا کر یہ پوچھ بیٹھے کہ پھر کیا کیا جائے۔ اس "پھر کیا کیا جائے" کا جواب سُننے سے پیشتر پہلے ایک خاص
مسئلے کو سمجھ لیجئے۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری اس حیرتناک دنیا میں کوئی ایک شے بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کا صرف ایک ہی رُخ ہو۔ ں
بلکہ اس کے برخلاف اس دنیا کی ہر شے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اور ہر شے کے اندر بوقت واحد خیر و شر اور سُود و زیاں دونو
عناصر موجود ہوتے ہیں —— یعنی ہماری اس عجیب و غریب دنیا میں ایک شے بھی ایسی نہیں پائی جاتی۔ جو سراسر خیر یا سراسر شر پر
ہو۔ اور ایک چیز بھی ایسی موجود نہیں ہے، جو سراسر سُود یا سراسر زیاں کی حامل ہو۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہر چیز میں کچھ خیر کا عنصر
ہے، کچھ شر کا۔ کچھ سُود کے عناصر ہوتے ہیں۔ کچھ زیاں کے۔

یہ الفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ اشیائے عالم کے رحم میں کبھی اور کسی حالت میں بھی ایک نہیں، بلکہ دو بچے ہیں۔ جنہیں سے ایک کو
یا سُود کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو شر یا زیاں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۲۴۷ اور اسی کے دوش بدوش اس بات کو بھی ذہن کی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیجئے، کہ اشیائے عالم کی متذکرہ صورت حال کے
جو اس کارخانۂ عالم میں "زشت و خوب" اور "مفید و مضر" کے امتیازی الفاظ بھی موجود ہیں۔ اور اسی زشت و خوب اور مفید و مضر کی نسبت
بعض چیزوں کو بعض پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اور بعض چیزوں کو اچھا اور بعض چیزوں کو بُرا کہا جاتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اشیائے عالم میں سے ایک شے بھی خالصتہً مفید اور خالصتہً مضر نہیں ہے۔ اور اسی
ساتھ ساتھ ہم ان حامل اضداد اشیا میں سے بعض کے اختیار و انتخاب پر اپنے کو مجبور بھی پاتے ہیں۔ تو اس وقت ہمارے واسطے اس کے
اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔ کہ ہم تمام اشیا پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالیں اور ہر شے کو انتہائی دیدہ دری کے ساتھ ادراک کانٹے پر
ل کر یہ پتا چلائیں۔ کہ کس چیز میں خیر کا عنصر زیادہ ہے۔ اور کس میں شر کا —— اور اس تحلیل و تحقیقات کے سلسلے میں جن اشیا،
متعلق ہمیں یہ علم ہو جائے۔ کہ ان میں خیر یا سُود کا عنصر نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ اُنہیں کو آخر کار اختیار کر لیں۔

اگر یہ سلسلۂ عمل صحیح ہے۔ تو اسی کی روشنی میں استادی اور شاگردی کی رسم پر نگاہ ڈالیئے، اور خود ہی فیصلہ کیجئے، کہ اس میں
نفع زیادہ ہے کہ نقصان؟

فائدہ تو اس رسم میں، جیسا کہ ہر بُری سے بُری شے میں بھی ہوا کرتا ہے۔ صرف اس قدر ہے کہ استاد کی امداد سے بشرطیکہ استاد
قول و متبحر بھی ہو، شاگرد، دوسروں کے مقابلے میں فنی و لسانی نکات پر جلد حاوی ہو جاتا ہے۔

اور نقصان اس رسم میں یہ ہے کہ شاگرد اپنی انفرادی شخصیت و حیثیت، اپنے انفرادی تفکر و تخیل، اپنے انفرادی رنگ، اور اپنے
انفرادی طرز کلام سے کلیتہً محروم ہو کر استاد کی ایک ایسی تربیت یافتہ سواری بن جاتا ہے۔ جس کو ذہنی و جسمانی دونوں حیثیتوں سے استاد جدھر چاہ

پڑھنا پڑتا ہے۔

میں دوبارہ پوچھتا ہوں۔ کیا یہ کوئی مفید تجارت ہے۔ کیا یہ کوئی عاقلانہ کاروبار ہے؟

جو شخص کندن دیکر پیتل اور موتی دیکر مونگا خریدتا ہے۔ کیا کوئی ذی عقل انسان اُسے ایک ہوشیار تاجر کا خطاب دے سکتا ہے اور کیا غریب شاگرد، اسی قسم کا تاجر نہیں ہوتا۔

اب رہی یہ بات کہ اگر کسی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ نہ کیا جائے، تو پھر زبان اور فن کی باریکیاں کیونکر معلوم کی جائیں۔

اس کا ایک، کسی حد تک بافیانہ، جواب تو یہ ہے کہ شاعر پہلے پیدا ہوا ہے۔ اور زبان و فن بعد کو —— اگر کوئی شخص حقیقی شاعر ہے تو اُسے نہ تو فن کی پروا کرنا چاہیئے، نہ زبان کی۔ جب وہ مرجائے گا۔ تو وہی غلطیاں جو اُس نے کی ہیں۔ ایک دن خود فن اور زبان کا خطاب حاصل کرلیں گی۔

اور دوسرا کسی حد تک مصالحانہ جواب یہ ہے۔ کہ ہر نوعمر کو، جسے شعر کہنے کا شوق ہے، ایسے حلقوں میں نشست و برخاست کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ جہاں اربابِ زبان و فن کا اجتماع اور جہاں فنّی و لسانی مباحث پر اظہار خیال ہوتا رہتا ہو —— اور اس کے ساتھ ساتھ علی الاتصال ایسے لٹریچر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جن سے فنّی و لسانی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح ایک طرف تو فنی و لسانی بصیرت بے منتِ غیرے پیدا ہو جائے گی۔ اور دوسری طرف اس عظیم الشان انفرادیت کا بھی خون نہیں ہوسکیگا۔ جو شاعر کی تنہا بنیاد، بلکہ اُس کی جان ہے۔ ("اشارات" مطبوعہ کلیم جنوری ۱۹۳۹ء)

از حضرت جوشؔ ملیح آبادی

شاعری میں استادی و شاگردی کی تکذیب اور تردید کے لئے یہ سطور میرے خیال میں کافی ہیں۔ لیکن اس پر بھی اگر استاد کی ضرورت احسانؔ صاحب کو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ تو مجھے اصرار نہیں۔ البتہ نوجوان نسل اور جدید شاعری کا نیا تقاضہ و نظریہ تو یہی ہے جسے اوپر نقل کیا گیا۔

لیکن بہرحال ظفرؔ صاحب کی نظم و غزل میں کافی جان ہے۔ اگر انہوں نے خود انتقادی و خود اعتمادی کو مشعل راہ بنایا، اور اپنے ذوق و دل کو خود ہی تیار کیا، اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کو خود ہی وسیع کیا تو مجھے یقین ہے کہ منزلِ مقصود ان سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

اربعہ عناصر

بسلسلۂ تصانیف ماہر نمبر ۲۳ مصنفہ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی سائز $\frac{18\times22}{32}$ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ فراش خانہ دہلی۔ مجلد۔

یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے۔ جو ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس میں ۴۸ مختلف مضامین اور عنوانات پر ہیں۔ حمد، نعت، مناجات، خوفِ الٰہی، حقائق و معارف، عبرت و موعظت، درس و پیام، پند و نصائح، دنیا، زندگی، خدمتِ خلق، جذبات، رندی و سرمستی، وطنیت، طلبا کے نام، طب و حکمت، سرمایہ و مزدور، کسان و مزدور۔

آخر میں متفرقات کے عنوان سے بھی کچھ رباعیاں ہیں۔ اس کے بعد مصنف کی تصویر ہے۔ تصویر کے نیچے جو رباعی ہے۔ اس قسم کی غیر جذباتی نقلی کی رباعی نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ "۸۶" کے بعد ایک رباعی ہے۔ جس میں بیک وقت حمد اور منقبت دونوں ہیں۔ اور ایک قسم کے سجع کے ساتھ ہیں۔ مگر جذبہ نہیں ہے۔ رباعی فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے ایک خاص صنف کلام ہے۔ اور جب اسکے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ سماعت کو گراں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد چار دیباچے ہیں۔ سب سے اول مولٰنا سیمابؔ اکبرآبادی کا دیباچہ ہے۔ اس

لیم آزاد انصاری کا دیباچہ پھر حضرت جوش کا دیباچہ اور سب سے آخر میں قابل صاحب گلاوٹھی کا دیباچہ ہے۔
سیماب صاحب نے رباعی کے موضوع پر اختصار کے ساتھ فنی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن غالباً وہ یہ بھول گئے کہ افغانی اور خواجہ
ند کے مقابلے میں ابن یمین رُباعی میں زیادہ مشہور ہے۔ ماہر صاحب کی رباعیات کے متعلق انکی رائے ہے کہ:۔

"ماہر صاحب کی رُباعیات میں وہی برجستگی پائی جاتی ہے۔ جو صنفِ رُباعی کے لئے ضروری ہے"

حکیم آزاد انصاری صاحب کا دیباچہ خالص مدح گوئی ہے۔ البتہ یہ مدح ماہر صاحب کے کل شعر و ادب سے ضرور تعلق رکھتی ہے رُباعی اور اس کے متعلقات پر کم روشنی ڈالتی ہے۔ جوش صاحب نے بطور "تبرک" چند سطور تحریر فرمائی ہیں۔ جنکا لب لُباب یہ ہے کہ:

"حکیم صاحب کی رُباعیوں کا یہ مختصر سا مجموعہ میں نے جستہ جستہ پڑھا۔ اور یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے جس رُباعی پر نظر ڈالی اسے مطبوع و دلپذیر پایا۔"

ان آراء کے نقل کر دینے کے بعد کوئی گنجائش رہ نہیں جاتی ہے۔ جس قدر یہ حضرات ماہر صاحب کے کلام کے فریفتہ ہیں میں ں ہوں۔ اربعۂ عناصر میں جو رُباعیات ہیں وہ اپنے موضوع اور عنوان کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔ زندگی اور معاملاتِ زندگی کے متعلق ہر صاحب کا نقطۂ نگاہ بالکل قدیم اور روحانی ہے۔ اسی کے لحاظ سے ان کے خیالات انہیں اخلاقیات کی صدائے بازگشت ہیں جنہیں ادنی تمدن و تہذیب کی یادگار کہا جاسکتا ہے۔

ان اخلاقی رُباعیات کے ساتھ ساتھ "رندی و سرمستی" کے باب میں ماہر صاحب نے جن "حقایق" کو نظم کیا ہے۔ وہ ان "اخلاقیات" سے بالکل مختلف شے ہیں۔ جو دوسرے ابواب میں پائے جاتے ہیں۔ گویا اس طرح ایک "تضاد" پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک ہیں کہ "اربعۂ عناصر" میں سب بابوں سے زیادہ گرم یہی باب ہے۔ اس کے بعد "سرمایہ داری و مزدور" کے موضوع پر رباعیاں ہیں جنہیں
۲۳۹ ربار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مختلف ابواب سے چند رُباعیاں ملاحظہ کیجئے۔

حقایق و معارف

مایوس نہو شکستہ کاشانوں سے
مغموم نہو کھلے بیابانوں سے
ایسے بھی کچھ انقلاب آجاتے ہیں
ویرانے بدلجاتے ہیں ایوانوں سے

میں کیا اثرِ نیم نگاہی لے لوں
یا لذتِ کیفِ بیگناہی لے لوں
فرصت مجھے اس کسل کدے میں ماہر
اتنی بھی نہیں کہ اک جماہی لے لوں

جذبات

خضر اپنی مجھے حیات بھی دے تو نہ لوں
فطرت سندِ نجات بھی دے تو نہ لوں
اک دردِ محبت کے عوض میں ماہر
کوئی مجھے کائنات بھی دے تو نہ لوں

رندی و سرمستی

صوفی نے تمام خانقاہیں لے لیں — منعم نے تمام بارگاہیں لے لیں
دنیا میں ہمارے لئے جب کچھ نہ بچا — ہم نے بھی گناہوں کی پناہیں لے لیں

"وطنیت" کے عنوان سے جو رُباعیاں ہیں۔ ان کا عنوان محض "وطن" ہونا چاہیئے تھا۔ یا "حبِ وطن" اس لئے کہ وہ تمام صنف کے وطن محض آگرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ نفس وطنیت سے نہیں۔

سرمایہ داری کے باب میں "خان صاحب" قطعی اشتراکی معلوم ہوتے ہیں۔

باقی رہے اُمید نہ لاحق ہے بیم — سائل کوئی کہلائے جہاں میں کریم
تخصیص کو تعمیم کی صورت بخشو — کر دو زر و سیم سب مساوی تقسیم

قدرِ اہلِ زباں برابر کردو — حالِ شاہ و گداں برابر کردو
پستی نظر آئے نہ کسی جا رفعت — اُٹھو سطحِ جہاں برابر کردو

ہو عقدہ کوئی، عقدہ کشا ہے مزدور — ہو کام کوئی کام روا ہے مزدور
اس ایک خدا کا نام جپنے والو — اس دہر کا دوسرا خدا ہے مزدور

ان رُباعیوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانہ کے تقاضات کس قدر وسیع ہو گئے ہیں۔ اور کوئی ذی حس شخص ان سے انکار کرنے کی جرأت کر نہیں سکتا۔ خواہ وہ دارالسلطنت کا خان صاحب ہی کیوں نہ ہو۔ ان دونوں ابواب میں تقریباً تمام رباعیاں خوب ہیں۔ اور ان اخلاقیات کی کافی تلافی کر دیتی ہیں۔ جو صدیوں کے فرسودہ ہیں۔ اور جن پر اب کم از کم نظرِ ثانی کی تو ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔

لیکن بہر حال رُباعیات کا یہ مجموعہ ہر لحاظ سے پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ اور میں اپنے دوست کو اس کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ساغر

مولویت اور اسلام

از حاجی نبی احمد بریلوی - قیمت ۴ر

یہ ایک رسالہ ہے جس میں مصنف نے مولویت کے خطرات عظیم سے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے۔ طرز تحریر نہایت خوشگوار اور مدلل ہے۔ یوں تو آج کل ہر ذی ہوش اور تعلیم یافتہ شخص مولویوں کے فتووں سے آگاہ ہو چکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض طبقوں میں ابھی تک مولویت کی تجارت کا بازار گرم ہے۔ اس فریب کو دور کرنا قومی خدمت ہے اور حاجی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ کاش اس رسالہ کی ایک کاپی ہر مولوی کی نظر سے گذرتی تاکہ وہ اس طبقہ کو جس کو مولانا نیاز فتحپوری نے سانپ سے مشابہت دی تھی واضح ہو جائے کہ ان کے زہر کا اثر اب نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ عقل اور خوش مذاقی کا تریاق اس زہر کیلئے کافی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مولویت منافی ہیں۔ اسلام نے توہمات . . . . کے خلاف علم بلند کیا۔ لیکن جس وقت سے کہ مادیت کا اسلام میں اثر شروع ہوا اسلام پر ترقی کے دروازے بند ہو گئے۔ موجودہ دور میں ترکی نے اس وقت تک ترقی نہیں کی جبتک مولویت کو داستانِ پارینہ نہیں بنا لیا گیا۔

کیا ہندوستان کے مسلمان سبق سیکھیں گے۔

ہم حاجی نبی احمد صاحب سے درخواست کرینگے کہ وہ بجائے "گائے کانفرنس" کی قسم کے رسالہ میں تضیع اوقات کرکے مولویت اور اسلام کی قسم کے رسائل و کتب لکھیں تاکہ ان کی تصانیف سے قومی و معاشرتی فائدے کی صورت نمودار ہو۔

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل

از میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا مدیر ہمایوں لاہور۔
کتابت و طباعت نہایت نفیس۔ حجم ۶۷ صفحات۔ قیمت ۴ر

یہ ایک مقالہ ہے جو میاں بشیر احمد صاحب نے لکھا ہے۔ مقالہ کی ماہیت نام سے ظاہر ہے اور اس کا منتہا جاننے کیلئے غالباً یہ کافی ہے کہ موصوف مسلم لیگ کے حامی اور علمبردار ہیں۔ ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ وہ مسلمان جو کام کرنے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہیں مسلم لیگ میں شریک ہو کر اپنے کو کسی کام کا باقی نہیں رکھتے۔

مقالہ میں مسلمانوں کی ۱۳ صد سالہ تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ریگستانِ عرب سے نکل کر اسلام نے ایک عالمگیر انقلاب کی بنا ڈالی اور دنیا کا ہر ذی ہوش شخص جس نے تاریخ کا ذرا سا بھی مطالعہ کیا ہے ایم این رائے کے الفاظ میں یہ ماننے کے لئے مجبور ہے کہ "اسلام کے انقلاب نے نوع انسان کو بچا لیا"۔ جناب بشیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی سے اس امر کو واضح کیا ہے کہ دنیا کے تہذیبی ارتقا میں اسلام کا حصہ نہایت مہتم بالشان اور دور رس رہا ہے۔

مقالہ کا وہ حصہ جو اسلامی تاریخ سے متعلق ہے نہایت غور و خوض، وسعتِ نظر اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ زیر نظر مقالہ کا یہ حصہ جو تقریباً نصف کتاب پر مشتمل ہے ہر شخص کے لئے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا

لیکن حیرت ہے کہ مصنف موصوف جیسے ہی ہندوستان کے "سیاسی مدّو جزر" کا قصہ بیان کرنے لگتے ہیں تو داخلی اثرات کے تحت عصبیت اور تنگ نظری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے ان کی نصیحتیں اور ان کی رائیں بے روح و بیکار نظر آتی ہیں۔ دیکھئے کہ مسلم لیگ کا ایک اعلیٰ سیاسی دماغ کتنی معرکۃ الآرا نصیحت دیتا ہے: "جمہوریت، اشتراکیت، قومیت، ہندوستانیت ان کی بحثیں اور پروپگنڈا تو جاری ہے اور برابر جاری رہیگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ بغیر اپنا وقت یا توانائی ضائع کئے چند اہل دماغ کو

تو اس شغل میں لگے رہنے دیں لیکن خود اپنے نصب العین کی طرف رُخ کئے وہ راہِ عمل اختیار کریں جس سے ان کی موجودہ ضروریات پوری ہوں۔" یہ تو ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ موصوف اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ کسی قوم کا نصب العین نتیجہ ہوتا ہے داخلی اور خارجی اثرات کا، اسکی سیاسی ضروریات کا، اقتصادی و معاشی پابندیوں کا، معاشرتی رجحانات کا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ قوم کا سیاسی شعور اتنا تیز کر دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کا احساس خود کر سکے نہ کہ صرف چند "اہل دماغ" اس "شغل" میں لگے رہیں اور "قوم" "مسلم لیگ کی خواب آور کہانی کو سُن کر اپنے نصب العین کا تجزیہ کرے۔

پھر اُس کی شکایت فعل عبث ہے کہ "بحیثیت قوم ہمارے سامنے ایک عرصے سے کوئی مخصوص نصب العین نہیں رہا۔" رہے کیسے؟ مسلم لیگ کا نصب العین عملی اور نظری دونوں حیثیت سے محض کانگریس کی مخالفت ہے۔ کانگریس اور لیگ کی سیاسی اہمیت میں بُنیادی فرق ہے۔ کانگریس کے افراد جب اپنے بلند سیاسی مقصد سے وقتی طور پر اور انفرادی حیثیت سے گر جاتے ہیں یا راستہ بھول جاتے ہیں تو بھی کانگریس موردِ الزام نہیں قرار دی جا سکتی۔ اگر جماعتی حیثیت سے بھی کانگریس کبھی غلطی کرے تو زیادہ تشویش کی بات نہیں کیونکہ لازمی ہے کہ کانگریس کو یا اسکے افراد کو جلد یا بدیر اپنی غلطی کا احساس ہوگا کہ کانگریس کے نصب العین سے بھٹکنا قوم کے مفاد کے منافی ہے۔ یا ایک لفظ میں یوں کہئے کہ کانگریس کی بُنیادی حیثیت مثبت ہے اور لیگ کی منفی۔ اس لئے لیگ اگر کبھی صحیح راستہ پر ہوتی ہے یا لیگ کے ارکان کسی معاملے میں قومی مفاد کے موافق ہوں تو وہ اتفاقیہ امر ہے۔ کسی قوم کی سیاست میں مذہبی جماعت کا وجود ہمیشہ رخنہ اندازی کا کام کرے گا خواہ نیت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو۔ ایسی جماعت ہمیشہ بدترین صورت میں ایک منفی حیثیت رکھتی ہے اور بہترین حالت میں (Nationalism.) اس کا ثبوت اسمبلی میں مسلم لیگ کی پالیسی ہے جہاں اس کا موجودہ طرزِ عمل اسکی بیکاری اور فضول وجود کا مظہر ہے۔

سیاست میں دلچسپی لینے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ لیگ کی ______ حکمت عملی کا لازمی نتیجہ پاکستان کی تحریک کا فروغ ہوگا اور اس بات کا ادعا کہ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں بلکہ یہاں کے مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت موقعہ نہیں کہ لفظ قوم کی تشریح کی جائے لیکن چند الفاظ اس موضوع پر کہنا ضروری ہیں کیونکہ لیگ کے مبلغین چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب و ثقافت و تمدن خطرے میں ہے اس سلسلے میں لیگ کے ارکان کا یہ شیوہ ہو گیا ہے کہ جواہرلال کو مطعون کیا جائے کیونکہ وہ مسلم تہذیب کے وجود کے منکر ہیں۔ لیکن کیا اچھا ہوتا کہ یہی کام اور صفائی سے کیا جاتا اور دانستہ غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا۔ بشیر احمد صاحب نے بھی اس عام روایت کو نشر کیا ہے جس کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ جواہرلال نے کہا ہے کہ مسلم تہذیب محض نام ہے ایک خاص قسم کی ڈاڑھی کا، ایک خاص قسم کے پائجامہ کا اور ٹونٹی دار لوٹے کا۔ کسی بیان کو اسکے (Context) سے جدا کرنا غلط بیانی کا عام طریقہ ہے۔ جواہرلال نے جہاں یہ کہا وہاں یہ بھی کہا کہ اس طرح ہندو تہذیب نام ہے محض چوٹی کا اور گول لُٹیا کا۔ ایسے تو جواہرلال ایسی عظیم الشان شخصیت کیلئے تہذیب کا یہ سطحی تصور رکھنا خواہ وہ "ہندو تہذیب" کے متعلق ہو یا "مسلم تہذیب" کے حیرت انگیز ہے۔ لیکن اس خیال کا اظہار جس ذیل میں کیا ہے بالکل درست اور روا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر اتنا بخوبی یاد ہے کہ جس سلسلہ میں انہوں نے ایسا کہا وہ یہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ ایک چیز ہندو تہذیب ہے اور ایک شئے مسلم تہذیب لیکن جب وہ گاؤں میں جاتے ہیں تو جو چیزیں ہندو اور مسلم کسانوں میں مابہ الامتیاز ہیں وہ ایک جانب ڈاڑھی پائجامہ اور ٹونٹی دار لوٹا اور دوسری جانب چوٹی اور لُٹیا ہیں۔" ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ شخص اس بیان کو قابلِ اعتراض نہیں کہہ سکتا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں موجودہ دور میں ہندو اور مسلم دو ایسی تہذیبیں ہیں جو ایک دوسرے کے منافی ہوتے ہوئے

دست و گریباں ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جہاں تک بالائی طبقوں کا تعلق ہے علم کی روشنی میں اور مغربی اثرات کے توسط سے ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے تمدنی و تہذیبی حیثیت سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ سوال "ایک دوسرے پر زبردستی اثر ڈالنے، ایک دوسرے کو خاموشی سے اپنے میں جذب کرنے" کا نہیں ہے۔ آج کئی صدیوں کے تاثرات سے ایک "ہندو مسلم" تہذیب وجود میں آ رہی ہے جس کا ڈھانچہ مغلوں کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس امتزاج و تخریب میں بہت سی قوتیں عمل پیرا ہیں۔ ایک تو وہ ہندو جذبہ ہے جو اپنے نشاۃ الثانیہ کے زعم میں ہندوستان کو کئی ہزار سال پیچھے گھسیٹ لینا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ خالص اسلامی جذبہ ہے جو دُنیا میں کہیں بھی اسلامی حکومت نہ دیکھ کر (واضح ہو کہ ترکی وغیرہ سیاسی حیثیت سے مذہبی حکومتیں نہیں ہیں) ہندوستان میں ۸ کروڑ افراد کے زعم میں اسلامی حکومت کا خواہشمند ہے لیکن یہ دونوں جذبے ناکام ثابت ہونگے۔ کیونکہ وقت کی ضرورت، وقت کا مطالبہ ان کے خلاف ہے۔ لیکن اس ہندو مسلم تہذیب کو خطرہ ہے مغربی تہذیب سے۔ اور یہ ٹکر عام ٹکر ہے جو ایشیا کے ہر ملک میں ہو چکی ہے، ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے اور جس کا فیصلہ چند قومیں مثلاً ترکی و ایران وغیرہ اپنے اپنے طرز پر کر چکی ہیں۔ یہ ہے صحیح تجزیہ ہمارے تہذیبی "امکانات" کا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہندو مسلم تہذیب کی تشکیل ابھی تک مکمل نہیں ہوئی ہے ورنہ مسلم لیگ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی۔ میرٹھ میں سکریٹری مسلم لیگ کی تقریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج سے کھلم کھلا مسلم لیگ کا نصب العین وہ ہو گیا ہے جس کا اندازہ آج تک محض مسلم لیگ کی حرکات مذبوحی سے ہوتا تھا۔ یعنی "ہندوستانی قومیت سے انکار"۔

مقالہ کے دوسرے حصہ میں یہی راگ الاپا گیا ہے کہ مسلمان الگ ایک قوم ہیں۔ پھر اس نکتۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے ان مذہبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو مصنف کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو من حیث القوم درپیش ہیں

۴۳ ہمیں اکثر تعجب ہوتا ہے کہ اس ادّعا کا کیا مطلب ہے کہ ہم ایسی حکومت کی بُنیاد ڈالیں جس کے مسائل خالص اسلامی نکتۂ نظر سے حل کئے جائیں۔ اسلام کی تاریخ خود اس بات کی تردید کر رہی ہے۔ جغرافیائی اور قومی حیثیت سے انکار کرنا دلچسپ مشغلہ تو ہو سکتا ہے لیکن غلط ہونے کی وجہ سے فضول ضرور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی فضا اس وقت بہت تاریک ہے لیکن اس کا یہ حل نہیں جو مصنف نے پیش کیا ہے یعنی ایک الگ جماعت، ایک الگ حکومت قائم کرنا۔ یہ راستہ تباہی اور بربادی کا ہے کیونکہ ناقابلِ عمل ہے۔

مسلم لیگ کے دفاع میں فاضل مصنف فرماتے ہیں۔ بجائے باہر سے نکتہ چینی کرنے کے ایسی جماعتوں کے اندر داخل ہو کر ان کی حتی المقدور اصلاح کرنی چاہیئے۔ اس نازک وقت میں غیروں کے پروپگنڈا یا اپنی تنگ خیالی یا مفروضہ بلند نظری سے متاثر ہو کر اپنے ہی قومی اداروں سے علیحدہ رہنا قومی غداری سے کم نہیں۔" ہم اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتے کہ کانگریس کے متعلق یہی رائے مصنف اور ان کے سیاسی ہمنواؤں کو دیں۔ آج اگر مسلمان کانگریس میں جوق درجوق شریک ہوتے تو کانگریس مہاسبھائی اثرات سے قطعاً خالی ہوتی۔ مسلمانوں کی فلاح ہندوستان کی فلاح میں مضمر ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہر شخص خواہ مخالف یا موافق رائے کا ہو اس مقالہ کو پڑھ کر محظوظ ہوگا۔ مصنف کا طرزِ بیان نہایت ہی خوشگوار اور سنجیدہ بحث کیلئے نہایت ہی موزوں ہے۔ کاش یہ زورِ بیان کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا!

بیمار

از سجاد ظہیر۔ مطبوعہ جامعہ پریس دہلی۔
کتابت و طباعت نفیس۔ قیمت درج نہیں۔

ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ عزیز اور سلیمہ میاں بیوی ہیں۔ عزیز کا ایک دوست بشیر بیمار ہو جاتا ہے اور عزیز اس کو اپنے گھر مہمان کی حیثیت سے بلا لیتا ہے۔ سلیمہ بشیر کی مہمان نوازی اور تیمار داری میں اتنی منہمک ہو جاتی ہے کہ گھر کا سارا انتظام ابتر ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی میں رنجش پیدا ہوتی ہے۔ عزیز بشیر کو تنبیہ کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ ہسپتال میں چلا جائے۔ دونوں میں بحث ہوتی ہے اور غالباً جذبات کی شدت کی وجہ سے بشیر مر جاتا ہے۔ ڈرامہ کا مقصد خانگی زندگی پر سرسری نظر ڈالنا ہے اور عزیز اور بشیر کی گفتگو کے دوران میں سماج کی ہیئت پر بحث کرنا ہے۔

مصنف اپنے مقصد میں کافی کامیاب ہوئے ہیں لیکن چند باتیں بحث طلب ہیں۔ عزیز کہتا ہے "ہر شخص کو سب سے پہلے اپنا پیٹ پالنے کی فکر کرنا چاہئے۔ تو تم نے پھر اس اصول پر عمل کیوں نہیں کیا؟"

محض لفظ اصول کے ذکر سے بشیر برافروختہ ہو جاتا ہے اور "اصول" کے خلاف ایک لیکچر دے ڈالتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہماری موجودہ سماج کے اصول انسانیت کے خلاف جرم ہیں۔ لیکن بہر حال دُنیا کا ہر نظام اصول پر مبنی ہے۔ اشتراکیت کے اصول البتہ جداگانہ ہیں۔ لیکن بے اصولی اشتراکیت کی بُنیاد نہیں ہو سکتی۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ قابل مصنف کو اس بات کا احساس نہیں تھا لیکن اشتراکی ادیبوں کو اس بات کی کافی کوشش کرنی چاہئے کہ اس عام خیال کو جس کے مطابق اشتراکیت اور بے اصولی مترادف ہیں جھٹلایا جائے۔

اسی طرح افسانہ کا منتہا بیمار کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنا ہے تاکہ اسکے عقائد سے ناظرین ہمنوا ہو جائیں۔ لیکن سلیمہ اور عزیز کی بحث میں عزیز کی زمین زیادہ مضبوط ہے۔ جو مقصد کو فوت کرتی ہے۔

ڈرامہ دلچسپ ہے۔ زبان سلیس اور خوشگوار استعمال کی گئی ہے۔ ناظرین اسکے مطالعہ سے ضرور لطف اندوز ہونگے۔ سجاد ظہیر صاحب ترقی پسند ادب کے علمبردار ہیں اور انگارے کے اولین مصنفین میں سے ہیں۔ ان کی تحریر میں جدت اور ترقی پسندی نمایاں ہوتی ہے۔

شاہ حبشہ ۔ ایک المیہ

از اختر اریوی۔
مطبوعہ مکتبۂ اُردو۔ لاہور۔

اُردو ادب میں ڈرامہ کا عنصر بہت کم ہے۔ اُردو ادب کے معمار فارسی کے نام لیوا تھے۔ ایران میں ڈرامہ کا وجود نہ تھا ہماری بدقسمتی سے سنسکرت سے اُردو ادب زیادہ بہرہ اندوز نہ ہوا ورنہ ممکن تھا کہ ابتک ہمارے ادب میں ڈرامہ کا حصہ نہایت لطیف اور نہایت بلند ہو جاتا۔ بہر حال یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب انگریزی ادب کی تقلید میں ڈرامہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے ڈرامہ کے فن کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کو احساس ہوگا کہ تاریخی ڈرامہ لکھنا جتنا مقبول ہے اتنا ہی مشکل بھی۔ مقبولیت کی غالباً وجہ یہ ہے کہ بنا بنایا پلاٹ موجود ہوتا ہے اور تخیل کو حرکت دینے کی ضرورت کم ہوتی ہے۔ اگرچہ اصل واقعہ یہ ہے کہ تاریخی فسانہ یا ڈرامہ لکھنے میں تخیل کو نہایت ہی وسیع، وقیع اور بلند ہونا پڑتا ہے کیونکہ ڈرامہ نگار پر یہ فرض ہوتا ہے کہ قصہ کی دلچسپی کے خیال میں تاریخ کی اصلیت سے دور نہ جا پڑے۔

زیر نظر ڈرامہ متعلق ہے اس حادثہ سے جس نے ۱۹۳۵ء میں دُنیا کے امن کو ختم کر دیا۔ مسولینی کا حبش پر حملہ بہت ہی اہم واقعہ ہے

مجلس اقوام کی بے بسی، سیاستِ عالم کی ابتری کا صحیح اندازہ اسی واقعہ سے ہوا۔ شاہ حبشہ اور ان کے نمائندوں کے احتجاج نے اس تلخ حقیقت کو آشکارا کر دیا۔ کہ دُنیا میں جس کی لاٹھی اسکی بھینس کے اصول پر پھر عمل شروع ہو گیا۔ اگرچہ ہم لوگ اپنے زعم میں یہ سمجھنے لگے تھے۔ کہ بیسویں صدی انسانیت اور بین الاقوامیت کے سُنہرے خواب کو سچا ثابت کرے گی۔ مجلس اقوام کے آخری اجلاس میں جب شہنشاہِ حبش سوال کرتا ہے۔ "کیا دنیا پر شیطان کی حکومت کا اعلان عام ہو گیا؟ کیا مجلسِ اقوام بھی فرزندانِ تاریکی کے حسب بعض ظالم چنگل میں ایک دم توڑتا، سسکتا ہوا آخری چراغ ہے؟" تو مجلسِ اقوام بلکہ موجودہ مہذب دُنیا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اس تقریر کے جواب میں محض مرحبا مرحبا کہنا اور چیرز دینا ثبوت ہے۔ اس بات کا کہ دنیا کو اپنی کمزوری کا احساس ضرور ہے۔ مگر اسکے دفعیہ کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

ڈرامہ کافی غیر جانبداری سے لکھا گیا ہے۔ اور تمام افراد و تمثیل کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے طالب علموں کیلئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ زبان صاف اور سلیس ہے اطالوی مدبرین کے ناموں کے ہجے میں کئی جگہ ترمیم کی گنجائش ہے۔ مثلاً کونٹ چیانی کو سیانی لکھا گیا ہے۔ شہزادی فلورا (شاہ حبش کی مُنہ بولی بیٹی) اور شاہ سماوج محمدؐ (ایک فوجی افسر) کے ذکر سے حسن و عشق کا عنصر پیدا کیا گیا ہے جس سے ڈرامہ میں چاشنی آگئی ہے۔ شاہ سماوج کی موت کے منظر میں جذبات نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ڈرامہ کامیاب ہے اور نوجوان مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

درسِ قرآن

یہ ضمیمہ ہے۔ سیرت کمپنی لاہور کے رسالہ ایمان کا جو رسالہ کی صورت میں ہر ماہ شائع ہوا کرے گا۔ سیرت کمپنی اپنے جدوجہد اور عمل کے لئے مشہور ہو چکی ہے۔ ہماری علاقوں میں علم و مذہب کی روشنی پہنچانا۔ اس کا نصب العین ہے۔ یہ ضمیمہ درسِ قرآن بھی تبلیغی مقصد رکھتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس چھوٹے سے رسالہ میں قرآن کی روشنی میں تیس سبق دیئے گئے ہیں جو جاہل طبقوں کی اخلاقی سطح کو ابھارنے میں کافی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

گائے کانفرنس کا خطبۂ صدارت

از حاجی نبی احمد بریلوی

قیمت ۳ر کتابت و طباعت ادنیٰ۔ حجم ۳۰ صفحات

زیرِ نظر رسالہ میں مصنف نے گوشت خوری، جیو ہتیا، گاؤ پرستی اور دیگر متعلق مسائل پر دلائل و واقعات سے بحث کی ہے لیکن ان موضوعات کے ذکر کے لئے انھوں نے ایک اپج پیدا کی ہے۔ جو مستحسن نہیں قرار دی جا سکتی۔ ایک گائے کے مُنہ سے خطبۂ صدارت دیا گیا ہے۔ جسمیں گائے موصوف گوشت خوری کی تلقین کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے کافی محنت سے اشلوک اور شاستروں سے گوشت خوری کی حمایت میں ثبوت پیش کئے ہیں۔ گایوں کے مُنہ سے قربانی کی تعریف کرانا بحث کو زیادہ صاف نہیں بناتا۔ بعض باتیں اگر صحیح بھی ہوں تو ان کا ذکر بدذوقی کی دلیل ہے۔ مثلاً مصنف نے ان نفس پرست برہمنوں کے واقع دیئے ہیں۔ جو گائے کے ساتھ فعلِ شنیع کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

بہرحال مجموعی حیثیت سے رسالہ میں دلچسپ معلومات کا ذخیرہ ہے جو اس موضوع کے سمجھنے میں کافی مدد دے گا۔ بعض جگہ طرزِ تحریر جارحانہ ہے۔ جس سے ہمارے ہندو بھائیوں کو دُکھ پہونچنے کا احتمال ہے۔ اور ہم کسی ایسی تصنیف کو مستحسن قرار نہیں دے سکتے جس سے کسی کو تکلیف پہونچے۔

ساغر

"نیو انڈین لٹریچر" (لکھنؤ)

"New Indian Literature"

ناشر انجمن ترقی پسند مصنّفین لکھنؤ سائز ۲۲×۱۸/۸ (ناول سائز) سالانہ قیمت صہ

کئی ماہ سے (New Indian Literature) کے اجرار کی خبر گرم تھی۔ ہندوستان کے اکثر ادبی حلقے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس انتظار کے دو وجوہ تھے (۱) پہلی تو یہ کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بنیادی مقاصد کی پسندیدگی اور امتیازی کوشش اسکے ارکان کی بیدار مغزی بلندی اور بلند ہو کر کام کرنے کی چینک کی بنا پر ادبی حلقوں کو یہ اُمید تھی کہ یہ لوگ جو قدم اٹھائیں گے وہ صحیح اور مخلصانہ ہوگا۔ اور جو کام کریں گے خلوص اور شوق کے جذبے میں کریں گے۔ جماعتی پروپیگنڈے اور جماعت بندی سے اُن سنجیدہ حضرات کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک اس تعمیری دور میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے امتیازی اور تعمیری مقاصد دیکھکر یہ توقع رکھتا تھا کہ اسکی کوششیں نئے ادب کی تخلیق اور تعمیر میں امداد دیں گی۔ کیونکہ کم و بیش ہر دیسی زبان کا ادب تعمیری منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اور گو میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حقیقی شاعر اور ادیب کو رہبری اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اس کا احساس اور اس کا تخیل خود اس کا رہبر ہوتا ہے۔ تاہم اس کی تراش کی ذمہ داری بہت کچھ ماحول کے سنگتراش پر بھی ہوتی ہے۔ بہر حال سادہ لوحی یا خوش فہمی کی بنا پر ملک نے "انجمن ترقی پسند مصنّفین" سے یہ توقع قائم کر لی تھی۔ کہ وہ اس تعمیر میں اخلاص کے ساتھ امداد کرے گی۔ اور ان ہستیوں کو پیش کریگی۔ جو دیسی زبانوں کے جدید ادب کے ہیرو ہیں۔

لیکن "نیو انڈین لٹریچر" کو دیکھنے کے بعد ان تمام نیک توقعات پر پانی پھر گیا۔ جو انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ذات سے وابستہ کی گئی تھیں اور مجموعی طور پر اسے دیکھکر سخت مایوسی ہوئی۔

آپ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کسی رسالہ یا کتاب کو خوبصورت اور دلکش بنانا ہی "مقابلہ" کا ایک نہایت ضروری جُزو ہے۔ تجارتی نقطۂ نظر سے جمالیاتی خصوصیات پیدا کرنا ایسا ہی لازم ہو گیا ہے جسطرح رسالہ کو کامیاب بنانے کے لئے مغز اور رُوح کی ضرورت ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم نیو انڈین لٹریچر کو دیکھتے ہیں۔ تو بیک نظر اس کا سائز ہی اس کے مقصد کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور مقابلاتی طور پر وہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) اور انڈین ریویو (مدراس) کے مقابلے میں نگاہوں میں نہیں کھُبتا۔

اسکے بعد ہمیں ادارۂ تحریر ایڈیٹوریل بورڈ میں بہت سے نام نظر آتے ہیں جنمیں اُردو زبان سے لیکر تامل اور تلنگو زبان کے ماہر تک موجود ہیں۔ لیکن جب مضامین پر نگاہ جاتی ہے۔ تو اور بھی افسوس ہوتا ہے۔ کہ اتنے ماہرینِ ادب کی پشت پناہی جس رسالہ کو میسّر ہو اُس کا کوئی ادبی معیار نہیں۔

اتنے شاندار ایڈیٹوریل بورڈ ہونے کے باوجود نیو انڈین لٹریچر میں ہندوستان کے جدید ادب کی ٹھیک نمائندگی بھی نہیں کی گئی ہے اُردو اور ہندی کے ان شاعروں کے ذکر سے بھی یہ خالی ہے۔ جو واقعی "نئے ادب" کے خالق و کارساز ہیں۔ صوبۂ بہار میں مشہور ہندی شاعر "دنکر" کا ذکر نئے ادب میں نہ کرنا کوئی انصاف اور بلندی

خیال یہ تھا کہ اگر نیو انڈین لٹریچر شائع ہوا تو امریکہ سے شائع ہونے والے ایشیا اور کلکتہ کے ماڈرن ریویو سے تو کسی طرح کم درجہ نہ ہوگا۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ صورت و سیرت کے لحاظ سے خود ان لوگوں کی توہین ہے جو "نئے ادب" کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔!؟

ملک راج آنند صاحب کے "ترقی پسند تحریک" والے مضمون میں ہندوستان کے مشہور اور ترقی پسند شعرا اور نثر نگاروں کا ذکر تک نہیں احمد عباس صاحب نثر نگاروں کی پہلی صف میں بٹھا دیئے گئے ہیں اور مجاز صاحب کے لئے فاضل مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں۔

"One of the most important revolutionary poets writting Hindustani today"

جہاں تک مجاز صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ہونہار نوجوان شاعر ہیں - اور اگر انہوں نے خود احتساب سے کام لیا تو ممکن ہے کہ کبھی دس پندرہ برس کے بعد اپنی انفرادیت قائم کر سکیں۔ "آہنگ" میں تو وہ صرف جوش ملیح آبادی کا ہلکا سا پرتو ہیں - انکی شاعری کلیتہً جوش کی تقلید ہے اور کسی نوخیز مقلد کیلئے یہ الفاظ نہیں کہے جا سکتے - جو ملک راج آنند نے لکھے ہیں - دوستی اور جانبداری کا ہرگز یہ فرض نہیں ہے کہ غلط مداحی کی صورت میں دوست کیساتھ کھلی دشمنی کی جائے - اس قسم کی مداحی کے اثرات مجاز کو تباہ کر دینگے - اور وہ اپنی شاعرانہ تخلیق کی قوت کو ترقی دینے سے عاری ہو جائیں گے - اپنی پارٹی کے افراد کی ثنا خوانی اور چیز ہے - اور تنقید دوسری چیز - غلط اور گمراہ کن بیانات مداحیات اور غلط ثنا خوانیاں ادب اور ادیبوں پر نہایت برا اثر ڈالتی ہیں - اور اس ترقی و تخلیق کا دروازہ بند کر دیتی ہیں - جس کو زمانہ کے تقاضات اور شاعر کے مخلصانہ احساسات اپنے ہاتھوں سے کھولا کرتے ہیں -

آیئے اب آپ کو ذرا یہ بھی بتائیں کہ ترقی پسند مصنفین کون کون ہیں !؟ میں' تم' میرا دوست تمہارا دوست اور "وہ" بس !!؟ سجاد ظہیر علی سردار جعفری' آنند' عبدالعلیم' احمد علی' احمد عباس' رشید جہاں'

عبدالعلیم صاحب "زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" نیو انڈین لٹریچر کے ایڈیٹر ہیں - آپ نے زبان کے مسئلہ پر ایک مضمون پہلے ہی نمبر میں سپرد قلم فرمایا ہے - انہیں نہ تو ان لسانی تحریکات کا ذکر ہے جو ہندوستانی زبان میں ہوئیں - اور نہ کوئی دوسری بات قابل غور ہے - نہ آئندہ کیلئے کوئی حل ہی پیش فرمایا گیا ہے - غرضکہ مضمون قطعی تشنہ ہے - اور کوئی فرض ادا نہیں کرتا -

ریویوز میں اقبال پر علی سردار جعفری کا ریویو ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے - کہ جعفری نے اقبال کو پڑھا ہی نہیں - نہایت مضحکہ انگیز ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے - کہ انہوں نے کبھی اقبال کو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی - محض مسولینی پر ایک نظم کہنے سے اقبال فسطائی Fascist نہیں ہو سکتا -

سیدین ہمارے ملک کے ایک بڑے ماہر تعلیم ہیں - واردھا اسکیم کے معاونین میں سے ایک ہیں لیکن جعفری کو انکی کتاب Iqbal's Educational Philosophy) میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی - اقبال پر اظہار رائے کرتے وقت اس کی تمام ترقی کو سامنے رکھنا پڑے گا - یہاں ——— ایک خاص گوشہ یہ پیدا ہوتا ہے - کہ نئے ادب سے آخر آپ کی مراد کیا ہے - !؟

کیا وہ ادب جو محض اشتراکی ہو یا محض سوشلسٹک لٹریچر (Socialistic literature) اگر نئے ادب کی یہ تعریف ہے تو آپ گویا ادب ہی کو ختم کئے دیتے ہیں - ادب تو ہر اصول و ہر فلسفہ و اعتقاد سے بلند ایک چیز ہے - اقبال کی شاعری "نئے ادب" کے ماتحت آتی ہے - دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو کلی طور پر بدل دیا یا نہیں - اگر اس سوال کا جواب خود ہمارے دل اثبات میں دیتے ہیں تو وہ ترقی یافتہ اور ایک عظیم الشان شاعر ہے اس کو فسطائی کہکر آپ گویا اسکی شاعری کو ساونتی تمدن کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں جو نہایت تنگ دلانہ اور غیر منصفانہ طرزِ عمل ہے -

لطف یہ ہے کہ یہ سلوک جعفری صاحب کرتے ہیں جنکے لئے اقبال کو سمجھنا اور سمجھانا شاید ابھی قبل از وقت ہے - یاد رکھیئے اقبال پر رائے زنی کرنے کے اوقات میں اسکی شاعری کے اس حصہ کو نظر انداز کرنے کا ہرگز حق نہیں ہے' جو اسکے کلام کا تیز و تند حصہ ہے اور جس میں وہ انسان سے لیکر قدرت تک دونوں کا باغی ہے ؎

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ عطارِ خصتِ تنویر ہو مجھ کو
جبتک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑونگی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

جس طرح لوگ پارٹیاں بنا کر تحفظی طور پر انگلستان کا سفر کرتے ہیں اور خود محفوظ ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ اسی طرح آنند صاحب کو بھی "نیو انڈین لٹریچر" کی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھکر اپنے دوستوں کو لندن پہونچانے اور پہنچنے کا حق حاصل ہے مگر اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے۔ کہ انگلستان کا راستہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے۔ جو تین ہزار روپیہ خرچ کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر "نیو انڈین لٹریچر" نے وہ فرض ادا نہیں کیا۔ جس کا دعوٰی دار اس کا نصرہ تھا۔ تو مجبوراً تنہا ہندوستانی ادب کو مغرب سے واقف کرانے کے لئے کوئی "موسیٰ" اٹھ سکتا ہے۔ اور نیو انڈین لٹریچر کے طلسم سامری کو توڑ دے سکتا ہے۔ کیونکہ اسباب اور نتائج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

"نیو انڈین لٹریچر" کے مجتہد العصر حضرات کو تو یہ غور کرنا ہی چاہیئے تھا۔ کہ تنقید کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے تنقید کرنا ادب کی کوئی خدمت نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ آہنگ (از مجاز) اور آہنگِ رزم (از وقار) کافی پرانی کتابیں ہو چکیں۔ وقار کی کتاب تو تقریباً دو سال کی پرانی کتاب ہے۔ اس لئے ان قدیم الاشاعت کتابوں پر نہیں۔ بلکہ تازہ مطبوعات پر تنقید ہونی چاہیئے تھی۔ یعنی نیو انڈین لٹریچر کو اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے کم از کم نیا ادب تو پیش کرنا چاہیئے تھا۔ !؟

آیئے ایک دلچسپ بات آپکو اور سنائیں۔ ہمارے دوست سجاد ظہیر کے نزدیک انقلابی شاعر مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔ مجاز جعفری شہاب۔ رضی۔ وقار۔ مطلبی اور جذبی۔

؟؟!!

جعفری۔ شہاب۔ مطلبی اور جذبی صاحبان کی شاعری سے مستفید ہونے کا اتفاق کم از کم شاعر حلقوں کو نہیں ہوا۔ شاید یہ حضرات کہہ کہہ کر صرف ترقی پسند مصنفین کے ارکان ہی کو اس "ایوانِ انقلابی" میں اپنی انقلابی شاعری سناتے ہیں جس میں ۲۶ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد داخل ہونا پڑتا ہے۔ رضی۔ سے مراد اگر رضی عظیم آبادی ہیں۔ تو ان کی چند نظمیں ضرور میں نے سنی ہیں۔ رہے مجاز صاحب سو ان کے متعلق زبان کھولنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ اسلئے کہ وہ آنند اور سجاد صاحب کی عدالتِ انقلاب کے "ملک الشعراء" ہیں۔ اب ہمارے دوست جوش ملیح آبادی کو فوراً شاعرِ انقلاب کہنے سے دست بردار ہو جانا چاہیئے کہ اب سے

"آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"

یہ بھی غالباً ترقی پسندی ہے اور "نیا ادب" کہ جو لوگ کہیں ان کو بڑا بنا کر پیش کیا جائے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ "نیو انڈین لٹریچر" پائنیر پریس میں چھپا ہے۔

"زخاکِ کعبہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است"

آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ "ترقی پسند مصنفین" نے ملک کو نیا خیال ضرور دیا ہے۔ اور اسکے افراد اگر اپنی ادبی انانیت و خود پرستی کو ترک کر دیں تو انہیں سے ہر شخص اپنی علمی قابلیت سے فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ اور ان میں سے ہر شخص میں یہ اہلیت ہو کہ اپنے اعمال کا احتساب کر کے "نیو انڈین لٹریچر" کو بلندی تک پہونچا دے۔ زیرِ نظر نمبر کو دیکھکر گو انتہائی تکلیف ہوئی مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ان حضرات نے چاہا تو وہ جلد ہی نیو انڈین لٹریچر کو معیاری رسالہ بنا دینگے۔

"عین الملک"

آجائے۔ ٹائمس اور ڈیلی میل ایسے اخباروں نے پیشنگوئی کی ہے کہ اب آسٹریا تاریخ کے لئے خاص مسئلہ نہیں رہا۔ میری رائے میں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہٹلر کے قبضۂ غاصبانہ کے بعد عام رائے کا ہٹلر آسٹرین جرمن اتحاد کے لئے فیصلہ کر دینا صرف اس ڈر سے ہوا کہ نازی فوجیں مع اپنے تمام مہلک سامان تباہی و بربادی کے آسٹریا پر چھائی ہوئی تھیں اور آسٹریا کے لیڈر جمہوری حکومتوں سے مایوس ہو کر ہر طرح ہمت ہار بیٹھے تھے۔ وقتی ہنگامے نے نت نئی پارٹیاں پیدا کر دی تھیں ملک چوندھیا گیا تھا۔ ورنہ یہ بالکل واقعہ ہے کہ اگر ڈاکٹر شُشنگ کی اُمیدوں کے مطابق عام رائے لی جاتی تو دو تہائی سے زیادہ اکثریت کے ساتھ شُشنگ کو کامیابی ہوئی ہوتی۔

پہلی جنگ کے مہلک نتیجے لوگوں کے سامنے تھے۔ بیرونی امداد کی اُمیدیں منقطع ہو جانے کے بعد اور حالات کی انتہائی تیز رفتاری کی وجہ سے کوئی دم نہ رہ سکا غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زبان و رسم و رواج اور خون کے قربت کی وجہ سے بھی کسی نے دم نہ مارا۔ اور مشیت میں چارہ کیا ہے کہہ کر ہتھیار ڈال دیئے۔

آسٹریا کی آبادی ستر لاکھ ہے ان میں سے اگر تیس لاکھ انسان بھی خیر مقدم کے ترانے جرمن قوم کے لئے گائیں تو بڑا شور معلوم ہو سکتا ہے اور برلن ریڈیو اسٹیشن کے طاقتور پیمانوں سے شور و شغب کی یہ لہریں وائٹ ہال میں عظیم الشان گونج پیدا کر سکتی ہیں۔ خاصکر جبکہ یہ شور غیر ذمہ دار نافہم ہنگاموں سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کی مضبوط چھاتیوں سے بلند ہوا ہو۔ اب بوڑھے اور سنجیدہ لوگ اسی طرح ڈر کر چپ ہو رہے تھے۔ جسطرح ایک خونخوار بلی سے چوہوں کی ایک کثیر فوج بھی لرز جایا کرتی ہے۔ خود میرا ایک شعر ہے ؎

بڑھاپا تحیر سے منہ تک رہا ہے   اُڑی جا رہی ہے فلک پہ جوانی

لوگوں کے سامنے خود جرمنی کے وہ واقعات تھے جبکہ ہٹلر نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تھی اور اپنے مدہوش نوجوان ساتھیوں کی مدد سے اقلیت کو بھی اکثریت پر غالب کر دیا تھا۔ آپ اُسے ساحرانہ کرشمہ کہیے یا شیطانی حرکتیں کہ جس نے ذرا بھی ہٹلر کی مخالفت میں آواز بلند کی اُسے سیاسی قیدخانوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ در گور کر دیا گیا۔ ایسے صرف یہودی ہی نہیں تھے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں خالص آرین نسل کے بہترین دست و بازو بھی تھے۔

حال میں ابھی میں نے مسٹر لوا ینڈ کی کتاب (
) "میں ہٹلر کا قیدی تھا" پڑھی۔ اس کتاب کا خلاصہ میرے ایک دوست کر رہے ہیں۔ جو الہٰشیا کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔ اسکے مطالعے سے آپ بھی اس نتیجے پر پہونچ جائیں گے جس نتیجے پر میں پہونچا ہوں۔

ڈیلی میل جیسا قدامت پرست اور رجعت پسند پرچہ بھی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "نازی جرمنی کے متعلق اس سے زیادہ تاثرانگیز کتاب نظر سے نہیں گذری" مسٹر لورینڈ ایک ہنگرین صحافی ہیں جو جرمن میں ایک مشہور ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اس وقت وہ انگلستان میں "پیجر پوسٹ اور للی پٹ" کے ایڈیٹر ہیں ظاہر ہے کہ ایسا ذمہ دار شخص خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بول سکتا کتاب میں انہوں نے اپنے اور جرمن کے چند دوسرے منتخب رہنماؤں کا جن میں اکثر کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا ذکر کیا ہے۔ بعض ڈاکٹر تھے بعض سائنسدان تھے اور بعض آرٹسٹ۔ ہٹلر کی نازی فوج نے ان لوگوں کے ساتھ صرف اس بنا پر سخت مظالم کئے کہ اُن کی جگہوں پر نازی نوجوان قائم مقام ہو سکیں۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آسٹرین قوم نے جرمنی کو سامانِ جنگ کے طوفان میں اپنی زندگی کے بیڑے کو گھبرا کر ڈال دیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آسٹریا کی دولت پر قبضہ کرتے ہی جرمنی نے غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا جنکے سہارے پر آسٹریا کا قومی بنک بن سکتا تھا۔

تیسرے سال بمبئی میں ایک آسٹرین صحافی لڑکی سے میری ملاقات ہوئی تھی اُن کا تازہ خط آسٹریا کے مستقبل پر روشنی ڈالتا ہے کاش میں

وہ خواہش لے کر سکتا بیچاری ابھی نازی چنگل سے آزاد نہیں ہوئی ہے۔ وہ خط ختم کرتے ہوئے کہتی ہے کہ "آسٹریا اپنی موجودہ غلامی سے خوش نہیں ہے" وہ خود کو ایک اُس زخمی کبوتر کی طرح سمجھ رہا ہے جس کی صحت صیاد کے ہاتھوں ہو رہی ہو اور جب دھیرے دھیرے زخم مندمل ہو جائینگے تو وہ پھر آزاد ہو جائے گا۔ آپ دیکھئے کہ عالمگیر جنگ کے موقع پر آسٹریا پھر انگڑائی لے گا اور نہ صرف آسٹریا بلکہ زیکوسلاویکیا اور ہنگری بھی یہ تینوں ملک متحد ہو کر جرمنی کو ایک بار پھر زبردست چوٹ لگا ئینگے"۔

چیکوسلاویکیا

سہ ماہی رسالے کے لئے جو نیم سیاسی بھی ہو یہ بڑی دقت کی بات ہے کہ جب واقعات اس قدر تیزی سے کروٹیں لے رہے ہوں واقعات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا ابھی میں نے آسٹریا کے متعلق آخری سطور لکھی ہی تھیں کہ چیکوسلوویکیا پوری طرح ہڑپ کر لیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی دنیا کی تاریخ میں عجیب و غریب کہانی کا اضافہ ہوا ہے۔
ہٹلر غالباً پہلا حکمران ہے جس نے دو ملک آسٹریا پھر چیکوسلاویکیا ۲
خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر فتح کر لیے۔ اس سے پہلے نپولین نے تیمور .... اور چنگیز نے صلاح الدین نے بڑی بڑی فتوحات کی تھیں۔ لیکن خون کی ندیاں بہا کر اپنا خون پانی ایک کر دینے کے بعد۔

ڈاکٹر ہاشا (Hacha) چیکوسلوویکیا کے صدر اور ان کے وزیر خارجہ مسٹر (نے کسطرح
مجبور ہو کر آسانی کے ساتھ اپنا ملک نازی جرمنی کو سونپ دیا ۱۴ مارچ کی سہ پہر کو پراگ کے جرمن وزیر نے چیک حکومت کے ذمہ دار افراد سے ملاقات کی اور ان کو ہٹلر کا یہ معنے خیز پیام دیا کہ چیک لوگوں کے لئے یہ نہایت مفید بات ہوگی کہ صدر اور وزیر خارجہ برلن آ کر کچھ مشورے کر لیں۔ جسوقت وہ برلن پہونچے اُنکا زبردست استقبال ہوا۔ فوج کا مکمل اور شاندار مظاہرہ کیا گیا۔ ہزاروں انسانوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے اور انکو فوراً ریش چانسلری میں لے جایا گیا۔ جہاں ہر ہٹلر فیلڈ مارشل گورنگ اور ہر فان ربن ٹراپ پہلے سے موجود تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک گول میز رکھی ہوئی تھی جس پر چیکوسلاویکیا کی قسمت کا آخری فیصلہ پہلے سے لکھا ہوا محفوظ تھا۔ جس پر چیک صدر اور وزیر خارجہ کے دستخط ہو جانے کے بعد حکومت کا چیکوسلوویکیا پر بغیر کسی جنگ و جدل کے قبضہ ہو جانا باقی تھا۔ ساتھ ہی بوہیمیا اور فرودیا کے مستقبل کا آئین بھی مدون تھا۔

کانفرنس کا آغاز ہٹلر نے ایک مختصر تقریر سے کیا اُنہوں نے کہا کہ "اب وقت بات چیت کا نہیں رہا بلکہ چیک قوم کو اب یہ بتا دینے کا وقت آگیا ہے کہ جرمن حکومت کا فیصلہ اٹل ہے اور اُسے سر تسلیم خم کر دینا ہی پڑے گا۔ چیک نمائندوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ہٹلر نے گرج کر کہا "کل صبح نو بجے جرمن فوجیں پراگ دارالسلطنت چیکوسلاویکیا) میں ہونگی۔ بوہیمیا ( ) اور ( ) اور موریا ریس کے سایہ عاطفت میں لے لئے جائینگے۔ اور جو کوئی بھی مقابلہ کی کوشش کریگا اُسے نازی سپاہیوں کے بھاری بھاری بوٹوں سے پیس دیا جائے گا۔ اس کے بعد نمائندگان چیک کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہٹلر نے فیصلہ پر اپنے آخری دستخط کر دیئے اور کمرہ سے چلا گیا۔ اسوقت رات کے ڈیڑھ بجے تھے۔ پریسیڈنٹ ہاشا اور وزیر خارجہ نے سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ وہ اپنے ملک کو کس منہ سے جائینگے!؟ اس سے پہلے کبھی کوئی سفید قوم اسطرح ذلیل نہیں کی گئی تھی۔ اور خود دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ جرمن افسران نے انہیں گھیر لیا۔ قلم ان کے ہاتھوں میں زبردستی دیدیے اور دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم اب بھی دستخط نہ کروگے تو دو گھنٹے کے اندر اندر تمام پراگ کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے گا"۔

انہوں نے بتایا کہ ... جنگی طیارے ہوائی جہاز اسٹیشن پر بالکل تیار کھڑے ہیں اور ایک منٹ کے نوٹس پر وہ پراگ کے لئے اُڑ سکتے ہیں ۶ بجے صبح تک اگر دستخط نہ ہوئے تو پراگ کا نام و نشان یورپ کی تاریخ سے مٹا دیا جائے گا۔

بیچارے ڈاکٹر ہاشا کی عجیب حالت تھی۔ اختلاجی دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ ڈاکٹر ہاشا نے آخر تنگ آکر کہا کہ وہ اسوقت تک دستخط نہیں کر سکتے جب تک کہ چیک حکومت کے دوسرے ذمہ دار افراد سے مشورہ نہ کر لیں جرمن وزراء نے کہا کہ ہم نے اس ہفتے چیک سے براہ راست ٹیلیفون کا سلسلہ سرحدی علاقوں کی مدد سے ملا لیا ہے۔ اور تم جس سے چاہو اسی وقت ٹیلیفون پر بات کر سکتے ہو۔ اب صبح کے ۵ ½ بج چکے تھے۔ صرف ۳ منٹ باقی تھے جن میں چیک قوم کو خانماں برباد ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ہاشا بے ہوش ہو گئے۔ نبضیں چھوٹ گئیں نازی ڈاکٹران نے انجکشن دیئے۔ ہوش میں آکر انہوں نے آخر ہمت ہار ہی دی اور اپنے ساتھ چیک قوم کی قسمت کے فیصلے پر بہ جبر دستخط کر دیئے۔

ہم نے امریکن شریف ڈاکوؤں کے کارنامے پڑھے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ آرٹ اور کلچر شعر و ادب کی علمبردار ایسی عظیم الشان قوم جس نے نطشے گوئٹے اور شلر جیسے پیغمبران ادب پیدا کئے وہ اس بیسویں صدی میں جبکہ تہذیب و تمدن کو اپنے پورے اوج پر ہونا چاہئے تھا ایک مہذب ڈاکو بنکر رہ گئی ہے آج اگر ایشیا کی کسی قوم نے ایسی دنی اور قزاقانہ حرکت کی ہوتی تو سارا یورپ چیخ پڑتا کہ ایشیا مہذب نہیں ہے۔ افسوس

لامکاں ٹھوکر میں ہے ہفت آسماں قطع کریں ہیں
اللہ اللہ یہ غرور انبساط سروری!؟

اسکے بعد ابھی چیکوسلوویکیا کا واقعہ تازہ ہی تھا اور دنیا کی خیرہ کن نگاہیں اٹھیں بھی نہ تھیں کہ ہٹلر نے رات کے رات میمل پر قبضہ کر لیا۔ یہ کوئی طویل کہانی نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے ملک کو بھی ہٹلر نے خون کی ایک بوند گرائے بغیر حاصل کیا لیکن انداز وہی مہذب ڈاکے کے سے تھے۔ وہی دھمکی اور دنیا کے سامنے وہی وجہ کہ میمل قوم خود ہی جرمن کی آغوش میں آنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے اس میں ہٹلر حق بجانب بھی ہو اسلئے کہ میمل کی نوے فیصدی آبادی جو نسلی طور پر جرمن ہی ہے۔

ہٹلر نے آسٹریلیا کو فتح کرنے کے بعد کہا تھا کہ اب اسکے بعد یورپ میں اسے کوئی حصہ ملک نہیں چاہئے۔ ۶ ہفتے کے بعد چیکوسلوویکیا کا مطالبہ کیا گیا تھوڑے دنوں بعد ہی میمل کی خواہش پوری کی گئی اور اب ہٹلر رومانیہ پولینڈ اور یوگوسلاویا کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا ہے۔ میونخ کے مقام پر برطانیہ اور فرانس سے جو معاہدہ ہوا اسکو ہٹلر نے ذرا سا خیال کئے بغیر ٹھکرا دیا۔ چیکوسلوویکیا بوہیمیہ۔ موریویا۔ اور میمل میں جو کچھ ہوا اسکے ذمہ دار صرف فرانس اور برطانیہ ہیں۔ چیمبرلین اور ڈلیڈیر نے جیسی منہ کی کھائی ہے اسکا احساس آج انہیں نہیں ہو سکتا لیکن وہ وقت دور نہیں ہے کہ انکی غفلتوں اور بہانہ سازیوں کا انجام ایسا خطرناک اور ایسا دردناک سا ہوگا کہ تمام انسانی ارتقاء خاکستر ہو کر رہ جائیگا۔

شکر کا مقام ہے کہ رومانیہ اور پولینڈ کی طرف جرمنی کی حریفانہ نگاہیں دیکھتے ہوئے چیمبرلین نے تھوڑی سی جو تقریری جوانمردی دکھائی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ بوڑھے شیر برطانیہ کو ہوکلما کی گولیاں کھلا دی گئیں ہیں وہ اب نئے سرے سے جوان ہو چلا ہے اور اگر ہٹلر کی جوانی نے زیادہ طلاطم دکھایا تو وہ اپنے دوسرے بوڑھے ساتھی فرانس کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ ہٹلر اور اسکی قوم کی جوانی موسم بہار کی سی جوانی ہے۔ کیونکہ اسمیں ابھی اقتصادیات کا جوبن نہیں ہے ہٹلر نے یکایک خاموشی اختیار کر لی اور وہ ہٹلر جو تقریر سے زیادہ عمل کا قائل ہے صرف یہ کہکر کم از کم وقتی طور پر خاموش ہو گیا کہ برطانیہ کی ۳۰۰ برس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جو کام بھی اس نے کیا وہ اپنی عصمت اخلاق کو داغدار بنا کر کیا۔ لیکن آج بڑھاپے میں وہ باعصمت اور پاکیزہ ہونے کی ڈینگیں مارتا ہے۔ ہٹلر نے یہ بڑی حد تک جھوٹ نہیں کہا۔ ۳۰۰ برس کی ہندوستان کی تاریخ ۱۸۵۷ء اور جلیان والے باغ کی خونی کارنامے صوبہ سرحد پر مسلسل بمباری افغانستان سے دھوکے اور چالبازی کے ساتھ امان اللہ کا تختہ اور فلسطین کے مسلمانوں کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھنسا لیا کیسے معلوم نہیں ہے!؟
برطانیہ کی اس کھوکھلی تاریخ کی روشنی میں ہٹلر سست ذکر

سارس جیسی چال چلنے والے مسٹر چیمبرلین کو کیا ہمت دے سکتا ہے
لیکن ہٹلر غالباً دنیا کی تاریخ میں جس نے چنگیز، تیمور اور نپولین
جیسے حکمران پیدا کئے اک نئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے
کہ جہاں تک ممکن ہو اور جب تک ممکن ہو۔ خون خرابے سے بچے جیسے
سینما کی سنگدل ایکٹریس اپنے ناقابل برداشت عشووں سے چاہنے
اور نہ چاہنے والوں کی جیبوں پر پوری طرح قبضہ کر لیتی ہے۔ تھوڑی
دیر کے لئے دم لینے کو بیٹھ گیا ہے۔ دوسری طرف اس ڈرامے کی
دوسری ہیرو سینور مسولینی کو لباس بازی گری کے کرتب دکھانے
کے لئے اشارہ کرتا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ بوڑھا دماغ
سیاسیات کے لئے کتنا ناموزوں ہے ——— !؟ اور جوان
دل و دماغ میں کتنے داؤں پیچ بوڑھوں سے کھیلنے کے لئے محفوظ ہوتے
ہیں۔ سود و زیاں اور ہار جیت کے خیال سے قطعاً آزاد سے

نہ رہبر نہ مشعل نہ جادہ نہ منزل ؎ چلی جا رہی ہے جوانی دوانی۔ سنو

آیشیا کی آخری کاپی پریس کو جا چکی تھی کہ ریڈیو خبر ملی اٹلی نے
البانیہ پر دھاوا بول دیا اور نہتا البانیہ فسطائی عسکریت کا شکار بن گیا
"البانیہ کی آزادی ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ وزیر خارجہ (لارڈ ہیلی فیکس)
نے یہ فرمایا کہ ہمیں البانیہ پر اطالوی حملہ سے ذرا بھی تعجب نہ ہوا ہمکو
یہ ایک مہینے پہلے سے معلوم تھا کہ ایسا ہونے والا ہے اور صرف
ہمیں نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو بھی معلوم تھا اور غالباً مراد فرانس سے ہے)
البانیہ میں ہمارا کوئی مفاد نہیں ہے اسلئے ہمیں پریشان ہونیکی ضرورت
نہیں ہے چھوٹا سا ملک تھا۔ نو دس ہزار سے زیادہ باقاعدہ فوج
نہ تھی یوں بھی اٹلی کے اثر میں تھا بہر صورت ہمیں تشویش ضرور ہے اور ہم
بہت جلد ——— اُن قوموں سے اپنے اتحاد کا فیصلہ کر دینگے جنکو ہم
غاصبوں کے مقابلے کے لئے تیار کر رہے ہیں"

یورپ میں یہ ایک آخری چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی جو خود (محافظ اسلام)
(مسولینی !؟) کے ہاتھوں غلام بنا دی گئی اور عیسائیوں کے زیر پناہ
لے لی گئی۔ رونے کی بات ہے کہ پاکستانی مسلمانوں سے دو چار
ریزولیوشن پاس کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے نظر آتے۔ بنگال ایگزیکٹو
مسلم لیگ کی طرف سے اور دوسرا لندن کی اسلامی انجمن کیطرف سے

یاد رکھئے کہ البانیہ پچھلے سال تک استاذ لعنت پرست اسلامی ملک
کہ سو فیصدی مسلمان عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں۔ دیکھنا یہ ہے
دورِ اسلامی سے ماہور مسلم لیگی حضرات کے نزدیک البانیہ میں اسلام
میں ہوا یا نہیں ہے؟

البانیہ اور تین مہینے کے اندر اندر یورپ کا نقشہ جغرافیہ بدل دیا
اس پر تفصیلی تبصرہ ایشیا کی آیندہ اشاعت میں ہو سکے گا۔
اسپین کے متعلق ہم ایک تفصیلی مضمون پہلی اشاعت میں شائع
کر چکے ہیں جس سے زیادہ لکھنے کی غالباً گنجائش بھی نہیں ہے۔ اتنا
صرف اتنا لکھنا ہے کہ اسپین کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ فرانکو کی فتح
اور برطانوی شاطروں کو ایک زبردست مات ہوئی۔
بوڑھے برطانوی سیاست دانوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسپین اور
البانیہ کے فتح ہونے کے بعد (میڈیٹرینین سی)
کے دو تہائی حصہ پر فسطائی اثر و اقتدار قائم ہو جاتا ہے۔ جس
وقتی صلح کے لئے مسٹر چیمبرلین اپنی ذات کو دوسرا حضرت عیسیٰ
بنا رہے ہیں اس کی بنیاد سے آئندہ کی ہلاکت و تباہی کے آتش
پہاڑ پھوٹ کر رہینگے۔
صرف ایک صورت ہے جس سے دنیا میں اب بھی امن قائم
ہو سکتا ہے۔ نازی زہر یورپ کے جسم کی رگوں سے کھینچا جا رہا
ہے اگر برطانیہ اور فرانس فوراً گفت و شنید میں ایک لمحہ ضائع کئے
بلقان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں کو ایمانداری کے ساتھ
یقین دلا دیں کہ نازی اور فسطائی حملے کے موقع پر وہ بغیر کسی
لحاظ کے اپنی پوری جنگی قوت کے ساتھ میدان میں آجائینگے
یاد رکھئے کہ ملتوں کے فنا ہونے کے بعد ہی قومیں بنتی ہیں۔
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
اور قوموں کی قربانی سے عالمگیر امن کی بنیاد پڑ سکتی ہے فسطائیت
پر اشتراکیت کو ترجیح دینی زیادہ مناسب ہے کیونکہ اشتراکیت
میں کم از کم عالمگیریت تو ہے۔ یعنی اسوقت روس کے جذبۂ اشتراک
اور امریکہ کی بے انتہا دولت سے یورپ کی دوسری جمہوری حکومتوں
(برطانیہ فرانس !) کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔

رہیں سہی لیکن تغیر کی روح ذرہ ذرہ میں اس طرح محسوس ہو رہی ہے جیسے دق کے مریض کے رگ و پے میں صحت کی روشنی!

یہ ہے ہمارا آج کا ماحول، جس میں سوال ہوتا ہے کہ شاعری کیا ہے ——— !؟
اپنی اپنی بولی میں بہت سے بزرگوں نے شاعری کی تعریفیں آپ کو بتائی ہیں۔ میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں، ہاں میں ان پیاسوں میں سے ضرور ہوں جو بتانے سے زیادہ جاننے کی فکر میں رہتے ہیں؛
شاعری کیسی ہونی چاہئے ——— !؟ بہت سے اُستادوں نے آپ کو ہدایتیں کیں، مولانا حالی سے لیکر اس وقت تک آپ کو برابر یہ تنبیہ کی جاتی رہی کہ شاعری کیسی ہونی چاہئے۔ ابھی ایک سال ہی ہوا کہ اسی مشاعرہ کی مسندِ صدارت سے ایک بزرگ نے ہدایات اور احکامات کے دریا بہائے تھے؛
دُنیا کے قیام سے لیکر اس وقت تک حُسن اور شاعری کی اَن گِنت تعریفیں کی گئیں مگر کسی تعریف پر دُنیا متفق نہ ہو سکی سو اب بھی کیا دعویٰ کیا جا سکتا ہے لیکن ۱۷ سال کے غور و فکر اور تجربات کی روح چند لفظوں میں بغیر کسی دعویٰ کے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں؛
"شاعری" شاعر کے محسوسات، جذبات اور معتقدات کا رنگین عکس ہے"
یہ شاعری کی خارجی تعریف نہیں، داخلی ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری، شاعر ہی کی روح کی پیداوار ہے، اور شاعر اپنے ماحول کی مخلوق؛ جذبات، محسوسات، اور معتقدات کو جامع اور حسین الفاظ میں ظاہر کرنے کی مہارت حاصل کر لینا ضرور خارجی اور مادی ہے باقی تمام جوہر داخلی ہے؛

یاد رکھئے مصوری، موسیقی، بُت سازی، ان تمام فنون میں بھی اکتساب کو رائی بھر ہی دخل ہے، شاعری کی طرح بالکل نہ سہی لیکن مصور، مغنی، اور بُت ساز کے لئے بھی داخلی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے؛ ایک فطری شاعر، دنیا، اس کی چیزوں یا دُنیا سے اونچے معاملات پر فلسفیانہ غور و فکر کرتا ہے اور اپنے اعتقاد کو روح کی روشنی میں ترتیب دیتا ہے اُسے اپنے موضوع سے فطری لگاؤ ہوتا ہے وہ فطرت کے گہرے مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہے ——— یہ سب کیا ہے ——— یہ سب کیوں ہے، اور دُنیا کو کیا اور کیسا ہونا چاہئے اس استفہام و تفہیم میں اسکی روح اُلجھی رہتی ہے، شاعری اسی داخلی اور خارجی ماحولی کشاکش کی مخلوق ہے؛
——— محض حسین لڑکیوں، خوبصورت مناظر، چمکتے دمکتے ہوئے لباسوں، پھولوں، ستاروں، آبشاروں، گاتی ہوئی ندیوں سے فطری شاعر کا متاثر ہونا، جمالیاتی ذوق کا کوئی کمال نہیں، بلکہ شاعر کی یہ عادت اسی پُرانے نظام جاگیردارانہ کی بناء پر پڑی ہے جس میں تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا جاتا تھا، اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ شاعر کو حُسن سے متاثر ہونا جرم ہے، میں یہ بار بار ذہنوں پر ڈالنا کتنا خیال کرتا ہوں کہ شاعر کو کیا ہونا چاہئے۔ شاعر کو شاعر ہونا چاہئے۔ مگر محض حُسن ہی جاذب نہیں، بدصورتی بھی کشش رکھتی ہے، لچکتی ہوئی کمروں کے بجائے جھکی ہوئی کمروں کو دیکھ کر جس آنکھ سے اک بے ساختہ آنسو گر پڑے وہ آنکھ سب سے بڑی شاعر ہے؛
زندگی کے ایک ہی رُخ سے متاثر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نصف شاعر ہے اور اسکی شاعری یک رُخی اور ادھوری ہے۔ پُرانے زمانے کے شعراء اگر امراء کے نمایندے تھے تو موجودہ سوسائٹی کی ترتیب و تشکیل کے لحاظ سے اس زمانے کے شاعر عوام کے نمائندے ہونے چاہئیں؛
غالباً حقیقی شاعر ہر وقت اصلی حیثیت کو محسوس کرتا ہے کہ وہ قدامت کا چولا اُتار پھینکے اور جدت و انقلاب کی نمائندگی کرے؛

ثروت آرا بیگم

(محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا ادبی شاہکار)

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں اور جن کے مضامین ملک کے وقیع رسائل میں ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے ادبی ماحول کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی ایک قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" کی اشاعت ہیں جو اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص درجہ کا ناول ہے اور جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ثروت آرا قیاس سے بعید تصوریت .... اور گذری ہوئی شعریت نہیں ہے بلکہ ناول کے معزرہ ماحول ... . اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ۲۵۴

یہ تو اصلی بنیاد ہے۔ لیکن جو زبان اسمیں استعمال کی گئی ہے وہ نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اس کو امتیاز بخشتی ہے ہر صفحہ بول اٹھتا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے، زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دینے والی بات ہے کہ اُسکے اندازِ بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہ بلکہ لہجہ۔ لفظی ترکیبیں بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ نا شروع کرنیکے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر تہذیب اور آفاقیت رکھ اُسکو پڑھکر دلّی کی گئی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچ کر رہ جاتا ہے۔ اور دسیوں نئے محاورے جو دلّی کے مردوں میں نہیں بلکہ عورتوں پر جاتے ہیں اُسکے پڑھنے سے معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادر محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد ریونیو منسٹر آسام کے نام معنون کیا اور شروع میں ان کی تصویر بھی شریک کتاب کیگئی ہے۔

ملنے کا پتہ **مکتبۂ شاعر ادبی مرکز میرٹھ**

ایشیا

ہندوستانی ادب، مشرقی تہذیب، کلچر اور مشرق کی انقلابی روح کا علمبردار

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہی رسالہ

ایشیا

زیر سرپرستی

آنریبل ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا وزیر تعلیمات صوبہ بہار

(بہار گورنمنٹ کی طرف سے اسکولوں کیلئے منظور شدہ)

ایڈیٹر ساغر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مجلد ایشیا ۶ھ، قیمت ایک نمبر مجلد عمہ، علاوہ محصول

قیمت سالانہ غیر مجلد ایشیا ۵ھ، قیمت ایک نمبر غیر مجلد عمہ علاوہ محصول

ساغر کے مجموعۂ کلام

بادۂ مشرق کا نیا روپ

ساغری (ناگری ایڈیشن)

(مع اُن تازہ گیتوں، غزلوں اور نئی قومی نظموں کے جو بادۂ مشرق میں نہیں چھپیں)

سنہ ۱۹۳۵ء میں اَدبی مرکز میرٹھ نے بادۂ مشرق کو اُردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی زبان میں شائع کرنے کا اعلان کیا تھا سنہ ۱۹۳۶ء میں بادہ کا اُردو ایڈیشن پانچہزار کی تعداد میں شائع ہوکر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا اور آج مکتبۂ ساغر میں اس کی ایک جلد بھی باقی نہیں ہے۔ اُردو زبان میں طبع ثانی سے پہلے اَدبی مرکز اس وعدہ کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اِس نے پبلک سے ناگری ایڈیشن کے متعلق کیا تھا۔ چنانچہ ہم نہایت مسرّت کے ساتھ ناگری پڑھنے والے اصحاب کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ بادۂ مشرق ناگری رسم الخط میں "ساغرِ بشری" کے نام سے تیار ہوگیا تمام کتاب کا انتخاب بجنسہٖ اُردو حروف کے بجائے ناگری حرفوں میں چھپا ہے اور حاشیہ پر اُن الفاظ کے معنی آسان زبان میں لکھ دیئے گئے ہیں جن کو سمجھنے میں کچھ دِقّت ہوسکتی ہے۔ کتاب پہلے رنگ کے اینٹک پیپر پر نہایت حسین اور واضح ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ اُردو ایڈیشن کی طرح ہر باب پر اس کی مناسبت سے بلاکس کے پس منظر دوسرے رنگ میں چھاپی گئی ہیں۔ جلد نہایت مضبوط اور حسین ہے۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات، کتاب میں حضرتِ ساغر کا ایک اسکیچ اور فوٹو کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ قیمت تین روپئے علاوہ محصول۔

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

فہرست

رسالۂ ایشیا (سہ ماہی) اپریل، مئی، جون ۱۹۳۹ء

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ	شمارہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۶۴	ماہنامہ ہندوستانی پٹنہ	ساغر	۱۷۳	۷۰	تمثیلی مشاعرہ	ساغر	۱۷۷
۶۵	مقامِ محمود	"	۱۷۴	۷۱	مصنفینِ اُردو	"	۱۷۸
۶۶	تابشِ خیال	"	۱۷۵	۷۲	واردات	"	۱۷۹
۶۷	نقش و نگار طبع ثانی	"	۱۷۵	۷۳	ماہنامہ مووی لینڈ	"	۱۸۰
۶۸	فکر و نشاط "	"	۱۷۶	۷۴	بقیہ حصہ افسانہ "اجزا" صفحہ ۱۳۶	شمیم	۱۸۱
۶۹	شعلہ و شبنم "	"	۱۷۷	۷۵	خطبۂ صدارت	ساغر	۱۸۵

لمحۂ چند!

یہ سازِ مشیّت سے پیماں ہے میرا
مصیبت میں بھی گنگناتا رہوں گا ـــــــــــ !؟

گذشتہ تین ماہ اپنی کشمکش، معروفیت، دُکھ اور روحانی مصائب کے لحاظ سے میرے لیے بڑے سخت گزرے۔ ہرچند کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ فرائض کے سلسلے میں ذاتی مجبوریوں کا سہارا لیا جائے لیکن بعض موقعوں پر ذاتی مسائل فرائض پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ انسان قطعاً معذور ہو جاتا ہے۔

چار سال ہوئے میری چھوٹی بہن شاہ جہاں بیگم مرض دق میں مبتلا ہوئی اور بالآخر مسلسل اور سخت علالت کے بعد ۲۳ مئی کو اس نے بے مرادی اور دوشیزگی و جوانی کے عالم میں انتقال کیا، میں بھی جانتا ہوں کہ یہ حادثہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہ تھا، موت اور زندگی انسان کے ساتھ ہے اور آدمی کو تنہا رہنا اور اکیلا جانا ہے۔ لیکن اس حادثہ کے ساتھ جس قدر معاملاتی اور روحانی جزئیات تھے وہ مل جل کر فرائض پر بھی طرح چھا گئے۔

بادۂ مشرق کا ہندی ایڈیشن بھی اس وقت تک شائع نہ ہوسکا اور زیرِ نظر نمبر بھی جسے جون کے آخر میں شائع ہو جانا چاہیے تھا، تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

ایک شجو کی معصوم اور دوشیزہ موت ہی اس کا سبب نہیں ہے، اگست کے شروع سے میں بھی تندرست نہیں ہوں، خاصکر دو ہفتوں سے فریش ہوں اور یہ چند سطور بسترِ علالت پر پڑے پڑے لکھ رہا ہوں۔

تاخیر کا جرم گو ناقابلِ معافی ہے مگر جب ہی تک میں معافی طلبی کا اقدام کروں، انسان کو اگر قدرت اتنا مجبور پیدا نہ کرتی اور اس کا شوق جبر اس درجہ بڑھا ہوا نہ ہوتا تو مجھے بالکل تکلف نہ ہوتا آپ سے معافی مانگنے میں۔ ہاں مجھے یہ افسوس ضرور ہے کہ کیوں انسان میں اتنی قوت نہیں کہ قدرت اور دنیا حالات اور مقدرات سب سے بیک وقت مقابلہ کر سکے، اس قوت کو حاصل کرنے کا خواب دیکھنا شاید معافی چاہنے سے زیادہ دانشمند فعل ہے اور اس دانشمندی کو حاصل کرنے کی دُھن ہی میں انسانی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

زیرِ نظر نمبر کو دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہیں ہے کیونکہ یہ بہرحال کسی طرح مشترک نمبر سے اپنی جامعیت اور حسن میں کم مرتبہ نہیں۔

ادبستان میں "کارل مارکس کے نظریۂ سرمایہ داری" پر جناب جوہر میرٹھی کے دو مقالے اپنے علمی وزن کے لحاظ سے نہایت نمایاں چیز ہیں۔ ادبیات میں "تشبیہ اور شعر و ادب میں اس کی اہمیت" محی الدین رنجور عظیم آبادی کا مضمون مفید چیز ہے، ہرچند کہ یہ زیادہ وسیع النظری اور پہلوؤں کے ساتھ لکھا جانا چاہیے تھا۔ "راجپوتانہ" پر میاں عبدالعزیز صاحب کی گو چند سطریں ہیں لیکن دماغ و دل اور انسانی روح کے لئے ایک نہایت عمیق تاثر کی دنیا پیش کر دیتی ہیں یہ شذرہ میاں صاحب نے بطورِ خاص "ایشیا" کے لئے عنایت فرمایا اسی سے آپ ایشیا کی قسمت اور اس شذرہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہزار داستان، میں فریدہ و شاکر کی کہانیوں کی ستائش کرنا گویا ایک نئی بے اعتمادی مول لینا ہے۔ یہ دونوں جو لکھتے

ہیں خوب کھیلتے ہیں، مگر اِن مسافروں کی حقیقی منزل یہ نہیں ہے، یہ مسافر نہایت عظیم اور طویل سفر کے لئے کمر باندھ کر نکلے ہیں اور ہم سے زیادہ اپنی منزل پہچانتے ہیں۔

البتہ مصطفیٰ منفلوطی مصری، عربی ادب کے چوٹی کے افسانہ نگار کا ایک زبردست شاہکار، لائق علی صاحب شمیمؔ نے تمام و کمال ترجمہ کیا ہے اور یقیناً یہ افسانہ اِس نمبر کی جان ہے، ترجمہ کی تعریف کرنا نہایت غلط چیز ہے، لیکن عربی جیسی وسیع المعنیٰ زبان کے اُردو میں اِس قدر بے ساختہ اور رواں ترجمہ یقیناً مترجم کے علمی تبحّر اور ترجمہ کرنے کی قابلیّت کا ثبوت ہے۔

میخانۂ الہام "نظم" کا حصّہ بھی اپنی روایات کے مطابق مکمّل اور معیاری ہے۔ جس سپہرِ ادب پر عسکری، ماہر، اکبر، تسمر وغیرہ جیسے ستارے جگمگائیں اُس کے نور و رفعت کا ٹھکانا ہی کیا ہو سکتا ہے ——!؟

یہ رسم رسم ہی ہے ورنہ جو کچھ ایشیا میں شائع ہوتا ہے وہ خود اپنا مقدمہ اور اپنی تعریف خود ہے۔

ایک ضروری بات آپ سے اور کہہ دوں، کہ یہ نمبر شروع سے لے کر آخر تک میری عدم موجودگی میں لکھا اور چھاپا گیا ہے۔ بہن کی علالت کے سلسلے میں اپریل ۱۹۳۹ء سے یکم جولائی ۱۹۳۹ء تک مجھے دہلی رہنا پڑا، اِس لئے جو کچھ کیا وہ دفتر والوں نے کیا۔ خصوصاً مسٹر بیقدر ناظمِ ایشیا اس نمبر کی صحت و عدمِ صحت کے کلّی طور پر ذمہ دار ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اُنھوں نے کافی محنت سے اس نمبر کی تیاری میں حصّہ لیا پھر بھی بعض باتیں میری ہدایت کے خلاف ہو گئیں ہیں۔

(۱) ادبستان کو جوشؔ صاحب کی نظم سے شروع کر دیا گیا۔

(۲) صفحہ ۱۱۲ پر بادۂ شیراز کے نام سے رنجورؔ صاحب عظیم آبادی کی فارسی کی غزل بغیر اصلاح دے دی گئی، جو ہرگز اشاعت کے قابل نہ تھی، اِس کے ساتھ ہی اِن کے نام کے آگے خود اِن کے قلم سے جس طرح "ساغری" لکھا ہوا تھا اس کو بحالہ رہنے دیا گیا۔ حالانکہ ۵
اِسے سب سے پہلے قلم زد کرنا چاہئے تھا۔

لوگوں نے اِس عہد میں تلمیذ کی نسبتی کی اہمیّت کا جنازہ نکال دیا ہے، اگر انسان ذوقِ سلیم کی روشنی میں سوچے تو نسبت ایسی نازک چیز ہے جو اظہار و اعلان کی ٹھیس کو برداشت نہیں کر سکتی، نسبت کو ظاہر کرنا خوش ظرفی نہیں، قیمت کو کم کرنے کے مترادف ہے، گویا بار اُٹھ نہیں سکا تو کہہ اُٹھے، ضبط نہیں ہو سکا تو ڈھول پیٹ دیا گیا۔

دوسرا رُخ اِس مسئلہ کا یہ ہے کہ مجھے اپنی دماغی حالت پر ابھی کچھ اعتماد باقی ہے، اِس اعتماد کی موجودگی میں میں کوئی قدم ایسا اُٹھانا پسند نہیں کرتا جو مجھے شیب یعنی بے اعتمادی سے قریب کرے، اپنی ذات سے نسبت دے کر اپنے احباب و تلامذہ کی ایک جماعت تیار کرنا، میں دماغی اور روحانی اعتماد کے منافی خیال کرتا ہوں، اِن احباب و تلامذہ کے تمام دماغی کیف و کم سے میں واقف ہوں، ہمیشہ اِن کی محبّت کی قدر کرتے ہوئے تحریر و تقریر کے ذریعہ اِنہیں سمجھاتا رہتا ہوں کہ اِن فروعات سے بلند ہو جائیں اور اگر وہ واقعی مجھ سے نسبت رکھتے ہیں تو میرے مقصد کو کامیاب بنائیں۔

ایک اور چیز نازک احساس ناظرین کو ناگوار ہو سکتی ہے اور وہ دو نمبروں سے میری عکسی تصویر کی اشاعت ہے۔ گذشتہ نمبر میں اصولِ تشہیر کی بنا پر کارپردازانِ "ایشیا" نے میری تصویر ہندی ایڈیشن کا ذکر کرتے ہوئے شائع کی تھی۔ اتفاق سے اِس نمبر میں بھی دو گروپ ایسے شائع ہو رہے ہیں جن میں مجھ روسیاہ کی شرکت ہے، لیکن میں سادگی کے ساتھ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اِس کی اشاعت سے مراد، نہ خود نمائی ہے

اور نہ ذوقِ خود نگری کی تکمیل

جوش میرٹھ آئے اور یکایک دہلی سے رخصت ہوئے، میرے دل پر اس آنے اور جانے کا اثر پڑا میں نے ایک شذرہ ان کے متعلق تحریر کیا۔ یونیورسٹی، نیز ادبی حلقوں کے اور احباب میرٹھ کے گروپ لئے گئے۔ ان میں سے دو بطور یادگار اس نمبر میں شائع ہو رہے ہیں۔

اول گروپ میں دو ہستیاں ایسی ہیں جنھیں آپ نظر بھر کر دیکھئے۔ قیصر صاحب میرٹھ کے نو طلوع ستارہ ہیں اور ان نظم و نثر میں وہ روشنی موجود ہے، جو ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ اس اہلیت کے ساتھ ہی ماشاء اللہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ارادی اور اختیاری طور پر لکھنے کے لئے سال سال بھر ضمیر کی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔ میں نے آئندہ نمبر کیلئے ان کا ایک شاہکار حاصل کر لیا ہے۔

دوسرے صاحب ہمارے دوست سید محمد یحییٰ میرٹھی ہیں، جو گویا دبستان کی مستقل "بسم اللہ" ہیں، آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ "ضمیر کی آواز" کے کبھی منتظر نہیں رہتے ۔۔۔۔۔ ؟

اس سہ ماہی میں وہ انتہائی کوشش کے باوجود "اسرائیل کا کنبہ" ترجمہ کر سکے، باوجود مکمل مایوس ہو جانے کے میں یحییٰ صاحب طرف سے دل شکستہ نہیں ہوں اور تدبیریں سوچتا رہتا ہوں کہ کس طرح آپ کے مطالعہ کے لئے ان سے کچھ حاصل کروں ۔۔۔۔ ! ؟

قدرت کے جبر سے جب دل نڈھال ہو تو کس سادنت میں ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ رسوم بھی ادا کرے جو زندگی اور موت سے تعلق رکھتی ہیں، نقصان ہو چکنے کے بعد میں تلافی کا قائل نہیں، مگر نقصان اور مسلسل نقصان بنی نوع بشر کی تقدیر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسانی فطرت قدم قدم پر بہلاوے اور فریب خوردگی کی عادی ہے۔ کسی نہ کسی توہم میں الجھے رہنا اس کے لئے شانتی اور سکون کا باعث ہے، اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نہ تعزیت غلط ہے اور نہ شکریہ، ورنہ تعزیت اول درجہ کی سنگدلی اور شکریہ "فریب خوردگی" کے علاوہ کچھ نہیں، بہرحال

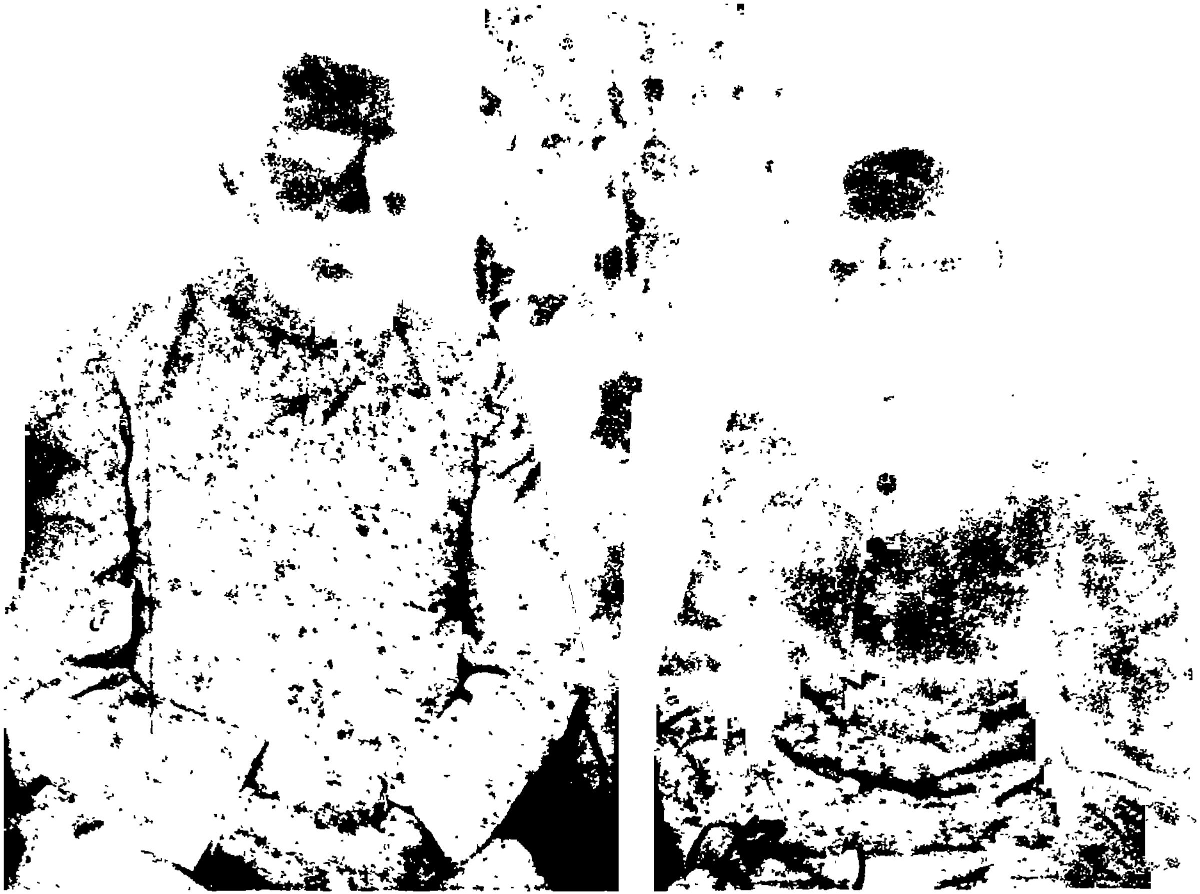
عزیزہ مرحومہ شاہجہاں بیگم کے انتقال پر جاننے اور نہ جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد نے میری غمگساری کی۔ سچ پوچھئے تو مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ملک میرے دکھ سکھ کا اتنا ساتھی ہے۔ دراصل جب فرد جماعت کی ملکیت بنجاتا ہے تو وہ اس عظیم خاندان میں شریک ہو جاتا ہے جو اس کی حیثیت و اثر کے لحاظ سے کبھی ایک ملک و قوم اور کبھی تمام دنیا کے افراد پر مشتمل تصور کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ کر سکے کہ احباب شناسا حضرات اور نہ جاننے والوں نے میری بہن کی موت کو "اس خاندان کی لڑکی کی موت" خیال کیا میرا خود کا غم اور بھی تیز ہو گیا!

نفسیاتی طور پر میرے لئے ان حقیقی تاثرات کی موجودگی میں جو میرے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے ہیں مشکل تھا کہ فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا۔ ان حضرات کا جنھوں نے مجھ سے ایک روحانی تعلق کا ثبوت دیا، مگر آج میں ایشیا کے ذریعہ یہ فرض ادا کرتا ہوں، زخم اپنی جگہ زخم ہے، الفاظ کے مرہم سے اندمال ممکن نہیں، اندمال تو اس جبر و فراموشی کا مرکب ہی کر سکیگا جو بنی نوع آدم کو قدرت سے ورثہ اور عطیہ کے طور پر ملا ہے، تاہم مجھے اعزا، احباب اور جملہ اصحاب کی مخلصانہ ہمدردی میں کوئی شک نہیں۔

ساغر



حضرت جوش ملیح آبادی ادبی مرکز میرٹھ میں
ساغر - نیّر - جوش - یزدانی



ساحر — دهلی چھوڑنے سے کچھ دن پہلے — جوش

ادبستان

ایشیا

پہلا باب

ادبیات وسیاسیات

اپریل، مئی، جون ۱۹۳۹ء

اِسرائیل کا کُنبہ

نسلِ یہود کی ذہنی، اور اِنقلابی قابلیّتیں

(از میکسم گورکی، مترجمہ سیّد محمد یحییٰ ہنگیری‌ٹی)

(تاریخی عجائبات میں سے سب سے زیادہ زندہ عجوبہ "قوم یہود" ہے۔ اگر گذشتہ تاریخ پر نظر کی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس سخت جان قوم نے زمانے کے ہاتھوں جو تکالیف برداشت کی ہیں وہ اگر کسی دوسری قوم پر نازل کی جاتیں تو شاید اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا مسیحیت کے عروج سے اس وقت تک تقریباً دو ہزار سال کی مدّت میں اس بدنصیب قوم کو کبھی چین اور سکھ میسّر نہ ہوسکا۔ ازمنہ وسطیٰ میں اسلامی سلاطین کی رواداری نے اس نسل کی حفاظت کی، لیکن مسلمانوں کے زوال کے بعد اسپین میں اور دوسرے یورپین ممالک میں یہودیوں کے خلاف جس جبر و تعدی کو روا رکھا گیا اس کی داستان پڑھ کر رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔ بالشویک روس سے قبل زار روس نے یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور آج جرمنی نے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہے اس کے خلاف ہر انصاف پسند انسان کا دل نفرت اور حقارت سے بھرا ہوا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر تمام دنیا کے قلوب اس نسل کے خلاف اس قدر تنگ کیوں ہوگئے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ اس قوم کو دو ہزار برس تک آوارہ پھرنے کے بعد بھی دنیا کا کوئی خطّہ چپّہ بھر زمین دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ محققین نے اِن سوالات کا جواب نقد و بصیرت کے ساتھ بالتصریح پیش کیا ہے اور قومِ یہود کی فطری تخریبی حرکتوں کو ان کی تباہ حالی کا اصلی سبب قرار دیا ہے، اِس جگہ ہمیں اس مسئلہ پر کوئی بحث کرنا مقصود نہیں ہے، شاید خود یہودی سیرۃ اِن تمام آفات کی ذمّہ دار ہو۔

موجودہ صدی کے سب سے بڑے انشا پرداز "میکسم گورکی"، نے مسئلۂ یہود کے متعلق ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا، جو اُس زمانہ کے تاثرات کا نتیجہ تھا۔ جب روس میں یہودیوں پہ بے پناہ مظالم توڑے جا رہے تھے، بلا شبہ یہود کی ذہنی قابلیتیں اور انقلابی رجحانات دنیا میں ہلچل پیدا کرنے اور نظاماتِ کہن کو توڑ مروڑ کر رکھ دینے کے بڑی حد تک ذمّہ دار ہیں۔ میکسم گورکی، نے یہودی قومی خصوصیات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز میں اس قوم کی دماغی برتری اور طبعی خلاقی کو مبالغہ کی حد تک سراہا ہے۔ یہ سرتاسر قوم یہود کا روشن پہلو ہے۔ ہم ذیل میں اس مقالہ کا ترجمہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں

.... "ادارہ")

مسئلۂ یہود! — یہ سیدھے سادے الفاظ تاریخ کے سب سے زیادہ اندوہناک اور سب سے زیادہ شرمناک اوراق کو نمایاں کرتے ہیں۔ اِن الفاظ کے ساتھ کراہیت اور نفرت کے شدید جذبات بھڑک اٹھنے چاہئیں۔ لیکن ہم شدید جذبات کا اظہار کئے بغیر اُن الفاظ کو منہ پر لا

کے عادی ہوگئے ہیں۔ بایں ہمہ یہ الفاظ ناانصافیوں کی مسلسل داستان کو پیش کرتے ہیں، یہ انسانی خون کے دریاؤں سے لبریز ہیں۔ نوع انسان کی بوقلموں حیات کے مکروہ اور سیاہ دھبّوں میں سے سب سے زیادہ مکروہ اور سیاہ ترین دھبّہ اِن الفاظ سے آشکارا ہوتا ہے۔

"مسئلہ یہود"! — جو لوگوں کے غلیظ جھوٹ اور افترا پردازی سے آلودہ ہے، میری رائے میں بالکل سادہ مسئلہ ہے۔ اس کا سرچشمہ خاص قماش کے لوگوں کے مخصوص طریقِ تفکّر میں مضمر ہے۔ اِن خاص قماش کے لوگوں کا طرزِ عمل، سوسائٹی کے لئے اس اصول پر مبنی ہے کہ "دنیا محض اس لئے معرضِ وجود میں آئی ہے کہ خاص میری ذات کے لئے راحت و تفریح کے سامان بہم پہونچائے"۔

ان لوگوں کے لئے جو اپنی حقیر "انانیت" کے سوا کسی چیز کو نہیں دیکھتے، جو اپنی منحوس ضروریات اور تفریحات کے دائرہ سے باہر کی ہر چیز کی طرف سے بے نیاز ہیں، یہودی ایک حیران کُن اور نفرت انگیز مخلوق ہے۔

یہ لوگ اس کی مثالیت (Idealism) کی بنا پر اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں اور کیوں نفرت کرنے پر مجبور ہیں؟ اس لئے کہ بدیہی طور پر دنیا کی کوئی طاقت یہودی کے قابلِ تعریف محقق دماغ کو تباہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی۔

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ بیان کروں تاکہ کوئی شخص اس امر میں شبہ نہ کرسکے کہ میں نے لفظ "آئیڈیلزم" اور "مادیت" کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یہاں "آئیڈیلزم" سے میرا مطلب کوئی متعین فلسفیانہ نقطۂ نگاہ نہیں ہے بلکہ وہ دلیرانہ روح جو انسان کو یونانی افسانہ کے "ہرکلیز" کی مانند خود اعتمادی سے سرشار کرتی ہے، جو انسان میں اُس ہمّت کو برقرار رکھتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ ہر گندہ اور بوسیدہ چیز کو ٹھیک اُسی طرح مٹا دیتا اور دور کردیتا ہے جس طرح "ہرکلیز" نے آجین کے اصطبلوں کو فضول توڑ اکر کٹ پاک وصاف کردیا تھا۔ دماغ کا اس قسم کا "آئیڈیلزم" "تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر کی کسی طرح بھی تردید نہیں کرتا۔ کیونکہ واقعتاً یہی "آئیڈیلزم" "تاریخ کے مادی تصوّرات اور مادیت کی تعلیمات کا خالق ہے۔

یہودی منارۂ نور

نوع انسان کے دُکھ بھرے سفر میں، ترقی کی اُس شاہ راہ پر جو علم و بصیرت کی طرف لے جاتی ہے، درماندہ رستہ کی ہر منزل پر، یہودی ایک "زندہ احتجاج" اور ایک محقق کی حیثیت میں کھڑا نظر آتا ہے، وہ ہمیشہ سے منارۂ نور بنا ہوا ہے۔ جس کی منفرد اور بلند رفعتیں، ہر گندگی کے خلاف، ہر اُس چیز کے خلاف جو انسانی زندگی میں پست اور ذلیل ہے، اس شدید اور ظالمانہ سلوک کے مقابلہ میں جو ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف روا رکھتا ہے، نفرت انگیز کم ظرفی کے خلاف، اور روحِ جہل کے مقابلہ میں، یہودی کا "اٹل احتجاج" دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلتا رہا ہے۔

یہودیت کے خلاف اس درجہ شدید نفرت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ یہودیت نے دنیا کو عیسائیت عطا کی، جس نے انسان کے شعور کو بیدار کیا، انسانی محبّت کے احساسات کو جگایا اور اس ضرورت کا احساس کرایا کہ جملہ مردوں اور عورتوں کی فلاح و بہبود کا پاس و لحاظ رکھا جائے۔ یہ بیداری "آقاؤں" اور "حیاتِ انسانی کے خداوندوں" کو پسند نہ آئی۔ عیسائیت کے پردے میں یہ لوگ ایک ایسے مذہب کو دیکھنا چاہتے ہیں جو (عوام) کو اطاعت گزاری اور ایثار و قربانی کی تعلیم دے تاکہ نوعِ بشر برضا و رغبت غلام بنانے والوں کے پیروں تلے روندے جانے پر آمادہ رہے۔ یہ لوگ اپنی اس کوشش میں بھی کامیاب ہوگئے ہیں کہ عیسائیت کو "غلاموں کے مذہب" میں تبدیل کردیں، اُسے عوام کے کاندھوں کا جوا بنائیں اور انصاف کے خلاف جنگ کرنے میں اُسے اپنی حفاظتی سپر بنائیں۔

لیکن عیسائیت کی تعلیم میں یہودی "آئیڈیلزم" کی روح کارفرما تھی۔ یہ ایک مغلوب نہ ہونے والی روح تھی، حکومت اور کلیسا کی تمام شورش اور ترغیب کے باوجود یہ روح اب تک کچلی نہ جاسکی۔ برخلاف اس کے اِس روح نے زندگی کے تاریک ترین گوشوں کو منوّر کردیا۔ یہودیوں نے اپنی

سرگرمی اور جوش کے ذریعہ انسانی زندگی میں گرمجوشی اور تلاشِ حق کے لئے انتھک حوصلہ پیدا کر دیا۔ امن و سکون کی اجازت نہ دے کر انہوں نے نوعِ بشر کو مسلسل بیدار رکھا ہے اور سب سے آخر میں (اور غالباً یہ واقعہ سب سے زیادہ اہم ہے) یہودی "آئیڈیلزم" نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے، جو کہ بعض طبقوں کے لئے سم قاتل ہے یعنی "سوشلزم"

میں اس بات میں یقین نہیں رکھتا کہ قوموں اور نسلوں کی باہمی دشمنی کوئی فطری چیز ہے۔ میں اس بات میں بھی یقین نہیں رکھتا کہ سوچ بچار کرنے کا کوئی ایسا مخصوص طریقہ اس دنیا میں موجود ہے جو سفید فام لوگوں میں سیاہ فام نسلوں کے خلاف فطری نفرت، یا غلاموں میں انگریزوں کے خلاف قلبی تنفر، یا روسیوں میں یہودیوں کے خلاف جذباتِ حقارت پیدا کرتا ہے۔

ایک سیاسی مسئلہ

روسی زندگی کے مخصوص حالات کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ یہاں ہر احساس خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ تیز اور زیادہ قوی انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسئلۂ یہود نے یہاں اس درجہ خوفناک شکل اختیار کر لی ہے، یہ صورت حال اتنی شدید ہے کہ اس نے تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور غم و غصہ کے جذبات مشتعل کرا دئے ہیں۔ روس میں مسئلہ یہود سب سے بڑھ کر ایک سیاسی مسئلہ ہے، روسی یہودیوں کا سب سے بڑا دشمن حکومت کا عملہ ہے۔ حکومت نے یہاں یہودیوں کو ایک ناقابل برداشت حالت میں ڈال دیا ہے۔ روحانی طور پر کچلنے اور جسمانی اعتبار سے فنا کر دینے کے لئے حکومت ہر ممکن بات عمل میں لا رہی ہے لیکن اس جوئے کے وزن کے نیچے بھی اس نسل کی حیرتناک قوت فنا نہیں ہوئی اس کی روحانی اور ذہنی صلاحیتیں زندہ و باقی ہیں اور تبدیل شدہ حالت میں جڑ پکڑ رہی ہیں۔

یہودیوں کو کچلنے کی غرض سے انھیں جن جن مصائب کا شکار بنایا گیا ہے ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ تمام مظالم بے نتیجہ ثابت ہوئے ہیں "ذہنی اختلاف" (Intellectual Opposition) میں یہودی پیش پیش ہیں۔

(قارئین کو ملحوظ رہے کہ میکسم گورکی نے روسی یہودیوں کے متعلق کچھ مدت پہلے کا نقشہ کھینچا ہے لیکن آج جرمنی اور اٹلی میں اسی کی بازگشت کو دنیا سن رہی ہے۔ یہودی قابلیتوں اور ذہنی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر من حیث القوم ان کی خود غرضیوں، سازشوں اور دنیا کی حالت سے بے نیازیوں اور بے گانگیوں پر غور کیا جائے تو میکسم گورکی کا مقالہ بے روح ہو کر رہ جاتا ہے)

عورت

(حضرت آتی جانسی)

مقصودِ نگاہِ اہلِ بینش — سرمایۂ نازِ آفرینش
جنّت ہی مراد تیرے دم سے — دل ہی تو ہی شاد تیرے دم سے
تسکین کو اضطراب کر دے — جو چاہے تو انقلاب کر دے
پردہ ترا شوق آفریں ہے — جلوہ ترا ذوق آفریں ہے
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

۲ تحصیلِ دل افتخار تیرا — پامالیٔ جاں شعار تیرا
ہر خیرہ سری دلبری دلیری — دل چھین لیا نگاہ پھیری
میں نے جب کبھی خطا کہیں کی — تیری طرف اعتنا نہیں کی
تعزیر کشش ہوئی دوبالا — آنچل سرکا دیا سنبھالا
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

فرمائش سوز، ساز تیرا — ایمائے نیاز، ناز تیرا
بیگانہ وشی ہے آشنائی — ہر سعیٔ حجاب خود نمائی
منہ پھیرے ہوئے کشادہ کاکل — دنیا کے وجود سے تجاہل
پھیلا ہوا دل کے واسطے جال — حیلہ کہ سکھائے جاتے ہیں بال
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

جب تجھ کو ہوا کبھی یہ شبہا — تھا تیغِ نظر کا وار اوچھا
بس بن گئی ایک برقِ مضطر — ایسی کہ شکار ہو نہ جاں بر
گردن موڑی نظر جھکائی — سینہ دیکھا، ملی کلائی
قامت کو عطا کیا وہ جھول — ہو جس سے خمِ کمر نمایاں
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

حیراں ہوں یہ ہے نمائشِ حسن — یا ہوتی ہے آزمائشِ حسن
اے نشۂ دلبری سے سرشار — برحق ہے نسائیت کا پندار
کیا ہے جو ہو تجھ سے بڑھ کے پیدا — آ دل میں ہو آ کے مسند آرا
زیبد بہ تو شانِ حکمرانی — ہے نذر تری یہ نظمِ مانی
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

دہلی میں حضرت جوش ملیح آبادی کی آخری نظم

جہاں میں تھا

یکم مئی ۱۹۳۹ء کی رات گذر جانے کے بعد ۲ بجے حضرت جوش ملیح آبادی نے خسرو اور غالب کی خوابگاہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا اور اپنے متعلقین کے ساتھ (جن میں ان کی اہلیہ، صاحبزادی، ان کے صاحبزادے سجاد حیدر، ان کے خویش الطاف احمد خاں اور ملازمین وغیرہ سب شامل تھے) اپنے وطن ملیح آباد تشریف لے گئے۔

ملیح آباد کی ملیح اور خوبصورت فضاؤں کی کشش نے آخر ان کو زندگی کا وہ بھید بتا ہی دیا جو اس وقت تک ان پر نہ کھل سکا تھا۔ وہ بھید ہے شریفانہ گوشہ نشینی، اس ذلیل اور مشین کار عہد میں شاعرانہ یکسوئی اور یکسوئی کے ساتھ انسانی دماغ و دل کی بے لوث ضیافت و خدمت!

حضرت جوش ۱۹۳۵ء کے جاڑوں میں حیدرآباد سے دہلی آئے اور تقریباً چار سال دہلی میں قیام فرما کر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کا دُنیا والوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ دہلی میں وہ کسی جماعت یا فرد کی دعوت پر نہیں آئے تھے، انھوں نے دہلی میں اپنے بل بوتے پر ماہنامہ "کلیم" جاری کیا (جو ملیح آباد سے اب بھی جاری رہے گا) اور اپنے کلام کو چند جلدوں میں شائع کیا جن کے یہ نام ہیں: —

نقش و نگار — شعلہ و شبنم — فکر و نشاط — جنون و حکمت

ان چار کتابوں کے علاوہ باقی تازہ کلام کو بھی ترتیب دیا، اور کورس کے لئے بھی اپنی نظمیں دہلی ہی میں ترتیب دیں۔ دہلی میں ان کے اولین معاون پنڈت شیونرائن ہرویا اسرکار وزیش پریس فتحپوری، دوسرے معاونین محمود علی خاں صاحب و حامد علی خاں صاحب ناظم مکتبہ جامعہ رہے، آخر کار جب ان کو زندگی کے نئے نئے تجربے ہوئے تو وہ خود ہی اپنے معاون

ثابت ہوئے۔

جوش سے اڈیٹر ایشیا کے روابط دوستانہ ہیں۔ یہ دوستی نہ کسی غرض کی بنا پر ہے اور نہ کسی عقیدت و احترام کی بنیاد پر یہاں تک کہ یہ دوستی محاسن کی بنیادوں پر بھی قائم نہیں ہے ہاں اگر اسے کچھ استحکام نصیب ہے تو محض معائب کی بنیادوں پر یعنی جس طرح اور جتنی انسان کی خلقی برائیاں ازل سے اس وقت تک مستحکم و جاری ہیں اسی طرح یہ دوستی بھی مضبوط و مسلسل ہے۔

میں یہ چند بے ساختہ سطریں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ ان کا ایک ہمعصر ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بربنائے خلوص و بے لوثی میں ان سے قریب تر ہوں اور بے تعلقی کی وجہ سے کوسوں دور۔ لیکن باوجود اس قرب و دوری کے مجھے جوش کے دماغ و دل اور ان کی حیرتناک نفسیات کو سمجھنے کا سو فیصدی دعویٰ یا خبط ہے!؟

اس دعویٰ یا خبط کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دہلی سے جوش کا ترکِ سکونت کرنا ایک سانحہ اور حادثہ ہے۔ اس حادثہ پر ادب کی تاریخ میں دہلی کی بے حسی اور مردم ناشناسی کا ہمیشہ ہمیشہ ماتم ہوتا رہے گا۔

جہاں تک جوش کی تحلیل نفسی (   ) کا سوال ہے سو ایک مستقل کتاب بھی اس کے لئے کافی نہیں۔ لیکن بہرحال اگر زمانے نے فرصت دی تو میں چند صفحے لکھوں گا ضرور جن میں جوش کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ کیونکہ ان کی برائیوں اور اچھائیوں کو میں شاید ان سے زیادہ جانتا ہوں لیکن اس وقت انکی مجموعی شخصیت کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ایسے اور اتنے متضاد عناصر کا فلسفی شاعر دنیا صدیوں ہی میں پیدا کرتی ہے ہندوستانی قوم کی اس سے بڑی خوش بختی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس میں جوش جیسا انسان پیدا ہوا، جس کو مسلمان......

.... برداشت

نہیں کر سکتے۔ لیکن جو مستقبل میں عظمت کے آسمان پر مہرِ نیمروز بن کر چمکے گا۔

جو لوگ جوش کو ذرا بھی قریب سے جانتے ہیں وہ شاید مجھ سے متفق ہوں گے کہ وہ دنیا اور انسان کو اپنے مطالعہ اور تجربہ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ہی کیا ہر شخص اپنے احساس اور قابلیت کے لحاظ سے اشیا اور کائنات کو اپنے تجربات زندگی کے اجالے میں دیکھتا ہے۔ اس شاعر اور عوام میں خواص بھی شامل ہیں۔" یعنی وہ عوام "جو عوام و خواص سے مل کر ایک جماعت بنتے ہیں) میں فرق صرف اس قدر ہے کہ عوام دیکھ کر چپ ہو جاتے ہیں اور شاعر اپنی مشتعل احساس کی وجہ سے جبر قدرت اور انسانی فطرت کی دنائت و کمزوری کے خلاف احتجاج کرتا ہے یعنی جب شاعر حقیقت و آگہی اور انسانی نفسیات کی دقیقہ رس دور فہمی کی منزل میں پہنچ جاتا ہے تو زندگی پر سوائے قہقہہ لگانے کے اس کی کچھ اور اہمیت نہیں سمجھتا۔

جس طرح انسانی دماغ اور ذہانت میں فرق ہوتا ہے اسی طرح دماغی انسان (شاعر اور فلسفی وغیرہ) اور "عوام" میں بھی فرق ہوتا ہے، گو سماج میں دماغی افراد بھی شامل ہیں لیکن سماج کو ان کی ضرورت ہے، ان کو سماج کی حاجت نہیں، کیونکہ ہر دماغی انسان بجائے خود اک انجمن ہے، اور سماج کے مفروضہ نظام سے بغاوت کرنا اس کی فطرت کا پہلا تقاضہ ہوتا ہے۔

جوش دماغی انسان ہے وہ سوسائٹی کی نچلی سطح پر آ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ نجی طور پر مصلحتیں بھی اس کو زمانہ کا غلام نہیں بنا سکتیں لیکن سماج کے اس خطرناک نظام میں جس کی باگیں اہل زر کے ہاتھوں میں ہیں دماغی انسان اور خاصکر شاعر کیلئے کوئی ایسا مرکز نہیں جہاں سے وہ طاقت پرست دنیا کو مرعوب کر سکے۔

شاعر، جبر، ظلم، حیوانیت، انسانی خودغرضی، غلامی، نفرت اور تمام اسی قسم کے دوسرے فاسد جذبات کو مٹانے کیلئے پیدا

ہوتا ہے اور سماج کو اعلیٰ اور لطیف تصورات سے روشناس کراتا ہے۔ اسکی ذہنی، روحانی، دماغی اور تہذیبی تکمیل میں مستر کے زمزموں کے ساتھ امداد کرتا ہے مگر دُنیا کے لئے یہ کوئی دلچسپ بات نہیں؛ اگر وہ دس ہزار فٹ کی بلندی سے بم گرا سکتا۔ یا کسی صوبہ کا وزیر اعظم ہوتا، یا محض ایک ریوالور ہی ہوتا۔ یا محض گیس کا ایک ڈبہ ہوتا تو اس "ترقی یافتہ" دُنیا کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ یعنی مشاہدات کی بنا پر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بنیادی طور پر روٹی اور خون کے مقابلے میں انسانی سوسائٹی کو اعلیٰ اور لطیف تصورات کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں جب وہ خون بہا چکے اور شراب ارغوانی کے ساتھ ڈنر تناول فرمالے تو شاید اسوقت اس کو اعلیٰ تصورات سے کھیلنے کی کچھ فرصت مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری میں دماغی انسان کی زندگی اور ترقی کا بظاہر کوئی مضبوط امکان نہیں۔

لیکن شاعر جو اپنے اعلیٰ اور لطیف تصورات کے رس میں دُنیا تو کیا خدا کو بھی اپنے من کی ایک موج سمجھتا ہے۔ اپنی ذات کو ان "افلاطونی خیالات" سے بہت اونچا خیال کرتا ہے۔ اسے سماج کی کوئی پرواہ نہیں، حالانکہ غیر شعوری طور پر وہ سماج ہی کی عزت بڑھاتا ہے اور اسکے دم سے سماج کی عظمت میں چار چاند لگتے ہیں۔ مگر سماج اسکے احساس کے سمندر کا ایک معمولی حباب ہے۔

ہم انگریزوں کی قدر اس لئے نہیں کرتے کہ اس میں کلائیو اور ولزلی پیدا ہوئے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس قوم میں شکسپیر شیلے، کیٹس اور بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ ہم جرمن قوم کو قیصر اور ہٹلر کی وجہ سے عظیم خیال نہیں کرتے بلکہ گیٹے اور نٹشے کی وجہ سے باعظمت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی قوم کی عظمت آنے والے زمانے میں ان چند سیاسی لیڈروں ہی کی وجہ سے نہیں ہوگی جو ملک کو "آئینی ترقی" کی راہوں پر چلا رہے ہیں، بلکہ اس وقت عظمت کی نئی نویلی دُلہن کی انگشتری کے ہیرے وہ جواہر ہوں گے جن کو دنیا نذر الاسلام، ٹیگور، اقبال اور جوش کے نام سے یاد کرتی ہے۔

بہرحال دہلی کے لاکھوں باشندوں کے لئے یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ اس عہد کے ایک عظیم ترین شاعر کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ اور ان کے کاندھوں پر لکھنؤ کی گذشتہ مہمان نوازیوں کا بار بحالہٖ باقی رہ گیا!؟

جس وقت جوش دہلی سے روانہ ہوئے ان کے مکان پر صرف ان کے دو مہمان اور ایک میں موجود تھا۔ وہ دہلی میں خود مختارانہ آکر بسے اور گوشہ گیر مسافر کی طرح چار سال رہ کر آزادانہ چلے گئے۔ جاتے وقت ان کی ذات پر دہلی کے ایک فردِ واحد کے احسانات کا بار نہ تھا، سب۔ سے پہلے انہوں نے مستقل اقامت قرولباغ میں اختیار کی اسکے بعد دریا گنج کی ایک کوٹھی میں جس کا نام "جینتی نواس" ہے دہلی کے قیام اور اس سے متعلق واقعات کو تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں لکھا جائیگا جسکے مسودات دماغ میں محفوظ ہیں۔ اس وقت اس سرسری نوٹ کی تحریر سے صرف یہ مقصود ہے کہ دُنیا "شاعر اور سماج" کے کمزور رشتہ سے واقف ہو جائے اور ہر دماغی انسان اپنی خود مختاریت کی طرف رجوع ہو۔ یعنی انسان کی خدمت انسان سے دور رہ کر سرانجام دے اور ہندوستان یہ جان لے کہ اب دہلی میں ایک انسان کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہی۔

دہلی سے روانہ ہوتے وقت جوش نے اپنی اعلیٰ انسانیت اور رفاقت کا ثبوت دیا، اور اپنے چار کتوں کو بھی سامان کی لاری پر بٹھا کر لے گئے تاکہ وہ ان کے بعد دہلی کی گلیوں میں مارے مارے نہ پھریں۔

ساغر

جہاں میں تھا!

شب آغوشِ چمن میں، صبحِ خنداں تھی، جہاں میں تھا
ہوائے سرد، موجِ آبِ حیواں تھی، جہاں میں تھا

زمیں کے چہرۂ رنگیں سے ایسی لَو نکلتی تھی
فلک کی شمع رہنِ طاقِ نسیاں تھی، جہاں میں تھا

چمن کے صحنِ رنگیں پر حقائق یوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی، جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسم ریز، روحِ شبنمستاں تھی، جہاں میں تھا

فرازِ ذہن کے رومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز، برقِ روئے تاباں تھی، جہاں میں تھا

شعاعِ عارضِ افسانۂ روئے مجازی سے
حقیقت مضطر و سر در گریباں تھی، جہاں میں تھا

صنم بردوش و کفر انگیز، محرابِ کلیسا میں
حرم کی شمعِ ایمانی فروزاں تھی، جہاں میں تھا

حقائق کے معطر جامعِ اضداد بستر پر
ہم خوابیدہ روحِ کفر و ایماں تھی، جہاں میں تھا

سرشتِ آدم و ابلیس تھی یوں محوِ سرگوشی
تجمل، آویزشِ یزداں و شیطاں تھی، جہاں میں تھا

چمن کے سرو و آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی، جہاں میں تھا

زراہِ معدلت کوشی، زبانِ مریمِ عصمت
جنونِ ذوقِ عصیاں کی ثنا خواں تھی، جہاں میں تھا

ستارے نقش بر دیوار تھے، مہتاب سکتے میں
مشیت، گوش بر آوازِ زنداں تھی، جہاں میں تھا

سرشکِ گریۂ پنہاں کی ظلمت خیز تابش میں
نگارِ خندۂ عشرت غزل خواں تھی، جہاں میں تھا

عروسِ وقت کی خواب آفریں آسودہ گامی سے
سبک، رفتارِ نبضِ چرخِ گرداں تھی، جہاں میں تھا

کبھی چہرے دمکتے تھے، کبھی زلفیں بکھرتی تھیں
حقیقت، نیم پیدا، نیم پنہاں تھی، جہاں میں تھا

کسی چشمِ سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے
ہر اک ذرے میں اک روحِ شبستاں تھی، جہاں میں تھا

مہکتے، مسکراتے، نیم وا غنچوں کے جھرمٹ میں
جوانی کی شکر خوابی، پرافشاں تھی، جہاں میں تھا

وفورِ آرزوئے جنبشِ دستِ زلیخا میں
عروسِ یوسفیت، چاک داماں تھی، جہاں میں تھا

قریبِ آبِ جو، میدان کے ڈھلتے کناروں پر
محبت کاکلیں کھولے خراماں تھی، جہاں میں تھا

ملائک ہی نہ تھے سجدے میں پیشِ آدمِ خاکی
الوہیت بھی زیرِ دامِ انساں تھی، جہاں میں تھا

جوشؔ ملیح آبادی

تشبیہ اور شعر و ادب میں اُسکی اہمیت

از سیّد محمد محی الدین بجور عظیم آبادی

تشبیہ کی تخلیق: ۔ دُنیا کے اُس دور کو لیجئے جبکہ انسان تمدن کی روشنی سے ناآشنا تھا، فنون و ادب کی تخلیق کا تصور بھی کوئی م
نہ رکھتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُس دورِ عتیق کا وحشی انسان دودھ کی طرح سفید چاندنی دیکھ کر نہ تڑپ اُٹھتا ہوگا؟ آبشاروں کے مدھر نغمے
میں طوفان بپا نہ کر دیتے ہونگے؟ وہ پھول کو ایک نازک شاخ پر ہنستا ہوا دیکھ کر کیوں نہ مچل جاتا ہوگا جبکہ جمالیاتی ذوق رکھنا مطلقاً
انسان کا ایک فطری ذوق ہے؟ .... ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے پاس الفاظ نہ تھے جو جذبات کی ترجمانی کرتے، ایسی حال
میں یقینی ایک وحشی جب دوسرے وحشی سے اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرنا چاہتا ہوگا تو چاند کی طرف اشارہ کر دیتا ہوگا۔ آنکھوں
تمثیل کے لئے جھیلوں کے کنول کو دکھا دیتا ہوگا، اور یوں ہی زمانہ جوں جوں گزرتا گیا، بربریت تہذیب سے بدلی۔ علم و ادب کی تخلیق ہوئی
انسان کا وجدان و ذوق شعری بلند ہوا ویسے ویسے یہ چیز بھی ارتقائی منازل طے کرتی رہی ——— اور یہی ہیں تشبیہ کے تدریجی مدا

ماحول کا اثر: ۔ یہ اور بات ہے کہ جغرافیائی حدود، آب و ہوائی تقسیم اور قوموں کے مخصوص جمالیاتی ذوق کے افتراق کے سب
اس نے نئے نئے چولے بدلے عرب کا شاعر معشوق کی آنکھ کو ہرن یا گاؤ وحشی کی آنکھ کہتا ہے، زلفوں کو لونگ و مشک کی سیاہی دی
اور دانتوں کو گلِ بابونہ سے ملاتا ہے، سرزمینِ فارس میں وہی آنکھیں نرگسِ بیمار ہو جاتی ہیں۔ زلفیں سنبل بن جاتی ہیں اور شبِ دیجور کا خطاب
ہیں، دانت وہاں انار کے دانے نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوستان کا شاعر زلف کی تشبیہ میں بھونرے اُڑاتا ہے، سانپ کے پھن لہراتا ہے، آنکھ
کی تعریف میں کنول کا پھول کھلاتا ہے اور دانتوں کی قصیدہ خوانی میں موتی پروتا ہے ———
متنبّی یاروں کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

خلا فیہ اھل وا وحشنا
وفیہ حرم مروح ابلہ

"وہ مکان یارانِ غمگسار سے خالی ہیں، حالانکہ رہنے والے موجود ہیں، اور وہ اونٹوں کے گلّے شام کے وقت چرا کر آتے ہیں لیکن میرا
اُداس ہوتا ہے کہ میرا یار نہیں۔"
بالکل یہی مضمون ہے جس کو فارسی کا شاعر یوں ادا کرتا ہے:

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم　　　جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کوری ماند

ریحور Book of Knowledge Vol. 8a

ہندوستان کا شاعر اسی تصویر کو دوسری رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کرتا ہے ـــــ

کوئی کوئی جس کوئل روئی ـــ رکت آنسو گھنگچی بن بوئی
جہاں جہاں ٹھاڑ ہوئے بن باسی ـــ تہاں تہاں گھونگچی کے راسی
بوند بوند مہر جانو جیؤ ـــ گنجا گونج کرے پیؤ پیؤ
تہیں دکھ بھلے پراس نپاتے ـــ لوہو بودی اٹھے ہوے راتے

"آہ! جس چیز کو لوگ گھونگچی کہتے ہیں وہ حقیقت میں کوئل کے خونی آنسو ہیں جو اس نے جنگل میں بوئے ہیں! یہ فراق زدہ جہاں جنگل میں پہنچ جاتی ہے وہاں ان رنگین (گھونگچیوں) کا ڈھیر لگ جاتا ہے جن کی بوند بوند میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان ہے اور پیا کا نام جپ رہی ہے۔ اس دردناک منظر کو دیکھ کر ٹیسو کے پتے گر گئے اور اسکے پھول خون کے آنسوؤں میں ڈوب کر نمایاں ہونے لگے۔"

پی سے کہیو سندیس ہا ہے بھونرا ہے کاگ
سو دھنی برہے جلی موئی تہی کا دھواں ہم لاگ

"کوا اور بھونرا آخر کالے کیوں ہیں، اسکے سیاہ ہونے کی بھی ہو نہ ہو کوئی وجہ ضرور ہے، سُنئے ـــــ ناگمتی کہتی ہے ـ اے! بھونرے اور کوے میرے منوہر من موہن، سے جا کر پیام کہدے کہ میں (ناگمتی) ہجر میں جل کر خاک ہو گئی، اگر وہ شوخ ثبوت چاہے تو اپنے سیاہ سیاہ بال و پر دکھا دینا جن کو میرا دھواں لگ گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ شاعر جو تشبیہں اور استعارے استعمال کرتا ہے قصداً نہیں کرتا، نہ اسکے ارادے کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے، بلکہ اس
'9 کے گرد و پیش کی چیزیں قطعی غیر ارادی طور پر سمٹ کر اسکے تصور میں آجاتی ہیں اور خود بخود نظم ہو جاتی ہیں۔ شکسپیئر نے کیا خوب کہا ہے:۔

"شاعر کی آنکھ لطیف وارفتگی کے عالم میں گردش کرتی ہوئی آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان تک نظر کرتی ہے اور جیسے ہی تخئیل نامعلوم اشیا کی تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعر کا قلم اس کو مجسم بنا دیتا ہے اور اشیائے موہومہ کو ایک مقامی مسکن دیکر کسی نام سے موسوم کر دیتا ہے"۔

Pastoral Poets (دہقانی شاعری) میں Virgil اور Dryden نے خوب خوب رنگ آمیزی کی ہے لیکن غور سے اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بیشتر مقاموں میں فطری غیر آہنگی پائی جائیگی کیونکہ دہقانی گلہ بانوں کی تصویر کھینچنے کے بجائے انہوں نے امراو شرفا کی تصویریں پیش کی ہیں، ہاں جادو بیاں ملٹن البتہ بہت بڑا نباض فطرت ہے، اسکی تصویروں میں کتنی ہی رنگ آمیزی کیوں ہو مگر Natural کا رنگ پھیکا نہیں ہوتا، شعراء عموماً بوڑھے انسان کو خزاں رسیدہ درختوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن ملٹن کی انفرادیت ملاحظہ ہو۔

"جنگل کی سرزمین کس قدر خاموش نظر آتی ہے، ہر درخت اور پھول اپنے اپنے فرائض انجام دیکر خاموش افسردگی کے ساتھ پڑا ہوا ہے جس طرح کہ آخر عمر میں لوگ خراب و خستہ ہو کر آرام و سکون حاصل کرتے ہیں"۔

تشبیہ کی اہمیت:۔ شعر و ادب میں تشبیہ گویا حُسنِ کلام کا زیور ہے، کسی جذبہ کا صحیح اثر دماغ پر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جبتک کہ جذبہ یا تخئیل کا ایک بدیہی نقشہ آئینۂ دماغ میں بن آجائے۔

کلام کے اندر جوش و شوکت پیدا کرنے میں الفاظ کا بھی حصہ ہے لیکن . . . . . نظم و نثر اور تحریر و تقریر میں ساری جادوگری اسی کے دم سے ہے۔ تشبیہ ایک تخئیل کو زمین سے آسمان پر چڑھا دے سکتی ہے اور یہی عنصر دنیائے ادب کا وہ عنصر ہے جو شاعری کو مصوری سے ممتاز کر دیتا ہے، علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

طشتِ گردوں سے ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے یا کھولی ہے فصدِ آفتاب

ساغر صاحب ایک جگہ آفتاب کی تشبیہ میں کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں ——

صبح کے ہلکے دھندلکے میں کوئی پیکر ہے تو
یا عروسِ صبح کا اک زرفشاں جھومر ہے تو

یا برہمن کی جبیں کا قشقۂ انور ہے تو
یا فلک کے ہاتھ میں سونے کا اک ساغر ہے تو

یا کسی شاعر کے دل کا داغ ہے دہکا ہوا
یا بہشتِ حسن کا اک پھول ہے مہکا ہوا

یہ ایسی تصویریں ہیں کہ ان کی روگشتی میں مانی اور بہزاد کے قلم قاصر ہیں سیکڑوں قسم کے رنگ کی رنگا رنگی اور بوقلمونی بھی یہ بات پیش نہیں کرسکتی جو ان چند تشبیہوں نے پیش کردی ہے۔ بات یہ ہے کہ مصورِ حسن کے خارجی پہلو میں خط و رنگ کے امتزاج سے دلکشی اور نظر فروزی پیدا کرسکتا ہے، لیکن داخلی پہلو کی تصویر کشی اسکے بس کی بات نہیں۔ بخلاف اسکے شاعر کا تصورِ فطرت کے گوشہ گوشہ سے گزر کر حسن و رعنائی، رنگ و بو کی سیر کرتا ہوا اک ڈرامہ دکھلاتا جاتا ہے، مجازی تشبیہوں سے حقیقت کی جھلکیاں عریاں کرتا اور شبہ کو بے نقاب کردیتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر چیز اپنی فطری حالت میں بھلی اور دلکش معلوم ہوتی ہے اس لئے تشبیہوں میں جہانتک ممکن ہو مجاز و حقیقت کی یک رنگی اور تطابق کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے، قدمائے عرب کی شاعری میں یہ رنگ بہت گہرا تھا ان کی اکثر اور بیشتر تشبیہیں اسی قسم کی ہوتی تھیں۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا
واسیافنا لیل تہاوی کواکبہ

(ہمارے سروں پر سیاہ سیاہ غبار اور ان میں چلتی ہوئی تلواریں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے رات ہو اور اس میں تارے ٹوٹ رہے ہوں)

فارسی میں بھی ایسی تشبیہیں ہیں مگر وہی ماحول کا اثر دامن کا دامن نہیں چھوڑنے دیتا۔ ہماری اُردو شاعری فطرت سے بہت دور جا پڑی ہے اس لئے آپ کو اُردو میں ایسی تمثیلیں کم ملیں گی، پھر بھی انیس اور نظیر اکبرآبادی کا کلام ہمارے ادب کا بڑا گراں مایہ سرمایہ ہے۔ چکبست، حالی آزاد نے انگریزی ادب کی تقلید کی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، —— حضرت عباسؓ پر ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں۔ دشمنوں کا چہار طرف نرغہ ہے۔ انیس اس حالت کا سماں کیا خوب بیان کرتا ہے۔

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

دو تشبیہیں انیس کی اور سن لیجئے۔

گردن میں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

موجودہ دور میں اقبال، جوش اور ساغر کے کلام میں یہ رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے، عشق کا تعلق کیفیات اور حیاتِ قلبی سے ہے گویا کمال شاعر بدیہی اور فطری تشبیہ سے اسے جیتی جاگتی تصویر بنا دیتا ہے ——

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق (اقبال)

قریب قریب یہی تخیل ہے، مگر تصویر زیادہ صاف اور نمایاں ہے، ملاحظہ ہو ——

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر — نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے جا ہوتا ہے گم نور کا لیکر آنچل — چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم — موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے کیفِ محبت میں یونہی دل میرا

شاعر کی نظر جتنی باریک بین، فطرت کا مطالعہ جتنا گہرا اور (شعور تصور) جسقدر تیز ہوگا تشبیہیں اتنی ہی بلند ہونگی، اور دل میں گھر کرنے والی (ورڈ سورتھ) اور (والٹر اسکاٹ) کا بیان اتنا دلکش اور تشبیہیں جیتی جاگتی صرف اس لئے ہیں کہ ان کا مطالعۂ فطرت بہت گہرا تھا۔

اسکاٹ کی نظموں کو دیکھ جائیے، جہاں جہاں اس نے باغ، جنگل اور پہاڑ کی فضا اور منظر کو نظم کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع کی روح میں جو خاصیتیں تھیں اسکاٹ نے ان سبھوں کو انتخاب کر لیا تھا، اسکی نظموں کو دیکھکر وہی سماں بندھ جاتا ہے جو آنکھیں وہاں مشاہدہ کر سکتی تھیں، مشہور ہے کہ روکبی کا قصہ جب وہ لکھ رہا تھا تو اس کے ایک دوست نے دیکھا کہ اسکاٹ ان چھوٹے چھوٹے بیل بوٹوں کو جو اس زمین میں اگے ہوئے تھے غائر مطالعہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور آپ اپنے نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا ہے۔ دوست نے پوچھا اس درد سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول نہ تھے؟ اسکاٹ نے جواب دیا ——

"دوست! دو چیزیں بھی کائنات میں ایسی نہیں جو بالکل مشابہ و یکساں ہوں" —— کوسائیں (فرانس کا مشہور نقاد) کا خیال ہے کہ "محاسنِ فطرت کی تقلید اور خوبصورت مناظر کو دیکھنے کی مسرت فنونِ لطیفہ کی اصلی مہیجات نہیں، بلکہ جس طرح دماغ ان کا مطالعہ کرتا ہے اسی طرح ان کی ترجمانی کرنے سے ادبیات کی ابتدا ہوتی ہے" —— اس لئے تشبیہوں کو چسپاں بنانے کی خاطر شاعر کو فطرت کا غائر مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے مطالعہ ہی نہیں بلکہ ہر شے کی روح میں جو خاصیت ہے اس کا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کشی شاعر کا کمال ہے۔

قدیم عربی شاعری میں امرؤالقیس، سنسکرت میں کالیداس، بھاشا میں تلسی داس اور اردو میں میر انیس اور نظیر اکبرآبادی ممتاز مثالیں ہیں۔ مرکب اور مفرد تشبیہ :- تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، مفرد اور مرکب، مفرد جیسے پھول کو چہرہ سے تشبیہ دی جائے۔

مرکب جیسے "میدانِ جنگ میں گرد اٹھی تو اس میں تلواریں یوں چمکتی تھیں جیسے رات میں ستارے" ——

انسان کی فطرت تنوع پسند واقع ہوئی ہے، جو چیزیں بار بار نظر کے سامنے آتی ہیں ان میں جاذبیت نہیں رہتی۔ مفرد تشبیہیں تعداد میں کتنی ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک مدت کے بعد ندرتِ بیان سے قطعی مبرا ہو جاتی ہیں۔ بخلاف اسکے مرکب تشبیہ کا میدان بہت وسیع ہے۔ متاخرین نے قدما کی متانت اور جزالت سے ہٹ کر تشبیہات کو استعارات کی لطافت سے سبک کر دیا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مشک و عنبر کی جگہ گلاب اور کیوڑہ کے چھڑکنے لگے، علامہ شبلی کے خیال میں فارسی میں اس کا موجد نظامی ہے۔ اردو میں مومن اور غالب کے عصر میں یہ چیز گرما گرمی کے ساتھ آئی تھی اور انیس و دبیر نے اسے معراج بخشی ہے۔ نظامی کا شعر ہے ؎

بہ باغِ شعلہ دہد دہقانِ انگشت — بنفشہ می درود ولالہ می کشت

خوابِ نرگس خمار دیدۂ او — نازِ نسریں بدرم خریدۂ او

مرزا غالب کہتے ہیں ؎

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر — ہے داغ اب بھی زینتِ جیب و کفن مجھے

داغِ عشق کی تپش کو کیا کہا جائے، آفتاب کی تپش بھی ہیچ ہے، اگر چاک گریباں کو دیکھئے کہ صبح کے وقت بھی عیاں ہے
میر صاحب فرماتے ہیں ؎

بدر ساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پہ یہ آگ ورنہ تھا پہلے مرا جوں ماہِ نو دامن جلا

مصحفی ؎

جو پھرا کے رُخ کو اس نے بقصد نقاب اُٹھا اِدھر آسماں اُٹھا اُدھر آفتاب اُٹھا

موجودہ دور کی شاعری میں یہ صنف بہت پسند ہے، ریاض خیر آبادی کا ایک شعر ہے ؎

یہ کالی کالی بوتلیں ہیں جو شراب کی راتیں انہیں میں بند ہیں میرے شباب کی

ان مثالوں میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہیں یعنی مجموعی کیفیات ہیں مفرد اسے کہیں گے ؎

شاخِ آہو ہیں بھویں چشم ہے چشمِ جادو مشکِ نافہ تھا اگر ناف میں اک تل ہوتا

مبالغہ اور استعارہ: - اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ استعارہ کی تخلیق کیونکر ہوئی اور وہ کون سے اسباب تھے جو اس کے محرک ہوئے، یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان کی فطرت ایک ہی چیز ہمیشہ دیکھنا پسند نہیں کرتی جوں جوں دماغ کی پرورش ہوتی ہے خیال میں بھی باریکیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ادب و شاعری میں لطافت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح تشبیہات میں جب حد سے زیادہ ترقی ہوا تو استعارہ و مبالغہ کی داغ بیل پڑی۔

سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوائے صیقل

اقبال نے بھرتری کے شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

جوہر

نازک کلائیاں میری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

یہیں حد ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ مستعار منہ بھی اکثر مجلس سے نکال دئے جاتے ہیں اور صرف اسکے لوازمات کا ذکر کر کے مستعار منہ کا تصور کر لیا جاتا ہے ——— غالب کا شعر ہے،

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے؟ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے؟

قلم کے دندان و انگشت کہاں؟ ناطقہ کا سر و گریبان کیسا؟ لیکن حیران و ششدر کے اوصاف سے قلم کو متصف کر دیا، اب قلم اچھا خاصا منشی ہے اور ناطقہ شاعر۔

نسیم کا مشہور شعر ہے ؎

داماں صبح پر نظر آتا تو ہے مجھے ہاں ایک داغ بے اثریٔ نالۂ شب

ظاہر ہے کہ صبح کے دامن نہیں ہوتا نہ نالہ کا داغ کہیں دیکھا گیا، مگر افق کو یہاں دامنِ صبح اور آفتاب کو داغِ نالہ بنا دیا گیا

امرالقیس کہتا ہے،

حملت ردینیا کان شباتہ
منا لھب لم تیصل بدخان

(میں نے نیزہ اُٹھایا، جس کا پھل شعلوں کے مانند تھا، مگر اس شعلہ جیسا نہیں جس میں دھواں لپٹا ہو)۔

میر انیس نیزہ کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ مصرع

گویا زباں نکالے ہوئے اژدا چلا

دوسری جگہ دو نیزوں کے ٹکرانے کے سماں کو کیا خوب نظم کیا ہے۔ مصرع

دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

تڑکا تڑکا ہے تارے جھلملا رہے ہیں۔ صبح کی دیوی کا آنچل کچھ سرک گیا ہے، میر انیس اس "منظر گزراں" کی تصویر یوں کھینچ کر دکھاتے ہیں

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں — چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار پر گل مہتاب کی خزاں — مرجھا کے رہ گئے ثمر شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے :

قاآنی نے اسی منظر کو یوں پیش کیا ہے ؎

دریچۂ فلک از نقرۂ سپید کشود — وزاں دریچہ فرو ریخت دانہ ہائے گہر
بزیر سپہر امادی کی یغمامۂ زود — کشود بال و فرو خورد ہرچہ بود اخگر
عزیق نیل فلک شد ستارہ چوں فرعون — نمود تا ید بیضا ز خود کلیم سحر

تشبیہ کی بعض خامیاں۔ جدت اور صنعت جتنی خوش آیند اور نظر فروز ہے اتنی دشوار گزار اور خطرناک بھی، اس راہ میں اکثر بڑے بڑے اساتذہ کے پاؤں بھی لغزش کھا گئے اور کھا جاتے ہیں، مرکز نگاہ فروگذاشت ہو جاتا ہے اور تشبیہ بالکل معمہ بن کے رہ جاتی ہے ملاحظہ ہو ؎

رقص پامال ہو چال ایسی ہے اے شاہ سوار — ساز مطرب ہے ترے گھوڑے کا یہ ساز نہیں — (ناسخ)

ماہِ کنعاں، چاہِ کنعاں آب خجلت سے ہوا — چشمۂ خورشید کو بھی تو نے شبنم کر دیا — (ناسخ)

سبزۂ خط ہر دم اس میں سے آتا ہے نظر — دو دتلیاں میں ہے عالم طوطیوں کے جال کا — (ناسخ)

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانے چرخ پیر — پھر جو اٹھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا — (ذوق)

رستم عید از برائے نغم کاؤس بہار — نو شدار و از دل دیو خزاں می آورد — (قاآنی)
یا منو چہرہ صبا ازپی آفریدوں ربیع — فتح نامہ سلم وے از خاوراں می آورد

اردو شعرا میں اس قسم کی بے اعتدالیاں کچھ نہ کچھ ہر شاعر میں پائی جاتی ہیں لیکن ناسخ نے جس قدر مہمل بکا ہے شاید بقیہ پورا ادب اردو اس کا جواب پیش نہ کر سکے۔ دو شعر اور سن لیجئے ——

نہ بیٹھا انتظار یار میں تکیہ لگا کر میں — کہ جوشن بن گیا ہوں اپنے دروازے کے بازو کا

جب خط مشکیں ہوا اس صنم رم کا رقم   زلف پیچاں کا قلم بھارو شناٸی غال کی

رستم وعید، کاؤس و دیو خزاں، منوچہرہ وصبا، یا میاں تاسخ کے "جوشن بن گیا ہوں اپنے دروازے کے باندکا"۔ وغیرہ میں۔ کوئی وجہ شبہ معلوم نہیں ہوتی —— ان اشعار کے پیش کرنے سے میرا مدعا اساتذہ کی عزت و وقعت کم کرنی اصلا نہیں دکھانا یہ ہے کہ حد سے زیادہ غلو سے تشبیہیں کس قدر دور از قیاس ہو جاتی ہیں، مگر مشاق اور اہل فن شعرا ہر جگہ اپنی استادی سے کچھ نہ کچھ کام لے ہی لیتے ہیں (جیسا اوپر غالب اور نسیم کے شعر میں موجود ہے) قاآنی کو دیکھئے غلو میں اکثر سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن پھر بھی کلام پر قدرت ہے، بعض جگہ محال کو بھی مثال اور اعتقاد کے زور سے امکان کو یقین کی حد میں لے آتا ہے، مثلاً

آسمان فتح را نعل سمند او ہلال   نو عروس ملک را گرد سپاہ او نقاب

محسن کاکوروی کو دیکھئے اپنے استدلال شعری سے محال محض کو کس طرح ممکن کر دکھاتا ہے ؎

ہو گئے زخم درون سینۂ عاشق کے ہرے   اشک گلرنگ کے چھڑکنے سے گل ہو کھلے

لالہ زار دل پر داغ سے رنگت بدلے   ساتھ ساتھ آتے ہیں نالوں کے جگر کے ٹکڑے

شجر آہ رسا میں نکل آئی کونپل

ایک پامال اور فرسودہ تشبیہ ہے مگر مصحفی نے جدت بیان سے اس کو کتنا بلند کر دیا ہے ——

اس کا عالم میں نرگ خواب میں دیکھا   جس طرح کہ ہوتی ہے نرگس کی کلی بند

میر حسن کا شعر ہے ؎

لیجائے جیسے غنچۂ پژمردہ کو صبا   تو آہ ! لے کے لخت جگر یہ تہ گئی

اس لئے شاعر کا کمال یہ ہے کہ اگر وہ خیالی تشبیہ سے کام ہی لے تو صرف انہیں جنونوں تک تخیل کو محدود رکھے جن کے اوصاف ۲
نمایاں ہو کر محسوسات اور مسلمات میں شامل ہو گئے۔ مثلاً

بوسہ لباں کا دینے کہا کہ کے پھر گیا   پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

مرغان قفس میں اب گھبرائے ہوئے ہیں   ماتم زدوں کے حلقے میں ہو نوحہ گر ہے

(باقی)

ٹوالسٹائے

(خدا کے حضور میں)

ٹوالسٹائے کے نام سے دُنیا ناآشنا نہیں ہے۔ البتہ جن خیالات نے اس کے دل کی دُنیا میں ہل چل پیدا کی اور جن جذبات نے اس کو نہ صرف مسرور ہی کیا بلکہ بارہا مدہوش بھی کر دیا۔ ان کا لطف ان ہی بدمستوں کو آیا ہوگا جنھوں نے اس کے میخانہ میں بادۂ معرفت کے جام چڑھائے ہوں گے۔ اس نے فن کی دُنیا میں ڈوب کر جو سوز و مستی کے مزے لوٹے اور سراغ زندگی کی جستجو میں شک کی جو کرب و بےچینی اٹھائی اس کی جھلک اس کی تصانیف میں دکھائی دیتی ہے۔

اگر ایک طرف عہدِ شباب بادہ نوشی اور عیش و عشرت سے ہم آغوشی میں گزرا تو دوسری طرف زمانۂ پیری سوزِ دروں و حق گوئی میں بسر ہوا۔ اگر عنفوانِ شباب میں اس روسی قلندر کو بدمستیوں میں چور دیکھتے ہیں تو دوسری طرف زمانِ پیری میں اس عارفِ کامل کو جلوہ ہائے حقیقت میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں۔

زمانۂ ملازمت کی مدہوش مصروفیتوں کا ذکر جس بیباکانہ انداز سے ٹوالسٹائے نے اپنی ڈائری میں کیا ہے محتاجِ بیان نہیں ہے میخواری و حسن پرستی کے مشاغل۔ بادۂ وصل کے مزے غنچگانِ سبزہ آغاز سے عیش و نشاط اور اسکی رسوائیاں۔ قماربازی کی بربادیاں۔ غرض زندگی کا کوئی تاریک پہلو باقی نہ رہا جس کا مزہ ٹوالسٹائے نے نہ چکھا ہو اور اس کا ذکر نہ کر دیا ہو جب یک لخت جوانی ختم ہوئی اور درخشاں پیری کا آفتاب طلوع ہوا تو وہی بادہ مست و عشق مست و حسن مست اب ربابِ روح کے نغموں سے مدہوش ضمیر کی روشنی میں راہِ حق طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔

نشۂ حق سے سرشار ہو کر اس نے وہ زورِ قلم دکھایا کہ زارِ روس کی تلوار کند ہو گئی اور ٹوالسٹائے کے نحیف و نازک لیکن حق گو قلم کا مقابلہ نہ کر سکی ٹوالسٹائے نے نہ صرف حکومت ہی کے خلاف جہاد کیا بلکہ کلیسا کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ان کٹھن دوراں دشمنوں کے مقابلہ میں صدائے حق بلند کرنا کسی معمولی انسان کا کام نہ تھا۔ یہ وہی ہستی کر سکتی تھی جس کی نگاہِ ضمیر باطن ہی میں تجلی طور کے جلوے بسے ہوئے ہوں جس کا ساغرِ دل بادۂ عرفاں سے لبریز ہو۔ جس کے لئے ہر خوف باطل یا ور ہر ہراس معطل ہو گیا ہو۔ جس کو نہ موت کی جستجو نہ زندگی کی آرزو باقی رہی ہو جس کا مقصدِ حیات ضمیر کی روشنی میں

"صراطِ مستقیم" پر چلنا اور مدام چلنا بن گیا۔ ٹوالسٹائے نے برہنہ تلواروں کی چھاؤں تلے جس دلیری سے اپنے معتقدات کا اظہار کیا وہ ہر ایماندار سے خراجِ تحسین وصول کرے گا

ٹوالسٹائے کے ناول آج بھی اسکے روحانی پیچ و تاب کا پتہ دیتے ہیں لیکن ہم اس وقت اس کی غیر معروف تصنیف "دورِ جدید کی غلامی" کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں ایک مضمون خاص طور پر پیش نظر کرنے کے قابل ہے اس کا عنوان ہے "حکومت منظم تشدد ہے"۔

اصول عدم تشدد ٹوالسٹائے کے ایمان کا سب سے بڑا ستون ہے۔ جس کا مفصل ذکر اس نے اپنے مضمون "میرا مذہب" میں کیا ہے۔ پیر روسی کل انسانی زندگی کی بنیاد اسی اصول پر رکھتا تھا جس مضمون کی طرف ہم نے آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے ملکی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ حکومت ایک منظم تشدد ہے اور تشدد سے فنا نہیں ہو سکتی۔ تشدد کو تشدد سے فنا کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا شعلہ کو شعلہ سے خاموش کرنا۔ اس لئے۔ حکومت کو فنا کرنے کے لئے ٹوالسٹائے نے ترکِ تعاون کا ایک پروگرام دیا ہے ہندوستان کے زندانی شاید اس کو شوق سے پڑھیں افسوس کہ اس وقت میرے سامنے نہیں ورنہ مکمل پروگرام پیش کر دیتا مجبوراً حافظہ پر تکیہ کرتا ہوں اور اس پروگرام کے خدوخال جو ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔ اس پروگرام کی چند اہم تجاویز حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) حکومت کے خطاب یافتہ اپنے خطاب واپس کر دیں۔

(۲) وکیل وکالت ترک کر دیں۔

(۳) طالب علم اسکول چھوڑ دیں۔ ۴

(۴) نوکری پیشہ نوکری سے دست بردار ہو جائیں۔

(۵) مزدور کارخانوں میں کام کرنا بند کر دیں۔

(۶) فوج والے استعفےٰ دیدیں۔

(۷) رعایا حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دے۔

چند سال ہوئے کہ ہندوستان اس روسی قلندر کے پروگرام پر عمل کر رہا تھا۔ لیکن اس امر کا اعتراف کہ یہ نسخۂ کیمیا پیر روسی کا عطیہ ہے کسی کی زبان سے نعرۂ تحسین نکلا نہ نالۂ جان سوز۔ ہمارے مدبرین نے ترک تعاون کے نام سے اس پروگرام کو اس طرح ملک کے روبرو پیش کیا گویا یہ ان کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اہلِ نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ہندوستانی مدبروں نے کس کی خوشہ چینی کی ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں مختلف خدام ملک کے مجسمے بھی نصب کئے گئے بزرگانِ ملت کی تصویروں کی نقاب کشائی بھی ہوئی لیکن جس کے گلشن کی شاخیں لیکر سرزمینِ ہند میں لگائی تھیں اس انسان کی تحسین میں ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا بلکہ دعوی کئے تو یہ کہ گجرات سے بیج آیا اور گنگا جل سے سینچا گیا۔

غلامی جہاں انواع و اقسام کے عیوب پیدا کرتی ہے وہاں غلام قوم میں تشکر اور ممنونیت کا جذبہ بھی فنا کر دیتی ہے جب کوئی قوم احسان کرنے کے قابل نہیں رہتی تو احسان فراموش بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری ذہنیت اس حد تک پست ہوگئی ہے کہ اعتراف حق میں بھی شرم معلوم ہونے لگی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ ایمانداری سے اس امر کا اعتراف کیا جاتا کہ

ھندوستان رومی قلندر کے پیغام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا ممنون احسان ہے۔
ٹوالسٹائے جیسی شخصیت کے سامنے انصاف کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے میرے چند شعر کسی زندہ دل کو گدگدا دیں پیش کئے دیتا ہوں شاید قبول خاطر ہوں۔

شب گذشتہ فروغِ خودی تھا جلوہ نما
چراغ روح سے روشن ہوئی تھی بزمِ شعور

میں سوچتا تھا خودی گر نہ ہو خدا بھی نہ ہو
جو سوزِ عشق نہ ہو نالۂ رسا بھی نہ ہو

جو حسن و عشق نہ ہوں روبرو ادا بھی نہ ہو
جو جنبش لب نازک نہ ہو صدا بھی نہ ہو

زمیں پہ جرأتِ انساں سے کارفرمائی
فلک پہ آدمِ خاکی سے جلوہ آرائی

یہ خشک و تر یہ فضا یہ ملائک و ملکوت
یہ نور و نار یہ دُنیا یہ عالمِ ناسوت

خرد کے دام میں انساں اسیر رکھتا ہے
کشادہ گوش ہے چشمِ صبیر رکھتا ہے

بلندتر ہے زمان و مکاں سے اسکی نگاہ
خدا کی ذات ہے اسکی خرد کی جولانگاہ

وہ لامکاں کو بھی قیدِ مکاں میں لاتا ہے
وہ ارتقائے خودی میں خدا کو پاتا ہے

خودی جو دامنِ وہم و گماں کو چاک کرنے
خودی جو کعبۂ دل ان بتوں سے پاک کرے

خودی وہ جس سے رموزِ ازل ھویدا ہوں
خودی وہ جس سے یقین و ثبات پیدا ہوں

خودی جو طوقِ غلامی کو پارہ پارہ کرے
خودی جو خاک کے ذرّہ کو ماہ پارہ کرے

خودی جو سیم و زر و مال سے فزوں تر ہو
خودی جو قیل سے اور قال سے فزوں تر ہو

اسی خیال میں سرمست محوِ خواب ہوا
نگاہ گم ہوئی احساس بے نقاب ہوا

تلاش عشق و خودی دیدہ ہائے بینا تھے
یہی نظارہ کن جلوہ ہائے سینا تھے

اِسی تلاش سے پیدا تھے چشم و گوش و دہاں
اسی تلاش نے واضح کئے رموزِ جہاں

نظارہ سوز تھے وہ جلوہ ہائے یزدانی
خرد تھی تیرہ و تار اور خودی تھی نورانی

ہوا شعور کہ ارواح کی یہ بستی ہے
جہاں نہ کوئی بلندی ہے اور نہ پستی ہے

جہاں نہ بندہ و آقا نہ کوئی میر و فقیر
جہاں نہ گردش شام و سحر میں کوئی اسیر

جہاں نہ دانۂ گندم کی فتنہ زائی ہے
جہاں کے ذرّہ میں مستور کبریائی ہے

جہاں ہے رنگ جُدا۔ بو جُدا۔ بہار جُدا
جہاں ہے نغمہ جُدا۔ لے جدا۔ شعار جُدا

جہاں کا مہر جُدا۔ ماہ کا کمال جُدا
جہاں کا حُسن جُدا۔ ضو جدا۔ جمال جُدا

"صراطِ مستقیم" پر چلنا اور مدام چلنا بن گیا۔ ٹوالسٹائے نے برہنہ تلواروں کی چھاؤں میں جس دلیری سے اپنے معتقدات کا اظہار کیا وہ ہر ایماندار سے خراجِ تحسین وصول کرے گا

ٹوالسٹائے کے ناول آج بھی اسکے روحانی پیچ و تاب کا پتہ دیتے ہیں لیکن ہم اس وقت اس کی غیر معروف تصنیف "دورِ جدید کی غلامی" کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں ایک مضمون خاص طور پر پیش نظر کرنے کے قابل ہے اس کا عنوان ہے "حکومت منظم تشدد ہے"

اصول عدم تشدد ٹوالسٹائے کے ایمان ایمان کا سب سے بڑا ستون ہے۔ جس کا مفصل ذکر اس نے اپنے مضمون "میرا مذہب" میں کیا ہے۔ پیر روسی کل انسانی زندگی کی بنیاد اسی اصول پر رکھتا تھا جس مضمون کی طرف ہم نے آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے وہ کئی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ حکومت ایک منظم تشدد ہے اور تشدد سے فنا نہیں ہو سکتی۔ تشدد کو تشدد سے فنا کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا شعلہ کو شعلہ سے خاموش کرنا۔ اس لئے۔ حکومت کو فنا کرنے کے لئے ٹوالسٹائے نے ترکِ تعاون کا ایک پروگرام دیا ہے ہندوستان کے زندانی شاید اس کو شوق سے پڑھیں افسوس کہ اس وقت میرے سامنے نہیں ورنہ مکمل پروگرام پیش کر دیتا مجبوراً حافظہ پر تکیہ کرتا ہوں اور اس پروگرام کے خد و خال جو ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔ اس پروگرام کی چند اہم تجاویز حسب ذیل ہیں۔

(۱) حکومت کے خطاب یافتہ اپنے خطاب واپس کر دیں۔

(۲) وکیل وکالت ترک کر دیں۔

(۳) طالب علم اسکول چھوڑ دیں۔

(۴) نوکری پیشہ نوکری سے دست بردار ہو جائیں۔

(۵) مزدور کارخانوں میں کام کرنا بند کر دیں۔

(۶) فوج والے استعفے دیدیں۔

(۷) رعایا حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دے۔

چند سال ہوئے کہ ہندوستان اس روسی قلندر کے پروگرام پر عمل کر رہا تھا۔ لیکن اس امر کا اعتراف کہ یہ نسخۂ کیمیا پیر روسی کا عطیہ ہے کسی کی زبان سے نعرۂ تحسین نکلا نہ نالۂ جان سوز۔ ہمارے مدبرین نے ترکِ تعاون کے نام سے اس پروگرام کو اس طرح ملک کے روبرو پیش کیا گویا یہ ان کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اہلِ نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ہندوستانی مدبروں نے کس کی خوشہ چینی کی ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں مختلف خدام ملک کے مجسمے بھی نصب کئے گئے بزرگانِ ملت کی تصویروں کی نقاب کشائی بھی ہوئی لیکن جس کے گلشن کی شاخیں لیکر سرزمینِ ہند میں لگائی تھیں اس انسان کی تحسین میں ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا بلکہ دعوی کئے تو یہ کہ گجرات سے بیج آیا اور گنگا جل سے سینچا گیا۔

غلامی جہاں انواع و اقسام کے عیوب پیدا کرتی ہے وہاں غلام قوم میں تشکر اور ممنونیت کا جذبہ بھی فنا کر دیتی ہے جب کوئی قوم احسان کرنے کے قابل نہیں رہتی تو احسان فراموش بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری ذہنیت اس درجہ تاریک ہو گئی ہے کہ اعتراف حق میں ہمیں شرم معلوم ہونے لگی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ ایمانداری سے اس امر کا اعتراف کیا جاتا کہ

ہندوستان روسی قلندر کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا ممنون احسان ہے۔ ٹالسٹائے جیسی شخصیت کے سامنے انصاف کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے میرے چند شعر کسی زندہ دل کو گدگدا دیں پیش کئے دیتا ہوں شاید قبول خاطر ہوں۔

شب گذشتہ فروغ خودی تھا جلوہ طراز
چراغ روح سے روشن ہوئی تھی بزم شعور

میں سوچتا تھا خودی گر نہ ہو خدا بھی نہ ہو
جو سوز عشق نہ ہو نالۂ رسا بھی نہ ہو

جو حسن و عشق نہ ہوں روبرو ادا بھی نہ ہو
جو جنبش لب نازک نہ ہو صدا بھی نہ ہو

زمیں پہ جرأتِ انساں سے کارفرمائی
فلک پہ آدمِ خاکی سے جلوہ آرائی

یہ خشک و تر یہ فضا یہ ملائک و ملکوت
یہ نور و نار یہ دُنیا یہ عالمِ ناسوت

خرد کے دام میں انساں اسیر رکھتا ہے
کشادہ گوش ہے چشمِ بصیر رکھتا ہے

بلند تر ہے زمان و مکاں سے اسکی نگاہ
خدا کی ذات ہے اسکی خرد کی جولانگاہ

وہ لامکاں کو بھی قیدِ مکاں میں لاتا ہے
وہ ارتقائے خودی میں خدا کو پاتا ہے

خودی جو دامنِ وہم و گماں کو چاک کرنے
خودی جو کعبۂ دل ان بتوں سے پاک کرے

خودی وہ جس سے رموزِ ازل ہویدا ہوں
خودی وہ جس سے یقین و ثبات پیدا ہوں

خودی جو طوقِ غلامی کو پارہ پارہ کرے
خودی جو خاک کے ذرّہ کو ماہ پارہ کرے

خودی جو سیم و زر و مال سے فزوں تر ہو
خودی جو قیل سے اور قال سے فزوں تر ہو

اسی خیال میں سرمست محوِ خواب ہوا
نگاہ گم ہوئی احساس بے نقاب ہوا

تلاش عشق و خودی دیدہ ہائے بینا تھے
یہی نظارہ کن جلوہ ہائے سینا تھے

اِسی تلاش سے پیدا تھے چشم و گوش و دہاں
اسی تلاش نے واضح کئے رموزِ جہاں

نظارہ سوز تھے وہ جلوہ ہائے یزدانی
خرد تھی تیرہ و تار اور خودی تھی نورانی

ہوا شعور کہ ارواح کی یہ بستی ہے
جہاں نہ کوئی بلندی ہے اور نہ پستی ہے

جہاں نہ بندہ و آقا نہ کوئی میر و فقیر
جہاں نہ گردش شام و سحر میں کوئی اسیر

جہاں نہ دانۂ گندم کی فتنہ زائی ہے
جہاں کے ذرہ میں مستور کبریائی ہے

جہاں ہے رنگ جدا۔ بو جدا۔ بہار جدا
جہاں ہے نغمہ جدا۔ لے جدا۔ شعار جدا

جہاں کا مہر جدا۔ ماہ کا کمال جدا
جہاں کا حسن جدا۔ ضو جدا۔ جمال جدا

جہاں کی گردشِ افلاک کا نظام جدا
جہان کا ذوق جدا اور شیخ و شاب جدا

سرود و ربطِ دل سے بڑھا تھا عشق کا جوش
رباب روح کے [illegible]

ہوئی فلک سے نمایاں جبینِ جبرائیل
وہ خیرِ گل کہ ہے جس کی جبیں جلیل جمیل

فضا میں گونج تھی بے انتہا تھا جوش و خروش
کوئی فرشتہ رہِ راستی تھا دوش بدوش

ہوا یہ شور کوئی خاک داں سے آیا ہے
زبانِ راستی دلِ پاکباز لایا ہے

ندا یہ آئی ریو حاضر حضور ہوا
جو آب و گل سے بنا تھا وہ باشعور ہوا

ہوا اشارۂ جبریل حمدِ باری کر
دیارِ شوق میں آیا ہے اشک باری کر

سنا! زمین میں آدم کی جستجو کیا ہے؟
رہا نہ دہر میں لالہ کا رنگ و بو کیا ہے؟

ترے دیار میں عاشق کی آبرو کیا ہے؟
زمیں میں آدمِ خاکی کی ہاؤ ہو کیا ہے؟

ریو حمدِ باری کرتا ہے

اے وہ کہ تجھ سے دلِ مضطرب کو تابِ قرار
اے وہ کہ پیکرِ خاکی میں آئی تجھ سے بہار

ترے جمال سے لالہ کا داغ شعلہ فشاں
ترے جلال سے بادل کے دل میں برق نہاں

ترے جمال سے مہتاب میں درخشانی
ترے جمال سے کل کائنات نورانی

ترے جمال سے شام و سحر میں رعنائی
ترے جمال سے ہر چشم دل میں بینائی

ترے جمال سے چشمِ خودی فروزاں ہے
ترے جمال سے شمعِ حیات سوزاں ہے

ترے جمال سے بود و نبود پیدا ہے
ترے جمال سے عشقِ ازل ہویدا ہے

میں تیرے پاس تری یاد لے کے آیا ہوں
بشر کا محضرِ فریاد لے کے آیا ہوں

تری زمین میں اب دورِ شہریاری ہے
ترے جہان میں دولت کی سحرکاری ہے

وہ انجمن نہ رہی اور وہ گفتگو نہ رہی
وہ ذکرِ حق نہ رہا۔ حق کی جستجو نہ رہی

دیارِ حسن میں پہلا سا رنگ و بو نہ رہا
وہ لالہ رو نہ رہے شیشہ و سبو نہ رہا

وہ حسن و عشق میں باہم تعلقیاں نہ رہیں
تبسمِ لبِ جاناں میں بجلیاں نہ رہیں

جو عرقِ شرم تھی ابرو وہ باوضو نہ رہا
نگاہِ ناز کی موتی سی آبرو نہ رہی

وہ شمعِ طور تو ہے چشمِ نور جو نہ رہی
فروغِ وادیِ ایمن کی آرزو نہ رہی

اے وہ کہ مذہبِ فطرت کا پاسباں تو ہے
فسانۂ شبِ ہجراں کا رازداں تو ہے

نہ رنگ لالہ میں نے سوز و سازِ بلبل میں
نہ بو گلاب میں باقی نہ پیچ و تابِ سنبل میں

۲۹

نہ ضبط صید میں ہے اور نہ جرأت پرواز
چمن میں رہتا ہے صیاد گوش برآواز

ہوس نے گلشن فردوس کو شرارہ کیا
ہوس نے دامنِ الفت کو پارہ پارہ کیا

کہیں ہیں تیغ بکف اور کہیں کمان بردوش
کہیں ہیں خوانِ سیاست پہ گرم نوشانوش

تری زمین میں سرمایہ دار شعلہ فشاں
مٹا رہے ہیں مساوات کا وہ نام و نشاں

تفنگ و تیر سے سرمایہ دار مستحکم
خراج دیتے ہیں دہقاں کے دیدۂ پُرنم

جو کھیت سینچتا ہے مزدور کے پسینے سے
جو دانہ اُگتا ہے دہقان کے دفینے سے

وہ سب امیر کے خوانِ ہوس کا سرمایہ
شکارِ ظلم و ستم ہے غریب بے مایہ

سیاست اُن کی فریب اور عبادت اُنکی رسوم
تجارت اُن کی جُوا سحر کار اُن کے علوم

فریبِ عقل سے دُنیا کو رام رکھتے ہیں
وہ ہر چمن میں چھپا ایک دام رکھتے ہیں

مجالس اُن کی طلسمِ فریب ہیں یکسر
حقوقِ ملّت و دیں مکر و ریب ہیں یکسر

وہ قیصری ہو کہ جمہور کی حکومت ہو
قتیلِ خنجرِ دولت ہے کوئی صورت ہو

تجارت ان کی قبا پوش ملک گیری ہے
کرشمہ زارِ ہوس فتنۂ امیری ہے

ہیں زخم خوردۂ شمشیرِ خواجگی مزدور
سرورِ بادۂ دولت سے مست ہیں جمہور

جو بُت شکستہ تھے ملّت کے کارساز بنے
جو بانیاز بنائے تھے بے نیاز بنے

جو خرقہ پوش ہے وہ بادہ نوش بھی ہے ضرور
جو اہلِ علم ہے وہ سیم و زر سے بندۂ زور

ہوس ہے، حُسن ہے۔ زنداں ہے۔ دستِ قدرت ہے
مگر نہ دیدۂ یعقوب ہے، نہ حسرت ہے

شرر ہے وادیٔ ایمن ہے طورِ سینا ہے
نہیں ہے گر تو وہی ایک چشمِ بینا ہے

ہوس ہنوز فسوں گرِ دیارِ ہستی ہیں
بشر ہنوز طلسمِ ہوا و مستی ہیں

مقامِ عشق و محبت نظر سے پوشیدہ
عروسِ حُسن و تجلّی ہنوز نادیدہ

مئے الست سمائی ہوئی ہے سینوں میں
دلوں میں چشمِ محبت کے آبگینوں میں

مگر خرد کو ابھی تک سرِ خمار نہیں
ہنوز عقلِ بشر مستِ چشمِ یار نہیں

بشر رواں ہے گزرگاہِ اہرمن میں ابھی
خودی ہے صیدِ زبوں دامِ راہزن میں ابھی

جوہر میرٹھی

بکھرے ہوئے پھول

انقلاب کا طوفان سر بہ فلک ایوانوں کو، غریبوں کے جھونپڑوں سے بھی پست بنا دیتا ہے۔

ظلم کا پودا عجز و انکسار کی سرزمین میں پھولتا پھلتا ہے، ظلم کو جھکانا چاہتے ہو تو قوت پیدا کرو۔ ایسی قوت جو مصلحت اندیشی کے فریب اور نفس کی کمزوری سے پاک صاف ہو۔

عقل اور علم، آدمی کو بزدل اور مصلحت اندیش بنا دیتے ہیں، جاہل اور وحشی قوموں کے آزادی کے صحیفے، سنگینوں کی نوکوں سے بھی چاک نہیں ہو سکتے۔ شاید! تمدن و تہذیب غلامی سکھاتے ہیں۔

سربلندی چاہتے ہو، تو خطرات میں کودنے کی عادت ڈالو۔ نرم قالینوں اور مخملیں صوفوں پر آرام کرنے والے جسم، کبوتر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے کانپ جاتے ہیں۔

پھانسی کے پھندے اور پھولوں کی سیج میں صرف زاویۂ نگاہ کا فرق ہے۔

آزادی بغیر قربانی اور قربانی بغیر جذبہ کے ناممکن ہے۔

آزادی کا سورج، آگ اور لہو کی چوٹیوں سے طلوع ہوتا ہے

شیر گولی کھانے کے بعد شیر ہوتا ہے۔ باغیوں کو ظلم کرنے والوں کا احسان مند ہونا چاہیئے۔

ممکن ہے کہ میں بہت سے رنگین نظاروں کو بھول جاؤں، مگر نرم و گداز ہتھیلیوں کا لمس، میرے محسوسات کبھی نہیں

بھول سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے۔ کاش! ایسا ہو سکتا۔

جوانی کے بہت سے نام ہیں، ایک نام محبت بھی ہے! بڑھاپا، محبت کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں قوت ہوتی تو "بوڑھے عاشقوں" کو سخت سے سخت سزا دیتا۔

ملوکیت کی اصطلاح میں استبداد کی ہر مخالفت کا نام "بغاوت" ہے۔

سچائی کے جوہر کو جتنا دباؤ گے، اتنا ہی اُبھرے گا۔

مصوّر کا قلم اور شاعر کا ذہن، دونوں تصویریں کھینچتے ہیں، ایک تصویر میں انگلیوں کی نزاکتیں اور دوسری تصویر میں دل کی دھڑکنیں بند ہوتی ہیں! شاعر، آرٹسٹ نہیں، آرٹ کا خلاق ہوتا ہے۔

انقلاب چاہتے ہو تو لٹریچر کو آزاد بناؤ، قوموں کی زندگی سے شعروادب کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

بہت سے آنسو جھوٹے اور بہت سی مسکراہٹیں بناوٹی ہوتی ہیں۔

٣١

جماہیاں اور انگڑائیاں، حسن اور نغمہ، محبت اور جوانی — زندگی کے یہ چند عنوانات ہیں۔

ماہرالقادری

افسوس کہ محدود ہے عرفاں تیرا — قطرے کی گرفت میں ہے طوفاں تیرا
تو خود کو سمجھ رہا ہے جزوِ عالم — عالم تو خود اک جزو ہے ناداں تیرا

خود اپنے ہی دائرے سے باہر ہو جاؤں — اپنی ہی نگاہِ خیر میں شر ہو جاؤں
درپیش ہے وہ مقامِ عزت و قرب — اب یاد کروں انہیں تو کافر ہو جاؤں

جوش ملیح آبادی

کارل مارکس کا نظریۂ سرمایہ،

جنس کن دو قسموں کے سرمایہ سے مل کر بنی ہے؟!

اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنی ضرورت کے لحاظ سے مادہ کی شکل بدل کر استعمالی چیزیں بناتا رہتا ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اگر وہ اپنی ذاتی ضرورت پورا کرنے کے لئے کوئی چیز بناتا ہے تو اس کو "استعمالی چیز" کہتے ہیں اور اگر تجارتی غرض سے نفع پیدا کرنے کیلئے تیار کرتا ہے تو اس کو "جنس" کہتے ہیں۔

۱ آج کل دنیا میں جنس کا دور دورہ ہے اور اس کی پیداوار اور خرید و فروخت "سرمایہ داری" کہلاتی ہے۔

فی زمانہ دو قسم کی جنسیں بنتی ہیں۔ اول قسم وہ جو فوراً صرف میں آجاتی ہے۔ مثلاً کپڑا۔ اور دوسری وہ ہے جو خود براہِ راست خرچ میں نہیں آتی بلکہ براہِ راست صرف میں آنے والی دوسری جنس پیدا کرتی ہے۔ مثلاً مشین۔

کپڑا براہِ راست صرف میں آجاتا ہے لیکن مشین براہِ راست خرچ میں نہیں آتی۔ کپڑا خرچ ہونے کے لئے ہوتا ہے اور مشین پیداوار کیلئے لیکن یہ دونوں چیزیں انسانی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اور اسی بنا پر ان کی قیمت ہے۔

ایک کپڑے کی فیکٹری کو دیکھئے خواہ وہ فیکٹری کی عمارت ہو یا روئی کی گانٹھیں یا سوت کاتنے کی مشین یا کپڑا بننے کی مشینیں، یا بجلی کا موٹر یا مشینوں میں استعمال ہونے والا تیل وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مادہ اور انسانی محنت سے مرکب ہیں۔ مادہ قدرت کی طرف سے مفت ہوتا ہے اس لئے جنس کی تمام تر قیمت انسانی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

فرض کیجئے کہ یہ سب چیزیں ایک ہزار آدمیوں کی ۳۶۵ دن کی محنت کا نتیجہ ہیں اور ہر آدمی کی اک روزہ محنت ایک روپیہ کے برابر ہے تو کل فیکٹری کی قیمت ۳۶۵۰۰۰ روپیہ ہوئی۔ مان لیجئے کہ فیکٹری کی عمارت ایک لاکھ روپیہ کی ہے۔ روئی ایک لاکھ روپیہ کی ہے مشینیں بھی ایک ہی لاکھ روپیہ کی ہیں اور باقی ۶۵ ہزار کے متفرقات ہیں۔

اب تجربہ اور مشاہدہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فیکٹری سال بھر دس گھنٹے روز چلے اور ایک لاکھ گز کپڑا بنائے تو دس برس میں فیکٹری کی عمارت اتنی بوسیدہ ہو جائے گی کہ اس میں کام نہ ہو سکے گا۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ فیکٹری کی عمارت کی قیمت میں سے ہر سال دس ہزار روپیہ کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ اور یہ رقم کپڑے کے ایک لاکھ گز کی قیمت کا جزو ہو جاتی ہے۔ اگر مشینوں کی عمر بھی دس برس

مان لیں تو وہ بھی فی سال دس ہزار روپیہ کپڑے کی قیمت میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ جس طرح بجلی گھر سے بھی تار کے ذریعہ آکر بجلی کے قمقمے کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح مشین اپنی قیمت، مزدور کے کام کرنے کی طاقت کے ذریعہ کپڑے میں اضافہ کرکے کپڑے میں قیمت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ عمل مشین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام مُردہ سرمایہ کے ساتھ ہے۔ روئی اگر پچاس ہزار روپیہ کی خرچ ہوتی ہے اور متفرق اخراجات ۶۵ ہزار کے ہوتے ہیں اور ایک سال میں ایک لاکھ گز کپڑا بنایا جاتا ہے تو اس کی قیمت کے اجزا حسب ذیل قوم ہونگی۔

عمارت		مشین		روئی		متفرقات
۱۰٫۰۰۰	+	۱۰٫۰۰۰	+	۵۰٫۰۰۰	+	۶۵٫۰۰۰

اور اگر یہ مان لیں کہ سو مزدوروں نے ایک سال کام کیا جن کی اُجرت بارہ ہزار روپیہ ہے تو ایک گز کپڑے کی قیمت حسب ذیل ہوگی۔

عمارت		مشینیں		روئی		متفرقات		مزدوری
روپیہ		روپیہ		روپیہ		روپیہ		روپیہ
۱۰٫۰۰۰	+	۱۰٫۰۰۰	+	۵۰٫۰۰۰	+	۶۵٫۰۰۰	+	۱۲٫۰۰۰

یعنی کل ۱٫۴۷٫۰۰۰ روپیہ ہوئے۔

مزدوروں کی اُجرت کے علاوہ جتنا بھی سرمایہ ہے یعنی ۳ لاکھ ۶۵ ہزار روپیہ اس کو کارل مارکس نے Constant capital کا نام دیا ہے۔ ہم اس کو مردہ سرمایہ کہیں گے اور بارہ ہزار کی رقم جو مزدور کو دی جاتی ہے اس کو کارل مارکس نے Variable Capital کہا ہے ہم اس کو زندہ سرمایہ کہیں گے۔ جب زندہ سرمایہ یعنی مزدور مُردہ سرمایہ یعنی مشین پر عمل کرتا ہے اس وقت کپڑا پیدا ہوتا ہے۔ زندہ سرمایہ یعنی مزدور اپنے کام کرنے کی طاقت سے روئی کو سوت میں اور پھر سوت کو کپڑے میں تبدیل کرکے نئی قیمت پیدا کرتا ہے۔ دوسرے مشین میں جو سماجی ضروری محنت موجود ہوتی ہے اس کو زندہ کرکے کپڑے میں داخل کرتا ہے۔ اگر مشینیں ایک لاکھ روپیہ کی ہیں اور سال بھر میں ایک لاکھ گز کپڑا بناتی ہیں تو ایک دن میں دو سو اکہتر گز کے قریب کپڑا بنائیں گی۔ اور اس میں ۲۷ روپیہ کی قیمت داخل کرینگی۔ جب پہلے روز مشینیں چلیں گی اور دس گھنٹہ کے بعد دو سو اکہتر گز کپڑا تیار کرینگی تو کام شروع ہونے سے پہلے ان کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہوگی۔ ۲۷ روپیہ کی کمی مشین کی گھسائی کی قیمت ہوگی۔ کیونکہ مشین نے گھسنے گھستے اپنی قیمت روئی میں داخل کر دی۔ اگر وہ نہ گھستی تو روئی میں استعمالی قیمت پیدا نہ ہوتی یعنی روئی کپڑا نہ بنتی۔ یہ گھسائی ہر روز جاری رہیگی یہانتک کہ مشینیں اپنی ایک لاکھ روپیہ کی پوری قیمت روئی میں داخل کر دینگی اور خود بیکار ہو جائیں گی۔ اسی طرح سارا مُردہ سرمایہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو کپڑے کی شکل میں تبدیل کر دے گا۔ مشین کی استعمالی قیمت روئی میں استعمالی قیمت پیدا کرتی ہے اور مشین کی اصل قیمت روئی میں اصل قیمت پیدا کرتی ہے لیکن یہ عمل از خود نہیں ہوتا بلکہ زندہ سرمایہ یعنی مزدور اپنی محنت کرنے کی طاقت سے مشین میں سے استعمالی اور اصل قیمت نکالتا ہے اور روئی میں داخل کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مشین کی استعمالی اور اصل قیمت میں کیا فرق ہے۔ مشین کی استعمالی قیمت اس کی خصوصیت ہے کہ وہ جوتا نہیں بنا سکتی کپڑا ہی بنا سکتی ہے۔ اصل قیمت وہ ضروری سماجی وقت ہے جو مشین بنانے میں لگتا ہے۔ مشین کی استعمالی قیمت نے روئی میں استعمالی قیمت پیدا کی۔ یعنی اس کو کپڑا بنایا اور مشین کی اصل قیمت نے کپڑے میں اصل قیمت پیدا کی۔ یعنی مشین میں جو ضروری سماجی محنت تھی وہ کپڑے میں داخل کی اور کپڑے میں اصل قیمت پیدا کر دی۔ یہ صاف ہو گیا کہ مُردہ سرمایہ اپنے آپ کو گھٹا بڑھا نہیں سکتا۔ اس کو جو چیز گھٹا بڑھا سکتی ہے وہ سماجی ضروری محنت اور وقت ہے

اس جملے کو ہم آگے چل کر واضح کرینگے۔ یہاں یہ سمجھنا کافی ہے کہ اگر ایک مشین میں ایک ہزار گز کپڑا بُننے کی استعمالی قیمت یا اہلیت ہے جس کے بعد وہ بیکار ہو جاتی ہے تو وہ صرف ایک ہزار گز کپڑے ہی میں استعمالی قیمت پیدا کر سکتی ہے اور اگر اس میں ایک ہزار روپیہ کی اصل قیمت ہے تو وہ ایک ہزار روپے کی اصل قیمت کپڑے میں پیدا کر سکتی ہے۔ اس تمام بیان سے یہ اظہار کرنا مقصود ہے کہ مُردہ سرمایہ صرف اپنے آپ کو زندہ سرمایہ کی مدد سے دوسری جنس میں منتقل کر سکتا ہے۔ وہ نہ از خود گھٹ سکتا ہے نہ بڑھ سکتا ہے۔ نہ قیمت بڑھا سکتا ہے اور نہ نفع پیدا کر سکتا ہے۔ وہ محض جنس کی قیمت کا جزو ہوتا ہے۔

اب ہم آپ کی توجہ زندہ سرمایہ کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر بارہ ہزار روپے سے سو مزدوروں کی کام کرنے کی طاقت ایک سال کے لئے خریدی جائے تو فی مزدور دس روپیہ ماہانہ اُجرت ہوئی یعنی سوا پانچ آنے روز۔ یہ زندہ سوا پانچ آنے جنس کی قیمت میں صرف سوا پانچ آنے ہی منتقل نہیں کرتے بلکہ اس سے زیادہ قیمت نئی جنس میں منتقل کرتے ہیں۔

زندہ اور مُردہ سرمایہ میں یہی سب سے بڑا فرق ہے کہ زندہ سرمایہ برخلاف مُردہ سرمایہ کے جنس میں اپنی قیمت سے زیادہ قیمت پیدا کرتا ہے جس کو قیمت کا بڑھاؤ کہتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک مزدور سوا پانچ آنے کی اُجرت پر فی دن جو بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے بارہ گز کپڑا بناتا ہے۔ فرض کیجئے کہ بازار میں جتنا کپڑا ہے اتنی ہی اسکی مانگ ہے اسکے یہ معنی ہوئے کہ کپڑے کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنی اصل قیمت پر فروخت ہوگا۔ فرض کیجئے کہ کپڑے کی اصل قیمت آٹھ آنے گز ہے تو بارہ گز کپڑا چھ روپیہ کا ہوا۔ فرض کیجئے کہ بارہ گز میں ایک روپیہ کی برابر قیمت عمارت اور اتنی ہی قیمت مشینوں نے منتقل کی اور ایک روپیہ کی روئی اور ایک روپیہ کی متفرق اشیاء خرچ ہوئیں۔ تو کل چار روپیہ تو مُردہ سرمایہ نے کپڑے میں منتقل کئے اور بقایا دو روپیہ زندہ سرمایہ نے پیدا کئے لیکن زندہ سرمایہ صرف سوا پانچ آنے ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مزدور کو ایک دن کام کرنے کے سوا پانچ آنے دئے جاتے ہیں لیکن اس سے دو روپیہ لئے جاتے ہیں۔ مزدور ایک روپیہ دس آنے ۹ پائی زیادہ دیتا ہے۔ مزدور کی محنت کرنے کی طاقت جو قیمت پیدا کرتی ہے وہ زیادہ خرچ ہوتی ہے لیکن مزدور کو معاوضہ صرف سوا پانچ آنے ملتا ہے۔ بقایا ایک روپیہ دس آنے نو پائی نفع کہلاتے ہیں۔ دراصل یہ مزدور سے چھینی ہوئی اُجرت ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ فی صدی کتنا نفع ہوا۔ سوا پانچ آنے نے ایک روپیہ سوا دس آنے نفع پیدا کیا۔ نفع کی شرح ۵۰۰ فی صدی کے قریب ہوئی۔ لیکن سرمایہ دار نفع کو دوسرے طریق پر شمار کرتا ہے۔ اس کے طریق سے چار روپیہ سوا پانچ آنے پر ایک روپیہ سوا دس آنے نفع ہوا تو شرح نفع ۴۴ فی صدی ہوئی۔ جب نفع کی فی صدی شرح مزدور کے نقطۂ نظر سے نکالی گئی تو ۵۰۰ فی صدی ہوئی۔ لیکن جب سرمایہ دار کے طریق سے نکالی گئی تو صرف ۴۴ فی صدی ہوئی۔ سرمایہ دارانہ طریق سے نفع پھیلانے میں یہ فائدہ ہے کہ مزدور سے سرمایہ دار یہ کہہ سکتا ہے۔ بھائی تمہارے کام کرنے سے تو معمولی سا فائدہ ہے اس پر کیوں لال پیلے ہوتے ہو۔ اگر مزدور کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ ۵۰۰ فی صدی نفع پیدا کرتا ہے تو وہ سرمایہ دار کے سینہ پر چڑھ جائے کہ میں دو روپیہ پیدا کرتا ہوں جس میں سے تم صرف سوا پانچ آنے مجھے دیتے ہو۔ اب یہ سمجھئے کہ مزدور کو سوا پانچ آنے کیوں ملتے ہیں زیادہ کیوں نہیں ملتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دوسری جنسوں کی طرح مزدور کی محنت کرنے کی .... طاقت کو بھی سرمایہ دار ایک جنس سمجھتا ہے۔ اور کیونکہ وہ جنس سوا پانچ آنے میں پیدا ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے وہی اسکی قیمت ہوئی حالانکہ جنس کی قیمت کے اصول مزدور کی محنت کرنے کی طاقت پر عائد نہیں ہوتے کیونکہ یہ جنس جب کام میں لائی جاتی ہے تو اپنی قیمت سے زیادہ قیمت پیدا کرتی ہے۔

اگر مزدور کو اپنی محنت کرنے کی طاقت برقرار رکھنے کے لئے سوا پانچ آنے کی ضرورت ہے جو چھ گھنٹے کی محنت کا نتیجہ ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ چھ گھنٹہ تو مزدور کو لازمی کام کرنا پڑے گا خواہ وہ دستکاری کرے یا کسی کارخانہ میں مزدوری۔ جب مزدور فیکٹری

ہیں کام کرتا ہے تو صبح کے چھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک مزدور نے خود اپنے لئے کام کیا۔ یعنی صرف اتنی اُجرت پیدا کی جو اس کے لئے کافی ہے اور جس سے وہ صرف اپنے کام کرنے کی طاقت برقرار رکھ سکتا ہے۔ مزدور نے اپنی روزی جو نقدی میں سوا پانچ آنے بنتی ہے خود پیدا کی۔ مزدور اپنی اُجرت خود پیدا کرتا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے گویا سرمایہ دار اپنی جیب سے مزدور کو اُجرت دے رہا ہے۔ بھلا سرمایہ دار نے بھی آج تک کسی کو کچھ دیا ہے! اُس کا تو اصول یہ ہے کہ ہر انسان اپنی روزی آپ پیدا کرے اور اس کا بہت بڑا حصہ سرمایہ دار کی نذر کر دے۔ مزدور کسی سے کچھ نہیں لیتا وہ تو صرف دیتا ہی دیتا ہے۔ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس کا بہت قلیل حصہ خود رکھ سکتا ہے اور باقی سرمایہ دار لیجاتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس اہم بات کو بھول جاتے ہیں۔ جہاں بھی سرمایہ دار اور مزدور کا ذکر ہوگا وہاں آپ یہ سنیں گے کہ سرمایہ دار مزدور کو اُجرت دیتا ہے اور کام لیتا ہے۔ برابر کا لین دین ہے اس میں گلہ شکوہ کی کیا ضرورت؟ ایک شخص چیز دیتا ہے اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ سرمایہ دار سوا پانچ آنے دیتا ہے اور مزدور سے بارہ گھنٹے کام کرنے کی طاقت لیتا ہے۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دار دیتا دلاتا کچھ نہیں۔ سوا پانچ آنے تو مزدور خود پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دار تو مزدور کو صرف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آ اور میری مشینوں کی خوراک بن جا۔ آ۔ تاکہ میری مشینیں تجھ کو کام میں لائیں۔ مشینیں مُردہ سرمایہ ہیں اور یہ مُردہ سرمایہ جونک کی طرح ہوتا ہے اور اس وقت موٹا ہوتا ہے جب زندہ سرمایہ کا خون چوستا ہے۔ کیونکہ سرمایہ کی جونک کو زندہ خون کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے مزدور کو زندہ رکھا جاتا ہے اور اس کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مشینوں کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اسے کھائیں اور اسی دوران میں مزدور کچھ اپنے کھانے کیلئے بھی پیدا کرلے تاکہ اس کا خون کہیں ختم نہ ہو جائے اور مشینیں بیکار نہ ہو جائیں۔

سرمایہ دار جنس بنانے کے سامان پر قبضہ ہونے کی بنا پر نفع حاصل کرتا ہے اور یہ ملکیت ہی ساری سرمایہ داری کی جڑ ہے،
۸ اس ملکیت کی حقیقت ہم نے اپنے مضمون سرمایہ داری کی ابتدا میں بتائی ہے کہ یہ ملکیت ڈاکے کا نتیجہ ہے اور بغیر ڈاکہ کے سرمایہ داری چل ہی نہیں سکتی۔ سماج نے اس کو جائز کر رکھا ہے کہ سرمایہ دار مزدور کے کام کرنے کی طاقت پر ڈاکہ ڈالے۔ لیکن اگر کوئی ڈاکو گاؤں کے مہاجن پر چھاپہ مارے تو پولیس اور فوج پہنچ جاتی ہے۔ سرمایہ دار دن دہاڑے ڈاکہ مارتا ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا ڈاکو پستول کا خوف دلاکر مہاجن کو مجبور کرتا ہے کہ مال اسکے حوالے کردے۔ سرمایہ دار پیداوار کے سامان پر قبضہ ہونے کی وجہ سے مزدور کو مجبور کرتا ہے کہ سوا پانچ آنے اپنے لئے رکھے اور ایک روپیہ سوا دس آنے سرمایہ دار کو پیدا کرکے دے۔ یہاں ڈاکو اور سرمایہ دار دونوں برابر ہیں۔ لیکن سیاسی اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے ڈاکو مجرم ہے اور سرمایہ دار سماج کا مربی۔ کارل مارکس کی قبضہ اور ملکیت کی مخالفت اسی بنا پر ہے کہ یہ دونوں ڈاکہ زنی کا نتیجہ ہیں اور جبتک سماج ان کو بنیادی اصول مانتی رہے گی تب تک اس سماج میں ڈاکو ہی پیدا ہوتے رہینگے۔ سوشلزم اس وقت شروع ہو سکتا ہے جب انفرادی یا جماعتی ملکیت تباہ ہو جائے۔

اگر یہ مان لیں ا — ۶ گھنٹے — ب لکیر کام کرنے کا وہ وقت ظاہر کرتی ہے جس میں مزدور اپنے لئے کام کرتا ہے تو جیسے جیسے ہم ا ب لکیر کو بڑھاتے جائیں گے مزدور کے کام کرنے کا وقت بڑھتا جائیگا۔ فرض کیجئے:-

(۱) ا — ۶ گھنٹے — ب —— شرح نفع = صفر۔

۶ چھ گھنٹے کا وہ وقت ہے جس میں مزدور اپنے لئے کام کرتا ہے اور سرمایہ دار کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اور یہ وقت یعنی ا تا ب لائن ہمیشہ برابر رہتی ہے اور اس میں کوئی گھٹائی بڑھائی نہیں ہوتی۔

(۲) ا — ۶ گھنٹے — ب ۲ گھنٹے ت —— نفع = $\frac{2}{6}$ / ۱۶ یعنی سرمایہ دار کو تھوڑے عرصہ میں معلوم ہوتا ہے کہ

مزدور سے اگر زیادہ دیر تک کام کرایا جائے اور مزدوری چھ گھنٹے ہی کی دی جائے تو اس کا فائدہ رہے گا اور یہ سوچ کر وہ ایک گھنٹہ کا مزدور کے کام میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اب مزدور کو ایک گھنٹہ (ب تا ت) کام کرنا پڑتا ہے جس کی اس کو مزدوری نہیں ملتی یہاں لئے سرمایہ دار کو ۷ گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی مزدور نے اپنی مزدوری تو چھ گھنٹوں میں پیدا کر لی لیکن ایک گھنٹہ (یعنی ب تا ت) اس کو کام سرمایہ دار کیلئے کرنا پڑا جس سے سرمایہ دار کو ۱۶$\frac{2}{3}$٪ نفع ہوا۔

(۳) ا - ۶ گھنٹہ - ب - ۳ گھنٹہ - ت - نفع = ۵۰ فی صدی

اس حالت میں مزدور نے اپنے لئے تو وہی چھ گھنٹے کام کیا اور مزدوری حاصل کر لی لیکن سرمایہ دار نے اس سے ۳ گھنٹہ اور زیادہ کام لیا جس کی مزدوری مزدور کو نہیں ملی۔ یعنی سرمایہ دار کو ۳ گھنٹہ کا نفع ہوا اور لکیر ب تا ت اور زیادہ بڑھ گئی۔ سرمایہ دار نے مزدور سے نو گھنٹہ کام لیا اور اس کو مزدوری صرف چھ گھنٹے کی دی یعنی اس کو ۵۰٪ نفع ہوا۔

(۴) ا - ۶ گھنٹہ - ب - ۶ گھنٹہ - ت - نفع = ۱۰۰ فی صدی

اس حالت میں مزدور سے سرمایہ دار نے ۱۲ گھنٹہ کام لیا اور صرف چھ گھنٹے کی مزدوری دی، ۶ گھنٹے (ب تا ت) انوکھے (مفت) میں کام لیا اور ۱۰۰٪ نفع حاصل کیا۔

ب تا ت وقت کا وہ حصہ ہے جس میں مزدور بلا معاوضہ سرمایہ دار کا کام کرتا ہے اور دنیا نے اس کا نام نفع رکھا ہے لیکن جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں ڈاکہ کا دوسرا نام نفع ہے۔ مزدور سے محنت تو لے لی جاتی ہے لیکن اس محنت کا معاوضہ اس کو نہیں دیا جاتا اور نہ وہ خود اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنی کی ہوئی محنت کا پھل اپنے ساتھ لیجا سکتا ہے اور مفت کی محنت سرمایہ دار کو مل جاتی ہے یعنی چھ گھنٹے کی مزدور کی محنت سرمایہ دار کو بچ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرمایہ نے یہ قیمت بڑھا دی۔

قیمت کی بڑھاؤ کی شرح نکالنے کا یہ قاعدہ ہوا کہ:—

$$\frac{\text{وہ وقت جس میں مزدور سرمایہ دار کیلئے کام کرتا ہے}}{\text{وہ وقت جس میں مزدور اپنے لئے کام کرتا ہے}} \quad \text{(تقسیم)}$$

جب قیمت کے بڑھاؤ کی شرح اس نسبت پر ٹھہری تو سرمایہ دار کا فائدہ اس میں ہے کہ وقت ب تا ت جس میں مزدور سرمایہ دار کے لئے کام کرتا ہے اس کو ہر ممکن طریق سے بڑھائے اور مزدور کا اس میں فائدہ ہے کہ وقت کم سے کم ہو تاکہ اسکے کام کرنے کی طاقت خرچ نہ ہو۔ یہاں سرمایہ دار اور مزدور میں لڑائی ہونے لگتی ہے۔ یورپ میں کئی صدیوں تک مزدوروں نے (ب تا ت) وقت کے گھٹانے کے لئے جنگ کی تب کہیں جا کر وقت کا تعین ہوا۔ سرمایہ دار یہ روزگے کا وقت بڑھانا چاہتا ہے اور مزدور گھٹانا چاہتا ہے یہ شور و غل جو آپ سنتے رہتے ہیں کہ مزدور آٹھ گھنٹے کا دن کرنا چاہتے ہیں اور سرمایہ دار دس گھنٹہ کا۔ یہ تمام کشمکش اس لڑائی کا نتیجہ ہے۔

لیکن سرمایہ دار کے پاس ایک اور بھی ہتھیار ہے وہ ب تا ت وقت کو نہیں بڑھاتا بلکہ (ا تا ب) وقت کو گھٹاتا ہے۔ اگر ا تا ب وقت گھٹ جائے تو ب تا ت وقت خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ یعنی فرض کیجئے کہ مزدوروں نے ہڑتالیں کر کے ۹ گھنٹے کا دن کرا لیا جس میں ۶ گھنٹے تو مزدور اپنے لئے کام کرتا ہے اور ۳ گھنٹے سرمایہ دار کیلئے۔ فرض کیجئے کہ سرمایہ دار یہ چاہتا ہے کہ مزدور چھ گھنٹے اس کے لئے روزگے میں کام کرے تو سرمایہ دار اپنا مقصد دو طرح حاصل کر سکتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ مزدور کو ۱۲ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کرے۔ چھ گھنٹے اپنے لئے اور چھ گھنٹہ سرمایہ دار کیلئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایسی تدبیر عمل میں لائے کہ ان چھ

گھنٹوں کو گھٹا دے جس میں مزدور اپنے لئے کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ملک کی صنعت و حرفت میں اتنی ترقی ہو گئی کہ مزدور کی ضروریات زندگی صرف
تین گھنٹہ میں پیدا ہونے لگیں تو مزدور کی قیمت تین گھنٹہ رہ جائیگی۔ اس شکل میں مزدور اگر نو گھنٹے ہی کام کرے تو بھی روزانہ کے چھ گھنٹے سرمایہ دار
کو مل جاتے ہیں۔ ل تا ب وقت مشین کاری کو فروغ دینے سے گھٹ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار سائنس اور مشین کا اتنا دلدادہ ہوتا ہے لیکن
جب سرمایہ دار کو اس میں فائدہ دکھائی دیتا ہے کہ مشین اور سائنس کو تباہ کیا جائے تو وہ اسکے لئے بھی تیار ہے (اسکا مفصل ذکر ہم نے اپنے
مضمون "سرمایہ داری اور امکان ترقی" میں کیا ہے) سرمایہ دار کا مقصد تو صرف نفع ہے وہ کسی شکل میں ہو خواہ سائنس کو تباہ کرکے، خواہ
اس کی مدد کرنے کے بعد۔

یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ سرمایہ دار کے مفاد کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ل تا ب وقت گھٹے یعنی جنس بنانے میں کم ضروری
سماجی وقت صرف ہو۔ یہ وقت طریق پیداوار کو زیادہ تیز اور آلات بنانے سے پورا ہو سکتا ہے یعنی سائنس کو طریق پیداوار کی خدمت کیلئے بڑھایا
جائے۔ کلیں اور مشینیں بنیں اور ان کی مدد سے پیداوار بڑھے۔ اگر بجلی کے زور سے ہل اور کنوئیں چلیں۔ فصل کٹے اور کٹے اور جو کام چھ
ماہ میں ختم ہوتا ہے وہ ایک ماہ میں ہونے لگے اور مزدور کی ایک دن کی ضروری اشیاء جو تین گھنٹوں میں پیدا ہوتی ہیں ایک گھنٹہ میں ہونے لگیں
اور کپڑا جو دو گھنٹے میں پیدا ہوتا ہے آدھے گھنٹہ میں ہونے لگے اور دیگر سامان ضروریات جو ایک گھنٹہ میں پیدا ہوتا ہے نصف گھنٹہ میں پیدا ہونے لگے
تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ مزدور کی ضروریات زندگی دو گھنٹہ ہی میں پیدا ہونے لگیں اس لئے مزدور کی قیمت دو گھنٹہ رہجائیگی اور اگر وہ نو گھنٹہ
کام کرے گا تو دو گھنٹہ تو اپنے لئے اور سات گھنٹہ سرمایہ دار کیلئے کام کرے گا۔ یہ راز سرمایہ دار کو سائنس اور مشینکاری کی ترقی پر مجبور کرتا ہے
مشینکاری سے سرمایہ دار کا نفع بڑھتا ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ ایک قیامت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ل تا ب وقت کو گھٹانے سے مزدور بیکار
ہو جاتا ہے۔ مشین طریق پیداوار میں داخل ہوتے ہی انسان کو برطرف کر دیتی ہے اور اسکی جگہ چھین لیتی ہے جس کے بعد سماج کی اقتصادی
۴۷ حالت خراب ہو جاتی ہے جس کے بعد سماج میں سیاسی بےچینی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں

اس جگہ سرمایہ داری میں ایک تضاد پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر سرمایہ دار ب تا ت وقت بڑھاتا ہے یعنی کم مزدور زیادہ دیر تک کام
کرتے ہیں تو سماج میں بیکاری پھیلتی ہے۔ جنس زیادہ پیدا ہوتی ہے لیکن لوگوں میں اسکے استعمال کرنے کی استطاعت کم ہوتی جاتی ہے
اور مزدور الگ لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت کو گھٹاتا ہے تو نفع غائب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ل تا ب وقت کو گھٹاتا ہے تو بھی سماج
میں بیکاری بڑھتی ہے اور سیاسی بےچینی پیدا ہوتی ہے اگر نہیں گھٹاتا تو نفع غائب ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کی حالت اس وقت اس بیمار کی سی ہوتی
ہے جس کا وقت آ گیا ہو جیسے بخار کی دوا دی جائے تو اسہال آنے لگیں اور اگر اسہال کو روکا جائے تو بخار کے بڑھ جانے کا خوف پیدا
ہو جائے ——— ؟ اور کمزوری برابر بڑھ رہی ہو۔

طریق سرمایہ داری میں اب ہر جگہ تضاد کی شکل پیدا ہو رہی ہے۔ اس صورتِ حال سے گھبرا کر ہندوستان میں ایک عجیب مغالطہ کی سی
کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب ہندوستانی سوچنے لگے ہیں کہ سرمایہ داری میں تضاد ہے۔ اس لئے سماج کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ معدودے چند
لوگ بہت امیر ہو جاتے ہیں اور باقی عوام بے حد غریب رہتے ہیں۔ مشین سرمایہ داری کی جڑ ہے اس لئے مشین ہی وہ برائی ہے جس سے
ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا مشین کے خلاف جہاد کرنا ہی انسانی خدمت ہے۔

اب ہندوستانی دستکاری پر زور دیتے ہیں اور مشین کاری کو مہلک خیال کرتے ہیں لیکن یہ بہت ہی سطحی نظریہ ہے مشین دراصل کوئی
بری چیز نہیں ہے یہ تو انسان کیلئے نعمت ہے بلکہ جو چیز مہلک ہے وہ مشین کا سرمایہ دارانہ استعمال ہے۔ طریق پیداوار پر سرمایہ دار کا قبضہ
اس کا لالچ اور حرص مشین کو مہلک بنا دیتے ہیں لیکن اگر پیداوار کی طاقتوں پر سرمایہ دار کا قبضہ نہ رہے بلکہ سماج کا قبضہ ہو جائے تو مشین ہی میں وہ

طاقت ہے جو دُنیا کو جنت بنا سکتی ہے۔ اگر کسی سماج میں مشین سے کام ہو اور وہ سماج مل جُل کر کام کرے اور دو گھنٹے روز کام کر کے تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ دوسرے دو گھنٹے مزید کام کر کے تمام عیش و آرام کی چیزیں مہیا کرے۔ باقی بیس گھنٹہ اسکے اپنے ہوں جس میں سماج اپنی جسمانی روحانی اور دماغی ترقی کی راہیں ڈھونڈے۔ نسل انسانی کو بہتر بنائے۔ علوم و فنون کو ترقی دے۔ دُنیا سے رنج و الم مٹائے۔ اور مسرت و خوشی پھیلائے تو یہ سماج اچھی ہے یا وہ جس میں سب چیزیں ہاتھ سے بنیں اور انسان دن رات کولھو کے بیل کی طرح کام کرے اور اس مشقت پر بھی صرف اتنی جنس پیدا کر سکے کہ اس کی آدھی ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہ ہوں۔ عیش و آرام کا تو ذکر ہی کیا۔ جب تمام وقت ایک آدمی پیٹ ہی کیلئے محنت کرنے پر مجبور ہوگا تو کیا جسمانی روحانی اور دماغی ترقی کر سکے گا وہ تو انسان نما جانور ہوگا۔ ہر عقل مند آدمی پہلی سماج کو ترجیح دیگا۔ اس لئے مشین لعنت نہیں بلکہ نعمت ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ مشین سرمایہ دار کے قبضہ سے نکال کر سماج کی ملکیت میں دیدی جائے۔

اب ہم اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں کہ مردہ سرمایہ نہ اپنے آپ کو گھٹا سکتا ہے اور نہ بڑھا سکتا ہے۔ اس کو جو چیز گھٹا بڑھا سکتی ہے وہ سماجی ضروری محنت کا وقت ہے۔ سماجی ضروری محنت کا وقت کیا ہے؟ اس کا ذکر ہم نے اپنے مضمون قیمت کی پیدائش میں کیا ہے یہاں ہم اسکے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے۔

سماجی ضروری محنت اور وقت کو دو طریقوں پر دیکھ سکتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ فرض کیجئے کسی سماج میں کپڑے کی ضرورت ہے لیکن وہ سماج جوتے بنانے لگتی ہے تو وہ سماجی ضروری محنت نہیں بلکہ غیر ضروری محنت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب بازار میں جوتے بکنے آئینگے تو جوتوں کے بدلے میں سماج یا تو کچھ بھی تبادلی قیمت نہ دیگی اور اگر دے گی بھی تو بہت کم۔ ایک مشکل تو یہ ہوئی کہ سماج نے اپنی ضرورت سے زیادہ جنس بنا دی۔ جنس بنانے میں جتنی سماجی محنت صرف ہوئی وہ غیر ضروری تھی۔ لیکن کارل مارکس کا سماجی ضروری وقت سے دوسرا مطلب ہے۔ ہم اسکے اظہار کے لئے مثال پیش کرتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ سنہ ۱۸۰۱ء میں ڈھاکہ میں ایک ہزار جولاہے تھے اور عام طور پر ایک جولاہا دس گھنٹے کے ایک دن میں دس گز کپڑا بُنتا تھا۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ سو جولاہے فی جولاہا ساڑھے آٹھ گز کپڑے کے حساب سے بُنتا ہو دو سو جولاہے فی جولاہا ساڑھے نو گز کپڑے کے حساب سے بُنتے ہوں۔ سو جولاہے فی جولاہا ساڑھے تیرہ گز کپڑے کے حساب سے بُنتے ہوں اور چھ سو جولاہے فی جولاہا دس گز کپڑے کے حساب سے بُنتے ہوں تو اس کا حساب یہ ہوا:

جولاہوں کی تعداد	تعداد گھنٹے	تعداد کپڑا فی جولاہا	کل تعداد کپڑا
۱۰۰	۱۰۰۰	۸½ گز	۸۵۰ گز
۲۰۰	۲۰۰۰	۹½ گز	۱۸۵۰ گز
۱۰۰	۱۰۰۰	۱۳ گز	۱۳۰۰ گز
۶۰۰	۶۰۰۰	۱۰ گز	۶۰۰۰ گز
۱۰۰۰			۱۰۰۰۰ گز

اگر ہم اس کا اوسط نکالیں کہ فی جولاہا کتنے گز کپڑا بُنتا ہے تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک ہزار جولاہوں نے دس ہزار گز کپڑا بُنا۔ فی جولاہا دس گز پڑے تو اوسطاً فی جولاہا ایک گھنٹہ میں ایک گز کپڑا تیار ہوا۔ اب ہم یہ کہیں گے کہ ایک گز کپڑا بُننے کیلئے ایک گھنٹہ سماجی ضروری محنت کا وقت درکار ہے۔ اس سماج میں اوسطاً ایک گز کپڑے کی اصلی قیمت ایک گھنٹہ ہوگی۔ اس اصلی قیمت کو کپڑے کی کمی یا زیادتی

نہیں بدل سکتی۔ خواہ کپڑا ضرورت سے زیادہ بنے یا کم لیکن جب بنے گا تو ایک گز بنانے میں ایک گھنٹہ سماجی ضروری وقت صرف ہوگا البتہ اس ایک گز کی تبادلی قیمت میں فرق ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جب کپڑے کی کمی ہو تو دس گز کے بدلے میں ایک جوڑی جوتا ملے اور جب کپڑے کی زیادتی ہو تو بیس گز کے بدلے میں ایک جوڑی جوتا ملے۔ لیکن یہ تبادلاتی قیمت کا فرق نہ گز بھر کپڑے کو ایک حالت میں آدھے گھنٹے کی محنت کر دیگا اور نہ دوسری حالت میں دو گھنٹہ کی محنت کردے گا۔ کپڑا ہمیشہ ایک گھنٹہ فی گز کے حساب سے بنیگا اور یہ اصل قیمت تبادلاتی قیمت پر برابر اثر ڈالتی رہے گی۔ اور سماج کو اس پر مجبور کرے گی کہ ایک گز کپڑا اوسطاً ایک گھنٹہ کی محنت کے بدلے بکے۔ دُنیا کی ہر جنس اصل قیمت رکھتی ہے اور یہ اصل قیمت سماج کو برابر مجبور کرتی رہتی ہے کہ ہر جنس اپنی اصل قیمت پر بکے۔ لیکن موجودہ سماجی نظام جس کو سرمایہ داری کہتے ہیں جنس کی اصل قیمت کو پس پُشت ڈال کر سماج کو انفرادی نفع کے اصول پر چلانا چاہتی ہے جس تہذیب و تمدن کا بُنیادی اصول انفرادی نفع ہو گا اس میں (Competition) مقابلہ ہونا لازمی ہے۔ جو سماجی زندگی کو بہت بھیانک بنا دیتا ہے۔

اب فرض کیجئے کہ دس سال بعد سنہ ۱۸۱۰ء میں روئی بہتر پیدا ہونے لگی۔ روئی کا تار لمبا اور مضبوط ہونے لگا۔ آسانی سے کھنچنے اور صاف ہونے لگا۔ پہلے جلدی جلدی ٹوٹ جاتا تھا اب نہیں ٹوٹتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دس گھنٹہ میں پندرہ گز کپڑا بُنا جانے لگے گا۔ یا فرض کیجئے کہ نئی وضع کا چرخہ یا کھڈی ایجاد ہو گئی جس سے ایک گھنٹہ میں دس کی بجائے پندرہ گز کپڑا تیار ہونے لگا۔ غرض کچھ ایسی ترقی ہوئی کہ پہلے جتنی محنت کر کے ایک جولاہا دس گھنٹہ میں دس گز کپڑا بُنتا تھا۔ اب وہی جولاہا اتنی ہی محنت کر کے دس گھنٹہ میں پندرہ گز کپڑا بُننے لگا۔ اب فرض کیجئے کہ ایک ہزار جولاہوں میں سے سات سو جولاہے تو ۱۸۰۰ء والے طریق پر خراب روئی سے اور پُرانے طریقے کے چرخہ اور کھڈیوں سے ایک گھنٹہ میں ایک گز کپڑا تیار کرتے ہیں اور تین سو جولاہے اتنی ہی محنت سے جتنی کہ پُرانے طریق میں کر رہے تھے ایک گھنٹہ میں ½ 1 گز کپڑا بُنتے ہیں۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ سماج میں ضروری سماجی محنت کے دو معیار ہو گئے۔

(۱) ایک معیار کی بموجب تو ایک گھنٹہ میں ایک گز کپڑا بُنا جاتا ہے۔

(۲) دوسرے معیار کے بموجب ایک گھنٹے میں ½ 1 گز کپڑا بُنا جاتا ہے۔

ایک گھنٹہ کی محنت ایک جگہ ایک گز کپڑا بناتی ہے اور دوسری جگہ ڈیڑھ گز۔ ان دونوں مقداروں میں فرق ہے لیکن دونوں ایک گھنٹہ کی محنت ہیں۔ اس سے ایک اصول مستنبط ہوتا ہے کہ جیسے جیسے مزدور کی پیداوار کی استطاعت بڑھتی جاتی ہے جنس کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے نئے حالات میں ایک جولاہا ایک گز کپڑا چالیس منٹ میں تیار کر لیتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک گز کی قیمت گھٹ گئی۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جیسے جیسے صنعت و حرفت میں مشینکاری اور سائنس داخل ہوتی جاتی ہے جنس سستی ہوتی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ نیا سماجی معیار پُرانے سماجی معیار پر کس طرح فتح پاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ سماج دس ہزار آدمیوں پر مشتمل ہے جس میں سے ایک ہزار جولاہے ہیں۔ اس سماج کو دس ہزار گز کپڑے کی ضرورت ہے اور ایک ہزار جولاہے فی جولاہا دس ہزار گز کپڑا سماج کو دیدیتے ہیں۔ فرض کیجئے دس برس تک یہی ہوتا رہتا ہے۔ گیارھویں برس تین سو جولاہے خواہ کسی نئی ایجاد کی وجہ سے خواہ اچھی روئی پیدا ہونے کی وجہ سے اتنی ہی محنت کر کے پندرہ گز کپڑا روز تیار کر لیتے ہیں۔ جب ایک گز کپڑا چالیس منٹ میں بن گیا تو فی گز کپڑے کی اصل قیمت چالیس منٹ ہوئی۔ کچھ دن یہ تین سو جولاہے سماج کو دھوکہ دے کر ایک گز کے بدلے میں سماج سے ایک گھنٹے کی محنت لیتے رہینگے۔ حالانکہ ان کے ایک گز میں چالیس منٹ ہوں گے۔ اس دھوکہ کو کچھ لوگ نفع سمجھتے ہیں اس دھوکہ سے قیمت پیدا نہیں ہوتی بلکہ قیمت کی تقسیم میں فرق آجاتا ہے۔ اس تبادلے سے تین سو جولاہے سماج کا وقت اور محنت چراتے ہیں۔ امریکہ کا مشہور صدر لنکن ٹھیک کہا کرتا تھا کہ چوری کا دوسرا نام تجارت ہے۔

کچھ دن تو یہ چوری چلتی رہے گی لیکن کچھ عرصہ میں یہ ہوگا کہ ترقی یافتہ تین سو جولاہے پندرہ گز کے حساب سے ایک دن میں

۴۵۰۰ گز کپڑا فی روز تیار کرینگے اور ایک ماہ میں ۴۵۰۰×۳۰ = ۱۳۵۰۰۰ گز کپڑا بنالیں گے۔ باقی سات سو جلاہے ۱ گز کے حساب سے فی ماہ ۷۰۰×۳۰ = ۲۱۰۰۰ گز کپڑا تیار کر لینگے۔ سماج کو فی ماہ کیونکہ ۳۰۰۰۰۰ گز کپڑے کی ضرورت ہے تو ۴۵۰۰۰ ہزار گز کپڑا زیادہ تیار ہوا۔ اب یا تو سات سو جلاہوں کا یا تین سو جلاہوں کا ۴۵۰۰ گز کپڑا بچ رہے گا۔ اور کیونکہ ہر جماعت یہ چاہے گی کہ اس کا سب کپڑا نکل جائے اس لئے دونوں جماعتوں میں کمپٹیشن ہونے لگے گا۔

لیکن اگر آپ اس سطح کے نیچے دیکھینگے تو آپ کو ضروری سماجی محنتوں اور وقتوں کے دونوں معیاروں میں مقابلہ ہوتا دکھائی دیگا ½ اگز کپڑا پیدا کرنے والا گھنٹہ ایک گز کپڑا پیدا کرنے والے گھنٹہ سے لڑ رہا ہوگا۔ دراصل یہ اندرونی لڑائی ہے جو سطح پر کمپٹیشن کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور سماج میں اقتصادی جنگ پیدا کر دیتی ہے۔ ان دو جماعتوں میں لڑائی اس وقت ختم ہوتی ہے جبکہ سماج میں ½ اگز کپڑا سب جلاہے ایک گھنٹہ میں تیار کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اسکے عام ہونے تک سماج میں پھر ضروری سماجی وقت بدل جاتا ہے اور پھر وہی سلسلہ از سرِ نو شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو صنعت و حرفت کی ترقی کہتے ہیں۔

انسان ہمیشہ خواہشمند رہتا ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرنے کی تدبیر کرے اس لئے جیسے ہی ایک خاص صنعت کرنے والے عام طور پر ایسی ایجاد کام میں لانے لگتے ہیں جو کم وقت میں زیادہ استعمالی جنس بنالے تو سماجی ضروری وقت اور محنت کا معیار بدل جاتا ہے۔ اگرچہ اس نئے معیار کے پوری طرح پھیلنے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔

ایک مشین کا کارخانہ لیجیئے جہاں کپڑا بُننے کی پچاس مشینیں پانچ برس میں تیار ہوتی ہوں۔ لیکن اس اثنا میں دوسرے کارخانے نے کسی تدبیر سے اتنی ہی محنت سے پانچ برس میں سو مشینیں بنالی ہوں تو پہلے کارخانے والوں کی مشینوں کی اصل قیمت آدھی رہ جائے گی کیونکہ سماجی ضروری محنت کا معیار بدل گیا۔ یا یہ ہو کہ دوسرے کارخانہ والے مشینیں تو صرف پچاس بنائیں لیکن پہلے کارخانہ والوں سے مضبوط بنائیں یا ایسی بنائیں کہ زیادہ کپڑا کم وقت میں تیار کرسکیں۔ ان صورتوں میں بھی پہلے کارخانہ والوں کی مشینوں کی قیمت کم ہو جائے گی فرض کیجئے کہ زید نے کپڑے کا کارخانہ کھولا اور پہلے مشین کے کارخانے والے سے ایک ہزار روپیہ فی مشین دس مشینیں اصل قیمت پر خریدیں۔ چند روز میں بکر نے کارخانہ کھولا۔ اس نے دس مشینیں دوسرے کارخانہ والے سے آٹھ سو روپیہ فی مشین اصل قیمت پر خریدیں دونوں کارخانوں کی مشینیں ایک سا کام دیتی ہیں۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ زید کی مشینوں کی قیمت کم ہوگئی اب ہر مشین آٹھ سو روپیہ کی ہوگئی۔ زید کی مشینوں کی قیمت بھی آٹھ سو روپیہ رہ گئی اور وہ کپڑے میں آٹھ سو روپیہ ہی منتقل کریں گی حالانکہ ان کی اصل قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔

سماج میں ضروری سماجی وقت اور محنت کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ اور اس لئے اصل قیمتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ یہی بات ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سائنس ضروری سماجی وقت اور محنت کا معیار بدلتی رہتی ہے اور طریقِ پیداوار کو برابر بہتر اور ترقی یافتہ بناتی رہتی ہے اور جنسوں کی اصل قیمت بدلتی رہتی ہے۔

جوہر

تندرستی کے رکھ رکھاؤ کا احساس بڑھاپے کی آمد آمد کا نقیب ہے۔
تنہائی کے باوجود جو بدبخت کسی نئی محبت کا آغاز نہ کر سکے اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ جوانی آخری سانس لے رہی ہے۔
اس یقین کے ساتھ کہ نہ جوانی ہے اور نہ محبت کا موسم۔ لیکن جوانی اور محبت کی اداکاری جو شخص جاری رکھے وہ نقال بنا ہی ہوس نقل کی خود ہی تصویر۔

ساغر

راجپوتانہ

از میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" وزیر ریاست جے پور

جے پور جا کر، جے پور رہ کر جو پہلے سے کچھ زیادہ بت پرست نہ ہو جائے
وہ گویا زندہ ہی نہیں! یہاں کوئی رہے اور آنکھوں سے دیکھے تو اُس
پر کھلے، کیوں اس آب وہوا، اس خس وخاشاک میں ایک خدا قطعی
ناکافی ہے یہ وہ وجہ ہے کہ مسلمان کبھی دراصل راجپوتانہ کے دل میں جگہ نہ کرسکے۔
راجپوتانہ کی پیچ در پیچ وادیوں میں اسکی ریت سے اُگنے والی چھوٹی چھوٹی
پہاڑیوں میں، اُن پہاڑیوں سے نکلنے والی چھوٹی چھوٹی خشک ندیوں میں
ایک خدا کا سکہ نہ چلا، پر نہ چلا یہاں تو چپے چپے پر نئی دیوی اور نئی قسمت کے بت ہیں
یہ محض فقرہ نہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان آئے اور دفن ہو گئے
انگریز آئے اور چل دینگے مگر یہ راجپوت جہاں تھے وہیں رہینگے، یہاں نہ ایک
خدا والے، نہ تین خدا والے، یعنی نہ بے اولاد خدا، نہ بن باپ کا بیٹا، نہ بے شوہر
کی ماں، کسی کا کام نہیں، جہاں چاند، سورج کی اولاد ہو، وہاں بھلا آدم و

حوّا والے قصّے کون سُنے! ؟

اس ملک کے لوگ شعلہ باز ہیں مرد مر کر جلتے ہیں، عورتیں جل کر مرتی ہیں، جس قدر آگ مٹّی سے مختلف ہے، اسی قدر یہاں کے شعلہ خو کفن پوشوں سے دور ہیں، یہاں جو انسان کچھ بھی ہو وہ کبھی کچھ نہیں کرتا، کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، رعایا مُفت کی موجود ہے ٹھاکر کو ٹھاکر کے نوکروں کو مُفت پالنے میں مصروف ہے مسرور ہے، اور موقع پڑے تو جان سے بھی دریغ نہیں۔

ٹھاکر تعلیم پاکر بھی ٹھاکر ہی رہتا ہے۔ رعایا ظلم سہ کر بھی ٹھاکر سے مُنہ نہیں موڑتی، لڑنے بھڑنے کے باوجود بھی گویا یہ سب لوگ ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں، اور جو معمولی نگاہ سے دیکھو تو اِدھر اُدھر محض ریت ہے، مگر اُسی خدا نے جسے دیویوں سے بیر نہیں، اس ریت میں فولاد کا زور بھر دیا ہے۔ کاش راجپوتانہ کی ریت اُڑ کر سارے ہندوستان میں پھیل جائے!

فلک پیما

فہم کی رسوائیاں

شوق ہے رہزنِ راحت، مجھے معلوم نہ تھا — دل لگانا ہے قیامت، مجھے معلوم نہ تھا
خوں رُلائیگی محبّت، مجھے معلوم نہ تھا — پُر ہے کانٹوں سے یہ جنّت، مجھے معلوم نہ تھا

اک نظر دیکھنے کا تجھ کو گنہگار ہوں میں — جو سزا دے تو مجھے اُس کا سزاوار ہوں میں
۳
عمر گذری کہ عذابوں میں گرفتار ہوں میں — اک نظر کی ہے یہ قیمت، مجھے معلوم نہ تھا

درد، درماں کے تہِ دام نہیں آئے گا — دمِ عیسیٰ بھی کسی کام نہیں آئے گا
تیرے پہلو میں بھی آرام نہیں آئے گا — اُف، یہ پہلوئے محبّت، مجھے معلوم نہ تھا

اب ہے یہ رنگِ قلق کشتگیِ جانِ خراب — جیسے پیاسا کوئی دم توڑ رہا ہو لبِ آب
تیرے دریائے کرم سے بھی نہ ہوگی سیراب — اتنی تشنہ ہے محبّت، مجھے معلوم نہ تھا

کیا خبر تھی وہ دن آئیگا محبت میں شتاب   کہ ترا لطف و کرم اور کرے گا بیتاب
جسکی بگڑی ہوئی تصویر ہیں برق و سیماب   وہ تڑپ دل کی ہے قسمت، مجھے معلوم نہ تھا

خاک صحرا کی ترے شوق میں برسوں چھانی   کون منت ترے ملنے کی نہیں سے مانی
اب کے بچھڑے نہ ملیں تونے یہ دل میں ٹھانی   تیرا عزم دمِ رخصت، مجھے معلوم نہ تھا

آنکھیں ترسینگی جمالِ رخِ زیبا کے لئے   روح تڑپے گی اسی طرزِ دل آرا کیلئے
یوں بچھڑ جاؤں گا میں تجھ سے ہمیشا کے لئے   یہ ہے فرمودۂ قدرت، مجھے معلوم نہ تھا

کبھی خاکسترِ دل آ کے ذرا تو بھی کرید   دیکھ تو دفن ہیں یاں کتنے دہکتے خورشید
سونپ کر ایک کفِ خاک کو سوزِ جاوید   امتحاں لیگی مشیت، مجھے معلوم نہ تھا

ہے مری آنکھوں کو رونے کی تمنا ابتک   خشک ہونے پہ بھی ہیں جوش میں دریا ابتک
میں بھلانے پہ بھی تجھ کو نہیں بھولا ابتک   ترکِ الفت بھی ہے آفت مجھے معلوم نہ تھا

تو نے عشرت کے عوض بخشی تھی دولت غم کی   کون سے جرم پہ اب چھین لی لذت غم کی
میں مسرت کو سمجھتا تھا امانت غم کی   غم بھی ہے تیری امانت، مجھے معلوم نہ تھا

آج ہر سانس میں تیری ہی صدا آتی ہے   آ کہ اب تو نہیں آتا تو قضا آتی ہے
دل دھڑکتا ہے کہ آوازِ ذرا آتی ہے   اتنی نزدیک ہے رخصت مجھے معلوم نہ تھا

عسکری طباطبائی

کارل مارکس کا نظریۂ ارتقائے سرمایہ داری

یا

سامراج

۵

انقلاب روس جنگ عظیم کا سب سے زیادہ نتیجہ خیز واقعہ ہے۔ یہ نہ شخصی اور خاندانی انقلاب تھا کہ زار کے قتل کے بعد کوئی دوسرا خاندان برسر حکومت آجاتا نہ سیاسی انقلاب تھا کہ ایک سیاسی پارٹی کسی دوسری سیاسی پارٹی کو شکست دے کر خود حکومت پر قبضہ کر لیتی اور بس۔ بلکہ یہ ایک اقتصادی اور سماجی انقلاب تھا جس میں انسانی تہذیب اور تمدن کے بدل ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی اور جس میں ان تمام اداروں کے بنیادی تخیلات پر حملہ کیا گیا تھا جو انسانی زندگی کا ماحصل خیال کئے جاتے ہیں۔

روسی انقلابی پارٹی نئے تخیلات کی دنیا آباد کر رہی تھی اس کا اعلان تھا کہ انسان سماج کی خدمت کے لئے ہے نہ کہ سماج کسی انسان کی جاگیر۔ دنیا کی اجناس کسی خاص انسان یا جماعت کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ تمام انسانیت کی ہیں۔ محنت کا اجر کام کی اہمیت پر نہیں بلکہ انسان کی ضرورت پر ہے۔ مذہب انسانی دماغ کے ارتقا میں حائل ہے اس کی تباہی انسانیت کی آزادی ہے۔ گھر۔ خاندان۔ کنبہ۔ ملکیت کے تخیل پر مبنی ہیں اس لئے ان کو تباہ کرنا ضروری ہے۔ انفرادی یا جماعتی ملکیت خواہ وہ کسی شکل ہی میں کیوں نہ ہو، دنیا کے لئے لعنت ہے۔ یہ اور اسی قسم کے انقلابی تخیلات روس سے ابلنے شروع ہوئے اور ان کے سیلاب نے کم و بیش تمام عالم کو گھیر لیا۔

ہندوستان کے نوجوانوں نے انقلاب روس کا نہ غور و فکر سے مطالعہ کیا اور نہ ان اصولوں کے سمجھنے کی کوشش کی جو کارل مارکس کی کاوش دماغی کے مرہون منت ہیں اور جو انقلاب روس کی روح رواں تھے۔ ایشیا کی مستقل مزاجی اس امر کی متقاضی تھی کہ کسی پیام کو نہ پہلی مرتبہ سنا جائے اور نہ اس پر عملدرآمد کیا جائے۔ اس لئے روس کی آواز ہندوستان میں صدائے بازگشت سے زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی۔

انقلاب روس کو بیس سال ہونے کو آئے لیکن ہندوستان ان اقتصادی اصولوں سے جن پر کہ روس کی انقلابی جماعت نے سماجی نظام اور آئین مرتب کرنے چاہے آج بھی اتنا ہی بے خبر ہے جتنا کہ بیس سال پہلے تھا لیکن اب کچھ عرصے سے ہمارے ملک کے چند نوجوان اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان اقتصادی انقلاب کی اہمیت سمجھے اور موجودہ اقتصادی حالات پر غور کرے جو انسانیت کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ان سوشلسٹ نوجوانوں کی کوشش کا یہ نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہندوستان کی سیاسی فضا میں چند الفاظ گونج رہے ہیں جن کا تعلق اس اقتصادی تخیل سے ہے جس کا درس کارل مارکس اور لینن دے چکے ہیں۔ ان الفاظ میں سوشلزم۔ بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانا۔ ملوکیت اور سرمایہ داری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ ہر باخبر ہندوستانی کی زبان پر یہ الفاظ ہیں۔ لیکن ان کے مطالب و معانی ہر ذہن میں با ترتیب اور صاف نہیں ہوتے۔ اس لئے غیر مناسب نہ ہوگا اگر ان کی بابت کچھ عرض کیا جائے۔

یہاں ہم صرف ملوکیت د امپیریلزم کے معنی بیان کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ یہ کن اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے اور اس سے نتیجتاً کیا حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح خفیف حرارت ایک عرصہ کے بعد ایک حد پر پہنچ کر دق میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح جب غریق سرمایہ داری اقتصادی ارتقاء کے مطابق ایک خاص منزل پر پہونچ جاتی ہے تو امپیریلزم کہلاتا ہے۔

ملوکیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے طریق پیداوار کی ارتقاء کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔ یہاں بہت اختصار کے ساتھ ان اقتصادی دوروں کا ذکر کر دینا ضروری ہے جس میں سے دنیا گزری۔ دنیا میں پہلی انفرادی دستکاری کا دور شروع ہوا۔ اگر آپ ہندوستان کے کسی بہت ہی پس ماندہ گاؤں کا تصور کریں تو اس کے دور کے خدوخال ذہن میں آجائیں گے۔ انفرادی دستکاری کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ جنس استعمال کے لئے بنتی تھی نہ کہ نفع کے لئے۔ کئی صدیوں میں دنیا اس دور کو طے کر کے ایک دوسرے دور میں داخل ہوئی جس کو اجتماعی دستکاری کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں بہت سے دستکار ایک سرمایہ کے ماتحت ملکر کام کرتے تھے۔ صدیوں تک دنیا نے دستکاری کی اس سست رفتاری کو برداشت کیا۔ اجتماعی دستکاری کے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ جنس استعمال کیلئے نہیں بلکہ نفع کیلئے بنائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ دور انفرادی دور کے برعکس تھا۔

نفع کی ابتدا ہوتے ہی سماج میں مقابلہ کی شکل پیدا ہو جانی ضروری تھی۔ اجتماعی دستکاری میں کیونکہ انفرادی دستکاری کی نسبت جنس ارزاں تیار ہوتی تھی۔ اس لئے جب جنس کے خرید و فروخت میں مقابلہ ہوا تو انفرادی دستکاری کی کچھ پیش نہ چلی اور آخر کار فنا ہو گئی۔ جس طرح اجتماعی دستکاری نے انفرادی دستکاری کو مقابلے کے ہتھیار سے فنا کیا تھا اسی طرح مشین کاری نے اجتماعی دستکاری کو تباہ کیا۔ مشین نے جنس کو ارزاں کر دیا۔ اجتماعی دستکاری کیلئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ بازار میں جنس کو مقابلہ کی قیمت پر فروخت کر سکے۔ لہذا کچھ ہی عرصہ میں اجتماعی دستکاری ختم ہو گئی اور مشین کاری کا دور شروع ہو گیا۔ مشین کاری کا دور جہاں جنس کو ارزاں کرتا ہے وہاں انسان کو برطرف بھی کر دیتا ہے۔ مشین انسان کی جگہ لے لیتی ہے جس کی وجہ سے سماج میں بیکاری عام ہو جاتی ہے۔ بیکاری عام ہو جانے کی وجہ سے مزدوری گھٹ جاتی ہے اور مخلوق کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ مالی استطاعت کم ہو جانے سے سماج کو ارزاں جنس بھی قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا سرمایہ دار کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جنس کسی طرح اور ارزاں کی جائے۔ تاکہ سماج اپنی بے بضاعتی کے باوجود بھی جنس خرید سکے۔ اب اس قسم کی مشین ایجاد کی جاتی ہیں جو خود بخود حرکت میں آجائیں اور انسان کی دست نگر نہ ہوں جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جنس تیار کر سکیں۔ لیکن اس میں بھی یہی قباحت باقی رہتی ہے کہ جوں جوں صنعت و حرفت آلاتی ہوتی جاتی ہے۔ انسان کو برطرف کرتی جاتی ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ اس سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ سرمایہ داروں کی جماعت میں برابر کا مقابلہ رہتا ہے۔ ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اپنے مدمقابل کو تباہ کر دے اس کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ بازار میں جنس کو اتنا ارزاں فروخت کرے کہ حریف نہ کر سکے۔ جنس کو ارزاں کرنے کیلئے یہ لازمی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مشین کو انسانی نگرانی سے بے نیاز خود بخود حرکت کرنے والی بنایا جائے۔ مشین کی تکمیل سرمایہ داری کی حیات کیلئے لازمی ہے۔ اگر ایک سرمایہ دار بہتر اور نفع بخش مشین نصب کراتا ہے تو اس کے مدمقابل کیلئے یہ لابدی ہو جاتا ہے کہ وہ بھی یا تو اسی قسم یا اس سے بہتر مشین نصب کرے تاکہ مقابلہ میں شکست نہ کھانی پڑے۔

یہ آپس کی اقتصادی جنگ سرمایہ داری میں ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اس مستقل جنگ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ دار تباہ ہو جاتے ہیں اور مفید مشین لگا

سکتے ہیں اور بڑا کارخانہ معاملہ کر سکتے ہیں۔ خام جنس ارزاں دام میں خرید سکتے ہیں۔ تباہ ہو جاتے ہیں اور اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ بڑی فیکٹری والا آدمی یا تجارتی قیمت پر ان کا کارخانہ خرید لے۔ اس کشمکش کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ تمام صنعت و حرفت چند بڑے سرمایہ داروں کے قبضہ میں آ جاتی ہے اور بہت بڑے پیمانے پہ کام ہونے لگتا ہے۔

کچھ عرصہ تک ان چند بڑے سرمایہ داروں میں مقابلہ رہتا ہے لیکن کیونکہ صنعت میں کروڑوں اور اربوں کا سرمایہ لگا ہوتا ہے۔ اس لئے بڑے سرمایہ دار قدرتی طور پر اس بات پر بہت جلد آمادہ ہو جاتے ہیں کہ آپس کا مقابلہ بند کر دیں تاکہ نہ صرف نفع ہی بڑھے بلکہ کاروبار میں بھی استحکام آ جائے۔ اس خواہش کے مطابق وہ آپس میں طے کر کے جنس کی قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور اپنے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے دنیا کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں بانٹ لیتے ہیں اور بلا خوف مقابلہ استحصال شروع کر دیتے ہیں۔

جب کسی ملک کی ایک صنعت اس قدر عظیم اور منظم ہو جاتی ہے تو دوسری صنعتیں بھی اس کی تقلید پر مجبور ہو جاتی ہیں وہ بھی نفع اور استحکام کی خاطر اجارہ، ٹرسٹ، یا سنڈیکیٹ کی شکل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر انگلستان میں لوہے کا اجارہ قائم ہو جائے۔ لیکن کوئلہ کے کاروبار میں مقابلہ رہے تو اس شکل میں اجارے والا کوئلہ کے مختلف کاروباریوں میں مقابلہ پیدا کر کے ان کی جنس کو کم سے کم بھاؤ پر خرید سکتا ہے۔ اب کوئلے والے بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ کاروبار کو ایک قسم کے اجارہ یا سنڈیکیٹ میں تبدیل کر دیں۔ اس طرح ملک کی تمام صنعت و حرفت اجارہ داری، ٹرسٹ سنڈیکیٹ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ان تجارتی اجارہ داروں کا ملکی حکومت میں بہت دخل ہو جاتا ہے۔ حکومت اب ان کی پشت پناہ ہو جاتی ہے۔ حکومت قومی اور ملکی بہبودی کے نام پر سرمایہ داروں کی زر نقد سے اعانت کرتی ہے یا ان کی حمایت میں مزدوروں کے خلاف قانون بناتی ہے اور دوسرے ممالک کے مال پر ٹیکس وغیرہ لگا کر ان کی مدد کرتی ہے۔ غرض اب حکومت سرمایہ داروں کی مجلس عاملہ ہو جاتی ہے اور ان کا مفاد حکومت کے مد نظر رہتا ہے۔ وہی سرمایہ دار جب حکومت کی کرسی پر جلوہ گر ہوتے ہیں تو وزیر کہلاتے ہیں اور جب فیکٹری کے دفتر کی کرسی پر رونق افروز ہوتے ہیں ۵۸
تو دنیا ان کو مینیجنگ ڈائرکٹر کہہ کر پکارتی ہے۔

جب ملک کی تمام صنعتیں حد درجہ آلاتی ہو جاتی ہیں اور ملک اور قوم کی تمام دولت کا حاصل ہوتی ہیں تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ ان کو ترقی دے جائے۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ترقی انسان کو برطرف کر دیتی ہے۔ بیکار مزدوروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے بے کاری غربت پیدا کرتی ہے غربت سیاسی بے چینی پیدا کرتی ہے اور سیاسی بے چینی کو دفع کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ مزید کارخانے کھولے جائیں تاکہ مزدوروں کو کام ملے۔ نئے کارخانے اس وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ نئی منڈیاں اور نو آبادیاں تصرف میں آئیں جہاں نہ صرف تیار کردہ جنس ہی فروخت ہو سکے بلکہ خام جنس بھی ارزاں قیمت پر خریدی جا سکے۔ نئی منڈیوں کو تصرف میں لانے کے لئے یہ لابدی ہو جاتا ہے کہ کمزور ملکوں پر فوج کشی کی جائے اور ان کو فتح کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا جائے۔ جب سرمایہ داری اس منزل پہ پہنچ جاتی ہے تو ملوکیت یا امپیریلزم کہلاتی ہے۔

فرانس اور انگلستان دونوں امپیریل سلطنتیں ہیں لیکن اب جرمنی، اٹلی اور جاپان بھی سرمایہ داری کے امپیریل دور سے گزر رہے ہیں۔ ان نوجوان سرمایہ دار ملکوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا تو اپنے مال کے لئے تلوار کے زور سے بازار پیدا کریں یا تباہ ہو جائیں۔ فرانس اور انگلستان جب اس دور سے گزر رہے تھے تو ان سلطنتوں نے بھی وہی کیا تھا جو آج اٹلی، جرمنی اور جاپان کر رہے ہیں۔

جاپان کی اقتصادی حالت اس کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ وہ چین کو فتح کرے اور وہاں کے بازاروں میں اپنی جنس فروخت کرے۔ وہاں سے جنس خریدے تاکہ دنیا کی منڈیوں میں اور سرمایہ دار ممالک سے اقتصادی جنگ یعنی مقابلہ کر سکے۔

اٹلی کے لئے لازمی ہے کہ اپنی اجناس فروخت کرنے کے لئے ممالک فتح کرے تاکہ اٹلی میں بیکاری کم ہو، سرمایہ بڑھے اور اٹلی دوسری سرمایہ دار حکومتوں کی طرح طاقتور ہو جائے۔

جرمنی کی بھی یہی اقتصادی ضرورت ہے جو اس کو اس امر پر مجبور کر رہی ہے کہ پہلے یہودیوں کو لوٹ کر ابتدائی سرمایہ جمع کرے تاکہ بڑی بڑی صنعتیں قائم ہوں سامان حرب بنایا جائے اور دوسرے ملکوں کو فتح کیا جائے تاکہ تیار شدہ جنس کو وہاں کی منڈیوں میں فروخت کرے۔

جب بہت سے ملک سرمایہ داری کی امپیریل منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو ان میں آپس میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے ہر ملک اپنے اپنے مقبوضات کو اپنی تجارت کے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ میں وہ مقبوضات اس کی تجارت کے لئے ناکافی ہو جاتے ہیں پھر امپیریل ممالک کو اور منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے اب دنیا تنگ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زمین کے چپہ چپہ پر کسی سرمایہ دار حکومت کا قبضہ ہوتا ہے۔ اس صورت حالات میں امپیریل ممالک آپس میں جنگ کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ یورپ میں جو ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے وہ سرمایہ داری کا ہی نتیجہ ہے اس ہنگامہ آرائی کا محکوم ملکوں پر جو اثر ہوتا ہے وہ خاص طور پر ہمارے لئے دلچسپ ہے۔ جب جنگ کی وجہ سے سرمایہ دار سلطنتوں سے مال آنا بند ہو جاتا ہے تو مقابلہ نہ ہونے کی وجہ سے محکوم ملک میں صنعت و حرفت بڑی سرعت سے بڑھتی ہے۔ محکوم ملک کی سرمایہ دار جماعت کو نفع کمانے اور کاروبار بڑھانے کا سنہری موقع مل جاتا ہے اور ملک میں بڑی بڑی صنعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جنگ کے ختم ہونے پر بھی سرمایہ دار ملکوں کو دوبارہ کاروبار کو اس کی اصلی حالت پر لانے میں کچھ عرصہ لگتا ہے اس وقفہ میں محکوم ملک میں سرمایہ داری جڑ پکڑ جاتی ہے اور ملک کی منڈیوں کے لئے خود جنس بنانے لگتی ہے۔ حاکم ملک کے سامنے اب نیا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ محکوم ملک کے بازار پھر اپنے پنجے میں کس طرح لائے۔ ان صورت حالات میں محکوم سرمایہ دار جماعت اور حاکم سرمایہ دار جماعت میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ محکوم سرمایہ دار جماعت یہ چاہتی ہے کہ حاکم ملک کی سرمایہ دار جماعت کو
۵. نکال باہر کرے اور حاکم سرمایہ دار جماعت یہ چاہتی ہے کہ سیاسی وقار اور اقتصادی لوٹ برابر جاری رہے۔ اگر محکوم سرمایہ دار جماعت کمزور ہوتی ہے تو حاکم سرمایہ دار جماعت اس کو کچلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے ورنہ کچھ عرصے کی قوت آزمائی کے بعد دونوں جماعتیں نصفا نصف پر راضی ہو جاتی ہیں۔

آجکل ہندوستان میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ دراصل ہندوستانی سرمایہ دار جماعت اور انگریزی سرمایہ دار جماعت میں ہو رہی ہے اور کیونکہ انگریزی سرمایہ دار جماعت آجکل یورپ کی سیاسی مشکلات میں الجھی ہوئی ہے اس لئے نصفا نصف پر راضی ہو گئی ہے۔ غریب کی بہبودی دونوں میں سے ایک کا بھی مطمح نظر نہیں ہے۔

آجکل ہندوستان کی سوشلسٹ جماعت کی حالت بہت ہی قابل رحم ہے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی امپیریلزم کے خلاف جنگ کرتی ہے۔ جاپانی امپیریلزم کے خلاف چین کی خدمت کے لئے طبی وفد روانہ کرتی ہے۔ اطالوی امپیریلزم کے خلاف نذر نقد سے اسپین کی حکومت کی امداد کرتی ہے دوسری طرف اس ادارے سے منسلک ہے جو سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جو سرمایہ داری کو فروغ دے رہا ہے جس کا منتہائے نظر صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی امپیریلزم کی بنیاد رکھی جائے اور اس کو مستحکم کیا جائے۔

ہندوستان اس وقت مشین کاری کے دور سے گذر رہا ہے لیکن... ابھی تک... ابتدائی منازل میں ہے اس لئے عام نظر ان مصائب کو نہیں دیکھ سکتی جو آئندہ اس پیداوار کی طرح برسیں گے۔ ہم اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی تمام صنعت و حرفت رفتہ رفتہ چند ہندوستانی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آ رہی ہے اور یہ بھی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستانی حکومت میں ان کا اثر روز افزوں ہے کوئی سیاسی یا اقتصادی مجلس ایسی نہیں ہوئی جس میں سرمایہ داروں کے نمائندے شامل نہ ہوں ان کا روپیہ قومی ادارہ میں کام کرتا نظر آتا ہے وہ قومی اداروں کو اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ قوم اور ملک کے نام پر ان کے کارخانوں کی جنس کا پروپیگنڈا کریں اور غیر ملکی جنس کو خلاف کسادبازاری کو آسانا کرنے میں

جان و مال کو قربان کریں۔ جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ غریب کو چاہیے کہ سرمایہ دار کی جان، مال اور کارخانے کے لیے اپنی جان قربان کر دے اور قلیل سے قلیل عرصے میں انگریزی امپیریلزم کو ختم کر دے تاکہ ہندوستانی امپیریلزم اپنے پورے شباب پر آ جائے لیکن جب غریب کی بھوک کا سوال ہوتا ہے تو بہت متانت سے اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ صبر سے کام لے ہم بہت جلد غریب کی حالت درست کرنے کی تدبیر اختیار کرنے والے ہیں۔ دراصل سرمایہ داری تمدن میں رہ کر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غریب کی حالت درست ہو، خواہ نیک نیتی سے اس امر کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔

جس طرح ہندوستانی سرمایہ دار جماعت انگریز کی سیاسی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر ملک کے سیاسی اور اقتصادی مورچوں پر قبضہ کر رہی ہے اسی طرح سوشلسٹ جماعت کو یہ چاہیے کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعت کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر ملک کے سیاسی اور اقتصادی مورچوں پر قبضہ کر لے کیونکہ جہاں ہندوستانی سرمایہ دار جماعت طاقتور ہوئی پھر وہ غریب کا پیٹ "برہنہ تشدد" سے بھرے گی۔ غریب اور اس کی بھوک کا ذکر اسی وقت تک ہے جب تک انگریزی سرمایہ داری سے لڑنے کے لئے ہندوستانی سرمایہ داری کو غریب کی مدد کی ضرورت ہے۔

جب دو بڑے سرمایہ داروں میں اقتصادی جنگ ہوتی ہے تو بڑا سرمایہ دار اپنے مال کے دام لاگت سے بھی بہت کم کر دیتا ہے تاکہ دوسرا سرمایہ دار کو دیوالیہ کر دے۔ اس دام کم کرنے میں بڑے سرمایہ دار کا مقصد چھوٹے سرمایہ دار کو ہلاک کرنا ہوتا ہے لیکن حادثتہً عوام کو بھی جنس ارزاں مل جاتی ہے۔ حالانکہ بڑے سرمایہ دار کا مقصد عوام کو فائدہ پہنچانا نہیں تھا۔ جب چھوٹا سرمایہ دار دیوالیہ ہو جاتا ہے اور مقابلہ ختم ہو جاتا ہے تو بڑا سرمایہ دار جنس کے دام اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ نہ صرف اس کا پہلا نقصان ہی پورا ہوتا ہے بلکہ کروڑوں کا مزید فائدہ ہو جاتا ہے۔

اگر یہ مان لیں کہ آجکل غریب کو قلیل فائدہ ہو رہا ہے تو وہ بالکل حادثاتی طور پر ہو رہا ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار جماعت اپنی دولت کو ارزاں کر رہی ہے جس کا مقصد غریب کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے بلکہ انگریزی سرمایہ دار جماعت کو نکالنا ہے۔

۹

ایم - ایم جوہر میرٹھی

پیغام

(محمد اصغر صاحب بھوپالی)

بہ نگاہِ دل نوازی، بہ ادائے بے نیازی
تو مرا نگاہ داری، بہ فسونِ عشوہ کاری

رگِ جانِ من تپیدہ، بہ خیالِ آرزوت
تو ہزار جلوہ سامان بہ نگاہ در نیائی

اگر ہندوستان میرے ہاتھ میں ہوتا!؟

(محمد احمد سبزواری)

(ہندوستان کے اکثر رسالوں اور اخباروں میں ایسے مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے مگر یہ مضمون خاص معاشی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اس میں نہ تو کسی خیالی چیز کا ذکر کیا گیا ہے اور نہ کوئی تصوری لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض اہم باتوں کے جواز میں تو اعداد و شمار بھی پیش کئے گئے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی آبادی کا بڑا حصہ قسمت پرست اور قناعت پسند ہو، جہاں کے لوگ ان پڑھ، ناواقف اور دنیا کے حالات سے بے خبر ہوں، جہاں مذہب کی غلط تاویلات کی جاتی ہوں، جہاں توہمات کا دور دورہ ہو، جہاں فضول اور مضحکہ خیز رسوم و رواج مروج ہوں، جہاں احساس ذمہ داری اور تنظیم کا فقدان ہو وہاں بغیر جبر کے اصلاح ناممکن ہے۔ نیز جبری اصلاح بغیر ایک ڈکٹیٹر کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہندوستان میں ایک ڈکٹیٹر کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

موجودہ زمانے کے مطلق العنان حاکمین کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا اپنا ایک معاشی نظام ہوتا ہے۔ اور اس نظام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ مختلف قسم کی سیاسی چالیں چلتے ہیں۔ گویا ان کی سیاست کا دارومدار معاشی لائحہ عمل پر ہوتا ہے۔ اطالیہ، جرمنی اور روس کی مثالوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر موجودہ زمانہ میں سیاسیات معاشیات کا ایک جزو بن گئی ہے اس اصول کی بنا پر ذیل کے مضمون میں بعض ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو بالواسطہ طور پر معاشی دائرے میں داخل نہیں ہیں)

ہندوستان کا ڈکٹیٹر ہونے کے بعد ملک کی حالت پر غور کرنا سب سے ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ملک میں کونسے وسائل اور ذرائع موجود ہیں، کس کی تناسبی اہمیت زیادہ ہے۔ ان میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور ان کی اصلاح کس طرح کی جا سکتی ہے ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہندوستان کی آبادی کی پیشہ وارانہ تقسیم حسب ذیل ہے۔

نام پیشہ	مشغول شدہ آبادی کا فیصدی
زراعت اور اس سے متعلقہ پیشے	۶۵ ، ۰۴
صنعت و حرفت	۱۰ ، ۳۸
تجارت	۵ ، ۳۵
ملازمت اور آزاد پیشے	۲ ، ۸۶
نقل و حمل	۱ ، ۶۵
متفرق	۱۳ ، ۶۴

جدول بالا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کا اہم پیشہ زراعت ہے اور ۳۴ کروڑ باشندوں میں سے ۱۵ کروڑ کے قریب اس پیشے میں مصروف ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

مگر جب زراعت کی حالت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہمیت کے اس کی حالت بڑی خراب ہے، زراعت قدیم اور فرسودہ طریقوں پر ہو رہی ہے۔ آلات زراعت اور طریق کاشتکاری نسلاً بعد نسلاً چلے آ رہے ہیں، ان میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی۔ زمین قوانین وراثت، انفرادیت اور مشترک خاندانوں کے زوال کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی ہے۔ پھر یہ حصے بھی منتشر حالت میں ہیں۔ بعض جگہ زمینیں اچھی ہیں مگر پانی کی قلت ہے اس وجہ سے ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ایسے حصے ہیں جہاں پانی کی کثرت سے نہ صرف فصلیں اور زمین خراب ہو رہی ہے بلکہ بارش کے زمانے میں ذرائع آمد و رفت بھی مسدود ہو جاتے ہیں، چونکہ ہندوستان قدیم ملک ہے اور پرانے زمانے سے زمینوں پر کاشت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے زمینوں کے قدرتی اجزا ختم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی پیداوار میں کمی آتی جا رہی ہے (اسی تخیل کو پرانے زمانے کے لوگ "خیر و برکت" کے کم ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں) ضرورت ہے کہ کم ہونے والے اجزا کو مصنوعی طور پر کھاد وغیرہ کے ذریعے سے دوبارہ زمینوں میں داخل کیا جائے۔

ملک میں مویشی ہی تنہا قوت متحرکہ کا ذریعہ ہیں اور انھیں پر زراعت کی ترقی کا دارومدار ہے مگر اس اہمیت کے باوجود ان کی غذا، رضاعت، رکھ رکھاؤ، علاج معالجہ اور عمدہ نسلوں کی پرورش کے انتظامات مفقود ہیں۔ کاشتکاروں کی آمدنی کا بڑا حصہ ناجائز طور پر دلالوں، آڑھتیوں، دوکانداروں، مہاجنوں، اور سرکاری ملازموں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔

جو شخص ہندوستان کے حالات سے واقف نہو۔ اگر جدول بالا اس کے سامنے رکھی جائے تو وہ یقیناً رائے قائم کرے گا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ منفعت بخش پیشہ زراعت ہے کیونکہ اسی میں کثیر آبادی مشغول ہے اور ہر ملک میں اسی اصول پر عمل ہوتا ہے مگر ہمارے

۹۱ یہاں حالات برعکس ہیں، یہاں زراعت میں کثیر لوگ اسی وجہ سے مضر ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا پیشہ نہیں ہے۔ زراعت سے بہت ہی قلیل آمدنی ہوتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں فنڈلے شیراز نے ملک کی زرعی پیداواروں کی قیمت سترہ کروڑ کے قریب بتائی تھی۔ اس سال زرعی آبادی کی تعداد ۱۲ کروڑ تھی گویا اس طرح ایک زراعت پیشہ فرد کی آمدنی ایک روپیہ سے بھی کم ہوئی۔

میں حاکم بنتے ہی وراثت کے پرانے قوانین کو منسوخ کر دوں گا۔ زمین کی تقسیم کے بجائے اس کی آمدنی تقسیم ہوا کرے گی۔ مثلاً ایک شخص کے ۱۰۰ ایکڑ زمین ہے جس سے ایک ہزار روپیہ آمدنی ہوتی ہے اس کے چار بیٹے ہیں تو اب بجائے اس کے کہ ہر لڑکے کو ۲۵ ایکڑ زمین ملے وہ ڈھائی سو روپیہ کا حقدار قرار پائے گا۔ ایک لڑکا کاشت کریگا۔ یہ ضروری نہیں کہ کاشت کرنے والا بڑا ہی لڑکا ہو بلکہ جو عمدہ کاشتکار ہوگا اس کو زمین ملے گی۔ اخراجات کے بعد جو آمدنی ہوگی وہ چاروں لڑکوں میں تقسیم ہوگی، منتظم کو ۱۰ فی صدی حق انتظام ملے گا۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ زمین منتشر اور منقسم نہ ہو سکے گی مگر یہ طریقہ محدود ہو جائے گا یعنی ایک مقررہ مقدار (۱۰ ایکڑ) سے کم زمین ہو تو اس کی تقسیم نہ ہوگی ایسی صورت میں چاہے جتنے بیٹے ہوں جو عمدہ کاشتکار ہوگا وہ زمین کا مالک ہوگا اس طریقے سے انگلستان کے قانون کے معاخرات سے بھی ملک محفوظ رہ سکیگا۔ ان تمام منتشر قطعات زمین کو جو ایک شخص کے ایک گاؤں میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہوں گے ملا دیا جائے گا۔ اس اشتراک سے انفرادی طور پر بعض کاشتکاران کو نقصان اور بعض کو فائدہ ہوگا۔ مگر مجموعی حیثیت سے ملک کے لئے یہ چیز مفید ہوگی۔ افراد کے عارضی منافعوں کو ملک کے مستقل منافع کے لئے قربان کر دینا جائز ہو سکتا ہے۔

ملک میں قابل ذکر تعداد ۱۴ کروڑ مویشی ضرورت سے زائد ہیں ان پر ۶۰ کروڑ روپیہ سالانہ کی رقم صرف ہوتی ہے جو ہندوستان کی مالگذاری

کی جو گنی رقم ہے۔ ناکارہ مویشی نہ صرف کوئی کام نہیں کرتے بلکہ تندرست اور اچھے مویشیوں کی غذا میں ساجھے دار بن کر ان کی کارکردگی میں بھی کمی کرتے ہیں۔ مذہبی رجحانات کی وجہ سے ناکارہ مویشیوں کی بڑی تعداد کو مارا نہیں جاتا۔ حالانکہ جس طرح ایک درزی مشین سے اس وقت تک کام لیتا ہے جب تک کہ وہ چلتی ہے۔ بیکار ہو جانے کے بعد اس کو الگ کر کے دوسری مشین خرید لیتا ہے۔ اسی طرح کاشتکاران کو مویشیوں کو اس وقت تک کھانا چاہئے جب تک کہ ان میں کام کرنے کی صلاحیت ہو۔ پھر علیحدہ کر دینا چاہئے۔ میں حاکم ہوتے ہی تمام ناکارہ مویشیوں کو ذبح کرا دوں گا اور ان کے گوشت، ہڈی، کھال اور خون سے مصنوعات اور کھاد کی تیاری کا کام لیا جائے گا۔ متعدی امراض میں مبتلا مویشیوں کے گولی ماری جائے گی اور ان کو دفن کر دیا جائے گا۔

ان علاقوں میں جہاں پانی کی قلت ہے نہروں، کنوؤں یا تالابوں کے ذریعہ سے آبپاشی کا انتظام کیا جائے گا۔ نیز ان حصوں میں جہاں پانی کی تیزی مسدہ زمینوں کو کاٹ دیتی ہے پشتے اور جنگلات لگا کر پانی کا بہاؤ کم کر دیا جائے گا تاکہ زمین خراب نہ ہو سکے۔

گوبر جو بہترین کھاد ہے ملک میں ایندھن کی قلت کی وجہ سے جلایا جاتا ہے۔ کاشتکار کا افلاس اس کو مصنوعی کھاد استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں گوبر کو بطور ایندھن جلانے کی ممانعت کر دوں گا اور ایندھن کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ جو لکڑی شہروں میں بطور ایندھن جلتی ہے وہ دیہات میں استعمال ہو اور شہروں میں برقی قوت سے کام لیا جائے۔ گاؤں کے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ گاؤں کے باہر ان گڑھوں میں ڈالیں جو اس کے لئے بنائے گئے ہیں اور انہی کو بطور بیت الخلا استعمال کریں۔ اس طرح ایک طرف گاؤں کی صفائی ہوگی دوسرے کھاد کی بڑی مقدار آسانی سے جمع ہو سکے گی۔ گاؤں میں صفائی اور عام نظم و نسق کے لئے پنچایتیں قائم کی جائیں گی جن میں پیشہ داری کے اعتبار سے نمائندے ہوں گے، گاؤں کی سب باتوں کی ذمہ داری پنچایت پر ہوگی۔

ملک میں اچھے بیجوں کی قلت ہے۔ کاشتکار اپنی مفلسی کی وجہ سے اپنی پیداوار فروخت کر دیتا ہے اور بیج ساہوکار سے قرض لیتا ہے یہ بیج بڑا خراب
۶ ہوتا ہے اور اس کا اثر فصلوں پر پڑتا ہے۔ میں ساہوکاروں سے تخم لینے کی ممانعت کر دوں گا ضرورت مند کاشتکاروں کو حکومت بیج دیا کرے
گی۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کے پاس اتنا غلہ کہاں سے آئے گا تو چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں سے مالگذاری زر کے بجائے غلہ میں وصول کرے گی
اس طرح کاشتکاروں کو یہ فائدہ ہوگا کہ موسم کے زمانے میں جبکہ پیداواروں کے نرخ گر جاتے ہیں محض لگان ادا کرنے کی غرض سے پیداوار فروخت
کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ہندوستان میں جنگلی جانوروں، چوہوں، چھچھوندروں اور ٹڈیوں سے ہر سال زراعت کو کثیر نقصان ہوتا ہے۔ اندازہ ہے کہ صرف صوبہ بمبئی میں ان سے ۷۰ لاکھ سالانہ کا نقصان ہوا ہے۔ اس میں مذہبی اعتقادات، اسلحہ کی پابندیاں اور ان کو ہلاک کے طریقوں کی لاعلمیت کو بھی دخل ہے۔ میرے دور میں ان تمام علاقوں میں جہاں جنگل قریب ہیں کسانوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت ہوگی اور فصلوں کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو ہلاک کر سکیں گے۔ چوہے اور ٹڈیوں کے مارنے کا انتظام جدید طریقوں پر صوبجاتی حکومتوں کے سپرد ہوگا۔

ہندوستانی زراعت کا اہم اور پیچیدہ ترین مسئلہ زرعی قرضداری ہے۔ سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی نے برطانوی ہند کے زرعی قرضہ کی تعداد ۹ ارب بتائی ہے ملک کی کثیر زراعت پیشہ آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ قرضہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ مگر بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ سودی اور غیر پیداوار قرضہ پر مشتمل ہے جس کے سود اور اصل کا بار کاشتکاروں کے لئے ناقابل برداشت ہے کاشتکاروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اس رقم کو ادا کر سکیں ناممکن ہے اس کے لئے ملک میں مصالحتی بورڈ بنائے جائیں گے اور مہاجنوں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے قرضہ کی تعداد کم کریں۔

تخفیف شدہ رقم چھوٹی چھوٹی اقساط میں وصول ہوگی۔ آئندہ سے غیر پیداواری کاموں کے لئے قرضہ دینے کی ممانعت ہو جائے گی اور جو مہاجن ایسا کریں گے ان کے قرضے ضبط ہو جائیں گے۔ جو کاشتکار دھوکے سے روپیہ حاصل کریں گے ان کو پنچایت سخت سزا دے گی۔

کاشتکاروں کی قلیل آمدنی کو بڑھانے کے لئے دیہات میں مختلف صنعتیں اور ضمنی پیشے قائم کئے جائیں گے۔ مثلاً مرغ پروری، مسل پروری، اون بافی، دستکاریوں کی کاشت، سیسہ سازی، بید کا کام وغیرہ وغیرہ۔ جو چیزیں ملک میں تیار ہوتی ہیں اس قسم کی چیزیں بیرونی ممالک سے ملک میں درآمد نہ ہو سکیں گی۔ ایسی صورت میں ملکی اشیاء کا بازار وسیع ہو جائے گا۔

ملک کی خوشحالی کے لئے سب سے ضروری چیز صحت و تندرستی ہے گو ہمارے ملک کی آبادی زیادہ ہے مگر صحت کا معیار بہت پست ہے اوسط عمر گھٹتا ہوا ہے۔ لوگ ضعیف اور کمزور ہیں اور بہ آسانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ متعدی بیماریاں بھی وباؤں کی طرح پھیلتی ہیں۔ اس میں کمسنی کی شادیوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ کم عمر والدین جن کے اعضا خود بھی مکمل طور پر نشو و نما نہ پا چکے ہوں کس طرح تندرست اولاد پیدا کر سکتے ہیں۔ کمزور اور دائم المرض بچے ملک کے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔ زچاؤں کی اموات اور پیدا شدہ بچوں کی ہلاکت سے ملک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ عورت بہتر ہے جو صرف دو ہی تندرست بچے پیدا کرتی ہے بہ نسبت اس عورت کے جو ایک درجن بچے پیدا کرتی ہے مگر اس میں سے صرف چار زندہ رہتے ہیں۔ بچے کی پیدائش سے عورت کی صحت متاثر ہوتی ہے اور آئندہ کمزور بچے پیدا ہوتے ہیں پھر کمزور اور ناتوان بچوں کی پیدائش اور اموات پر جو رقم صرف ہوتی ہے وہ محض "تضیع" ہے اس کے علاوہ ایک اور چیز کمسن لڑکیوں کی ضعیف العمر افراد سے شادیاں ہیں۔ ایسی صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ شوہر چند سال کے بعد ایک نوجوان بیوہ اور ایک دو بچے چھوڑ کر مر جاتا ہے اور ان بچوں کی پرورش کا بار غریب بیوہ پر پڑتا ہے۔ چنانچہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے حسب ذیل چیزوں پر عمل کیا جائے گا۔

(۱) ۲۲ سال سے کم عمر کا لڑکا اور ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہ ہو سکے گی۔

(۲) قانوناً کوئی ایسی شادی جائز قرار نہیں دی جائے گی جس میں میاں بیوی کی عمر میں دس سال سے زیادہ کا تفاوت ہو۔

(۳) ہر مرد اور عورت کا شادی سے پہلے طبی معائنہ ہوگا۔

۲۳ (۴) مجنون، جذامی، برص اور امراض خبیثہ کے مریضوں کو شادی کی اجازت ہوگی۔ مگر اولاد پیدا کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) ڈاکٹروں کے مشورے سے تندرست بچے کا وزن مقرر کیا جائے گا اور جو بچہ صحیح الاعضا ہو اور اس مقررہ وزن پر پورا اترے اس کو حکومت کی جانب سے وظیفہ دیا جائے گا۔ اس طریقہ سے دوسروں کو تندرست اور صحت مند بچے پیدا کرنے کی ترغیب ہوگی۔

(۶) ملک میں اسپتال، زچگی خانے، کھیل کے میدان، پارک وغیرہ بنائے جائیں گے۔ ہر شخص کو اپنے گھر اور اپنے گھر کے سامنے کے حصے کی صفائی کا ذمہ دار بنایا جائے گا اور جو اس کے خلاف ورزی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔

تعلیم کی افادیت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان بغیر تعلیم کے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں حاکم ہوتے ہی جبری تعلیم عام کروں گا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا نصاب بالکل علیحدہ ہوگا۔

موجودہ تعلیم کی ایک یہ بھی خرابی ہے کہ مختلف طبقوں کے بچوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دیہات کے بچوں کو فرضی قصے پڑھانا، شعر کے محاسن اور ادب کی باریکیاں بتلانے سے کیا فائدہ۔ ان کے لئے دیہی قصے، زرعی معلومات اور ان کی زندگی کے متعلقہ امور کی تعلیم دینا چاہئے مزدوروں کے بچوں کو بتلانا چاہئے کہ دنیا میں بڑے آدمی کس طرح پیدا ہوئے۔ آخر مزدوروں کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی خدمت کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے نصاب سے بچوں کو اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا ہوگی اور انسانی امنگ، جوش اور ولولہ پیدا ہو جائے گا وہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے اور اپنی خوابیدہ قوتوں سے کام لے کر ملک اور ملت کو فائدہ پہنچائیں گے۔ ملک میں ادبی تعلیم کے علاوہ زرعی، تجارتی، صنعتی تعلیم کا بھی انتظام ہوگا۔ اس وقت ہمارے دیہات میں جو مدارس قائم ہیں اور ان پر جو رقم صرف ہو رہی ہے اس کا بڑا حصہ بیکار جاتا ہے کیونکہ بچوں کو مدرسہ ختم کرنے کے بعد تعلیمی ماحول نہیں ملتا اور اکثر بچے لکھنا پڑھنا بھول جاتے ہیں۔ اس نقص کے دفعیہ کے لئے دیہات میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں اور دارالمطالعے

کھولے جائیں گے اور گشتی کتب خانوں اور تعلیمی اور اصلاحی مضمون کی نمائش کا انتظام کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہر گاؤں میں مستقل تعلیمی ماحول قائم کرنے کے لئے وہاں ایک گریجویٹ کو رکھا جائے گا۔ پروفیسر برج نراین نے [illegible] میں صرف پنجاب کے پاس شدہ گریجویٹ کی تعداد [illegible] ہزار بتائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی درسگاہوں سے ہر سال ۵ ہزار گریجویٹ نکلتے ہیں اور ان کی بڑی تعداد بے روزگاری کا شکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو قلیل معاوضہ پر گاؤں میں بود و باش اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور ان کو زراعت کرنے میں حکومت کی جانب سے مختلف سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ ان سے اصلاح دیہات میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

جو لوگ سکہ کے معاملات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانی سکہ آزاد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انگلستان کے سکے سے ہے۔ جب کسی ملک کا سکہ آزاد نہیں ہوتا تو اس کو دوسرے ملک کے حالات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر انگلستان اپنے یہاں کے مقامی حالات سے مجبور ہوکر معیار طلا کو ترک کر دے تو ہندوستان بھی مجبوراً معیار طلا سے الگ ہو جائے گا خواہ مقامی حالات اس کی اجازت دیتے ہوں یا نہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آزاد سکہ کی عدم موجودگی سے ہندوستان کا بعض اوقات کس قدر نقصان ہوا ہے۔ میں حاکم ہوتے ہی ملک میں آزاد سکہ رائج کروں گا اور اس سے ملک کو خواہ مخواہ جو نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں ان سے نجات مل جائے گی۔

اگرچہ ہندوستان شہروں کا ملک نہیں ہے اور یہاں ایک لاکھ سے زائد آبادی کے صرف [illegible] شہر ہیں مگر پھر بھی بعض شہروں میں اور بالخصوص کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں مکانوں کا مسئلہ بہت شدید ہے۔ مکانوں کا کرایہ اس قدر زیادہ ہے کہ متعدد خاندان ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گذارتے ہیں اس کا اثر صحت کے علاوہ اخلاق پر بھی بہت برا ہوتا ہے۔ ایک جانب ایک نیا شادی شدہ جوڑا شب عروسی منا رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک غریب عورت زچگی کی حالت میں دم توڑ رہی ہوتی ہے۔ پھر ان شہروں میں ہزاروں ایسے افراد بھی ہیں جن کے پاس مکان ہی نہیں ہے وہ سڑکوں، چبوتروں اور دکانوں کے سامنے رات بسر کرتے ہیں۔ میں حاکم ہوتے ہی غریبوں کے لئے مکان بنواؤں گا اور ان کا کرایہ بہت قلیل رکھا جائے گا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ غیر مستحق لوگ ان مکانوں پر قبضہ نہ کر سکیں۔

کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے روزانہ آٹھ گھنٹے سے زائد کام لینے کی اجازت نہ ہوگی۔ ان کو دن میں ایک گھنٹہ کی چھٹی اور ہفتہ میں ایک دن تعطیل دینا ہوگی۔ کارخانہ کے کسی مزدور کو چھبیس روپیہ ماہانہ سے کم تنخواہ نہ ملے گی۔[1] نیز عورتوں کو زچگی کے زمانہ میں رخصت ملا کرے گی اور اس زمانہ کی تنخواہ بھی ادا کی جائے گی۔

ہر ملازم کے لئے خواہ وہ سرکاری ہو یا خانگی زندگی کا بیمہ لازمی قرار دیا جائے گا اس سے ایک طرف نیا کاروبار پیدا ہوگا دوسری طرف ہر فرد کی وفات کے بعد اس کے ورثا کو ایک معقول رقم مل جایا کرے گی۔ اس کے علاوہ ان تمام اداروں میں اور خانگی ملازمتوں میں جہاں اوقاف اور مذہبی اداروں، خانقاہوں اور مزاروں کی جاگیریں، انعام، معافیاں وغیرہ ضبط کر لی جائیں گی اور ان کی آمدنی سے محتاج خانے، بیت المعذورین، دار الضعفاء، یتیم خانے اور بیوہ گھر بنوائے جائیں گے۔ آجکل ان اوقاف کا حقیقی مقصد بالکل پورا نہیں ہو رہا ہے اور یہ چیزیں متولیان وقف کی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ مستحق اور ضرورت مند ان کے فوائد سے مستفید نہیں ہوتے، ملک میں گداگری کی قطعاً ممانعت کر دی جائیگی۔ اور جو لوگ حقیقی طور پر امداد کے مستحق ہیں ان کی پرورش میری حکومت اپنے ذمہ لے لیگی۔

قدیم زمانہ میں مذہبی خدمات کے علاوہ فوجی اور سیاسی اغراض کے لئے بھی جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ مگر موجودہ جاگیردار ان خدمات کو تو

---

[1] آجکل اجرت کا سوال بہت اہم ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے جو حساب لگایا ہے اس کی رو سے ایک خاندان (جس میں شوہر اور بیوی کے علاوہ ۱۸ سال سے کم عمر کے تین بچے شامل ہوں) کے لئے کم از کم ۲۶ روپیہ ماہوار کی ضرورت ہے تاکہ یہ خاندان معقول اخلاقی معیار زندگی بسر کر سکے

انجام نہیں ہو سکتے رہے، البتہ جاگیروں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ میں ان سب جاگیروں کو ضبط کروں گا۔ البتہ جاگیرداروں کے ساتھ اتنی رعایت کی جائے گی کہ ان کو تاحیات جاگیر کی نصف آمدنی دی جائے گی۔ اس طرح تمام جاگیریں انتظام واحد کے تحت آجائیں گی۔

ہر ملک کو اپنی مدافعت کے لئے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے چنانچہ مدافعت کی خاطر ہر ہندوستانی عاقل و بالغ مرد پر ۱۲ سال سے ۴۱ سال کی عمر تک ایک سال کے لئے مغربی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوگی۔ نیز ہر عورت پر تین ماہ کا فرسٹ ایڈ کا کورس ختم کرنا ضروری ہوگا عورتوں کی فرسٹ ایڈ کی تعلیم گھر میں بہت کام آئے گی اور ضرورت کے وقت ملک بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے گا۔

ملک میں نئی نئی صنعتیں قائم کی جائیں گی نیز ابتدائی زمانہ میں ان کو معقول امداد دی جائیں گی بیرونی سرمایہ ملک میں بطور سرمایہ داخل نہ ہو سکیگا۔ البتہ بشرط ضرورت بطور قرض آسکتا ہے۔ ساحلی جہاز رانی کا اجارہ بدیسی کمپنیوں کے ہاتھ میں نہ رہے گا اس سے ملک کو کافی فائدہ ہوگا

"مطالبات ولایت" اس کثیر رقم کو کہا جاتا ہے جو حکومت ہند اپنے کام کے واسطے انگلستان سے جو سامان خریدتی ہے اس کی قیمت، جو قرضہ لیتی ہے اس کا سود اور اصل، جنکو ملازم رکھتی ہے اُن کی تنخواہ بھتے، انعام اور پنشن وغیرہ اسی مد میں شامل ہیں اور یہ پونڈ کی شکل میں ادا کرنا ہوتی ہیں۔ ہندوستان کو اکثر اوقات ان مطالبات کے سلسلے میں بڑا کثیر نقصان ہوا ہے۔ بہرحال میں حاکم ہوتے ہی اس مد کو ختم کر دوں گا

نیز ہندوستانی راجاؤں اور مہاراجوں کو یورپ میں لاکھوں روپیہ صرف کرنے کی ممانعت کر دی جائے گی۔ ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ صرف اُن ہی لڑکوں کو بھیجا جائے گا جن کی صلاحیتیں عمدہ ہیں، کوئی لڑکا محض اس وجہ سے یورپ نہ جا سکے گا کہ وہ ایک مالدار آدمی کا لڑکا ہے نیز یورپ کے تعلیم یافتہ آدمیوں کو یورپین خواتین لانے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ اس سے ملک کی لڑکیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ پھر غیر ملکی بیویوں کے اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور وطن کے سفر میں ملک کی کثیر رقمیں باہر نکل جاتی ہیں۔

پنشن کا رواج نہیں ہوگا وظیفہ پر ہی تقرر کیا جائے گا۔ اس وظیفہ کے لئے کام کرنے والے کی تنخواہ کا ایک حصہ کٹتا رہے گا۔ اس کے علاوہ آقا کو
٥ بھی چوتھائی حصہ دینا پڑے گا اور حکومت بھی تھوڑی بہت امداد کیا کرے گی۔

سارے ملک میں امتناع منشیات کا قانون نافذ کر دیا جائے گا۔ کیونکہ منشیات سے صحت اور کارکردگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے صحت اور اخلاق تباہ ہو جاتا ہے۔ آمدنی کا معقول حصہ وقتی راحت حاصل کرنے کی نذر ہو جاتا ہے۔ عارضی تفریح کے دیگر ذرائع مثلاً عمدہ ڈرامے، اصلاحی فلم، موسیقی اور اسی قسم کے دوسرے تفریحی مشاغل مہیا کئے جائیں گے۔

اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ ان تمام تدبیروں کو عملی صورت میں لانے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا بلکہ ملک کی موجودہ آمدنی میں کمی ہوگی۔ امتناع منشیات کی بدولت آبکاری، افیون وغیرہ کی آمدنی ختم ہو جائے گی۔ ملک کی صنعتوں کو تامین دینے سے محاصل درآمد میں کمی ہوگی۔ مگر "مطالبات ولایت" اور آزاد سکہ سازی کی بدولت آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ مزید اخراجات کے لئے فوج اور سرکاری تنخواہوں میں تخفیف کی جائے گی۔ ہندوستان کی سیاسی اہمیت اور موجودہ بین الاقوامی نازک صورت حال کا مطالعہ فوج کی تخفیف کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر اس وقت ہمارے یہاں گورہ فوج بھی ہے چنانچہ سنہ [illegible] میں برطانوی ہند میں ۵ برطانوی رسالے تھے۔ ہر رسالے میں ۲۷ افسر اور ۸۶۵ سپاہی تھے۔ اور ۴۵ رجمنٹ تھیں اور ہر رجمنٹ میں ۲۸ افسر اور ۸۶۵ سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوجوں میں بھی برطانوی افسر ہیں اور ہوائی بیڑہ بھی برطانوی افراد ہی پر مشتمل ہے۔ برطانوی سپاہیوں اور عہدہ داروں کی تنخواہیں ہندوستانیوں کے مقابلہ میں دوگنی ہوتی ہیں۔ میں حاکم ہوتے ہی بدیسی فوجوں کو ختم کر دوں گا۔ اس طرح ایک جانب ۵۰ ہزار ہندوستانیوں کو روزگار مل جائے گا اور اخراجات میں کئی کروڑ کی کمی ہو جائے گی۔ ہندوستانی ریلوں میں بھی بدیسی افسران کے بجائے دیسی لوگ ملازم رکھوں گا۔ اس طرح اخراجات میں بچت ہوگی اور بے روزگاروں کو روزگار مل جائے گا۔

دوسری صورت ملازموں کی تنخواہوں میں تخفیف ہے۔ میں بحیثیت ڈکٹیٹر کے ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ لوں گا صوبہ کے گورنروں کو ۷۰۰ روپیہ

وزیر افسروں کو چھ سو اور دوسرے کو دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملا کرے گی۔ تنخواہ کے علاوہ کسی کو مکان یا موٹر یا الاؤنس نہ ملے گا علاوہ جو دورے کے زمانہ میں اس کے معمولی اخراجات ملا کریں گے اس طریقہ سے بہت کافی بچت ہوگی۔ مگر اس بچت کا بڑا حصہ ان ملازموں کی تنخواہ بڑھانے میں ادا کیا جائے گا۔ میرے دور حکومت میں ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم سرکار کو بھی ۲۶ روپیہ ماہوار سے کم تنخواہ نہ ملے گی۔ جب ملازمان سرکار کو معقول پیمانہ آرام پر زندگی بسر کرنے کے لائق تنخواہ دی جائے گی تو رشوت کا انسداد آسانی سے ہو سکتا ہے کم تنخواہ والوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ رشوت نہ لیں ایک فضول خیال ہے۔ میں قانون بنا دوں گا کہ رشوت لینے اور دینے والے دونوں کو سخت سزائیں دی جائیں اور اس بات کی نگرانی کا انتظام رکھا جائے گا کہ رشوت ختم ہو جائے۔ نیز مختلف طریقوں سے ملک کے عام معیار اخلاق کو بلند کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے بعد ان چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں کا خود بھی انسداد ہو سکے۔

دولتِ کونین

(شعری صاحب بھوپالی)

کبھی حصولِ الم میں کمی نہ کی ہیں نے — تمام عمر تڑپ کر گذار دی میں نے

ملا کے اپنی نگاہوں سے کیفِ نظارہ — بنا دیا ترے جلووں کو عیدنی میں نے

کسی پہ دل کو مٹا کر کچھ اسطرح خوش ہوں — کہ جیسے دولت کونین لوٹ لی میں نے

فنا سے اب مری ہستی کو واسطہ نہ رہا — بنا لیا ہے محبت کو زندگی میں نے

جو تو نہیں تو نہ ہو، یوں بھی مطمئن ہوں میں — ترے خیال سے کرلی ہے دوستی میں نے

بڑھا کے داغِ محبت کی تابشِ پیہم — فلک سے مشعلِ خورشید چھین لی میں نے

فسردہ ہو کے جہاں سے اٹھا ہوں میں شعری
جہاں اٹھائے بہت لطفِ زندگی میں نے

روس کا تعلیمی انقلاب

(از سعدی مجلی مشہدی)

"ہم کسی طرح بھی نصف جنگ بلند کئے بغیر کامیابی کی آخری منزل پر نہیں پہونچ سکتے۔ ہم اسی وقت اشتراکی ہو سکتے ہیں جب ہمارے دلوں سے وہ سرمایہ دارانہ خیالات نکل جائیں جن میں زر و جواہر جمع کرنے کے سوا اور کسی چیز کی گنجائش نہیں —— ہاں! میں یہ جانتا ہوں کہ اگر مجھے تھوڑا بہت بھی علم ہے تو مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ اشتراکی ہے اور وہ علم سے بے بہرہ ہے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہرگز اشتراکی نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں کوئی شخص اس وقت تک صحیح معنی میں اشتراکی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ —— زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ نہ ہو۔ (لینن)"

"اشتراکیت کی فتح اسی وقت ہو سکتی ہے جب دنیا میں صحیح طور پر آرٹ اور سائنس پھیل جائے —— اور یہ دونوں چیزیں یقیناً ہر انسان کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ دیکھو تم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک تم میں کام کرنے کی پوری صلاحیت نہ پیدا ہو جائے (لن چراکسی)

٧٤

انقلاب سے پہلے

یہ خصوصیت صرف حکومت روس ہی کو حاصل ہے کہ اس کا نظامِ تعلیم بہت پرانا ہے اور جو ہمیشہ سے حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ کیتھرائن عظمیٰ نے یورپی ممالک پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے اثرات سے ۱۸۰۲ء میں مفت تعلیم دینا رائج کیا۔ اس وقت اسکول تھوڑے تھے اور ان میں طلبا کی کل تعداد تیس ہزار سے زاید تھی، اس کے بعد سکندر اول نے تختِ سلطنت پر بیٹھتے ہی متضاد طریقے سے اس میں چند فی صدی ترقی دکھائی۔ نیز ایسی اسکیم بھی بنائی جس کے تحت طلبا اسکول کے محدود دائرے سے نکل کر یونیورسٹی تک پہونچ سکیں۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود لوگ صرف حکومت کے دباؤ کی وجہ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس دور کے نکولس اول نے اسے محسوس کیا اور وہ احکامات جاری کئے جن کے ذریعے سکنڈری (ثانوی) تعلیم مزدوروں اور کسانوں کے لئے ممنوع قرار پائی اور اعلیٰ تعلیم بھی صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دی گئی جو حکومت کے عہدے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سیاسی آزادی کی کشمکش کے ساتھ ساتھ تعلیمی تغیرات کا آغاز ہوا۔ جوں جوں سیاسی حالات سدھرے تعلیمی حالات بھی بہتر ہوئے۔

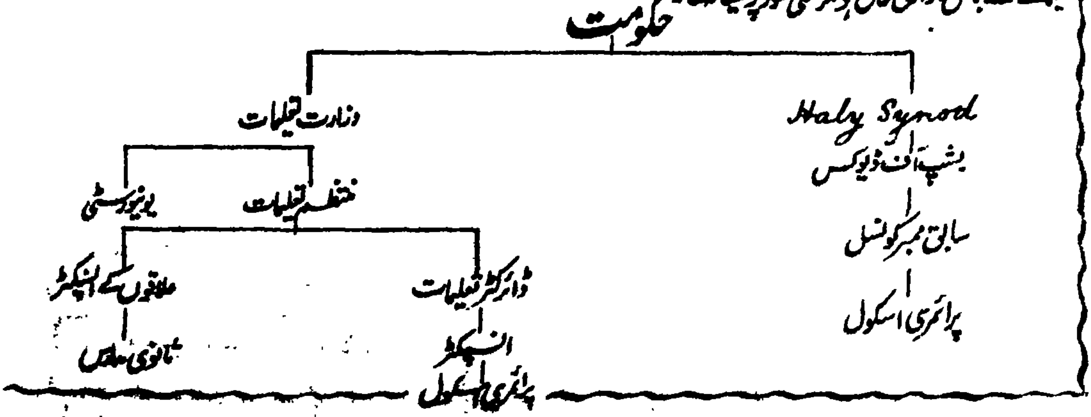
ایک عرصے پہلے تعلیم کلیسا والوں ہی تک محدود تھی۔ ۱۸۳۱ء میں ایک ایسٹیکل (   ) اکاڈمی کیو (Kiev) میں قائم ہوئی تو اس وقت کلیساؤں نے بھی عوام کی تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اکاڈمی مذکور نے اپنے مدرسے جامعتی سرمایہ سے جاری کئے۔ گذشتہ صدی میں ادارہ نے غیر مذہبی (Undenominational) مدرسے جاری کئے۔ یہ دیکھ کر اہلِ کلیسا نے اپنی فوری توجہ اس طرف مبذول کی۔ اور پرائمری تعلیمات کے لئے مدارس قائم کئے جن کے لئے حکومت سے مدد حاصل کی۔ یہ مدارس (Holy Synod) کے زیر اثر آ گئے۔ ان اسکولوں کی جگہ

کرنے والی ”پروکیوٹر پابنا سینتو“ کی مشہور و معروف ہستی تھی۔ پرائمری طریق تعلیم کے جاری کرنے کے سلسلے میں دو جماعتوں کا نام قابل تذکرہ ہے
(۱) اعلیٰ طبقے کے مقامی لوگوں کی جماعت
(۲) اہل کلیسا کی جماعت

اِن دونوں میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے کافی مقابلہ اتی جنگ ہوئی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فاستو کی پارٹی یا اہل بلدیہ تشدد پسند نہ تھے۔ بلکہ یہ وجہ تھی کہ اہل کلیسا مذہبی تبلیغ نہ کرنے کے نتائج سے واقف تھے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ حکومت اہل کلیسا کی مدد کرتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے مدارس کو بھی امداد دیتی تھی۔ چنانچہ تمام دیگر جماعتوں کو اسی وجہ سے حکومت نے تشدد پسند قرار دیکر ہمیشہ کیلئے کچل دینا چاہا۔ حکومت کی اس پالیسی کے خلاف عوام کے سمجھدار طبقے میں حکومت اور وزارتِ تعلیمات کے خلاف شورش شروع ہوئی۔ اس شورش نے اکثر مقامات پر خون خرابہ تک کی نوبت پہنچائی۔

ثانوی (سیکنڈری) اور فنی مدارس کو بھی ”دستو لیرچل“ کی امداد حاصل تھی۔ لیکن اُن کو مدارس کے انتظامات میں دخل دینے کی حکومت کی طرف سے بالکل ممانعت تھی وہ خازن کو اپنے چندے لاکر دے دیتے تھے جو تعلیمی ترقی پر کم ہی خرچ کی جاتی تھی۔ ان مدارس کا تعلق براہِ راست مرکزی حکومت سے تھا جو نہایت مطلق العنانی کے ساتھ جو چاہتی کرتی، وزارتِ تعلیم بھی آزادانہ کچھ نہ کرسکتی۔ تعلیمی شعبے کے عہدے دار خود بادشاہ کی طرف سے منتخب ہوتے۔ جو سب اپنی اپنی جگہ پر مطلق العنان تھے۔ وہی نصابِ تعلیم، اساتذہ اور دوسرے ذمہ دار انتظامی عہدے داروں کا تقرر کرتے صرف یہی نہیں بلکہ پڑھانے کے طریقوں کا بھی فیصلہ کرتے۔ چونکہ ان منتظمین ہی کے ہاتھ میں پرائمری تعلیمات کے ڈائرکٹر اور ناظر ادبی کا تقرر ہوتا تھا اسلئے وہ ان ڈائرکٹروں کو کافی اختیارات عطا کردیا کرتے تھے۔ ناظر ادبی کے ذمہ یہ خدمت بھی تھی کہ وہ دستو اور بلدیہ کے مدارس کی جانچ پڑتال کرے اور دیکھے کہ اُن میں کیا ہو رہا ہے۔ بلدیہ وغیرہ کے مدارس کی آزادی کو دیکھ کر وزارتِ تعلیمات نے ذاتی (پرائیویٹ) مدارس جاری کرائے
4 جن کو حکومت کی طرف سے ایک خاص قسم بطور امداد ملی۔ یہ مدارس حکومت کے پورے اختیار اور اثر میں ہوتے تھے۔ جیسے کہ آج ہمارے اپنے ملک کے پبلک مدارس یا حکومتی مدارس ہیں۔ تعلیمات کے اصول حکومتی، تعصباتی اور تثلیث خیالات کے حامل تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف حکومتی لوگوں کو تعلیم دی جانی چاہئے عوام کو تعلیم دینا فضول ہے۔ نقشہ سے حکومت زار کے طریق تعلیم پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ حکومت زار کے وقت میں پرائمری تعلیم کا ڈائرکٹر کلیسا کی مجلس منتظم کا سابق ممبر ہوا کرتا تھا جس کے اثرات کافی ہوتے تھے۔

نقشہ کے ذریعہ یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی کا تعلق براہِ راست وزارت تعلیم سے تھا۔ گو بادی النظر میں یہ نظریہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بالکل آزادی حاصل ہو مگر عملی طور پر ایسا نہ تھا۔



غالباً اس موقع پر مندرجہ ذیل ریگولیشن کا تذکرہ کرنا، جو طلبار کے لئے وزارت تعلیمات نے جاری کئے تھے خالی از دلچسپی نہ ہوگا
"۱۳- سپاسناموں کا پیش کرنا، بہت سے لوگوں کے دستخط کرا کے عرضداشت پیش کرنا، وفد بھیجنا، کسی قسم کی نمائش کرنا، طلبار کے لئے ممنوع ہے۔

۱۴- سرکاری عمارتوں میں، عدالتوں میں، یونیورسٹی کی زمینوں یا ایسی جگہ پر جہاں عوام کا اجتماع ہو سکے۔ دار المطالعہ، کھانے پینے کے کلب، تھیٹر ہال، اور ناچ گھر وغیرہ کا قیام ممنوع ہے۔

۱۵- طلبار کو کسی قسم کے جلسے کرنے کی اجازت نہیں ہے خواہ وہ تعلیمی ہوں یا اور کسی طرح کے تقاریر پر اور کسی اجتماع کی بھی اجازت نہیں ہے۔ طلبار کے لئے چندہ وغیرہ جمع کرنا قطعاً ممنوع ہے۔

۱۶- طلبار کو کسی خفیہ انجمن کا یا منظور شدہ سرکاری انجمنوں کا ممبر بننا ممنوع ہے وہ صرف اسی حالت میں کسی جماعت یا انجمن کے ممبر بن سکتے ہیں کہ انھیں یونیورسٹی کے افسران بالا کی اجازت حاصل ہو"

۱۸۹۹ء میں یہ احکامات جاری کئے گئے کہ سینٹ پیٹرزبرگ یونیورسٹی کے سنگ بنیاد کا جلسہ منعقد کرنا قطعاً ممنوع ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ روسی حکومت کی سختیوں اور خود غرض طریق کار کی وجہ سے سول نافرمانی، ہڑتال اور یونیورسٹی میں خفیہ جماعتوں کا قیام دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں سیاسی طاقتوں کو ایک نہفت دھکا لگا اور ساتھ ہی ساتھ روس کی مذہبی طاقتوں کو بھی نقصان پہونچا برل سیاست دانوں نے یہ دیکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا اور تعلیمی نظام کی طرف فوری توجہ مبذول کی اور یہ تمام تعلیمی سرگرمیاں دور جہالت کے لئے مفید ثابت ہوئیں اور عوام نے انھیں پسند کیا۔ انقلاب سے پہلے بسلسلۂ تعلیمات کافی وظائف کا دینا واقعی عقلی کامیابی کا بین ثبوت تھا مصوری کی تعلیم کا ایسی حالت میں پایۂ تکمیل کو پہونچنا سخت مشکل تھا جبکہ وہ ایک محدود دائرے میں مقید تھی اور جس کے باہر بصیرت افروز
۶۹ حلقہ تھا اور اس کے ساتھ ہی حکومتی سلسلہ جو صبح کے دھندلکے کی طرح غیر یورپی علاقے پر بری طرح چھا رہا تھا اور چونکہ تعلیم صرف ملکی زبان میں ہوتی تھی اور اس کا جاننا لازمی تھا اس لئے ان علاقوں میں جہاں روسی یعنی ملکی زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ حصول تعلیم میں اور بھی سخت دشواریاں حائل تھیں اس مسئلہ کا حل در اصل آزاد خیال (نیشنلسٹ) لوگوں کے وجود سے اسکولوں میں ہوا تاہم جھیکستان میں تعلیم ۲۵ فیصدی اور ازبکستان میں ایک فیصدی اور کرغزستان میں دو فیصدی تھی۔

روس کی رعایا غیر روسیوں سے کچھ زیادہ بہتر حالت میں نہ تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ زار کو زبردست شخصی طاقت حاصل تھی اور کلیسا والے کے خدا، برل جماعت کی ہر تحریک کے خلاف تھے۔ روس میں وزارت تعلیم کی طرف سے ۱۹۰۴ء میں کلومزن کے مقام پر ایک تعلیمی جلسہ منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل بیان دیا گیا کہ "۹۳ فیصدی آبادی حکومت امریکہ کی تعلیم پا رہی ہے اور اگر دوسرے ممالک کی آبادی پر نظر ڈالی جائے تو جرمنی کی کل آبادی میں سے صرف ۱۹ فی صدی، انگلستان کی آبادی میں ۱۶ فی صدی اور فرانس کی آبادی میں سے ۱۵ فی صدی تعلیم پا رہی ہے۔ اس کے برعکس حکومت روس کی تعلیمی حالت کو دیکھا جائے تو صرف ۳، ۲ فی صدی آبادی تعلیم حاصل کر رہی ہے"

درحقیقت زار یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی رعایا علم حاصل کرے کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اگر رعایا پڑھ لکھ گئی اور جہالت کی تاریکی دور ہوئی تو وہ حکومت پر نکتہ چینی کرے گی اور اس کی مطلق العنانی کے خلاف جہاد پر آمادہ ہو جائے گی۔ بہرحال ۱۹۰۸ء میں وزیر تعلیمات نے ایک اسکیم پیش کی تھی جس کا نام "یونیورسل ایجوکیشن اسکیم" رکھا گیا تھا۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام ملک میں چوبیس لاکھ پینتالیس ہزار نئے مدرسے قائم کئے۔ جن کا سالانہ بجٹ کل چھیتر کروڑ روبل (روسی سکہ) خرچ ہوتا تھا اور ان مدارس سے پہلے بائیس ہزار مدرسے

۱ (1) V.G SimKhovich, Educational Review May 1907.

موجود تھے۔ اب یہی جدید مدارس کا اضافہ تھا۔ اس نے حکومت ہند کو شکل میں ہی اہل خیالات دے دیں سکے خرچ اخراجات کو برداشت نہ کرسکی
اسی وجہ سے وزارت کو سخت دھکا لگا۔ ۲۰۰ سال قبل تو غالباً یہ تجویز پیش کی جاسکتی تھی مگر ایسی حالت میں جبکہ انگلستان ۴۲-۴۰ روبل فی کس خرچ کر رہا تھا اور یہاں پر صرف ۰۲۵ روبل خرچ ہو رہا تھا حکومت کی دشمنی رعایا کے ساتھ صاف طور پر ظاہر تھی۔ چنانچہ وزیر تعلیم شیشکوف نے زار سکندر کی اجازت سے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"علم[1] اسی وقت تک مفید ہے جبکہ وہ آٹے میں نمک کی طرح ہو جسے لوگ تھوڑی مقدار میں اپنی ضرورت کے لحاظ سے استعمال کیا کریں۔ عوام کو سکھانا، اکثریت کو تعلیم دینا بجائے مفید ہونے کے سراسر نقصان رساں ہے"

ایک دوسرے بارسوخ اور ذمہ دار روسی افسر نے ایک بیان میں کہا "تعلیم یقیناً کامیابی اور خوش اقبالی کی نشانی ہے لیکن بات حسب تناسب دینا چاہیے اور ان لوگوں کی نگہداشت کرنی چاہیے جن کو تعلیم دی جارہی ہو۔ امیروں کے بچوں کو غریبوں کے بچوں کے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ امیر طلباء کو غریب طلباء سے الگ رکھا جائے اور ان کی تعلیم بھی الگ ہو۔ اس طرح وہ غریبوں کے برے اثرات اور رکیک خیالات سے محفوظ رہیں گے۔"

ایک[2] اسکول کا نظام الاوقات یوں مرتب کیا گیا تھا۔

مذہبی امور کے لئے	ایک ہفتہ میں	۶ گھنٹے	لکھنے کے لئے	ایک ہفتہ میں	۲ گھنٹے
کلیساؤں کے لئے	"	۳ "	حساب کے لئے	"	۵ "
روسی زبان کے لئے	"	۸ "	گرجاؤں میں گانے بجانے کیلئے	"	۳ "

۱۹۱۰ء میں روس تعلیم یافتہ قوموں میں انیسویں درجہ پر تھا۔ صرف ۲۸ فی صدی لوگ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ دنیا کا کوئی شخص حکومت
کی اس تعلیمی پالیسی پر جس قدر غور کرے گا اسی قدر مایوس ہوگا۔ دنیا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ روس کی اس جہالت عامہ کی تاریکی کو اشتراکیت ۷۰
کی عظیم الشان اور روشن تحریک نے ختم کیا۔

اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں میں میں انقلاب کے بعد روس کو جو تعلیمی ترقی ہوئی اس پر روشنی ڈالوں گا ——— !!!

ذرہ ذرہ آئینہ دارِ محبت بن گیا
دل کو حیراں، مجھکو حیراں، آنکھ کو حیراں دیکھ کر

شغل

(1) Thessa Back, Educational change in Russia
(2) Education in Russia, Board of Education Special Report 1909.

یورپ پولینڈ

سفرِ یورپ ۱۹۳۷ء کے مشاہدات آج کی روشنی میں

جس وقت میں نے پولینڈ کی سرزمین پر قدم رکھا اور ذمہ دار لوگوں سے ملا جن میں صحافیوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی، میں نے یہ محسوس کیا کہ پولینڈ کی سیاسیات یورپ کے دوسرے ملکوں کی سیاسیات سے کچھ مختلف نہیں۔ وہی لیفٹ اور رائٹ کی کشمکش وہاں بھی تھی۔ یہ دو جو نکے ہیں جو مختلف سمتوں سے چلے ہیں۔ ایک صرف تھکے ہوئے مسافر جیسی چال چل رہا ہے دوسرا مجبور کی طرح چکر کھا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ ایک بڑھاپا ہے دوسرا جوانی ہے۔

دن گذرے، ہفتے گذرے، مہینے گذرے۔ میں ملک کے گوشے گوشے میں ہو لیا، چھوٹے بڑے، سب سے ملا، پولینڈ چھوٹا سا ملک ہے دو مہینے اتنے چھوٹے ملک کی سیاحت کے لئے کافی تھے۔ پھر میری ہمسفر میری صحافی دوست ——————— تھی جن کا خاندان وارسا میں کافی مشہور و مقبول ہے۔ ان کی معیت میں مجھے حقائق کے مطالعہ میں بڑی آسانی ہوئی اور دور و نزدیک ہر جگہ پہنچ سکا۔

جینوا سے جب میں چلا اور ٹرین میں نہ صرف اپنی دوست بلکہ دوسرے پول مسافرین سے گفتگو کی، میں نے اندازہ کیا کہ پول باشندوں کے لئے جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت بہت پریشانی کا باعث ہے۔ پولینڈ پہونچکر اور ملک کے طول و عرض میں پھرتے ہوئے مجھے پول باشندوں کے جرمنی کے خلاف اس جذبۂ نفرت کے مطالعہ کا بہت موقع ملا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جرمنی اور اہلِ جرمنی اور ان سے متعلق ہر چیز کے خلاف سارے ملک میں نفرت کا جذبہ شدت سے پھیل رہا تھا۔

یورپ تو یورپ، ہندوستان میں بھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جذبہ کتنا سخت تھا۔ پارلیمنٹ کے ممبران، سیاسی ناخدا اور اخبارات مخالف پارٹیوں پر حملے کرتے ہوئے ایسے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے کہ برساتی کیڑوں کی طرح نکلے ہوئے ہندوستانی اخبارات جو اپنی گندگی اور پھوہڑپن کے لئے مشہور ہیں بھی شاید وہ الفاظ استعمال نہیں کرسکتے۔

پولینڈ کے باشندوں کا کیرکٹر عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف آپ ان میں مدافعتی جذبہ بھی پائیں گے۔ دوسری طرف قدم قدم پر آپ کو انتہائی وطنی جوش و خروش سے سامنا ہوگا۔

جب میں نے پولینڈ کا قومی ترانہ Ali Daukiz ons alNaech سنا اس وقت بھی میں اسی نتیجہ پر پہونچا، پہلی سطر اس طرح شروع ہوتی ہے۔ "ابھی پولینڈ نے بالکل دم نہیں توڑا ہے" یہ جملہ پولینڈ کے سیاسی دل و دماغ کی بہترین تصویر ہے۔ ہمت وطنیت، جوش و خروش کے جذبے اُبلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی حُزن اور احساسِ شکست بھی "ابھی" اور "دم نہیں توڑا ہے" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

پول کسان

پول قوم کے کسان ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن کی تعداد ساری آبادی کا $\frac{2}{3}$ حصہ ہے۔ یہی وہ معدن ہے جہاں سے پولینڈ اپنی طاقت کی شراب کھینچتا ہے۔ میں جب پول کسانوں کو دیکھتا تھا اور ان سے باتیں کرتا تھا، جوش کی ایک لہر خود میرے دل و دماغ میں دوڑ جاتی تھی اور میں خون کی سردی اور گرمی سے کانپنے لگتا تھا۔ پولینڈ کے کسان بھی ہندوستان کے کسانوں کی طرح بڑی بڑی سختیاں اٹھاتے ہیں، پھر بھی اُف نہیں کرتے فرق صرف اتنا ہے کہ پول کسان زیادہ ذہین، زیادہ جوشیلا اور زیادہ

حساس ہوتا ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ ملک کی سیاسیات میں بھی دخیل ہوتے۔ غالباً سیاسیات میں پولینڈ کے کسانوں کے نمایاں نہ ہونے کی وجہ بھی وہی ہے جو ہندوستان کے کسانوں کی سیاسیات سے علیحدہ ہونے کی ہے۔ یعنی عام جہالت۔ ۸۰ فیصدی پول کسان نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں۔

پول کسان غریب بھی ہندوستانی کسانوں جیسا ہے۔ اکثریت چھوٹے چھوٹے کسانوں اور صناعوں پر مشتمل ہے۔ جن کے ذمہ ہندوستان کی طرح خاندان کے بیشتر افراد کی پرورش ہوتی ہے۔ فصلوں کی شرح قیمت بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرعی حصہ میں اکثر بھونچال آتا رہتا ہے۔ ملکیت کیخلاف تحریک بڑھتی جاتی ہے۔ اشتراکی اثرات دلوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ پولینڈ کا کسان خود بھی محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کی حیثیت ملک کیلئے ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے اور اس نے نہ صرف غیر ملکی سرمایہ کے جال سے محفوظ ہو جانے کی بلکہ خود اپنے ملک کی جاگیردارانہ پالیسی اور زمین کی ملکیانہ تنظیم کو توڑ دینے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ پول کسانوں کی فلاح اس وقت تک نہ ہو سکے گی جب تک کہ ملک روس کی طرح کسانوں اور مزدوروں کے زیر نظم نہ آ جائے۔ میں نے ہر پول کسان کی روح اور دل و دماغ کو کراہتے اور ڈکرتے پایا۔

مذہبیت اور توہمات

پولینڈ کے لوگ کٹر مذہبی ہوتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ پر انکا اعتقاد ویسا ہی ہے، جیسا کہ ایک معصوم دودھ پیتے بچہ کو اپنی ماں کی چھاتیوں سے ہوتا ہے۔ یہ بات میرے لئے حیرانی کی اس لئے تھی کہ دوسری باتوں میں وہ بالشویک عقائد کے گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کم ہے اور جہالت سارے ملک کو اپنی اندھی جالی میں پھنسائے ہوئے ہے۔ گرجا کی گھن گرج، گھنگھور رسمیں، ہائی ماس کی شان و شوکت۔ دلوں کو مدہوش کر دینے والے نغمے، خوشبو اور آرائش و زیبائش کا اثر ان جہلا پر قدرتی طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ جرمنی سے نفرت کی بھی بڑی وجہ یہی ہے کہ جرمنی تمام مذہبی و خدائی جاگیرداری کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ روس کی مذہبی پالیسی چونکہ جارحانہ نہیں ہے اس لئے روس کی لامذہبیت ان جہلا کو زیادہ برانگیختہ نہیں کرتی۔

مذہبی ہونے کے علاوہ پولینڈ کے لوگ وہمی بھی بے انتہا ہیں۔ یوں تو توہمات پر اعتقاد یورپ میں ہندوستان سے کم نہیں ہے مگر پولینڈ میں توہمات ہندوستان جیسے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے جہلا کی طرح جادو پر پول لوگ بھی یقین رکھتے ہیں۔ بھوت و پریت پر ان کا بھی ایمان ہے۔ ان کے یہاں بھی بچوں اور عورتوں کی بیشتر بیماریاں نظر لگنے کا نتیجہ سمجھی جاتی ہیں۔

(Wieliczka) کے گاؤں میں ایک بوڑھی کسان عورت نے مجھے ایک قصہ سنایا ایسے قصے خود ہماری بڑی بوڑھیاں بھی ہمیں سناتی ہیں،،

(Strachnik) نامی ایک کسان کی بیوی بہت بیمار تھی۔ گاؤں کے ایک سیانے نے بیماری کی وجہ ایک عورت جوزیفین کی بددعا پر محمول کی۔ یہ سنتے ہی گاؤں کے سارے لوگ جوزیفین کے مکان میں گھس گئے اور اُسے باہر کھینچ لائے۔ انہوں نے اُسے خوب مارا اور یہاں تک کہ وہ خون تھوکنے لگی۔ خون زمین پر گرنے سے پہلے انہوں نے ایک پیالہ میں اسے بھر لیا۔ جس پر گاؤں کے سیانے نے منتر پڑھ رکھا تھا۔ اس خون کو بیمار عورت کے سارے جسم پر خوب ملا گیا اور وہ اچھی ہو گئی ......؟؟؟

اخلاق و معاشرت

پولینڈ میں جرائم کی بڑی کثرت ہے، دھوکا دہی، غبن، لوٹ مار، قتل، چوری اور ڈاکے کی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ علم کی روشنی سے ان کے دماغ روشن نہیں ہوتے ہیں اور پیٹ کی آگ انہیں ہر وقت تپاتی رہتی ہے۔ بھوک اور فاقہ انہیں بے چین اور بیتاب کر دیتا ہے۔

لیکن تعلیم یافتہ پول بہت مہذب، شریف اور نازک طبع ہوتے ہیں۔ ان کا اخلاق اور ان کے رہن سہن کا طریقہ سارے یورپ میں مشہور ہے۔ مثل مشہور ہے، "گھر کا مہمان گھر کا خدا ہوتا ہے" اس کا ذاتی تجربہ مجھے اپنی دوست .... کے گھر میں ہوا، بوڑھے والدین بہن بھائی اور خاندان کے دوستوں تک نے میری خاطر مدارات اس انہماک سے کی کہ خود مجھے دھوکا ہونے لگا کہ شاید پولینڈ کی سرزمین پر کرشن جی نے بابا فرید کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے۔

عجیب عجیب رسمیں ہیں، پرانی خاندانی روایات ہیں جنھیں امتدادِ زمانہ ترقی یافتہ معتقدات نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ایک طرف میں نے لندن میں دیکھا کہ ایک عمارت میں رہتے ہوئے پڑوسی زمانہ گذر جاتا ہو اور ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھتے۔ عزیز و اقارب بھی رسمی علیک سلیک سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھتے دوسری طرف پولینڈ میں تہواروں کے موقعوں پر یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ عزیز و اقارب، دوست و دشمن ہر ایک کے یہاں جایا جائے۔ ایسے موقعہ پر مہمان اور میزبان ایک دوسرے کا منہ چومتے ہیں، گلے لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اجنبیوں کے مکانوں پر بھی لوگ جاتے ہیں کہ محلہ کے مذہبی خدائی فوجدار کے پھونکے ہوئے اسپیم سور کے گوشت، اور پنیر کے کیک کھائیں اور برکت حاصل کریں ہم ہندوستانی بھی عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کے موقعوں پر ایک دوسرے کے گھروں پر جاتے ہیں۔ میٹھے نمکین کھانے کھاتے ہیں، گلے ملتے ہیں اور خوشبوئیں لگاتے ہیں رنگ کھیلتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔

مغرب کی تہذیب اتنی سطحی اور خود غرضانہ ہو گئی ہے کہ پولینڈ کے لوگوں کی اس نمائش کو خلوص پر محمول نہیں کیا جاتا۔ وہ اسے فضول اور بے معنی دکھاوا کہتے ہیں، یہ ان کا غلط خیال ہے۔

پولش عورتیں

پولش عورتیں غالباً ہنگرین عورتوں کے بعد یورپ میں اپنے حسن و جمال کا جواب نہیں رکھتیں انھیں انتہا جنسی کشش بھی ہے۔ گفتگو کا طریقہ ایسا بھولا بھالا ہوتا ہے۔ چلت پھرت ایسی لوچ اور بل لئے ہوئے ہوتی ہے کہ بے اختیار دل کھنچ جاتا ہے ایک زمانہ تھا کہ پولش عورتیں ملک کی سیاسیات میں نمایاں حصہ لیتی تھیں۔ آج وہ بڑی حد تک گھریلو ہو گئی ہیں۔ پھر بھی خانہ داری کے معاملات ہیں، کمروں کی آرائش و زیبائش اور باورچی خانہ کی ترتیب و صفائی کے معاملہ میں وہ ہماری ہندوستانی عورتوں کی طرح بڑی پھوہڑ ہیں، باغوں میں، تھیٹروں میں اور سینما گھروں میں پولش عورتوں کی ساحری ضرور موہ لیتی ہے اس لئے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی سلونی جوانی اور گرم و تیز جوبن سے پورا کام لیتی ہیں۔ لیکن گھروں کے اندر جانے کے بعد اور ان کی محدود زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے پھوہڑپن میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ غسلخانوں میں کھانوں کی چیزیں پڑی رہتی ہیں۔ نہانے کا پائپ اگر کسی خرابی کے باعث بیکار پڑا ہو تو میلے کپڑے، جوتے وغیرہ کے قسم کی چیزیں بھر دی جاتی ہیں۔ بیٹھنے کے کمرہ میں دیواروں کے مابین رسی باندھ دی جاتی ہے جس پر خاتونِ خانہ کے سلک کے موزے لٹکے رہتے ہیں۔ یہ مس میو کی طرح سطحی اور طائرانہ مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ دو مہینے کی طویل سیاحت کے بعد ہر قسم کے لوگوں سے ملنے، ان کے گھروں میں جانے کے بعد میں ان سطور کو لکھ رہا ہوں۔ ۵۰ فی صدی پولش عورتیں ان پڑھ ہوتی ہیں غالباً انتظامی معاملات میں ان کے پھوہڑ ہونے کی وجہ یہی ہے۔

پولینڈ اور جرمنی کا خطرہ

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنیوالی جنگ کی چنگاری کو پولینڈ اور جرمنی کے سرحد کی تیز و تند ہوا بھڑکائے گی اور یہیں سے چلی ہوئی آندھی ساری دنیا کو اپنے طوفانی دامن میں لپیٹ لے گی اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے سیاسی مشاہدات کی روشنی میں آج کی ہنگامہ پرور سیاسیات پر بھی تبصرہ کروں۔

پولینڈ اور جرمنی کی دوستی کا رشتہ اب ٹوٹ چکا ہے، جرمنی نے اپنے چہرہ سے نقاب ہٹا دیا ہے اور اس کے سارے ہمسائے اس کی دُزدیدہ نظریں دیکھنے لگے ہیں۔ جرمنی اور اس کے ہمسایوں کے درمیان تمام اعتبارات ٹوٹ چکے ہیں۔ پولینڈ کا سرکاری اخبار (GAZETA POLESKA) نے لکھا ہے کہ پولینڈ اور جرمنی کے تعلقات ختم ہو چکے ہیں اور ہمسائیگی کی حرارت بھی منجمد ہو چکی ہے۔ ....

جرمنی نے ایک سال کے اندر اندر چیکوسلاویکیا پر قبضہ کر لیا اپنی فوجیں سلوویکیا میں بٹھا دیں میمل لے لیا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس نے پولینڈ کو اپنے فولادی اور آہنی ہتھیاروں سے گھیر لیا ہے اور اب ڈینزگ (Danzig) پر دست درازی کی نیت کر رہا ہے اور ساتھ ہی پولینڈ کے ساحلی راستوں پر اپنے لئے علیحدہ جگہ چاہتا ہے لیکن جرمنی کو معلوم ہونا چاہیے کہ پولینڈ افیونیوں کی طرح سو نہیں رہا ہے وہ اپنی آزادی کی مدافعت کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ ہم کسی قیمت پر بھی اپنی چھاتیوں پر جرمنی کو مونگ نہیں دلنے دینگے۔"

گزیٹا پولیسکا کے اس اداریتی نوٹ نے جرمنی کے سرکاری حلقوں

میں سنسنی پھیلا دی ہے۔ میری دوست .... نے پچھلے ہفتہ مجھے لکھا ہو کہ "پولینڈ کا سرکاری حلقہ جرمنی کیساتھ عہد و پیماں دوبارہ جوڑنے کے لئے تیار رہے بشرطیکہ بات چیت دوستانہ اور مساوی حیثیت سے ہو لیکن ایسی صورت میں کہ جرمنی برابر دھمکی دے رہا ہے، صرف دھمکی نہیں بلکہ چیکوسلوویکیا کیطرح ڈینزگ میں بھی اندرونی گڑبڑ پھیلا رہا ہے۔ پولینڈ کی حکومت ذرا بھی سر جھکانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ خطرہ سے ہم وقت پر آگاہ ہو گئے، جرمنی نے دوسرے ہمسایوں کی طرح ہمیں سوتے ہوئے نہیں پکڑا۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ دوسری بڑی طاقتوں نے بھی ہمیں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے"

یہ پولینڈ کی خوش قسمتی ہے کہ خطرہ بالٹک اور سلیسیا کی طرف سے نہیں رہا۔ جنوب میں پولینڈ کی سرحد اتنی کمزور نہیں ہے۔ چیکوسلوویکیا پر ہٹلر کے لئے بجلی بن کر گرنا آسان تھا۔ لیکن پولینڈ کی آبادی ۲۵۰ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ جن میں وطن پرستی کی آگ تیزی سے سلگ رہی ہے۔ پچھلے خزاں کے مہینوں میں ہٹلر کے لئے پولینڈ پر اپنا غضب ڈھانا شاید اتنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ آج پولینڈ کی مدد کے لئے جرمنی سے بڑی بڑی طاقتیں ہیں اور اندیشہ ہے کہ پولینڈ پر ہٹلر کو خون کی ندیاں بہانی ۴۷
ہوں گی جس کے لئے ہٹلر کسی طرح تیار نہیں ہے۔

پولینڈ میں جرمن آبادی تین فیصدی کے قریب ہے۔ اس اقلیت نے جرمن ریش، کی مدد کی امید میں گڑبڑ شروع کر دی ہے جس سے پولینڈ کو کسی قدر پریشانی ہو رہی ہے۔

باوجود برطانیہ اور فرانس کے وعدوں کے ایسا نہیں ہے کہ پولینڈ بالکل مطمئن ہو۔ خطرہ کی شدت کا احساس پولینڈ کو اچھی طرح ہے۔ سلوویکیا پر قبضہ کے بعد شمالی سرحد جرمن نشانہ کے زد میں آجاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ وسطی یورپ میں ہوا اور جس طرح آسٹریا چیکوسلوویکیا، میمل، البانیہ پر اکیس طاقتوں نے قبضہ کر لیا اس سے پولینڈ کو برطانیہ اور فرانس پر پورا بھروسہ بھی نہیں رہا۔

میمل پر قبضہ کے بعد جرمنی کے لئے بالٹک حصوں میں آسان راستے کھل جاتے ہیں اور رومانیا سے اقتصادی رشتہ جوڑنے کے بعد جرمنی کی ہنگامی طاقت اور بڑھ جاتی ہے۔

پولینڈ کو اس خطرہ کا احساس دو سال سے ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ جب میں پولینڈ میں تھا، اس وقت بھی پولینڈ اپنی مدافعت کی تیاریوں میں سرگرمی سے مشغول تھا۔

ہر پول یہ محسوس کرتا ہے کہ جرمنی سے لڑائی ضرور ہونی ہے۔ لڑائی کی تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) پولینڈ میں جرمن اقلیت جن کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے اور جو سارے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔

(۲) اہلِ جرمن کا احساس برتری اور پولینڈ کے ساحلی راستوں پر قبضہ۔

(۳) سرحد کی قطع و برید۔ برلن سے پولینڈ کی سرحد صرف سو میل کی دوری پر ہے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر جرمنی سرحدی علاقوں کو مسمار کر سکتا ہے۔

لیکن پولینڈ اس زبردستی پر سر تسلیم خم کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں اس لئے صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ جنگ۔ اور جنگ کے لئے ساری پول قوم تیار ہے۔

پولینڈ کی فوجی قوت

پولینڈ کی فوج ملک کی مدافعت کے لئے کافی طاقت رکھتی ہے لیکن اپنی سرحد سے باہر نکل کر لڑائی کے لئے ناقص ہے۔ پر سفر کی ڈلی نہیں ہے کہ آسانی سے گھل جائے۔

اکیس برس کی عمر ہونے پر ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے، اس طرح ہر سال تین لاکھ نئی بھرتی ہوتی ہے۔ اور جہاں تک ہتھیار بند ہونے کا تعلق ہے، ساری پول قوم مسلح ہے۔

باقاعدہ فوج دو لاکھ چھیاسٹھ ہزار (۲۶۶۰۰۰) ہے، جنہیں افسروں کی تعداد (۱۸۰۰۰) اٹھارہ ہزار کے قریب ہے۔ جنگی ہوائی جہاز تقریباً ... کے قریب ہیں۔ سمندری قوت بھی اسی معیار کے تحت بڑھائی گئی ہے۔

پول کے ہوا باز اپنی ذہانت، ہوشیاری اور ہمت کے لئے سارے یورپ میں مشہور ہیں۔ ہوائی حملوں سے بچاؤ کے ساتھ جدید طریقوں کا نفاذ ہو چکا ہے، ساری قوم بے انتہا منظم ہے۔

ڈینزگ

میں ڈینزگ میں پورے ایک ہفتہ رہا ڈینزگ کی معاشرت پر جرمن معاشرت پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ دراصل ڈینزگ جرمن شہر ہے وہ ساری خوبصورتیاں اور دلکشیاں جو جرمن آرٹ کا خاص حصہ ہیں۔ ڈینزگ میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں شہر نہایت صاف ستھرا ہے۔ عالیشان عمارتیں ہیں خوبصورت پارک ہیں جنسے سیاحوں پر کافی رعب پڑتا ہے۔

ڈینزگ سمندر سے ذرا ہٹا ہوا وکٹولا (Victola) کے دہانے پر واقع ہے جو زرد ریگ ساحل کی طرف پھینکتا رہتا ہے۔ ساحل کی اس زردی کا پھیلن تمام ڈینزگ پر چھایا ہوا ملیگا۔ ڈینزگ کے گرجا اپنی عظمت کے لئے سارے یورپ میں مشہور ہیں ان میں سب سے خوبصورت سنٹ میری ہے جس کے منارے آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں۔ روم اور ملان میں بھی میں نے ایسی مرعوب کن عمارت نہیں دیکھی۔

ڈینزگ کی اولین تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ بندرگاہ پہلے فرانس کے قبضہ میں تھا سنہ ۱۸۰۷ء میں فرانس نے اسے آزاد شہر کی حیثیت اس شرط پر دی کہ جرمنی سے اس کا کوئی واسطہ نہ رہے۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں جرمنی سے تمام رشتے ناتے زبردستی توڑ دیئے گئے پھر سے ایک سو سال کے بعد ورسیلز (Versailles) کے عہد نامہ کی رو کے مطابق دوبارہ اسے جرمنی اثرات سے محفوظ کر دیا گیا۔ مگر آبائی اور نسلی اشتراک آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتا۔

ڈینزگ آج ریش اور مشرقی پراشیا کے درمیانی مضبوط پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تیز رفتار ریل گاڑیاں اور جہاز آمد و رسل کے ذرائع ہیں۔

پولینڈ اور ڈینزگ کے تعلقات ہمیشہ سے خراب رہے۔ تھوڑے دنوں سے ضرور پولینڈ نے کوشش شروع کی ہے کہ دونوں قوموں میں تعلقات ہموار ہو جائیں لیکن اب جرمن اثرات اتنے زیادہ ہو گئے ہیں اور ڈینزگ کے نازی اپنی ماں کی گود میں واپس جانے کیلئے اتنے بیتاب ہو چکے ہیں کہ یہ گاڑی چلتی نہیں معلوم ہوتی۔

ہٹلر اور ڈینزگ

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جنگ عظیم سے پہلے ڈینزگ ایک خالص جرمن شہر تھا۔ صدیوں سے ڈینزگ پر جرمن معاشرت کے اثرات چھائے ہوئے تھے یہاں تک کہ جنگ کے بعد پولینڈ کی حکومتی سطوت بھی اس اثر کو نہ ختم کر سکی جس زمانہ میں ڈینزگ جرمنی کے قبضہ میں تھا، اس وقت پولینڈ کا وجود بھی نہ تھا۔ اس وقت اگر کچھ بیرونی اثر تھا تو وہ روس کا تھا جسے ڈینزگ کے بندرگاہ کی اس وقت خاص ضرورت نہ تھی۔ آج جرمنی کو اپنے جنگی جہازوں کی آمد و رفت اور وسطی یورپ کی چوکیداری کے لئے بے آف ڈینزگ (Bay of Danzig) کی ضرورت ہے۔ اگر اسے ڈینزگ مل گیا تو (Gdynia) کا پول بحری ساحل بالکل ختم ہو جائے گا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پولینڈ کی بحری قوت مکمل طور پر فنا ہو جائے گی۔ اس کے یہ بھی معنی ہوں گے کہ پھر جرمنی (Vistula) وستولا کا راستہ استعمال میں لائے گا جس کی وجہ سے پولینڈ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیگا

ہٹلر اسی لئے ڈینزگ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے کہ ڈینزگ پر قبضہ کر کے وہ پولینڈ کی کمر ہمیشہ کے لئے توڑ دے اور اس سے مقابلہ کے موقع پر پولینڈ آنکھوں میں دھول نہ جھونکے۔ ہٹلر چاہتا ہے کہ پولینڈ کو اتنا کمزور کر دے کہ ۱۰ لاکھ نفوس سے زیادہ آبادی نہ رہ جائے۔ ہٹلر نے اپنی سوانح حیات "میری جدوجہد" میں صاف صاف کہا ہے کہ جرمنی کے مغربی سرحد پر کسی دوسری بڑی طاقت کا نشو و نما نہیں ہو سکے گا۔

پولینڈ کی پھانس پیروں سے نکال لینے کے بعد ہٹلر کے لئے روسی سرحد پر پہونچ جانا ذرا بھی مشکل نہ ہو گا۔

فرید مچھلی شہری

خطباتِ زرتشت

حصہ اول

باب ۹

داعیانِ موت

ازفریڈرک نطشے ۔ مترجمہ عبدالسلام صاحب رام پوری

موت کی دعوت دینے والوں کا وجود ہے ، زمین ایسوں سے پر ہے جن کو زندگی سے کنارہ کشی کی تلقین ضروری ہے
زمین فضول لوگوں سے بھری ہے ۔ فضول لوگوں کے وجود سے زندگی خراب ہے ۔ کاش حیاتِ جاوداں ان کو اس زندگی سے بہکا کر لے جائے

٧٦ ایسے خوفناک لوگ بھی ہیں ۔ جن کے بھیس میں شکاری جانور پھرتے ہیں اور جن کی پسند بجز ہولناکی اور خستہ خاطری کے کچھ نہیں اور ان کی ہولناکیاں بھی خستہ خاطری ہی ہیں ۔

یہ خوفناک لوگ اب تک انسان نہیں ہوئے ۔ کاش وہ زندگی سے دست برداری کی دعوت دیں اور خود رخصت ہوں ۔ روحانی مدقوق بھی ہیں ! پیدا نہیں ہوئے تھے کہ مرنا شروع ہو گئے ۔

وہ درماندگی اور ترکِ دنیا کے اصولوں پر فریفتہ ہیں ۔

وہ شوق سے مریں ۔ ہم کو ان کی خواہش کی تحسین کرنا چاہیئے ! ان مردہ لوگوں کو جگانے سے اور ان زندہ تابوتوں کو ضرر پہنچانے سے ہمیں احتیاط چاہیئے ۔ انھیں کوئی ناکارہ ، کوئی بڑھا یا کوئی نعش ملی اور وہ فوراً کہہ اٹھے " زندگی باطل ہے "

حالانکہ باطل وہ خود ہیں اور ان کی وہ آنکھ ہے جو ہستی کا فقط ایک ہی رُخ دیکھتی ہے ۔

ادنیٰ مرگ آفریں حادثوں کے مشتاق ، کثیف افسردگی کا کفن پہنے منتظر بیٹھے رہتے ہیں اور دانت پیستے ہیں ۔

یا مٹھائی کے سر ہو جاتے ہیں اور اس طرح اپنے بچپن کا مذاق اڑاتے ہیں یا وہ خود اپنی حیات کے تنکے کا سہارا لیتے ہیں اور پھر بھی اپنے سہارا لینے کی تضحیک کرتے ہیں ۔

اُن کی دانائی کہتی ہے " جو زندہ رہے بیوقوف ہے " اور اس حد تک ہم بھی بیوقوف ہیں ، اور یہی زندگی کی سب سے بڑی حماقت ہے ۔"

" زندگی صرف مصیبت ہے " بعض لوگ کہتے ہیں اور جھوٹ نہیں کہتے ، لہذا ایسی تدبیر کرو کہ تم ختم ہو جاؤ اور زندگی جو سراسر مصیبت ہے ختم ہو جائے ۔

اور تمہاری خوبی کی تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ تُو تجھے خودکشی کر لینا چاہیئے۔ تجھے خود اپنے آپ سے جان چرانا چاہیئے"۔

"ہولناکی گناہ ہے" بعض موت کی دعوت دینے والے کہتے ہیں "ہم کو علیحدہ ہو جانا چاہیئے اور بچے نہ پیدا کرنا چاہئیں" وضع حمل تکلیف دہ ہے دوسرا فرقہ یہ کہتا ہے "اور بچے کیوں پیدا کئے جائیں"؟ انسان صرف بدقسمت پیدا کرتا ہے" اور یہ بھی موت کے داعی ہیں۔

"رحم ضروری ہے" ایک تیسری جماعت کہتی ہے" جو میرے پاس ہے لیلے، جو میں ہوں وہ لیلے اور اتنی ہی کم مجھے زندگی سے وابستگی ہوگی" اگر وہ واقعی رحمدل ہوتے تو اپنے ہمسایوں کی زندگی دوبھر کر دیتے" بشر یہ ہونا ... ان کی سچی نیکی یہ ہوتی۔

لیکن وہ زندگی سے نجات چاہتے ہیں۔ انہیں کیا پروا کہ وہ دوسروں کو اپنی زنجیروں اور اپنے تحفوں سے اور بھی زیادہ سخت جکڑ رہے ہیں۔

اور تم بھی جو زندگی کو ایک سخت محنت اور کرب سمجھتے ہو! زندگی سے سخت تھکے ہوئے نہیں ہو؟ کیا تم موت کا وعظ سننے کے لئے تیار نہیں ہو؟ تم سب لوگ جنہیں سخت، تیز، نئی اور غیر مانوس محنت عزیز ہے۔ اپنے آپ کو بڑی طرح برداشت کر رہے ہو۔ تمہاری محنت گریز اور خود فراموشی کی خواہش ہے۔

اگر تم زندگی کے کچھ زیادہ معتقد ہوتے تو اپنے آپ کو وقتی چیزوں میں کم مصروف رکھتے۔ لیکن تم میں انتظار کی کافی قابلیت ہے نہ کاہلی کی۔

موت کی دعوت دینے والوں کی آواز ہر جگہ گونج رہی ہے اور زمین ایسے لوگوں سے پُر ہے، جن کو موت کی یا 'حیاتِ جاوداں' کی دعوت دینا ضروری ہے۔ میرے لئے یہ سب یکساں ہے بشرطیکہ جلد رخصت ہوں۔

زرتشت نے یہ تقریر کی۔

باب ۱۰
جنگ اور جنگجو

ہم نہ سخت ترین دشمنوں سے رعایت چاہتے ہیں نہ دلی دوستوں سے۔ لہذا مجھے سچی بات کہنے دو۔

میرے بہادرانِ جنگ! مجھے تم سے دلی محبت ہے۔ میں ہمیشہ سے تم جیسا تھا اور ہوں۔ میں تمہارا سخت ترین دشمن بھی ہوں۔ لہذا مجھے تم سے سچ کہہ دینا چاہیئے۔

مجھے تمہارے دلوں کے کینہ اور حسد کا علم ہے۔ تم اتنے برتر نہیں کہ کینے اور حسد سے واقف نہ ہو۔ تو اتنے تو برتر ہو جاؤ کہ تمہیں اُن سے شرم نہ آئے ... اگر تم علم کے شیخ نہیں ہو سکتے تو میری التجا ہے کہ کم از کم اُس کے مجاہد ہی ہو جاؤ۔ اس مشیخت کے رُفقاء اور مقدمہ یہی لوگ ہیں۔

میں بہت سے سپاہی دیکھتا ہوں۔ کاش بہت سے جنگجو دیکھ سکتا۔ ان کی پوشش "یکساں" ہے۔ کاش! اس سے جس چیز کو چھپاتے ہیں وہ یکساں نہ ہو۔

تمہیں ایسا ہونا چاہیئے کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ دشمن کی، اپنے دشمن کی جویا ہیں۔ تم میں سے بعض کی پہلی نظر میں کینہ بھرا ہے۔ تمہیں اپنے دشمن کو تلاش کرنا چاہیئے۔ تمہیں جنگ کرنا چاہیے مگر اپنے خیالات کی خاطر۔ اور خیالات کے مغلوب ہونے پر بھی تمہاری دیانت کو فاتحانہ نعرہ زن ہونا چاہیئے۔

تمہیں صلح اس اعتبار سے عزیز ہو کہ وہ نئی جنگوں کا ذریعہ ہے۔
اور طویل سے مختصر صلح زیادہ عزیز ہونا چاہیئے۔
تمہیں میرا مشورہ کام کا نہیں، بلکہ معرکہ آرائی کا ہے۔ میں تمہیں صلح کا نہیں، فتح کا مشورہ دیتا ہوں۔ معرکہ آرائی تمہارا کام اور امن تمہاری فتح ہونا چاہیئے۔ آدمی خاموش اور نچلا اسی وقت بیٹھ سکتا ہے جب اس کے پاس تیر و کمان ہو۔ ورنہ وہ بکواس اور جھگڑے کرتا رہتا ہے۔ تمہاری امن کو فتح ہونا چاہیئے۔
تم کہتے ہو اچھا مقصد ہی ایسی چیز ہے جو جنگ تک کو مقدس بنا دیتی ہے؟ میں تم سے کہتا ہوں اچھی جنگ ایسی چیز ہے جو ہر مقصد کو مقدس بنا دیتی ہے۔ جنگ اور جرأت نے ہمدردی سے کہیں زیادہ بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ تمہاری ہمدردی نے نہیں بلکہ تمہارے شعور نے اب تک مظلوموں کو بچایا ہے۔
"خیر کیا ہے"؟ تم پوچھتے ہو، شجاع ہونا خیر ہے۔ چھوٹی لڑکیاں کہیں کہ "خوشنما اور پُر اثر ہونا خیر ہے"۔
وہ تمہیں سنگدل کہتے ہیں، لیکن تمہارا دل سچا ہے۔ اور مجھے تمہاری سرگرمی کا شرمیلا پن محبوب ہے۔ تم اپنے بدن سے شرماتے ہو اور دوسرے اپنے خدا سے۔ تم بدصورت ہو؟ اچھا تو برتری اختیار کرو جو بدصورتی کا پردہ ہے۔ اور تمہارا نفس بڑا ہوتے ہی خود پسند ہو جاتا ہے، اور تمہاری برتری بھی شرارت ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ تمہارے دشمن شرارت میں خود پسند اور کمزور شریک ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کو غلط سمجھتے ہیں، میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ بغض کے قابل ہو نہ کہ قابلِ حقارت۔ تمہیں اپنے دشمنوں پر ناز کرنا چاہیئے پھر دشمنوں کی کامیابی بھی تمہاری کامیابی ہوگی۔
مدافعت۔ غلاموں کی خصوصیت ہے۔ تمہاری خصوصیت اطاعت ہونی چاہیئے۔ تمہارا حکم اطاعت ہو۔
اچھے جنگجو کو تو "یہ کرنا ہوگا" میں چاہتا ہوں سے زیادہ خوش آئند ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں تمہیں عزیز ہیں اُن کے لئے پہلے تم کو مامور ہونا چاہیئے۔ زندگی سے محبت تام ہونا چاہیئے اپنی اعلیٰ امید سے محبت کا۔ اور تمہاری اعلیٰ امید کو تصورات حیات میں سے بلند ترین تصور ہونا چاہیئے۔ بہرکیف تم کو اپنے بلند ترین تصور پر میری طرف سے مامور ہونا چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان ایسی چیز ہے جس سے ترقی کرنا ہے۔ لہٰذا اطاعت اور جنگ کی زندگی بسر کرو، طویل زندگی میں کیا رکھا ہے، کون جنگ جو رعایت چاہتا ہے۔
میں تمہاری رعایت نہیں کرتا۔ مجھے تم سے دلی محبت ہے۔ میرے برادرانِ جنگ!
(زردشت نے یہ تقریر کی)

ناخدایاں

زیرِ نقاب ہنس کے نہ اب دیکھنا مجھے
آنے لگی ہے تیری حیا سے حیا مجھے

حیرت سے تک رہا ہے جہانِ وفا مجھے
تم نے بنا دیا ہے محبت میں کیا مجھے

مٹ جائے موج و کشتی و دریا کا امتیاز
اپنی جگہ بٹھائے اگر ناخدا مجھے

موجوں سے ہمکنار تھا اک حسبِ شوق میں
تکتی ہی رہ گئی نگہِ ناخدا مجھے

بچ بچ کے جا رہا ہے بھنور کے حدود سے
کر دے نہ غرق یہ کرمِ ناخدا مجھے

میں خود ہوں ناخدا و خدا اپنے بحر کا
کشتی مری سپرد کرے ناخدا مجھے

کیفِ خودی نے موج کو کشتی بنا دیا
ہوشِ خدا ہے اب نہ غمِ ناخدا مجھے

ساغر (جون ۱۹۳۹ء)

ہٹلر کا قیدی

مسٹر (Stefan Lorant) کی ڈائری — I was Hitler's Prisoner کے اقتباسات کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے جن کا تمام تر انحصار ان کے دیکھے اور بیتے ہوئے واقعات پر ہے جنہیں کسی قسم کی رنگ آمیزی اور عبارت آرائی کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ واقعات کو ان کے اصلی روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

مسٹر Lorant ۱۹۰۱ء میں Budapest (بوڈاپسٹ) پیدا ہوئے اپنے بچپن میں وہ کچھ عرصہ تک موسیقی کی تعلیم حاصل کرتے رہے مختلف مجلسوں اور محفلوں میں وہ ستار بھی بجایا کرتے۔ میٹرکیولیشن (Matriculation) کے بعد انہوں نے ہنگری چھوڑ دیا اور (Vienna) میں آکر بحیثیت ایک فلم کیمرا مین Cameraman کے اپنی روزی کمانا شروع کر دی جس میں انھوں نے کافی ترقی کی لیکن یکایک اس پیشے سے دل اچاٹ ہو گیا اور اسے بالکل تضیع اوقات خیال کرنے لگے۔

آخر ۱۹۲۰ء میں برلن آکر انھوں نے اخبارات کے لیے مضامین لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ اس میں بھی انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی ———

آخر ۱۹۲۵ء میں وہ Das Magazine کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد وہ Munchner Illustrierte Presse کے مدیر مقرر ہو گئے جہاں وہ ۱۹۳۳ء میں اپنے جیل جانے تک بڑی قابلیت سے کام کرتے رہے جیل سے رہائی کے بعد انھوں نے انگلستان آکر Lilliput اور Picture Post دو پرچے جاری کر دیے۔

آج فلیٹ اسٹریٹ Fleet-street کے کامیاب اور ممتاز ترین جرنلسٹوں میں ان کا شمار ہوتا ہے

(ش۔ع)

(۱)

میونخ سیاسی جیل خانہ

۱۹ر مارچ ۱۹۳۳ء

جیل خانے میں ایک ہفتہ ہوگیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ میں رہا
کب ہوں گا؟ نہیں کہہ سکتا۔ میرا حشر کیا ہونے والا ہے؟ اس کا بھی علم
نہیں۔

پہلے میرا خیال تھا کہ مقدمے کی سماعت کے بعد میں چھوڑ دیا
جاؤں گا لیکن اب نقشہ کچھ دوسرا ہی نظر آتا ہے۔ جیتے جی تو اس قید
سے چھٹکارا نصیب ہوتا نہیں۔

اکثر وہم ہونے لگتا ہے کہ میں مر گیا ہوں، پلنگ پر مردوں کی طرح
بے حس پڑا گھنٹوں چھت کو تکا کرتا ہوں۔ پھر خود ہی چونک پڑتا ہوں
زندگی اور عمل کی خواہش مجھ میں ابھر آتی ہے لیکن ایسے امید افزا لمحات
بہت مختصر اور زود پا ہوتے ہیں ورنہ وہی موت اور مایوسی کی پرچھائیاں!

موت!

موت کا احساس مجھ پر غالب آجاتا ہے، زندگی کہیں گم ہوتی
ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن جب میں اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہوں
تو اسی ماحول کو پاتا ہوں۔ وہی زنداں کی گندی اور مٹیالی دیواریں!
میں پانی پینے کے پیالے کو اٹھاتا ہوں تو تانبے کے سرد لمس کا
احساس ہوتا ہے۔

قیدیوں کی چیخیں اور کراہیں سنائی دیتی ہیں۔

زندگی کے احساس سے میں اچھل پڑتا ہوں۔ میں ابھی تک
زندہ ہوں۔

آج ایک سپاہی نے کاغذ اور پنسل بھی مجھے لا دی۔ میں نے یہ
چیزیں طلب کی تھیں، ان کا دستیاب ہونا میرے لئے کسی مدت کے
بچھڑے ہوئے رفیق کے ملنے کے برابر تھا۔ ان کے بغیر میرے خیالات
کا توازن جا رہا تھا۔ اب کاغذ کی سطح پر میری پنسل تیزی سے چل رہی
تھی۔ میں بے ربط اور بے جوڑ جملے لکھے جا رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے
ہوئے۔ یہاں تک کہ میری انگلیوں نے جواب دیدیا۔ اب تک میں نے
جو کچھ لکھا تھا پھاڑ ڈالا اور بستر پر لیٹ کر سوگیا۔

لکھنے نے میری دماغی اضطراب کو بہت سکون پہونچایا، میں
شام تک سوتا رہا۔

میں ابھی کچھ دیر ہوئے اٹھا ہوں۔ وارڈر (Warder) نے
باہر سے روشنی جلائی، میرے سوتے ہی سوتے شام ختم ہوگئی۔ اندر
حوالات کی کوٹھری (Cell) دن کی نسبت اور بھی بھیانک معلوم ہو رہی
تھی۔

میں اس کال کوٹھری میں پھر بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا، کچھ سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیسے وقت کٹے، پڑھنے کے لئے بھی تو کوئی چیز پاس نہیں
لیکن پھر مجھے خیال ہوا کہ میرے پاس کاغذ اور پنسل جو موجود ہے۔ میں نے
اپنے اس خزانے کو بستر کے نیچے سے نکالا اور لکھنا شروع کردیا۔ میں اس
تندہی سے لکھ رہا تھا جیسے کسی اخبار کا مقالہ لکھ رہا ہوں۔ میں لکھتے لکھتے
یکایک رک گیا۔ اس لکھنے سے فائدہ؟ کس کے لئے لکھوں؟ نہ یہ کبھی
چھپے گا اور نہ کوئی اسے پڑھ سکے گا۔ یہ ہاتھ جو اس وقت اس کے لکھنے میں
مصروف ہیں کیا معلوم کل بیجان ہوجائیں؟ میرے اوپر مایوسی اور یاس کا
طاری ہوگیا۔ جو اب تک لکھا تھا پھر پھاڑ ڈالا اور اضطرابی حالت میں اس
کال کوٹھری کا چکر لگانے لگا۔ میرا صحافتی خون میری کمزوری پر غالب
آرہا تھا۔

جب تک بھی میرے دم میں دم ہے اور میرے پاس لکھنے کا
موجود ہے میں ضرور لکھوں گا۔ میں نے اپنی کابُزدلی (Cowardice) کی د
کو مخاطب کرکے کہا جیسے وہ میرے اس کام میں مانع تھی!

میں اپنے جذبات سے مشتعل ہوکر بول رہا تھا، میری آواز
میرے کانوں کو غیر مانوس سی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی اجنبی دور
بول رہا ہو۔ میں جب خاموش ہوا تو مجھے جیل کے بھیانک سناٹے کا احساس
ہوا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ میری کنپٹیاں جل رہی
ہیں اور خیالات میں الجھن ہے۔ پھر وہی مایوسی!

"روزنامچہ (Diary) رکھنے میں بڑا خطرہ ہے، اگر یہ
پولیس Political Police کے ہتھے چڑھ گئی تو موت یقینی ہے۔
مجھے کوئی طاقت نہ بچا سکے گی۔"

مرنا تو ہے آج یا کل! میرے ضمیر نے کہا۔

میں نے فیصلہ کرلیا ہے ضرور روزنامچہ لکھا کروں گا اور اسے
کسی نہ کسی طرح جیل سے باہر بھی پہونچاؤں گا۔ میں دنیا کو بتانا چاہتا

۸۰

کہ Reichstag کے پس پردہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ شاید اپنے اور دوسروں کے دکھوں کی یہ داستان سنا کر اُن سے کچھ شنوائی کی امید ہو سکے جن کے کانوں پر آج جوں تک بھی نہیں رینگتی اور شاید وہ افراد بھی ان مظالم کے خلاف اور انسانیت کے نام پر ہتھیار اٹھا لیں جنھوں نے اس کے لئے اب تک کچھ نہیں کیا اور اس طرح وہ شاید دس ہزار بے گناہ رہا ہو سکیں جو ابھی تک جرمنی کے سیاسی جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

میں نے پنسل اٹھائی اور کاغذ کو جیل خانے کی دیوار کا سہارا دے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میری طبیعت میں اب بالکل پژمردگی نہ تھی۔ میرے پیش نظر اب ایک مقصد تھا ——————

یہ سطور میں حوالات کی کوٹھری ۲۲ میں لکھ رہا ہوں۔ یہ تیسری کوٹھری ہے جس میں میں اپنی گرفتاری کے وقت سے بدلا جا چکا ہوں۔ بڑی تنگ و تاریک ہے! ایک طرف دیوار پر کسی قیدی نے انگلی سے "ہٹلر زندہ باد" لکھ دیا ہے اور دوسری جانب "Communist International" کا پورا ترانہ لکھا ہوا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں مجھ سے پہلے نازی اور کمیونسٹ قیدی رہ چکے ہیں اور اُن کی جگہ میں بند ہوں۔ جسے سیاست سے کبھی سروکار نہیں رہا۔

میں اُنہی دس ہزار قیدیوں میں سے ہوں جو سیاسی وجوہ کی بنا پر پکڑے گئے ہیں!

باہر نئی جرمنی کی تخلیق ہو رہی ہے، ہزاروں اور لاکھوں جرمن خوشیاں منا رہے ہیں جن کے خیال میں ہٹلر اور اس کی قومی اشتراکیت (National Socialism) ان کے لئے بہتری اور آزادی کا سندیسہ ہے۔ لیکن جیل کی محدود فضا جنتا کی اس اندھی بدمستی سے پاک ہے یہاں قیدیوں کے دماغ اور ان کی نظریں اچھی طرح سوچ اور دیکھ سکتی ہیں۔ انھیں قومی اشتراکیت، اپنے اصلی روپ میں دکھائی دے رہی ہے، اس کے ظلم اور استبداد کے کارنامے ان کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے لئے "قومی اشتراکیت" مطلب ہے تنگ نظری اور استبداد کا!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جرمن اپنے اس مردم خیز وطن کو ہٹلر اور اس کے گروہ کی بھینٹ چڑھانے کو کس طرح راضی ہو گئے۔ کیا انہیں نہیں معلوم تھا کہ اُن کا یہ لیڈر شاعروں، ادیبوں اور مفکرین کے اس ملک کو تنگ نظر اور وحشی، درندوں کی سرزمین بنا دے گا۔ جرمنی کے مستقبل کو سوچ کر دکھ ہوتا ہے۔ کتنی مرتبہ اُس نے اپنے لیڈروں پر بھروسہ کیا اور ہر مرتبہ اس کے اس اعتماد کو شکست ہوئی۔ گزشتہ چند سالوں میں جرمنی نے انہی وجوہ کی بنا پر کیا کچھ تکلیفیں نہیں برداشت کیں!؟۔

ہٹلر نے ان سے جو کچھ وعدے کئے ہیں وہ اُن پر آس لگائے ہوئے ہیں لیکن اس کے یہ وعدے آپس میں کتنے متضاد ہیں۔ یہ نہیں سوچتے! اُس نے مزدوروں سے ان کی بہتری کے وعدے کئے ہیں اور سرمایہ داروں کو اُن کے تحفظ کا یقین دلایا ہے!

جرمن جنگ سے پس چکے تھے، فاقہ کشی اور بیروزگاری کی مصیبتوں نے تھکا کر اُن کی قوتِ ارادی اور جذبۂ خود اعتمادی کو بالکل مٹا دیا تھا، انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی سوچنے اور عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھا، وہ کوئی آسرا ڈھونڈھ رہے تھے، وہ کسی ہٹلر کی تلاش میں تھے جسے وہ اپنا مذاق بنا سکتے۔

ہٹلر اٹھتا ہے اور انہیں اپنے ذات پر اعتماد کی دعوت دیتا ہے۔ آرام و آسائش کا یقین دلاتا ہے۔ بیروزگاری اور فاقہ کشی کی مصیبتوں کو دور کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ جرمن جو ہمیشہ دھوکے کے شکار ہوئے ہیں پھر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ہٹلر کو اپنا نجات دہندہ اور دیوتا سمجھنے لگے۔

میں نے ہٹلر کو ایک مرتبہ تقریر کرتے سُنا ہے۔ اُس نے زور سے کہا "جرمنی" اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اُس نے پھر پکارا اب کے ذرا زور سے جرمنی —————— اور تیسری بار وہ اپنی پوری طاقت سے گرجا جرمنی ——————

ہٹلر کی کامیابی کو جانچنے کیلئے اُس کے اِن الفاظ کا نفسیاتی اثر دیکھنا تھا! ۔ سارا مجمع مشتعل ہو گیا۔ جیسے کسی جادو کے زور سے۔ لوگ بیتابی سے اچھل، چیخ اور رو رہے تھے۔ مجمع پر سیاسی شعور کے بجائے ایک قسم کا جذباتی بھوت سوار تھا!

جرمن پر نشہ طاری ہے وہ ابھی سو رہے ہیں اور اس حالت میں ایسے خواب دیکھنے میں مشغول ہیں جو دیکھنے میں بہت امید افزا لیکن تعبیر میں بہت ڈراؤنا ثابت ہونیوالا ہے۔ جب اُن کا یہ نشہ اُترے گا اور وہ اپنے خواب سے بیدار ہوں گے تو خود کو پھر اُسی جنون اور دھوکے کے جال میں پھنسا پائیں گے۔ جس میں وہ پہلے بھی بار بار پھنس چکے ہیں۔

دن بیت گیا۔ سات بجے ہی جیل کی بھیانک رات کی ابتدا ہوئی۔ وارڈر (Wachtmeister) کی بیرک کی بند ہو گئی۔ بالکل سناٹا ہے۔ کبھی کبھی ایک قیدی کی سسکیوں کی آواز آ جاتی ہے جو ایک گھنٹے سے زیادہ اسی طرح سسکیاں بھرتا رہا۔ اب اس کا رونا بند ہو گیا شاید نیند نے تھپک کر سلا دیا۔

قبر کی سی خاموشی اور اس پر یہ روشنی!! —— نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ اپنے سوا کوئی دکھائی دیتا ہے۔ گویا کل دنیا میں ایک میں ہی جاندار باقی رہ گیا ہوں۔

میں اپنی آزادی کے آخری ایام کے متعلق سوچتا ہوں۔ پچھلے واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے جیسے وہ سامنے اسٹیج پر ہو رہے ہوں۔

منظر۔ میونخ۔ ۹ مارچ کی تاریخ جس روز قومی سوشلسٹ (Nationalsozialisten) نے یہ انقلاب برپا کیا تھا۔ یہ تاریخی دن جو جرمنی کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس دن کے واقعات کو از سر نو اپنے دماغ میں تازہ کرنے لگا۔ دل بہلاوے کا اچھا شغل ہے، اس طرح دماغ کو یکسوئی رہیگی۔ زنداں کی میلی دیواریں ایکدم غائب ہو گئیں، ایک، دو، تین۔ وقت کی سوئیاں گھوم کر پھر ماضی کے مرکز پر پہنچ گئیں۔ عالمِ خیال نے حوالات کی کوٹھری سے اُڑا کر پھر آزادی کی کھلی ہوئی فضا میں لا کھڑا کیا۔ کلنڈر میں ۹ مارچ کی تاریخ لگی ہوئی ہے، صبح کا وقت ہے۔ میری ابھی آنکھ کھلی ہے۔

Mutter نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی "آپ اُٹھ گئے؟"

میرے بچے نے قریب آکر پیار کیا اور ہاتھی کی کہانی سنانے کی فرمائش کرنے لگا جو مجھے بلاناغہ روز صبح اُسے سنانا پڑتی تھی کہانی ختم ہوئی حجام میرا منتظر تھا، ڈاڑھی بنانے کے دوران میں اس نے سیاست پر بکواس شروع کر دی۔

یہ ہٹلر جو ہے آخر اس سے لوگ کیا چاہتے ہیں —— سوائے پھٹی ہوئی آواز کے اس میں ایسا کونسا گُر ہے! —— وہ خاک بھی تو نہیں جانتا —— لیکن پٹھا اب وہ چانسلر بن بیٹھا۔ لیکن یہاں Bayern میں اسکی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ ہمارے لئے تو ہماری مقامی گورنمنٹ سلامت رہے۔ بس ایک بادشاہ کی کمی ہے۔ جی ہاں بادشاہ کی۔ ہٹلر پروشیا والوں (Preussen) ہی کو مبارک ہو ہمیں نہیں چاہئے۔ نا ہمیں یہاں کسی نازی وازی کی ضرورت ہے۔"

کون یقین کر سکتا تھا کہ اسی شام میونخ ہٹلر اور قومی سوشلسٹ کے ہاتھوں میں ہوگا!؟

جب میں گھر سے نکلا تو دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں ابھی سے بہار کی ترنگ تھی، چند ہفتے کی اور بات ہے (Frühling) کی تال میں نہان اور تیراکی شروع ہوا چاہتی ہے۔ خزاں کی پت جھڑی ٹہنیوں پر ہری کونپلیں پھوٹ آئی ہیں۔ میونخ والے اب ایک دوسرے سے ملنے پر کہتے ہوں گے بہار آگئی! بہار آگئی!!

ٹرام (Maximilianmonument) کا چکر کاٹ رہی تھی لوگ اپنے اپنے دفتروں کو جا رہے تھے۔ آرام و سکون سے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے، کوئی جلدی میں نہ تھا۔ میں بھی آہستہ خرامی سے جا رہا تھا (Maximilianstrasse) ابھی تک سنسان پڑا تھا لیکن ہوٹل (Vier Jahreszeiten) کے سامنے زندگی کی ہماہمی شروع ہو گئی تھی۔ اُسی وقت ہوٹل کی موٹر بس امریکی سیاحوں کی ایک جماعت کو لیکر آئی تھی حمال (Portier) ان کے بھاری بھرکم بکسوں کو اُٹھا اُٹھا کر اندر لئے جا رہا تھا۔ نیشنل تھیٹر کے سامنے ایک بڈھا فقیر بیٹھا کبوتروں کو دانہ کھلا رہا تھا۔ اور کبوتر اُڑ اُڑ کر اس کے اوپر بیٹھ رہے تھے۔ کبھی سر پر کبھی ہاتھوں پر ——

امن اور سکون کا کتنا خوبصورت منظر تھا! ؟ ——

اوڑھنے بچھونے سوکھانے کے لئے کھڑکیوں کے باہر لٹک رہے تھے اور گھروں کی منگھر بیویاں راہ چلتوں کے سروں پر اپنی گرد سے اٹی ہوئی جھاڑ نوں کو جھاڑ رہی تھیں۔

راستے میں دفتر کے ایک اور ساتھی مل گئے۔

ہم اب (Sendlingerstrasse) کی جانب مڑے اور اپنے دارالاشاعت پر پہونچ گئے۔ میرے اس ساتھی کو اس ادارے میں بیس سال ہو گئے تھے اور مجھے ابھی پانچ ہی سال کا عرصہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں کے جذبات یکساں تھے۔ دو ہزار آدمی کام کرتے اور دو ہزار کے دو ہزار آپس میں ایک بڑے خاندان کی طرح وابستہ تھے۔

Münchner Neuesten Nachrichten روزانہ اخبار جو اس ادارے کی جانب سے نکلتا تھا وہ اپنی پالیسی کے لحاظ سے قدامت پسند، حکومت کا طرفدار اور شہنشاہیت کا حامی تھا اس کے اڈیٹر (Buchner) اور (Brüning) کی حکومت سے بڑی رواداری کے تعلقات تھے۔ (Baron Aretin —) اخبار کا سیاسی مقالہ نگار (Bavaria) کی بادشاہت پسند جماعت Royalist League (Prince Rupprecht) کا لیڈر تھا اور ولی عہد Rupprecht کے چند رازدار مخلصوں میں سے تھا۔

اس کے برخلاف 'فرم' کے ہفتہ واری پرچے Süddeutsche Sonntagspost اور اس کے اڈیٹر Walter Tschuppik کی لبرل پالیسی ڈیموکریٹک تھا اور ہمارے شام کے اخبار (Telegrammzeitung) اور اس کے اڈیٹر Rahn کا رجحان کچھ کچھ اشتراکی تھا۔

Münchner Illustrierte Presse جس کا میں اڈیٹر تھا صرف ایک ایسا تنہا پرچہ تھا جو ہر قسم کے رجحانات سے پاک تھا۔ اگر ان کو سیاسی خیالات کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف اتنے تھے کہ اُسے قومی اشتراکیت کی تحریک پر اعتماد نہ تھا۔ اور لوگ ہمارے ادارہ کی سہ رنگی چال کو نہیں سمجھ سکیں گے لیکن ہم بحیثیت ایک خاندان کے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ ہر ایک کو آزادیٔ خیال حاصل ہو۔ لیکن اپنے خیالات کی ان رنگا رنگیوں کے باوجود ہم سب ایک نکتہ پر متفق تھے ہم سب کو جرمنی سے اُنس تھا اور ہم جو کچھ بھی کرتے پہلا خیال جرمنی کی بہتری کا ہوتا۔ خلوص و محبت کا یہی جذبہ تھا جو تمام Knorr und Hirth کے دارالاشاعت میں کارفرما نظر آتا۔

میں نے اپنے ساتھی کو ان کی جگہ چھوڑا اور خود لفٹ سے میں اپنے دفتر پہونچ گیا۔

پوری 'فرم' میں حسب معمول بڑے انہماک سے کام جاری تھا۔

میری ڈاک، میز پر موجود تھی، دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے لاتعداد تار، خطوط اور تصاویر —— ٹائپسٹ اپنے اپنے شارٹ ہینڈ کی کاپیاں لئے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے انھیں بولنا شروع کر دیا اور تصویروں کے ڈھیر کو بھی الٹ پلٹ کرتا رہا۔

آج جمعرات تھی، پریس کا آخری دن تھا۔ جس دن پورے ہفتہ سے زیادہ کام ہوتا ہے۔

میرے کمرے کا دروازہ بار بار کھلنے اور بند ہونے لگا ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ برلن ہدایات کا منتظر تھا۔ ایک پریس بول رہا تھا۔

جرمنی میں کیا ہو رہا ہے؟ پریس کے ایک اخبار کا نمائندہ دریافت کرتا تھا۔

'کچھ بھی نہیں'، میں نے جواب دیا۔ سب باتیں حسب معمول ہیں۔

"پریس میں یہ افواہ ہے کہ میونخ کی سڑکوں پر لڑائی ہو رہی ہے میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

"بالکل لغو"، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لڑائی کس کے ساتھ ہو رہی ہے، کچھ اس کی بھی افواہ ہے؟ — یہاں بالکل سکون ہے۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔

تعجب ہے، میں نے سوچا، کس طرح یہ بے سر پیر کی افواہیں باہر اُڑ جاتی ہیں۔ بھلا میونخ کے گلی کوچوں میں کون لڑنے آئے گا اور آخر وجہ!؟ ——

ٹیلیفون پھر ہوا،

"ہمیں ابھی اخبار کا سرورق نہیں ملا" کوئی کہہ رہا تھا۔ "دس بج
چکے ہیں۔"

میں تصویریں چھانٹنے لگا، سرورق کیلئے کونسی تصویر موزوں
ہوگی۔ ایسی تصویر ہو جو گزشتہ ہفتے کے واقعات سے متعلق ہو۔
پچھلے اتوار کے چناؤ .... میں ہٹلر اور
ہنڈنبرگ کو ۵۰ فی صدی سے زیادہ ووٹ ملے ہیں۔
یعنی آدھے سے زیادہ جرمن لوگوں نے اسے چنا، اس لئے اُسی کی
تصویر سرورق پر جانا چاہیئے۔ میں نے اپنے عملے کے چند ساتھیوں
کو رائے لینے کو بلایا کہ ہٹلر کی تصویر سرورق پر کیسی معلوم ہوگی؟
اُنھوں نے اس کی مخالفت کی اس پر ہم میں گرما گرم مباحثہ
رہا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ سرورق کی جلدی ہو رہی تھی مجھے
کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنا تھا۔

منکنر السٹریٹی پوئنزکوئی سیاسی
اخبار نہیں ہے۔ اور اس بے لاگ پالیسی کو میں نے اب تک بڑی دھوم دھام
سے نبھایا اور آئندہ بھی اسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا ہمارا کام ۳۸
واقعات کو اصلی روپ میں پیش کرنا تھا۔ ہٹلر کو جرمنی کی اکثریت اپنا
چانسلر چن چکی ہے، اس کی تصویر دینا واقعات کے عین مطابق ہے۔
میں نے اپنا قطعی فیصلہ اپنے ساتھیوں کو سنا دیا۔ وہ بڑبڑاتے رہے
لیکن میں نے تصویر بھیج دی

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ 'فرم' کے افسر اعلیٰ Dr Betz بول
رہے تھے۔
"میں نے سُنا ہے، تم ہٹلر کی تصویر سرورق پر دے رہے ہو؟"
"جی ہاں۔"
"کیا تم اسے نامناسب نہیں خیال کرتے؟"
"اب وہ چانسلر ہو گیا" میں نے جواب دیا۔
"بہر حال ہمیں اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کر لینا چاہیئے۔
لنچ پر بات چیت رہے گی۔
لنچ کے لئے ہم دونوں ساتھ گئے۔ دوران گفتگو میں

Dr Betz نے بتایا کہ ہماری فرم، قومی سوشلسٹ کے جاسوسوں
سے بھری ہوئی ہے اور ہمارے حسابات کی نقلیں ان کے صدر
دفتر میں پہونچائی جارہی ہیں۔ اور اس مخالفت کی وجہ صرف اتنی ہے
کہ ہمارے اخبار Münchner Neuesten Nachrichten
سے ہورہا ہے Völkischer میں ہٹلر کے اخبار
Beobachter کو سخت تجارتی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس کے باعث
وہ اپنی مرضی کے موافق ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ کسی طرح سے Münchner
Illustrierte کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سے یہ تجارتی
مقابلہ بند ہو جائے۔ اس کے علاوہ آج سے دس سال قبل ہٹلر
کے اخبار Putsch کی ناکامی وقت ہٹلر اور Rohm کے
خلاف ہمارا جو رویہ تھا، مخالفت کی ایک وجہ وہ بھی ہے۔
لنچ کے دوران میں Münchner Illustrierte کی سیاسی
پالیسی کے متعلق اور آج شام کو میرے برلن جانے کی بابت جو 'فرم' کے
بعض تجارتی امور کے سلسلے میں تھا بات چیت ہوتی رہی۔
لنچ کے بعد جب ہم واپس ہو رہے تھے۔ ہم نے کوتوالی کے
بند دروازے کے سامنے سے بہت لوگوں کو کھڑا دیکھا۔ میں نے
ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے پولیسمن سے پوچھا کہ کوتوالی کیوں بند ہے لیکن
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
کوتوالی کب تک کھلے گی؟
پولیسمن کے جواب دینے کے بجائے بھیڑ میں سے کوئی بولا۔
جب تک پولیس کا افسر اعلیٰ نہ آجائے۔
ہم پھر اپنی راہ چلنے لگے لیکن تجسس باقی رہا Dr Betz
نے آگے بڑھ کر اخبار خریدا لیکن اس میں کوتوالی کے بند ہونیکا کوئی ذکر
نہ تھا۔ ہم آگے بڑھے تو ایک جگہ Swastika کا نشان
لہرا رہا تھا۔ اور راہ گیر اس کو کھڑے ہوئے تعجب سے تک رہے تھے
یہ ہو کیا رہا ہے؟
ہم تیزی سے دفتر پہونچے۔ تازہ خبریں یہاں پہونچ چکی تھیں
Himmler اور Capt-Rohm نے دو؟
-Dr Held کے وزیر اعظم کے قریب ہیورہا

ملازمان سے یہ درخواست کی کہ وہ مارچ کے چناؤ کے نتیجے کے مطابق عوام کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے Bavaria کے جملہ حکومتی اختیارات کو موجودہ [illegible] کے سپرد کردیں۔

ایک اور تازہ خبر ملی کہ ڈاکٹر Held نے ہٹلر کو برلن ٹیلیفون کیا تھا جس کے جواب میں چانسلر نے انھیں یقین دلایا کہ اس کا Bavaria کی موجودہ سیاسی حیثیت میں کسی قسم کی تبدیلی کا ارادہ نہیں ہے۔

اس وقت ہمارے سارے دارالاشاعت میں بےچینی، اضطراب اور تجسس کی فضا طاری تھی۔ تمام جرنلسٹ ٹیلیفون لئے بیٹھے تھے۔ ہر گھڑی تازہ اور پریشان کن خبریں وصول ہو رہی تھیں۔

ایک خبر یہ بھی ملی کہ Captain Röhm یہ سب کچھ ہٹلر کی ہدایت کے بغیر خود اپنی مرضی اور ذمہ داری پر کر رہے ہیں۔ وہ
------------ بویریا
حکومت کو زبردستی معزول کرکے (نازی) دستے کی مدد سے سرکاری عمارات پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

مجلسِ وزراء کا یہ اہم اجلاس چار بجے سہ پہر کو ختم ہوا۔
ڈاکٹر Held نے قومی سوشلسٹ کے نمائندوں Wagner، Himmler اور General von Epp capt: Rohm کو مطلع کر دیا کہ حکومت ان کے اس مطالبہ کو قبول کرنے سے مجبور ہے
اس پر Rohm نے وزیراعظم کو مطلع کیا کہ اس صورت میں نازیوں کا دستہ میونخ پر چڑھائی کر دے گا اور اس خونریزی کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ اپنے صدر دفتر Brown House لوٹ کر انھوں نے ہٹلر کو ٹیلیفون کیا اور اس سے اس معاملہ میں ہر قسم کی آزادیٔ عمل کی اجازت چاہی۔

ہٹلر پس و پیش میں رہا، وہ کسی قسم کا انقلابی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے میونخ میں اپنی ۱۹۲۳ والی ناکامی کی یاد تازہ تھی جس میں قومی سوشلسٹ گولیوں کا نشانہ بنے اور اس بغاوت کے دونوں لیڈر خود ہٹلر اور Ludendorff کو بھاگ کر جان بچانا پڑی۔ جس نے نازی تحریک کو کئی سال کے لئے دبا دیا۔

ہٹلر دوسری ناکامی سے ڈرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ Bavaria میں نیشنل سوشلزم کی بڑھتی ہوئی تحریک کو بویریا کی کسی غلطی سے نقصان پہنچے۔ اس نے Rohm کی اس درخواست کو ٹال دیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعات کا پانسہ کدھر پڑتا ہے۔ اس سے پہلے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہ جھجکتا تھا۔

اسی دوران میں Dr. Held نے Hindinberg کو بھی ٹیلیفون کیا اور صدر کو ان کا وہ تازہ وعدہ یاد دلایا۔ جس میں انھوں نے بویریا کو اس کی آزادی برقرار رکھنے کا یقین دلایا تھا۔ Dr Held اس وقت وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اگر بویریا کی فوج کو حکومت کے بچاؤ میں نازیوں کے .... حفاظتی گارڈ سے لڑنا پڑے تو اس صورت میں جرمنی کی قومی فوجیں تو دخل اندازی .... نہیں کریں گی جس کے جواب میں صدر کی جانب سے سکریٹری آف اسٹیٹ نے مندرجۂ ذیل بیان دیا جس میں انھوں نے جرمنی کی پالیسی کی اچھی طرح وضاحت کر دی۔

" صدر جرمنی کی اور نیشنل گورنمنٹ بویریا کے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی یا کسی اسٹیٹ کمشنر کے تقرر کا کوئی ارادہ نہیں ہے وہاں کی حکومت کو عوام میں امن قائم رکھنے کے لئے اپنے جملہ اختیارات کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

Dr Held نے اطمینان کا سانس لیا صدر Hindenburg اپنے الفاظ پر قائم رہیں گے۔ آخر بویریا کی آزادی یوں نہیں کچلی جا سکے گی۔ اب وزیراعظم کو اپنی فتحیابی کا یقین ہوگیا۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنی حکومت کو 'نازی' شکنجے سے بچا لیا۔ لیکن Capt. Rohm نے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے جرمنی کے وزیر داخلہ [illegible] ڈاکٹر Frick Innenminister کو ٹیلیفون سے مطلع کیا کہ میونخ میں صورتِ حال اندیشہ ناک ہو چکی ہے۔ نازی حفاظتی گارڈ کے دستوں نے متعدد پبلک عمارات پر قبضہ جما لیا ہے اور ان کے اور مقامی پولیس میں کئی بار سخت کشمکش ہو چکی ہے۔ حالات نازک

" نازی جماعت کے ایک دستے نے Bayerisch en Kurier کے دفتر پر دھاوا بول رکھا ہے "

اس کا دفتر ہمارے دفتر کے بالکل مقابل تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نازی نوجوانوں کا ایک دستہ سڑک پر قطار باندھے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند دوڑ دوڑ کر عمارت میں جاتے اور اخبارات کے پلندے اٹھا اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ کاغذوں کو اپنے پیروں سے بے دردی سے روند رہے تھے اور دیوانوں کی طرح چیخ اور اچھل رہے تھے۔ اوپر کھڑکیوں میں سے بھی اخبار کے فائلوں کو نیچے کھڑی ہوئی لاری میں پھینکا جا رہا تھا۔ لاری اخبار کے ان پلندوں کو لیکر چلدی۔ لیکن یہ Bayerischen Kurier کی کاپیاں نہ تھیں یہ عنایت Dr. Gerlichs — کے ہفتہ وار پرچے Der Gerade Weg پر ہو رہی تھی۔ جو ایک عرصہ سے نازی تحریک کی مخالفت میں دلیری سے قائم تھا۔ اس کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں تھا۔

پولیس کا کیا رویہ تھا؟ ۔ وہ سڑک پر کھڑے یہ سب کچھ خاموشی سے تک رہے تھے۔ جب نازیوں نے دیکھا کہ پولیس بالکل دخل انداز نہیں ہوتی تو انھوں نے سڑکوں پر بھی اودھم مچانا شروع کر دیا۔ Swastika پھر ٹاؤن ہال پر نصب کر دیا گیا۔ اب ہمیشہ کے لئے! کوتوالی پر بھی وہ قبضہ جما چکے تھے!!

جب Carl-Rohim اور نیشنل سوشلسٹ اس طرح اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے Dr. Held حفاظتی تدبیریں بھی سوچ رہے تھے۔ وہ ابھی تک آئینی اور پارلیمانی ہتھیار استعمال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ نازی جماعت کو اس خطرناک رویہ کے احتجاج میں وہ برلن کی حکومت کو ٹیلیفون کر رہے تھے!۔

اس ایک گھنٹے کے عرصہ میں جب نیشنل سوشلسٹ کی تمام چالیں ٹھیک بیٹھ چکی تھیں اور ان کی جیت یقینی تھی تب ہٹلر نے اس کھیل میں ہاتھ ڈالا۔ آٹھ بجے میونخ میں جرمنی کے وزیر داخلہ کا ایک تار صادر ہوا جس میں جنرل فان اپ کو Bavaria کی حکومت کے جملہ اختیارات ہیں! وزیر داخلہ نے گھبرا کر ہٹلر کو ٹیلیفون کیا کہ اب نیشنل گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ دخل انداز ہو اور General von Epp کو اپنی جانب سے اسٹیٹ کمشنر مقرر کر دے۔

ہٹلر ابھی تک پس و پیش میں تھا۔ یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا ابھی کون کہہ سکتا تھا؟ ۔

اس عرصہ میں کئی سو نازی، (میونخ) MarienPlatz میں جمع ہو چکے تھے (Amann) مقامی نازی جماعت کے ناظم نے ٹاؤن ہال پر Swastika کا جھنڈا نصب کر دیا۔ اور عمارت کی مہتابی پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ نیشنل سوشلسٹ Bavaria کی حکومت پر قابض ہو چکے ہیں۔ لیکن چند منٹ بعد سرکاری حکام نے جھنڈا وہاں سے علیحدہ کرا دیا۔

حکومت کے فوجی دستے شہر کے باہر حکم کے انتظار میں کھڑے تھے!

ہمارے ادارے میں پریشانی اور اضطراب کا عجیب عالم تھا۔ میرے ساتھی گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ایک ایک منٹ پر تازہ واقعات کی خبریں مل رہی تھیں جن پر آنے والے واقعات کے متعلق ہر ایک رائے زنی کر رہا تھا۔ عجیب طلاطم تھا! ۔

کیا اس ہنگامے میں حکومت کی جیت رہے گی؟ ۔ یہ صرف بویریا ہی کی قسمت کا سوال نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ کل جرمنی کی قسمت منسلک تھی۔ اگر Dr. Held آخر تک اپنی جگہ مضبوطی سے جمے رہے تو جنوبی جرمنی میں نازی تحریک کے پھیلنے کے امکانات ختم ہو جائینگے اور پھر اس وقت جنوبی جرمنی کی تمام ریاستیں بلکہ اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کر سکیں گی۔

میرے ساتھی آنیوالے واقعات کے متعلق پیشن گوئیاں کر رہے تھے۔

پھر ایک ٹائپسٹ لڑکی میرے کمرے میں دوڑتی ہوئی آئی اور اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں سے بڑی مشکل سے اس نے یہ خبر سنائی۔

بھنا گئے تھے۔ اب عوام میں امن قائم رکھنے کے لئے انہیں ہر فعل کا مجاز تھا!

Himmler اور Wagner Capt. Rohim

نازی انقلاب کے یہ ہیرو اسٹیٹ کمشنر کی معیت میں دفتر خارجہ پہونچے جہاں اُن کی پیش قدمی کے لئے کوئی موجود نہ تھا۔ سوائے ایک نگراں کے ساری عمارت خالی پڑی تھی۔

Dr Held نے اپنی کمزوری سے یہ ہار خود مول لی۔ انھوں نے بغیر لڑے ہی ہتھیار ڈالدئے!

وزیر اعظم اور ایک اور وزیر Stutzel دونوں اپنے اپنے گھروں سے کھینچ کر دفتر خارجہ میں Capt. Rohim کے سامنے لائے گئے Stutzel غریب کو تو راستے میں پیٹا بھی گیا۔

Dr Held کو رسا قلمدان وزارت جنرل کے سپرد کرنا پڑا اس کے بعد اُن کی جان بخشی ہوئی۔

آخر فتح Capt. Rohim ہی کی رہی!؟ —

جب میں شام کو دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا میونخ کی سڑکوں پر آدمیوں کا ہجوم تھا۔ یہ منظر صبح کے پُرسکون منظر سے کتنا مختلف تھا! — وہ سکون، وہ خوبصورتی!؟ —

اس وقت میونخ انقلاب کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ سڑکوں پر حفاظتی گارڈ کے دستے گشت لگا رہے تھے۔ میری نظر میں انقلاب کے تمام پس منظر پر افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ عوام میں وہ جوشش و ترنگ اور زندگی نہیں تھی۔ وہ ذرا بھی خوش نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ آدمیوں کے ہجوم میں لوگ اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی کے حکم کے تابع ہوں۔ وہ ہاتھوں میں مشعلیں لئے Feldherrnhalle کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں میونخ کے نئے حکمراں تقریر کرنے والے تھے۔

جرمنی کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا Bavaria کے سر پر بھی آخر نیشنل سوشلزم کا بھوت منڈھ دیا گیا! —

میں اُسی روز رات کو برلن روانہ ہوگیا۔

میرے اوپر والی حوالات میں کوئی ٹہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قدموں کی تیزی اور سست روی سے اس کے دماغی کرب کا پتہ چلتا تھا۔ وہ جب سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے اسی طرح گھومے جا رہا ہے کبھی آہستہ قدموں سے اور پھر دو تین تیز قدم! یہ کون ہو سکتا ہے؟ — میں نے اپنے سر کو ذرا چھت سے قریب لاکر کھڑکی میں سے پکارا، ٹہلنا بند ہوگیا۔ وہ سوچ میں تھا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ اس کو مخاطب کرنے کے لئے میں نے چھت میں دو تین گھونسے لگائے۔ اوپر سے آواز آئی۔

کون ہے؟ —

میں نے اپنا نام بتایا۔ اوپر سے جواب آیا کہ "میرا نام Dr. Gerlich ہے لیکن ہوشیار رہو، دروازہ قریب ہے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ Dr. Gerlich جو میونخ میں نازی انقلاب کے سب سے پہلے شکار ہوئے۔ میرے اوپر والی حوالات میں بند ہیں! ان کا ٹہلنا بند ہوگیا معلوم ہوتا ہے تھک کر بیٹھ گئے۔ مگر میں برابر لکھے جا رہا تھا، میری نوٹ بک میں ابھی بہت سے سادہ ورق باقی تھے۔

میں تین روز بعد میونخ لوٹا۔ شہر میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آرہی تھی۔ گھروں کے دروازوں پر نازی نشان لٹک رہے تھے۔ سڑکوں پر حفاظتی گارڈ کے جوان وردی پہنے شان جتاتے پھر رہے تھے۔

دفتر میں ہر شخص پریشان نظر آرہا تھا Süddeutsche Sonntagspost کا اڈیٹر Tschuppik جمعہ کے روز صبح کو گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی گرفتاری کی کوئی بظاہر وجہ نظر نہیں آتی صرف یہ افواہ ہے کہ چونکہ وہ کئی سال سے اپنے اخبار میں ہٹلر کے خلاف مضمون شائع کر رہا ہے اس لئے نیشنل سوشلسٹ اُسے پکڑ لے گئے۔

سب محسوس کر رہے تھے کہ Tschuppik کی گرفتاری محض ابتدا ہے جو سچ نکلا۔ میں ابھی اپنے دفتر میں آکر

بیٹھا ہی تھا کہ خبر ملی۔ Minchner اڈیٹر Buchner اور Neuesten Nachrichten

اور اس کا رفیق کار Baron Aretin آج صبح اپنے اپنے مکانوں سے گرفتار کر لئے گئے۔

ہمارے ادارے کے دو اخباروں کے اڈیٹر جیل میں پہونچ چکے تھے۔ میں اور Telegramm اڈیٹر Rache اور Zimmermann ابھی تک آزاد تھے! لیکن اب کے ہماری باری تھی۔

دوسرے صبح — یعنی ۱۴ مارچ کو میری خواب گاہ کے دروازہ پر کسی نے زور سے دستک دی۔

کیا بات ہے۔ صبح صبح دروازہ پر کون ہے؟ —

دو آدمی کھڑے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تھانے سے آئے ہیں کیا میں دروازہ کھول دوں؟ پکانے والی نے پوچھا۔

میرے کمرہ میں بالکل تاریکی تھی۔ بستر سے نکل کر میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی، کوئی ۶ بجے کا وقت ہوگا۔ میں نے دو مرتبہ دہرایا "پولیس! — "پولیس؟!۔ اب میرے دماغ میں تمام واقعات تازہ ہو گئے۔

آخر پولیس مجھے بھی پکڑنے آ گئی!؟ — میں نے جلدی سے اپنی بیوی کو جا کر اٹھایا۔

"اٹھو پولیس آگئی"۔

— Nanna مجھے تعجب سے تک رہی تھی، وہ ابھی تک سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ آخر پولیس تم سے کیا چاہتی ہے!؟ —

اس دوران میں پکانے والی نے دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ پولیس کے آدمیوں نے مجھے تحریری اجازت نامہ دکھایا اور کہا ہم خانہ تلاشی لینا چاہتے ہیں، آپ اپنے خطوط اور دستاویزیں وغیرہ کہاں رکھتے ہیں۔؟"

میں نے اپنی ڈسک کا تالا کھول دیا ان میں سے ایک خطوط اور دستاویزوں کی الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اور دوسرا کتابوں کی الماری کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک [illegible] تک ڈھونڈنے ہر چیز کی اچھی طرح سے چھان بین کی۔

"مہربانی کر کے آپ کپڑے پہن لیجئے ہم آپ کے دفتر کی بھی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"کیا میں اپنے آپ کو زیر نگرانی سمجھوں؟ میں نے دریافت کیا۔

"نہیں، ہمیں صرف اتنا حکم ملا ہے کہ آپ کو ساعت کیلئے پیش کریں۔"

تمہیں معلوم ہے کہ میں غیر ملکی ہونے کی حیثیت سے ہنگری سفارتخانے کے زیر تحفظ ہوں؟"

"ہمیں اس کا علم ہے۔"

"اور پھر تم مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو!؟"

"ہم آپ کو گرفتار نہیں کر رہے ہیں، صرف کوتوالی تک لیجانا چاہتے ہیں۔"

میں نے ٹیلیفون اٹھایا۔

"آپ کسے ٹیلیفون کرنا چاہتے ہیں!؟" وہ دونوں چیخ اٹھے۔

"اپنے سفارتخانے کو میں انہیں اس کے بارے میں مطلع کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے، جب ہم چلے جائیں تو آپ کی بیوی ٹیلیفون کر سکتی ہیں۔"

میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا، وہ دونوں پولیس کے آدمی میرے منتظر تھے۔ جب میں اپنی بیوی اور بچے سے رخصت ہوا ننھے Andi کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اتنے سویرے گھر سے جاتے دیکھنے کا عادی نہ تھا۔

"آپ نے ابھی کہانی تو سنائی نہیں!"

"دوست میں اس کے بدلے شام کو تمہیں بڑی اچھی کہانی سناؤں گا۔"

بچہ ذرا چپکا ہوا لیکن وہ مجھے نیچے سیڑھیوں تک پکارتا رہا۔

"شام کو ضرور گھر آ جانا!"

[illegible] کے میٹھے بول ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

ہم دفتر پہونچے۔ دروازہ پر سنگین چڑھائے دو سپاہی کھڑے تھے، کس لئے!؟

پولیس کے دونوں آدمیوں نے میری میز اور دراز کے کاغذات کی چھان بین شروع کر دی۔ آخر میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ تلاشی میں کس چیز کے ہیں!؟ لیکن انھیں اس کی خود خبر نہ تھی۔

ہمیں انسپکٹر کے دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ لیجانا ضروری ہے؟
"تو شاید تمھاری یہ ٹوکری کارآمد ہو؟" میں نے مذاق کے طور سے کہا۔ لیکن انھوں نے اسی پر عمل کیا۔ اور ہم ناکارہ تمھارے ہی ٹوکری اور چند بھی خطوط کیساتھ کوتوالی کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب ہم کوتوالی پہونچے تو مجھے سیاسی پولیس کے دفتر میں لیجایا گیا۔ جہاں سے مجھ کو حوالات لیجانے کا حکم ملا۔ میں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی۔ بغیر جواب دئے پولیس افسر نے اپنی پشت پھیر لی جس کے معنی یہ تھے کہ غالباً خود اُسے بھی میری گرفتاری کا علم نہ تھا!۔

میں نیچے کی منزل میں لیجایا گیا۔ میری جامہ تلاشی ہوئی۔ اور ایک وارڈر کی رہنمائی میں مجھے جیل خانے کے آہنی دروازے میں پہونچا دیا گیا۔ کئی لمبی راہ داریوں سے ہوتے ہوتے جن کے ہر دو جانب چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کی قطاریں تھیں ہم چوتھی منزل پر پہونچے۔ وارڈر نے کوٹھری [illegible] کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے تمہاری حوالات"۔

حوالات کی صفائی ہو رہی تھی اور اس کے تین قیدی باہر کھڑے تھے۔ جب صفائی ہو چکی تو مجھے بھی ان تینوں کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ ہم نے اپنا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔
"میرا نام Karl Bach ہے"
[illegible] کہتے ہیں"

"اور مجھے [illegible]" میرے تیسرے ساتھی نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے سے گرفتاری کی وجہ دریافت کی لیکن اصل وجہ کسی کو بھی نہیں معلوم تھی۔

وقت جوں توں کٹ رہا تھا۔ سب اپنی اپنی پیشی کے منتظر تھے۔ گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ ہر قیدی یہی پوچھ رہا تھا کہ اس کی پیشی کب ہوگی؟ وارڈر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے!؟
شام بھی ہو گئی۔ ہم سب سونے کے لئے دراز ہو گئے لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ جیل میں میرا پہلا دن اس طرح ختم ہوا!!۔
دوسرے دن نو بجے ہماری کوٹھری صفائی کے لئے خالی کرائی گئی۔ اس عرصہ میں ہم کو راہ داری میں اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہم پھر اسی کال کوٹھری میں ٹھونس دئے گئے۔

یہ دن بھی جا رہا تھا، دوپہر گذر کر شام ہونے کو آئی لیکن ہماری کوئی شنوائی نہ تھی۔ راہ داری میں لوگ برابر آ جا رہے تھے۔ حوالات کے آہنی دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی بدنصیب یہ بھی پوچھتا ہوا سنائی دیتا۔
"میں یہاں کس جرم میں بند کیا جا رہا ہوں!؟"۔
ہماری حوالات کا دروازہ کھلا۔ "[illegible] پیشی کے لئے چلو"۔ آواز آئی
پولیس مجھے جیل کے متعدد آہنی دروازوں اور پھاٹکوں سے نکال کر "محکمۂ سیاسی" کی جانب لیگیا۔ ایک نوجوان جو مشکل سے بیس سال کا ہوگا۔ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مقابل ٹائپ رائٹر کے سامنے ایک ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی۔
"میں تم سے چند خطوط کے بارے میں جو تمہارے کاغذات میں سے نکلے ہیں پوچھنا چاہتا ہوں" اُس نے کہا "ایک خط یہ ہے اس پر [illegible] کی تاریخ ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کا لکھنے والا کون ہے؟"
اُس نے مجھے ایک خط دکھایا جس پر ٹائپ کی چند سطور لکھی ہوئی

تھیں۔ کسی شخص نے میرے اخبار کیلئے اپنی روسی سیاحت کی چند تصاویر بھیجی تھیں۔

"میں اس شخص کی بابت کیا بتا سکتا ہوں؟" میں نے جواب دیا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ یہ میرا ذاتی خط نہیں ہے۔ بلکہ اخبار کے نام ہے۔ میرے اخبار کے نام روزانہ تقریباً تین سو خط آتے ہیں، اس صورت میں بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں کہ آج سے چار سال پہلے کون سا خط کس نے بھیجا تھا؟"

"اور اس کارڈ کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟"

اُس نے ایک تصویری کارڈ دکھایا جو ۱۹۳۱ء میں مجھے مشہور ایکٹریس Margarete Melzer نے روس سے بھیجا تھا۔

"اس کارڈ کے متعلق کس صفائی کی ضرورت ہے؟ یہ ایک تصویری کارڈ ہے جس میں وہ سب کچھ لکھا ہے جو اس قسم کے کارڈوں میں عموماً لکھا جاتا ہے۔ یعنی یہ خوبصورت جگہ ہے، موسم بہت خوشگوار ہے وغیرہ وغیرہ" ——————

"لیکن یہ تو روس سے آیا ہے؟"

"تو پھر!؟ — روس کی سیاحت کوئی جرم تو نہیں، سینکڑوں جرمن خود روس کی سیاحت کو جاتے ہیں؟"

"یہ ٹھیک ہے لیکن یہاں اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روسی عوام کی معاشی حالت کو سمجھنے کیلئے مارکس اور اینجل کا مطالعہ کر رہی ہیں اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

"جواب!؟ ابھی تک جرمنی میں عوام کے مطالعہ پر تو کوئی پابندی عائد کرنے کا قانون نافذ ہوا ہے نہیں اور پھر اپنے دوستوں کے مطالعہ کا میں ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جاؤں؟"

یہ نوجوان افسر بہت دیر سوچتا رہا کہ کیا جواب دے۔ آخر اُس نے کہا۔

"کیوں کہ مارکس، مارکس ازم کا بانی ہے، اس لئے اس کی کتابوں کو کوئی نیک نیت شخص تو پڑھے گا نہیں۔"

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا!۔

میں نے اپنے ٹائپ کئے ہوئے بیان پر دستخط کر دئے جس کو لیکر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور پولیسمین مجھے پھر اُسی تاریک زنداں میں واپس لے چلا —————— وارڈوں کے پاس حوالات کی کنجیاں رہتی ہیں اس وقت قریب موجود نہ تھا، پولیسمین مجھے یہیں راہ داری میں چھوڑ کر اُسے بلانے چلا گیا۔ جب میں کھڑا اس کی واپسی کی راہ تک رہا تھا، مجھے خیال آیا کہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر حوالات میں میرے دو پرانے ساتھی Biohner اور Baron Arnoltz بند ہیں! راہ داری اس وقت بالکل خالی پڑی تھی۔ میں دوڑ کر اُن کی حوالات تک گیا۔ آہنی دروازے کے سوراخ سے میں نے جھانکا Arnoltz اور Biohner دونوں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے کھٹکھٹایا اور اپنا نام لیکر پکارا کہ میں ہوں۔ وہ دونوں چونک پڑے!۔

"تم یہاں کیسے؟"

"سیاسی وجوہ کی بنا پر!"

"سیاسی!؟" انھوں نے تعجب سے کہا "تمہارا سیاست سے کیا واسطہ!؟"

اتنے میں وارڈر آگیا جو مجھے وہیں سے دیکھ کر گرجا۔

صبح صبح ہم منہ ہاتھ دھو کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ وارڈر نے آکر کہا "اپنا سامان سنبھالو۔ تم یہاں سے منتقل کئے جا رہے ہو"

"کہاں؟"

"تم تنہائی میں جا رہے ہو"

"لیکن وجہ؟" ——————

"حکم"

اب میں [illegible] میں تھا۔ جو کل چھ قدم لمبی اور دو قدم چوڑی تھی۔ اس میں [illegible] کی طرح پلنگ وغیرہ نہ تھا بلکہ بھوسہ بھرا ہوا گدی کا ایک لمبا سا تابوت پڑا ہوا تھا۔ اور سردی بلا کی تھی!۔ (باقی)

شاکر علی

رُوس کی فوج

(از سیّد زبیر جعفری قوم مچھلی شہری)

اسٹیلن اپنی سُرخ فوج کے متعلق کہتا ہے "سُرخ فوج کی پہلی اور نہایت خصوصی تعریف یہ ہے، کہ یہ آزادی حاصل کئے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کی فوج ہے، یہ اکتوبر کے انقلاب کی پلی ہوئی فوج ہے، جنتا کی ڈکٹیٹر شپ کی فوج ہے۔

ہماری فوج کی دوسری خصوصیت یہ ہے، کہ ہماری جنتا کے لئے خوشحالی کا باعث ہے، ہماری فوجی طاقت کو دیکھ کر گری ہوئی قومیں اُبھرتی ہیں، ہماری فوج، ہمارے ملک، اور ہمارے ملک کے لوگوں کے لئے ناقابلِ شکست ڈھال ہے۔

تیسری خصوصیت ہماری سُرخ فوج کی یہ ہے کہ ہمارے فوج کا ہر آدمی ملک کے ہر باشندے کے لئے نامرِ بہے جس دن سے اس کی تنظیم ہوئی ہے اسے دوسروں سے اشتراک اور محبت کی تعلیم دی گئی ہے، اسے سکھایا گیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے محنت کاروں کی عزت کرو اور عالمگیر امن کے لئے اپنے کو وقف کر دو۔"

پھر اسی فوج، کو ہم "قومی فوج" نہیں کہہ سکتے، یہ دراصل انقلاب عالم کا ایک پُرزہ ہے، جب ہم سوویٹ روس کے سیاست دانوں کے بیانات پڑھتے ہیں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے،

روس کے فوجی بجٹ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے چار برس سے روس نے اپنی فوجی قوت کو بڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، صرف مزدور اور کسان ہی اپنے سوشلسٹ دیش کی مدافعت میں ہتھیار اٹھا سکتے ہیں، جو مزدور اور کسان نہیں ہیں، ان کو دوسرے شعبوں میں جگہ دی جاتی ہے خصوصیت سے صرف اُن نوجوانوں کا انتخاب ہوتا ہے جن کی سیاسی تعلیم مکمل ہو چکی ہوتی ہے جن کو سیاسیات علم کے متعلق اچھی معلومات ہوتی ہیں جو موجودہ سیاسی معتقدات میں نیک و بد کی تمیز کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیمات کے لئے مزدوروں کی جماعتوں میں مختلف مجلسیں ہیں، دوسرے نوجوان خصوصاً ان پڑھ کسانوں سے وقتی فوجی خدمت لی جاتی ہے۔ فوجی تعلیم ان کے لئے بھی لازمی ہے لیکن ان کا کام عالمگیر جنگ کے موقع پر ملک کے اندر ہی ہوگا، باقاعدہ فوجی ملازمت کی میعاد پانچ برس ہے، اس کے بعد حالات کے مطابق ہے۔

Territorials فوج کا نظام

terri-torials

فوج دراصل ان لوگوں سے بنتی ہے جن کی خدمات ہر وقت اور ہر ضرورت کے لئے نہیں ہوتیں، یہ فوج ناگہانی موقع کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہے جب کہ باقاعدہ فوج کے علاوہ بھی تربیت یافتہ نوجوانوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس میں باقاعدہ

خدمت کی میعاد دو برس ہے صرف بحری اور ہوائی بیڑوں میں تین برس ہر وہ شخص جو (Territorial) فوج میں دو یا تین برس کی ملازمت کر چکا ہوتا ہے۔ اُسے پانچ برس تک باقاعدہ فوج میں بھی ملازمت کرنی ہوتی ہے، اس پانچ برس کے دوران میں انہیں دو مہینے کے لئے فوجی تعلیم گاہوں میں بھی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے۔ جس وقت کہ وہ ٹریٹوریل .... میں ہوتے ہیں انھیں فوجی تعلیم گاہ میں پہلے برس صرف دو مہینے اور دوسرے چار برس پانچ سے آٹھ مہینے تک تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے، پانچ برس کی ملازمت ختم کر چکنے کے بعد آدمیوں کو مزدرہ ———— فوج میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں ان کا نام چالیس برس تک، فوجی خدمات اور ہنگامی ضروریات کے لئے محفوظ رہتا ہے۔ اس دوران میں بھی انھیں تین مہینے کی مزید فوجی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے۔

وہ نوجوان جو کسی صورت سے باقاعدہ وقتی فوج اور ٹریٹوریل یونٹس .... میں کسی وجہ سے نہیں داخل کئے جاتے ان کو بھی چھ مہینے کے لئے کسی فوجی تعلیم گاہ میں داخل ہو کر فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔

جہاں تک اعداد و شمار ملک کی مصلحتوں کے باوجود ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور مشکلات کے باوجود اندرونی طور پر جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، یہی ہے کہ روس کی موجودہ فوجی قوت دنیا میں تمام ملکوں پر بھاری ہے۔ باقاعدہ ہتھیار بند فوج کی تعداد سنہ ۱۹۳۶ء کے شروع تک تیرہ[13] لاکھ تھی۔ تربیت یافتہ محفوظ فوج تیس لاکھ کے قریب ہے، ان تیس لاکھ محفوظ سپاہیوں میں زیادہ تعداد ان مزدوروں کی ہے جو فیکٹریوں میں کام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے وقت اُن کی بھرتی سے ملک کی تجارت کو نقصان پہونچے گا۔ ستر لاکھ کسانوں کی فوج ہے جن کی کوئی خاص فوجی تعلیم نہیں ہے۔ جو صرف اس وقت کے لئے محفوظ ہیں جب کہ ٹریٹوریل یونٹس کو جنگی معیار پر پہنچنے کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوگی یا ضرورت کے وقت اُن کی خود نئی فوجیں تربیت دی جا سکتی ہیں۔ لیکن موجودہ صورت میں فوجی معیار کے لحاظ سے اُن دونوں کی قیمتیں معمولی ہیں، باقاعدہ فوج جو وقتی طور پر ملازمت کی پابندی میں ہے۔ حکومت کے پورے اثر اور قابو میں ہے، یوں بھی فوجی تعلیم کے نصاب میں اشتراکیت کی سیاسی تعلیم بھی شامل ہے جس پر کافی زور بھی دیا جاتا ہے۔

آج بھی روسی سپاہی کی اچھائیاں اور بُرائیاں وہی ہیں جو اس میں پہلے تھیں۔ وہ سخت جان پُرجوش سنجیدہ دماغ، صابر اور محنتی ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ کاہل ہے، سوچ بچار سے محض کورا ہوتا ہے، کسی ملک کے لوگوں کا مزاج بدلنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ خصوصاً وہ ملک جہاں آمد و رسد کے ذرائع مشکل ہیں جہاں کی جنتا کی اکثریت ایسے کسانوں کی ہو جو اَن پڑھ ہوں۔ روس میں جس تیزی کے ساتھ کسانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے اور جنتا کی جہالت جس سرعت سے دور کی جا رہی ہے۔ وہ یقینی معجزہ ہے سترہ برس کا عرصہ کسی ملک کے اتنے عروج پر پہونچنے کیلئے بہت کم ہے۔ یہ صرف اشتراکی انقلاب کی کارفرمائیاں ہیں کہ مارکس اور لینن نے منزلِ مقصود تک اُسی جنتا کو پہونچا دیا ہے۔

یہ چیز بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ روس میں اوپر بیان کی ہوئی فوجی تعلیم اور ملازمت کے علاوہ بھی ابتدائی فوجی جلسوں میں شرکت ضروری ہے، انیس[19] برس کی عمر فوجی عمر کہلاتی ہے لیکن سترہ برس سے لیکر انیس[19] برس کی عمر تک ان ابتدائی فوجی جلسوں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس تعلیم میں سیاسیات کا زیادہ حصّہ ہوتا ہے اور میعاد دو مہینے ہوتی ہے۔

روس کی بری فوج کو سنہ ۱۹۳۶ء میں تربیت دی گئی تھی۔ بائیس حصوں میں فوج کو تقسیم کیا گیا تھا، جن میں ۱۰۰ پیدل سپاہیوں کی کمپنیاں شامل تھیں۔ اکتیس[31] ہتھیار بند اور چھبیس[26] ٹریٹوریل ———— اور سات گھوڑسوار کمپنیاں تھیں جن کو بتیس ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جن میں سے اکتیس[31] ہتھیار بند تھے۔ پیدل اور گھوڑسوار فوجوں کے پاس رائفلیں، مشین گن، اینٹی ٹینک بندوقیں ۳۷ سے ۴۵ ملی میٹر تک کی ہوتی ہیں، گھوڑسوار فوجوں کے پاس ۷۶ اور ۱۰۶ ملی میٹر دہانوں کی بندوقیں

ہوتی ہیں اور ہاؤٹزر Howitzer مارکے کی بندوقیں نہایت تیزی سے جو گولی پھینکتی ہیں - ۱۲۲ اور ۳ ہاؤٹزر ہیں ان کے علاوہ تین موٹر Mechanised کمپنیاں ہیں اور دو Mechanised Brigade ہیں ..

- - - - - - - - - - - - باقاعدہ کام کرتے ہوئے ٹینکس کی تعداد پانچ ہزار ہے - اس میں بعض ایسے ٹینک جو کسی دوسرے ملک کے پاس نہیں - یہ ٹینک انگارے برساتے ہیں اور زہریلے گیس پھینکتے ہیں -

روس کی سب سے بڑی قوت اس کی ہوائی فوج Motorised ہے ، جنگی ہوائی جہازوں کی صحیح تاریخ معلوم نہیں کی جا سکی ، لیکن ان کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے گیارہ ہزار کے قریب سول ہوائی جہاز ہیں جو نہایت جلدی جنگی ہوائی جہازوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں - جدید روسی ہوائی جہاز اپنی تیز رفتاری اور مضبوطی کے لحاظ سے جرمن اور اطالوی جہازوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سمجھے جاتے ہیں - اسپین کی لڑائی میں اس کا ثبوت مل چکا ہے کہ جہاں گنتی کے چند روسی ہوائی جہازوں نے کئی سو جرمن اور اطالوی ہوائی جہازوں کو ہر موقع پر شکست دی - چین میں بھی روسی ہوائی جہازوں کو بڑی کامیابی ہوئی ہے -

روس کی بڑی فوجی قوت اس کی ہوائی چھتریاں ہیں Parachutists یہ چھتریوں کی فوج ہزاروں پر مشتمل ہے - یہ فوج چھتری بازوں Parachutant کی فوج کہلاتی ہے جو دوسرے ملکوں کے لئے بالکل نئی اور عجیب چیز ہے - جنگ کے موقع پر ان کا کام یہ ہوگا کہ یہ دشمن کی فوجوں کے پیچھے روسی سپاہیوں کی بڑی تعداد پہنچا دے جن کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ریلوے جنکشن - پل اور جنگی فیکٹریوں کو تباہ کر دیں - ان کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ وہ ان جگہوں پر پہنچ کر لوگوں کو غیر منظم کر دیں جہاں لوگ اطمینان سے یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ لڑائی تو آگے ہو رہی ہے اور وہ محفوظ ہیں بھاری بھر کم جنگی ہوائی جہاز ایک ایک چھتری میں چار چار آدمی نیچے پہنچا سکتے ہیں -

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت لیڈروں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ فوج میں درجے اور افسری ماتحتی کے عہدے ختم کر دئے تھے - فوجی افسر کتنا ہی بڑا عہدہ کیوں نہ رکھتا ہو کامریڈ کمانڈر کہلاتا تھا ، لیکن حالات نے اشتراکی روس کو بھی یہ سکھا دیا کہ فوج میں تقسیم مراتب کرنا ہی پڑے گا - اس لئے نئے روسی وفاق میں جس کا نفاذ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۵ء میں ہوا تمام قدیم مراتب اور خطابات برقرار کر دئے گئے - افسروں کی نئی پوزیشن کیلئے نیا قانون بنایا گیا جس سے ان کو ملک میں دوسروں پر اہمیت حاصل ہوئی غالباً یہی چیز تھی جس کو دیکھ کر

نے اپنی کتاب

میں لکھا ہے کہ ہم ایک نئی استعماریت کی طرف جا رہے ہیں ، زیادہ تر افسر فوجی اسکولوں میں تعلیم پائے ہوئے ہیں - یہ کسان اور مزدور ہیں جو فوجی شان و شوکت کی زندگی سے متاثر ہو کر فوجی اسکولوں میں داخل ہوئے اور ان عہدوں تک پہونچے یہی احساس برتری ہے - جس کے جرم میں فوجی افسر موت کے گھاٹ آئے دن اتارے جاتے ہیں اور اخباروں میں ہم یہ پڑھ کر افسوس کرتے ہیں کہ روسی فوج میں کوئی نظم نہیں ہے - وہاں آئے دن بغاوت ہوتی رہتی ہے - - - - - - - - - - - مارشل وروشیلوف نے روسی فوج کی بیسویں سالگرہ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ہمیں اطمینان دلانے کی کوشش کی - یہ سارے شریر موت کی گھاٹ اتار دئے گئے ہیں " ۱۱ رجون ۱۹۳۷ء کے فوجی شمار بعد فوجی افسروں کی شان پھر بہت حد تک کم کر دی گئی ہے اور اب زیادہ طاقت فوجی کونسل کو حاصل ہے جس کا صرف ایک کمانڈر ہوتا ہے - سارے دوسرے فوجی افسر اسی کونسل کے ماتحت ہیں - موجودہ حالات یہی بتاتے ہیں کہ روس ابھی اپنی افواج کو کسی جنگ میں نہیں شریک کرنا چاہتا جہاں تک طاقت مہلک اور جدید اسلحات اور فوج کی تعداد کا تعلق ہے روس اپنی فوجی قوت پر ناز کر سکتا ہے - لیکن ابھی کمانڈر اور شخصیتوں کی کمزوریاں ہیں - روسی فوج ایک بہت بڑے حصے میں پھیلی ہوئی ہے - مغربی سرحد میں کل فوج کا ۲/۳ حصہ ہے - باقی کوہ قاف اور مشرق بعید ۲ -

۲ ہیں اگر جنگ میں جرمنی نے جاپان سے اشتراک کر لیا - قرائن یہ بتاتے ہیں کہ روس کو اپنی ساری فوج مشرقی محاذ پر بھی مشغول رکھنی ہوگی -

زمینِ ماضی کی یادیں

ہائے وہ پچھلے پہر اُنکا غزلخواں ہونا
اُن کی آواز سے وہ میرا نمایاں ہونا

اِن ستاروں نے تو دیکھا ہے ستاروں کی قسم
ہر طرف موجِ تبسم سے چراغاں ہونا

دیکھ کر خاکِ رہِ یار مرے دامن پر
بارے ہے میری گریباں کو گریباں ہونا

میری آشفتگیٔ شوق کی رُوداد نہ پوچھ ۹۴
تیرے گیسو کو تو آتا ہے پریشاں ہونا

عشق پر اپنے تغافل سے حجابات نہ ڈال
اس حقیقت کے مقدر میں ہے عُریاں ہونا

قیدِ ہستی کی بھی تعریف بدل دوں تو سہی
کھیل سمجھے ہو مرا داخلِ زنداں ہونا

یاد ہیں ماضیٔ رنگیں کی وہ شامیں ساغر
سامنے اُنکو بٹھانا وہ غزل خواں ہونا

ساغر

ہزار داستان

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

اپریل، مئی، جون ۱۹۳۹ء

انّا کرینینا

"تلافیٔ مافات"

(ٹالسٹائی کا مشہور شاہکار اُردو میں)

(مسلسل)

(مترجم۔ محمود الحسن صاحب صدیقی بی اے (علیگ)

اس اخبار کو پڑھ کر اور قہوہ کی دوسری پیالی اور مکھن لگے ہوئے توس ختم کرتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ اپنی ویسٹ کوٹ پر سے کھانے کے چند ذرات کو جھاڑتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا اپنے سینہ کو پھیلایا، اور خوشی سے مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ خوشدلی کی مسکراہٹ نہ تھی۔ بلکہ اسکے صحیح اور تندرست ہاضمہ کی علامت تھی۔ لیکن مثاً اس مسکراہٹ کے بعد ہی سب باتیں اُس کے خیال میں آگئیں اور وہ متفکر ہو گیا۔

دو بچوں کی آوازیں آئیں جن کو اسٹیفن نے پہچانا کہ سب سے چھوٹے بچے گریشا اور سب سے بڑی لڑکی تینیا کی آوازیں ہیں۔ وہ دروازہ کے دوسری جانب سے آرہی تھیں۔ وہ کسی چیز کو کھینچ رہے تھے۔ جو اُلٹ گئی تھی۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم مسافروں کو چھت پر نہیں بٹھا سکتے لڑکی نے انگریزی میں چلا کر کہا۔"

"ان کو اُٹھاؤ۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں کوئی نظم قائم نہیں رہا۔" اسٹیفن آرکیڈی وچ نے خیال کیا۔ "بچے وحشیوں کی طرح پھر رہے ہیں" اس نے دروازہ کھولا کر ان کو پکارا وہ بکس کو جس کو وہ ٹرین بنا رہے تھے چھوڑ کر بھاگے، اور اپنے باپ کے پاس آتے چھوٹی لڑکی جو اپنے باپ کی بہت چہیتی تھی، دلیری سے دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ اور اس کی گردن میں باہیں ڈال کر خوشی سے ہنسنے لگی اس کو اپنے باپ کے بالوں کی خوشبو بہت پسند تھی۔ بچی نے اسکے چہرہ کو جو جھک جانے کی وجہ سے سُرخ اور الفت پدری سے متموج ہو رہا تھا پیار کر کے اس نے اپنی باہیں ہٹا لیں اور اسکے پاس سے بھاگی۔ باپ نے اس کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری

ممی کیا کر رہی ہیں" چھوٹے بچے کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا۔
"کہو تم کیسے ہو؟" اس کو اس کا احساس تھا کہ وہ بچے سے اتنا مانوس نہیں ہے، جتنا لڑکی سے۔ لڑکے نے بھی اس فرق کو محسوس کیا۔ اور اپنے باپ کی سرد مسکراہٹ کا جواب اس نے دیا۔ چھوٹی لڑکی نے کہا۔ "ممی بیدار ہو گئی ہیں" اسٹیفن آرکیڈی وچ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ بے خوابی کی ایک رات اور گذری" چھوٹی لڑکی جانتی تھی کہ اسکے ماں باپ میں جھگڑا ہے اور اسکے باپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان حالات میں وہ خوش نہیں رہ سکتی۔ اور یہ سوال اس نے یہ جانتے ہوئے کیا ہے کہ وہ اپنے باپ کے بجائے خود محجوب ہو گئی اس نے بھی اس کو محسوس کیا اور خود بھی محجوب سا ہو گیا۔

"میں نہیں جانتی" اس نے کہا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم آج سبق نہ لیں بلکہ مس ہل کے ساتھ نانی اماں کے پاس چلے جائیں۔

"اچھا بھاگ جاؤ"

"لیکن ٹھہرو" اس نے ان کو روکتے ہوئے اور اسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — اور مٹھائی کا ایک بکس جیب سے نکالتے ہوئے...... وہ دو اپنے مٹھائی کے بچی کو دئے۔

"یہ ایک گریشا کے لئے" بچی نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے"

بچی کو پیار کرتے ہوئے۔ اسے رخصت کر دیا۔

"گاڑی تیار ہے" میٹوے نے اطلاع کی۔ "اور ایک اور عورت ہے جس کو آپ سے کچھ کام ہے"

"کیا وہ یہاں دیر سے ہے" اسٹیفن نے پوچھا۔

"تقریباً آدھ گھنٹے سے"

"میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے، کہ لوگوں کو منتظر نہ رکھا کرو"

"لیکن آپ کو کم از کم ناشتہ کیلئے تو وقت چاہیئے تھا" میٹوے نے اپنی محبت آمیز لیکن کرخت آواز میں، جس سے کوئی شخص برا نہیں مان سکتا تھا۔ جواب دیا۔

"اچھا اسے فوراً بھیجو" اسٹیفن آرکیڈی وچ نے کسی قدر کبیدہ ہو کر کہا۔

ایک عورت کیپٹن کلے نن کی بیوی، اس کے پاس آئی تھی اور ایک لغو اور ناممکن الحصول درخواست کر رہی تھی لیکن اسٹیفن آرکیڈی وچ نے اپنی عادت کے مطابق نہایت خلق کے ساتھ اس سے بیٹھ جانے کو کہا۔ اور اس کی تمام گفتگو کو توجہ سے سنا اور مفصلاً ہدایت کی کہ اس کو کہاں اور کس طرح درخواست پیش کرنا چاہیئے ایک شخص کے نام جو اسکے لئے مفید ہو سکتا تھا اپنے صاف اور واضح خط لکھ دیا۔

اس عورت کو رخصت کرنے کے بعد وہ کچھ دیر رکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھول گیا ہے۔ وہ کوئی چیز نہیں بھولا تھا۔ سوائے اسکے جسکو وہ بھلانا چاہتا تھا یعنی اسکی بیوی۔

"خدایا" اس نے اپنے سر کو فکر سے جھکا لیا۔ اور اس کے خوبصورت چہرہ سے ایک سخت تکلیف ظاہر ہونے لگی۔

"میں اس کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں" ایک اندرونی آواز اس سے کہتی تھی کہ "یہ سب فریب ہے" ان کے تعلقات کو تبدیل کرنا ناممکن ہے چونکہ نہ وہ اب بڈھا اور نا قابل محبت بن سکتا ہے، جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ نہیں، اور یہ اس کی فطرت کے منافی ہے۔

"لیکن مجھ کو کسی نہ کسی وقت جانا پڑے گا۔ موجودہ صورت میں حالات کو نہیں رہنے دیا جا سکتا" اپنی ہمت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنے شانوں کو پھیلایا، سگرٹ روشن کیا، اور دو تین گہرے کش لیکر اس کو ایک سیپ کی طشتری میں پھینک دیا۔ اور مضبوط قدموں کے ساتھ وہ ڈرائنگ روم میں سے گذرا اور اپنی بیوی کی خوابگاہ کا دروازہ کھولا۔

(۴)

ڈیریا الگزنڈروونا ایک جاکٹ پہنے ہوئے کمرہ کے وسط میں، ایک کھلی ہوئی الماری کے سامنے کھڑی تھی اور اس میں سے چیزیں نکالکر اس کو خالی کر رہی تھی۔ اسکے بال جو کبھی نہایت گھنے اور شاداب تھے، اب دو پتلی پتلی چوٹیوں میں پیچھے سے بندھے ہوئے اس کی

گردن پر پلک رہے تھے۔ اس کا چہرہ اداس اور پیلا ہو رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں غمناک تھیں۔ کمرہ بے ترتیب پڑا ہوا تھا۔ جب اس نے اپنے شوہر کے قدموں کی آواز سنی تو وہ دروازہ کی طرف مڑی، اور اپنے چہرہ پر ایک سخت اور تحکمانہ کیفیت طاری کرلی۔ اس کو اس ملاقات کا خوف تھا۔ گذشتہ تین روز میں اس نے دس بار یہ کوشش کی ہوگی کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی چیزیں یکجا کرکے اس مکان سے رخصت ہو جائے اور اپنے میکے چلی جائے لیکن وہ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار نہ کرسکی تھی۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ "حالات موجودہ صورت میں نہیں رہ سکتے، اس کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے، کچھ سزا دینا چاہئے، یا کم از کم اس کو غیرت دلانا چاہئے کہ اس کی تکلیف کا جو اس کی حرکت نے اسکو پہنچائی ہے کچھ معاوضہ ہو جائے۔ وہ مسلسل اپنے آپ کو اس پر آمادہ کر رہی تھی کہ ان حالات میں اپنے شوہر کو چھوڑ دینا اسکا اخلاقی فرض ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچتی تھی کہ "یہ ممکن نہیں ہے" وہ اپنے شوہر کے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی، علاوہ اسکے وہ سوچتی تھی کہ اپنے گھر ہی میں اس کو پانچ بچوں کی پرورش و تربیت میں دشواریاں ہیں۔ اس کے میکے میں تو ان بچوں کی نگرانی و تربیت اور بھی زیادہ خراب ہو جائیگی اب بھی سب سے چھوٹا بچہ کچھ دن سے بیمار ہے، کیونکہ اُسے خراب پکا ہوا شوربہ کھانے کو ملا، گذشتہ رات ہی کو بچے بے کھائے سوئے ہیں، وہ جانتی تھی کہ چلا جانا ناممکن ہے، لیکن پھر بھی اپنی چیزوں کو سمیٹ رہی تھی، اور اپنے آپ کو دھوکا دے کر اس خیال پر آمادہ کر رہی تھی کہ وہ جا رہی ہے۔

جب اُسکی نظر اپنے شوہر پر پڑی، اس نے فوراً اپنا ہاتھ الماری میں ڈالا، گویا وہ کسی چیز کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی طرف اس وقت تک نہ دیکھا جب تک وہ بالکل قریب ہی نہ آگیا، بجائے سخت اور تحکمانہ انداز کے جو وہ اپنے چہرہ پر پیدا کرنا چاہتی تھی، اسکے چہرہ پر انتہائی تکلیف اور تذبذب کے آثار پیدا ہوگئے۔

"ڈوالی" اس نے خاموش اور بزدلانہ آواز میں کہا، اس نے اپنا سر جھکالیا اور اپنے آپ کو رنجیدہ اور مطیع ظاہر کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ خوش اور مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

اُس کی بیوی نے اُس کو سر سے پیر تک دیکھا "بے شک وہ مطمئن اور خوش ہے، اور میں۔

اور اس کی یہ زندہ دلی، جس کو دوسرے لوگ خوشگوار سمجھتے ہیں لیکن مجھے اس سے کتنی نفرت ہے۔

اُس نے اپنے ہونٹوں کو سختی کے ساتھ دبایا، اور اسکے چہرہ کے عضلات میں ایک اعصابی بے چینی پیدا ہوئی۔

"تم کیا چاہتے ہو" اس نے بالکل غیر فطری آواز میں پوچھا۔

"ڈوالی" اس نے کہا، اس کی آواز میں لرزش تھی، "انا آج یہاں آرہی ہے۔"

"تو مجھے کیا" میں اُس کا خیر مقدم نہیں کرسکتی۔

لیکن "ڈوالی" کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ ہونا چاہئے۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ بالکل مطمئن رہ سکتا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کا صرف خیال کر رہا تھا، اور یہ امید کرسکتا تھا کہ حالات خود بخود درست ہوجائیں گے۔ جیسا کہ میٹو نے کہا ہے۔ اور وہ بدستور اطمینان کے ساتھ اپنا قہوہ پی سکے گا، اور اپنا اخبار پڑھ سکے گا۔ لیکن اپنی بیوی کے سامنے آکر، اور اسکے کرب و تکلیف کے شاہد چہرہ کو دیکھ کر اور اس کی دردناک آواز کو سن کر۔ اسکے گلے میں کوئی چیز اٹکنے لگی، اسکے آنسو بھر آئے۔

"میرے خدا! میں نے کیا کیا" "ڈوالی" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، کیونکہ سسکیاں اس کو بولنے نہیں دیتی تھیں۔

اُس کی بیوی نے الماری بند کردی اور اس کی طرف مخاطب ہوئی۔

"ڈوالی" میں اسکے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے معاف کردو! کیا گذشتہ ۹ سال کی زندگی، مطمئن زندگی، چند لمحہ ..... کی تلافی نہیں کرسکتی۔

اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں، اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اس کو سننے لگی۔ گویا اس کو توقع تھی کہ وہ اس کو حقیقت غلط دکھائے کہ یہ سب

جھوٹ ہے۔

بُری ترغیبات کے چند لمحے ...... پھر اس نے کہا۔ اسپر ڈوالی نے پھر اپنے ہونٹوں کو بھینچا گو یا اس کو کوئی جسمانی تکلیف ہے، اور پھر اسکے چہرہ پر ایک اعصابی تشنج پیدا ہوا۔

جاؤ! یہاں سے چلے جاؤ!! مجھ سے اپنی ترغیبات اور اپنے کمینہ پن کا ذکر مت کرو!

وہ باہر نکلنے کے ارادہ سے مڑی، لیکن گرتے گرتے بچی، اور ایک کرسی سے اُس نے سہارا لیا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے "ڈوالی" اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ خدا کے لئے بچوں کا خیال کرو۔ اُن کا کیا قصور ہے۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے تو صرف مجھے سزا دو، مجھے بتاؤ، کہ میں کیا کروں۔ تم جو کہو گی میں کروں گا۔ میں منفعل ہوں۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کس قدر رنجیدہ اور پشیمان ہوں، "ڈوالی" مجھے معاف کرو!

وہ ایک کرسی پر گر گئی، وہ اسکے لمبے لمبے سانسوں کی آواز سُن سکتا تھا، اُس کا دل اُس کی تکلیف سے کڑھ رہا تھا، اس کی بیوی نے ایک دو بار بولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ بول سکی، وہ منتظر کھڑا رہا۔

"تم بچوں کا محض اس لئے خیال کر رہے ہو کہ تم اُن سے کھیلتے ہو، لیکن اُن کا مجھے بھی خیال ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ اب بھی تباہ ہیں۔ اس نے وہ فقرہ کہا جو گذشتہ تین دن سے اسکے ذہن میں تھا۔

وہ اس سے ملائمت کے ساتھ بات کر رہی تھی، اور وہ متاثر تھا اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے نفرت کے ساتھ اس کو جھٹک دیا۔

"میں ہمیشہ بچوں کا خیال کرتی ہوں، اور ان کو تباہی سے بچانے کیلئے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کروں گی۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ ان بچوں کا اُن کے باپ کے پاس سے لیجانا مناسب ہے یا اُس باپ کے پاس چھوڑ دینا مناسب ہے جو آوارہ منش ہے۔

"ہاں ایک آوارہ بدچلن"

"کیا تمہارا خیال ہے، کہ ہم جو کچھ ہو چکا ہے، اسکے بعد اسی طرح رہتے رہیں گے، مجھے بتاؤ کیا یہ ممکن ہے؟"

"میرا شوہر، میرے بچوں کا باپ، اس کے گورنس کے ساتھ ایسے تعلقات!؟"

"لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں" اس نے ملتجی آواز میں ندامت سے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"تم میرے لئے نفرت خیز ہو" وہ چلائی اور زیادہ مشتعل ہو کر اس نے کہا "تمہارے آنسو پانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ تمہارے دل نہیں ہے۔ تمہارے لئے ننگ و نام کوئی شے نہیں ہے۔ تم نہایت مکروہ اور قابل نفرت ہو۔"

"اسکے بعد سے تم میرے لئے بالکل اجنبی ہو، ہاں بالکل اجنبی، اور یہ بات اس نے اتنے سخت الفاظ میں کہی جو خود اسکے کانوں کو بھی عجیب معلوم ہوئی۔

وہ اس کو متعجب ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کا پُر از نفرت چہرہ اس کو متحیر کر رہا تھا۔ اس کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کا اظہار تاسف اسکی بیوی کو اس قدر مشتعل کر دے گا۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ گو محبت نہیں ہے مگر انتہائی ہمدردی ہے۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریگی اور یہ نہایت ہی خوفناک بات ہے" اس نے کہا۔

یکایک برابر کے کمرے سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی اور ڈیریا الیگزینڈرونہ کے چہرہ پر نرمی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک غیر متیقن سی ذہنی حالت میں وہ دروازہ کی طرف چلدی۔

یقیناً وہ میرے بچے سے محبت کرتی ہے، یہ محسوس کر کے کہ بچے کے رونے کی آواز نے اسے کتنا متاثر کیا۔ ہاں میرے بچے سے۔ پھر وہ مجھ سے نفرت کس طرح کر سکتی ہے۔

"ڈوالی" ایک اور لفظ سُنو! یہ کہکر وہ اسکے پیچھے پیچھے چلا۔

"اگر تم میرے قریب آئے، تو میں نوکروں، اور بچوں کو بلاؤں گی، اور ان سب کو بتا دوں گی کہ تم کس قدر نالائق ہو۔ میں آج جا رہی ہوں اور یہاں تم اپنی داشتہ کے ساتھ رہ سکتے ہو" وہ بھاگ کر کمرہ سے نکل گئی، اور اپنے پیچھے دروازہ کو زور سے بند کرتی گئی۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے ٹھنڈی سانس لی، اپنی پیشانی کو رومال سے صاف کیا اور خاموشی کے ساتھ کمرہ سے نکل گیا۔

میٹوے کہتا تھا "سوہ ہموار ہو جائیں گی" "لیکن یہ کیسے ہوگا موجودہ حالت میں تو یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے، کتنا خوفناک اور پریشان کن، اس کا اس بُری طرح چلاّنا اور داشتہ اور نالائق کے الفاظ کو چلاّ چلاّ کر کہنا ممکن ہے نوکروں نے بھی سُن لیا ہو۔ یہ سب کس قدر مہیب صورت ہے۔"

آج جمعہ کا دن تھا جرمنی گھڑی ساز کھانے کے کمرہ کی بڑی گھڑی میں چابی دے رہا تھا۔ اسٹیفن کو اسے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نے ایک دفعہ اس جرمن شخص سے جس کے سر کے بال اُڑ گئے تھے ایک پُر لطف مذاقیہ فقرہ کہا تھا کہ "معلوم ہوتا ہے کسی نے عمر بھر کے لئے اسکے چابی بھر دی ہے، جیسی وہ گھڑیوں میں چابی بھرتا بھرتا ہے،" اور اس خیال سے اسے کچھ ہنسی سی آگئی۔ اسٹیفن مذاقیہ فقروں کا بڑا شائق تھا لیکن پھر اسے اپنی بیوی کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی وہ بقول میٹوے ہموار ہو سکے گی۔ اور ہموار ہو جانے کی ترکیب بھی خوب ہے، میں کسی روز اس کو کسی اور سے بھی دُہراؤں گا۔

اس نے میٹوے کو بُلا کر کہا کہ "میریا سے کہو کہ ایک کمرہ اناآرکیڈیانہ کے لئے درست کرلیں۔"

"بہت اچھا جناب" میٹوے نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ نے اپنا کوٹ پہنا، اور باہر جانے کا قصد کیا۔

میٹوے نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا "کیا آپ شام کا کھانا یہیں کھائیں گے"

"مجھے یقین نہیں" "لیکن ہاں دیکھو تمہیں اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ لو" اسنے دس روبل کا ایک نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"غالبًا یہ کافی ہو جائیگا" میٹوے نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا، اور گھر میں واپس چلا گیا۔

اس دوران میں ڈیریا الیگزنڈرونہ بچے کو خاموش کر چکی تھی، اور گاڑی کی آواز سے یہ معلوم کر کے کہ اس کا شوہر چلا گیا وہ اپنے کمرہ میں واپس آئی۔ یہ کمرہ گھر کی مختلف چپقلشوں سے اس کے لئے جائے پناہ تھا، ابھی وہ تھوڑی دیر کیلئے نرسری میں گئی تھی کہ انگلش گورنس میٹریانہ نے اس سے متعدد سوال شروع کر دئے جن کا جواب صرف وہی دے سکتی تھی۔

"بچے ہوا خوری کے لئے کیا لباس پہنیں گے۔ کیا ان کو دودھ دیا جائے۔ دوسرے باورچی کا انتظام ہونا چاہیئے۔"

خدا کیلئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اس نے چلاّ کر کہا، اور اپنے کمرہ میں آگئی اور اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر قبل اس نے اپنے شوہر سے باتیں کی تھیں اور اپنے ہاتوں کو ملتے ہوئے جن کی پتلی انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی ڈھیلی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے اپنی گفتگو پر تبصرہ شروع کیا۔

وہ چلا گیا۔ لیکن کیا اس نے گورنس سے قطع تعلق کر لیا، کیا وہ اس سے اب بھی ملتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کیوں نہیں۔ نہیں نہیں ہم متحد نہیں ہو سکتے اور ایک گھر میں رہنے کے باوجود بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم بالکل اجنبیوں کی طرح رہینگے۔ ہمیشہ کے لئے اجنبی اس نے اس خوفناک لفظ کو پھر دُہرایا۔ مجھے اس سے کتنی محبت تھی میرے خدا! میں اسے کتنا چاہتی تھی، اور کیا مجھے اب بھی اسکے ساتھ محبت نہیں ہے؟ یہ سب سے زیادہ خوفناک چیز" اس نوبت پر میٹریانہ نے دروازہ پر آکر اسکے خیال کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

کیا میں اپنے بھائی کو بُلاؤں وہ شام کے لئے کھانا پکا لیگا ورنہ کل ہی کی طرح ہوگا۔ کہ بچوں کو صبح ۶ بجے تک کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا، اچھا میں خود آتی ہوں اور کوئی انتظام کروں گی، کیا تازہ

دودھ منگوایا ہے؟

اسکے بعد ڈیریا الیگزنڈرونہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوگئی اور وقتی طور پر اپنے غم کو بھول گئی۔

(۵)

اسٹیفن آرکیڈی وچ اپنی فطری ذہانت کے باعث اسکول میں ممتاز طالب علم رہا۔ لیکن وہ محنت کا چور تھا اس لئے امتحان میں اپنے درجہ میں سب سے پیچھے رہا لیکن وہ خوش قسمت تھا کہ باوجود اپنی نوجوانی اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے کے وہ ماسکو کے ایک سرکاری محکمہ کا پریسیڈنٹ ہوگیا۔ اس عہدہ پر اس کو ایک معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اس کو یہ عہدہ اپنے بہنوئی الیکسی الیگزنڈرووچ کرینن کے اثر سے ملا جو وزارت کا ایک بڑا رکن تھا اور اسی کے تحت میں یہ صیغہ تھا۔ لیکن اگر کرینن اسکے لئے کوشش نہ کرتا تو اسکے اور اعزا بھائی بہنیں چچا چچی یہ یا اسکے مساوی کوئی عہدہ اس کو ضرور دلوا دیتے جس کی آمدنی چھ ہزار روبل سالانہ ہوتی۔ باوجود اپنی بیوی کی طرف سے ایک بڑی جائداد ملنے کے اسٹیفن روپے کا ضرورتمند رہتا تھا۔ ماسکو اور سینٹ پیٹرسبرگ میں تقریباً ایک تہائی ذی اثر عہدہ دار اسکے باپ کے دوستوں میں تھے اور بچپن سے اسکو جانتے تھے۔ دوسری تہائی میں خود اسکے دوست تھے اور بقیہ تہائی میں اس کے شناسا، اس طرح تمام صاحب اقتدار لوگ جن کے اختیار میں زندگی کی مسرتیں ملازمتوں یا اور مختلف مراعات کی صورت میں تھیں اسکے دوست تھے، جو اس سے قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔ اب لانسکی کو اس عہدہ کے حاصل کرنے میں زیادہ کاوش نہ کرنا پڑی تھی۔ اپنی جگہ پر قائم رہنے کے لئے معمولی جھگڑوں یا چھوٹے چھوٹے حاسدوں کے حسد سے بچے رہنا چاہئے تھا، اور یہ اس جیسے خوش مزاج آدمی کیلئے دشوار نہ تھا۔ اگر وہ کسی مناسب تنخواہ کی جگہ کا متمنی ہو، اور لوگ اس سے کہیں کہ وہ اس کو نہیں مل سکتی تو وہ ان کا مذاق اڑائیگا۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس جگہ کے لئے وہ اتنا ہی موزوں اور لائق ہے جتنے وہ لوگ جو اس پر کام کر رہے ہیں۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ سے جو لوگ واقف تھے وہ اسے بہت پسند کرتے تھے اور اس کا سبب اس کی خوش مزاجی اسکی دیانت اور خود اس کی پُر از جاذبیت شخصیت تھی۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں سیاہ ابروؤں اور بالوں اور اسکے چہرہ کا رنگ جو دیکھنے میں بہت ہی خوشگوار تھا، ان سب میں ایک خاص کشش تھی اور جو لوگ اسے دیکھتے تھے اس سے یقینی طور پر متاثر ہو جاتے تھے۔

"اہا ہا جناب اسٹیفن صاحب" لوگ مسکراہٹ اور مسرت کے ساتھ اس کو دیکھ کر کہتے۔ اور اگر کبھی اس کی گفتگو انہیں مایوس بھی کرتی تو بھی وہ اس سے دوسرے دن ملنے کی تمنا ضرور کرتے۔

گذشتہ تین سال سے وہ اپنے محکمہ کا پریسیڈنٹ تھا اور اس دوران میں اس نے اپنے ساتھیوں اور اپنے ماتحتوں کی محبت اور اعتماد کو پورے طور پر حاصل کر لیا تھا اور ہر وہ شخص جس کا اس سے سابقہ پڑا تھا اس کا مداح تھا، اسٹیفن آرکیڈی وچ کی سب سے بڑی خصوصیت جس سے اس کو یہ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ انتہائی مہربانی کا برتاؤ تھا جو وہ عام لوگوں کے ساتھ کرتا تھا، اور جس کی بنیاد دراصل یہ تھی کہ اس کو اپنی کمزوریوں کا خود احساس تھا وہ ہر شخص کے ساتھ نہایت آزادی سے ملتا تھا، وہ آزادی نہیں جو اسکے زیر مطالعہ اخبارات سے ظاہر ہوتی تھی بلکہ وہ آزادی جو اس کی فطرت کا جزو تھی وہ ہمیشہ نفس معاملہ سے بے پروا رہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دوران معاملت میں نہ وہ کبھی بدمزاج ہوتا تھا نہ اس سے غلطی ہو سکتی تھی۔

اپنے دفتر پہنچکر اسٹیفن آرکیڈی وچ اپنے پرائیوٹ کمرہ میں گیا اردلی نے اس کا دفتری بکس لا کر رکھا۔ اس نے اپنا سرکاری لباس پہنا اور جنرل آفس میں آگیا دفتر کے اہلکار کھڑے ہوگئے اور مؤدبانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ اسٹیفن آرکیڈی وچ حسب معمول عجلت سے اپنی جگہ پر کونسل کے دوسرے ممبروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

اس نے چند دوستانہ اور تمسخر آمیز جملے اپنے دوستوں سے کہے

بالکل برمحل تھے اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اسٹیفن آرکیڈی ویچ سے بہتر کوئی دوسرا شخص اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ دفتری معاملات کے اندر آزادیٔ طبع اور فطری سادگی سے کس حد تک کام لینا چاہئے تاکہ دفتری معاملات تک ان کا اثر نہ پہنچے۔

اس کا سکریٹری آیا اور بے تکلفی لیکن ساتھ ہی مؤدب طریقہ سے اس نے کاغذات پیش کئے۔ یہ طریقہ ان سب لوگوں کا تھا جو اسٹیفن کے ارد گرد کام کرتے تھے۔ وہ نہایت نرمی اور صفائی کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور یہ طریقہ گفتگو خود اسٹیفن کا جاری کیا ہوا تھا۔

آخرکار حکومت چنیسہ نے وہ کاغذات بھیجدئے، کیا جناب چاہتے ہیں۔

"اچھا یہ آ گئے،" اسٹیفن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا اور انگلی سے کاغذات کو آگے بڑھا دیا ——— "اچھا جناب" اور کام شروع ہو گیا۔

"کیا ان لوگوں کو یہ خیال ہو سکتا ہے،" اس نے اپنا سر ایک جانب کو اظہار تشخص کے ساتھ رکتے ہوئے خیال کیا۔

اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ صرف آدھ گھنٹے پہلے ان کا پریسیڈنٹ اسکول کے نہایت شریر لڑکے کی حیثیت میں تھا، اس خیال سے اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک پیدا ہو گئی۔

جنرل کاؤنسل دو بجے تک مسلسل اپنا کام کرتی رہی اور پھر لنچ کے لئے وقفہ دیا گیا۔

۲ بجنے سے تھوڑی دیر پہلے ہال کا شیشہ کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اس میں داخل ہوا۔ اس شخص کے یکایک آنے کی وجہ سے لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح جو تھوڑی سی مہلت ان کو کام سے مل گئی اس سے وہ لوگ خوش ہوئے پہرہ دار نے داخل ہونے والے شخص کو دروازہ سے باہر کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

جب وہ لوگ رپورٹ ختم کر چکے۔ اسٹیفن آرکیڈی ویچ کھڑا ہو گیا۔ اور انگڑائی لیکر موجودہ دور کی آزاد خیالی کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کونسل کے کمرہ میں اپنا سگرٹ نکالا۔ اور اپنے پرائیوٹ کمرہ کی طرف چلدیا۔ اسکے ساتھ ساتھ دو اور ممبر نکی ٹین اور چیمبرلین گیرین ویچ بھی آ گئے۔

"ہم لنچ کے بعد اس رپورٹ کو ختم کر لیں گے،" اسٹیفن آرکیڈی ویچ نے ان سے کہا۔

"ہاں بیشک" نکی ٹن نے اُس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ گرینو ویچ نے معاملۂ زیر تحقیقات میں ایک شخص کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کہا "فورمین کتنا بدمعاش معلوم ہوتا ہے"

اسٹیفن آرکیڈی ویچ اس پر منقبض ہو گیا۔ گویا وہ پسند نہیں کرتا تھا کہ "کسی شخص کے متعلق قبل از وقت رائے زنی کی جائے" لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

اُسنے پورٹر (پہرہ دار) سے دریافت کیا کہ کون شخص تھا جو ابھی آیا تھا۔

یور ایکسلنسی! ایک شخص بغیر اجازت کے اندر داخل ہو گیا جبکہ میں دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہدیا ہے کہ وہ کام ختم ہونے تک انتظار کرے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

"وہ کہاں ہے؟"

"غالباً وہ برآمدہ میں ہے، کیونکہ وہ وہیں ٹہل رہا تھا"

اتنے میں ایک مضبوط چوڑے سینہ والے، نوجوان کی طرف جسکی ڈاڑھی کے بال گھونگر والے تھے اور وہ بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا، اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"یہ وہی صاحب ہیں"

یہ شخص زینہ کی صاف شفاف دھلی ہوئی سیڑھیوں پر تیزی کے ساتھ چڑھ رہا تھا۔ دفتر کے کلرکوں میں سے ایک کلرک نے جو بستہ بغل میں دبائے ہوئے تھا اس کی طرف غصہ سے دیکھا اور پھر ابلانسکی کی جانب مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ابلانسکی اس وقت زینہ کے سرے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ جس سے اس کی صاف باطنی ہمیشہ مترشح ہوتی تھی اس آنے والے شخص کو پہچان کر خوشی سے سرخ ہو گیا۔

"کھو تم لے ون" اس نے نہایت بے تکلفی اور نیم تمسخرانہ انداز

میں نووارد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"آخر تم نے ہمت کر کے مجھے اس خوفناک جگہ میں پا ہی لیا۔" اور اپنے دوست سے محض مصافحہ کو کافی نہ سمجھتے ہوئے محبت سے اُسے بوسہ دیا۔

"تم کب آئے"

"میں ابھی ابھی آیا، اور تم سے ملنا چاہتا تھا۔" "لے وِن" نے گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف دیکھتے ہوئے سہمے ہوئے طریقہ سے کہا۔

"اچھا، آؤ میرے دفتر میں آؤ!"

استیفن آرکیڈی وچ اپنے دوست کی طبعی خصوصیات سے واقف تھا وہ جانتا تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر گھبرا جاتا ہے، اور اپنی ذات کا احساس یا حس کو خود شناسی بھی کہئے اس میں ایسے موقعوں پر زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے دوست کا بازو پکڑ کر اپنے کمرہ کی طرف رہبری کی گویا وہ اُس کو خطرہ سے بچانا چاہتا ہے۔

10 استیفن آرکیڈی وچ اپنے تمام دوستوں سے بہت زیادہ بے تکلف تھا خواہ اسکے دوستوں میں ساٹھ سال کے بڈھے ہوں خواہ بیس سالہ نوجوان ہوں خواہ ایکٹر ہوں، وزرا ہوں، تاجر ہوں، یا فوج کے جنرل، وہ مختلف طبقات یا درجات کے لوگوں سے دوستی رکھتا تھا اور بعض اوقات اسکے دوست بہت ہی مختلف قسم کے لوگوں کو اسکے قریب دیکھ کر متوحش ہو جاتے تھے۔ جس شخص کے ساتھ اس نے ایک مرتبہ بھی شیمپین پی لی وہ اسکا بے تکلف دوست ہو گیا۔ اور شیمپین اس نے قریب قریب سب کے ساتھ پی تھی۔

اگر اپنے ماتحتوں کے سامنے اس کو اپنے عجیب و غریب دوستوں سے ملنے کا سابقہ ہوتا تو وہ خیال رکھتا تھا کہ ان کے سامنے کوئی نامناسب اور بے تکی بات نہ ظاہر ہو۔ "لے وِن" اسکے کم درجہ دوستوں میں سے نہ تھا، لیکن اب لانسکی محسوس کر رہا تھا کہ اس موقع پہ ان کی پرانی دوستی کا اظہار بھی کچھ خوشگوار نہیں ہوگا۔ اور اسی وجہ سے وہ اس کو عجلت کے ساتھ اپنے کمرہ میں لے گیا۔

"لے وِن" ابلانسکی کا ہمعصر تھا، اور ان کی دوستی شیمپین کی دوستی نہ تھی بلکہ لے وِن اس کا بچپن کا ساتھی تھا وہ دونوں باوجود اپنے اختلاف طبائع اور اختلاف مذاق کے ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ اور یہ انہیں لوگوں میں ہوتا ہے جو بچپن سے ایک دوسرے سے مانوس ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ عموماً مختلف مذاق اور حالات کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کو حق بجانب سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی اپنی روش پر ایک دوسرے کو بظاہر اچھا سمجھتا ہے لیکن دل میں ضرور نفرت کا احساس لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ہر ایک فریق سمجھتا ہے کہ اسکا طریق زندگی بہت اچھا ہے اور دوسرے کا طریق زندگی بالکل غلط ہے۔

"لے وِن" کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ابلانسکی تمسخرانہ مسکراہٹ کے بغیر نہ رہ سکا۔ ---------

--------- اس نے لے وِن کو اپنے دیہات سے "ماسکو" میں کئی بار آتے ہوئے دیکھا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاص کاموں میں معروف ہے جو ابلانسکی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا ہیں اور نہ اس میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ وہ ان کا تجسس کرے، "لے وِن" ہمیشہ ماسکو میں کسی نہ کسی جوش سے بھرا ہوا آتا ہمیشہ عجلت کرتا ہوا۔ اپنی ضعیف الاحساسی کے باعث "احساس ذات" میں مبتلا، اور اس سے پریشان زندگی اور عام اشیا کے متعلق خاص نظریات لئے ہوئے۔ استیفن آرکیڈی وچ اپنے دوست کی ان باتوں پر مضحکہ بھی اُڑاتا لیکن پھر بھی وہ اسے پسند کرتا تھا۔

اسی طرح "لے وِن" ابلانسکی کی دنیاوی زندگی اور اسکی مصروفیات کو نفرت سے دیکھتا اور ان پر ہنستا۔ کیونکہ یہ اسکے خیال میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ ابلانسکی جو دوسروں کی طرح ایک عام زندگی بسر کرتا تھا، اپنے دوست پر محض خوشدلی کے طور پر ہنستا تھا،

(باقی)

سونے کے بٹن

(فرید مجیلی شہری کی تازہ کہانی)

مچھر دانی ہٹانی چاہیے یا بغیر ہٹائے ملنا چاہیے۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے اپنے پر بھروسہ تو تھا مگر اس وقت میری تلملائی ہوئی آنتڑیوں نے مجھے اندھا سا بنا دیا تھا۔ سارا دن مزدوری کی تلاش میں گزرا، مزدوری سارے شہر میں چکر لگانے پر بھی نہ ملی اور جب بھیک مانگی یہی سننے میں آیا کہ مزدوری کرو۔ جوان اور تندرست ہو کر بھیک مانگتے لاج نہیں آتی..... شرم، پیٹ بھرے ہوئے لوگوں کو جب یہ کہتے شرم نہ آئی مجھ بھوکے کو کیوں شرم آتی۔ میں نے تو ایک دن تنگ آ کر ایک کتے سے اس کی چچوڑی ہوئی ہڈی چھین لی تھی اور اسے چبا گیا تھا اس وقت مجھے دیوانہ کہا گیا تھا اور پاگل خانہ میں بند کر دیا گیا تھا جب مجھے کتے سے ہڈی چھیننے میں شرم نہ آئی، روٹی کے لئے دو پیسوں کی بھیک مانگتے شرم کیوں آتی۔

یہی خیال تھے جو گھنگھور بادل کی طرح میرے دماغ پر چھا گئے، میری آنکھوں کو صرف اتنا نظر آ رہا تھا کہ چھت سے سفید سفید پردے لٹک رہے تھے اور پردوں کے اندر سایہ جیسے دھندلکے کی طرح کوئی سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر گھور کر دیکھتے رہنے کے بعد [illegible] ہر چیز کسی قدر صاف نظر پڑا اور سفید کرتے میں لگے ہوئے سونے کے بٹن۔ بٹنوں کو دیکھتے ہی میری آنکھوں سے دھندلکا چھٹ گیا اور میری ہمت بندھی۔

باغ میں یوں اندھیرا تھا لیکن چاند کی ہلکی روشنی چھن چھن کر مچھر دانی پر پڑ رہی تھی اور سڑک کے برقی لیمپوں کی کرنوں سے مل کر مچھر دانی کے اندر لانبی چوڑی شکلیں سی بنا رہی تھی۔ اسی وقت چار پانچ مینڈک ٹرّا اٹھے۔ مجھے کسی نے دیکھ تو نہیں لیا، میں گھبرایا۔ پھر میں نے سوچا کہ لڑ بھڑ کر مرنا تو اچھا ہے اور جاگتے ہوئے آدمی سے لڑنا زیادہ آسان ہے۔ اس دشمن پر جو مقابلہ کر سکے جو اپنا بچاؤ کر سکے، حملہ کرنا اسے مار دینا زیادہ سہل ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔

باغ کے باہر سڑک پر ایک تیز موٹر گذر گئی۔ جس نے گرد اڑا دی، باغ کو بھی لپیٹ لیا۔ میں پھر بھی نہ گھبرایا۔ سوئے ہوئے آدمی کو ہمیشہ کی نیند فوراً سلانا ہے۔ پھر سونے کے بٹن اپنے قبضے میں کرنے ہیں۔ مجھے اپنے پکڑے جانے اور پھانسی پر چڑھنے کی بھی پروا نہ رہی۔ میرے پیش نظر صرف ایک سکڑا ہوا پیٹ تھا، سونے کے بٹن تھے۔ مجھے یقین تھا کہ سویا ہوا آدمی ذرا آواز نکالے بغیر جان دے گا آواز نکلی بھی تو اس کے خراٹے سے دب جائے گی۔

اس وقت میرے جذبات خالص انقلابی نہ تھے۔ میں اپنے کو کالی دیوی کے مندر کا پجاری سمجھ رہا تھا۔ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ ایک [illegible] جذبہ کے تحت تھا۔ خونی وقت کی گہرائیوں میں ڈوب گئی تھی۔ میں سونے کے [illegible] کر رہا تھا۔

بھوک اور دوڑ دھوپ کے بعد باغ میں اُس کو سوتا دیکھ کر مجھے یکایک غصّہ آگیا تھا اور بغیر کسی ڈر اور جھجک کے مسہری کے پاس
پہنچ گیا تھا۔ جب سونے کے بٹن نظر پڑے میں بالکل اندھا ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پوریاں کچوریاں کھا کر سوئے ہیں۔ سونے کے بٹن سوتے
ہوئے بھی الگ نہ ہوئے۔

میرا دل مضبوط تھا۔ اندھی دولت کے زعم میں سوئے ہوئے سرمایہ دار اور اس کے سونے کے بٹنوں کو دیکھ کر میری خودی، دنیا کا درد
سمو کر اٹھی اور میرے دل و دماغ میں ایک عجیب کشمکش شروع ہوگئی۔ درد، تکلیف بے چینی کے رنگ اپنے چہرے پر خود محسوس کر رہا تھا۔
میں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا، کانپتے ہوئے داہنے ہاتھ سے استرا اور بائیں ہاتھ سے ایک چاقو نکالا' رام پوری چاقو، میرے
دوست شاکر کا آخری تحفہ۔ میری رگیں پھول گئیں۔ استرے سے فوراً مر جائے گا، میں نے سوچا تو مگر میں اُسے استعمال نہ کر سکا۔ چاقو کو دیکھ کر
خود اپنے سے نفرت ہوگئی۔ میں نے اپنے کو کمینہ خیال کیا، بھوک انسان کو کمینہ بھی بنا دیتی ہے، میں قاتل کہلاؤں گا، پولیس میرے پیچھے
دوڑے گی۔ میں اندھیری رات کے تھرتھراتے ہوئے سایوں کی طرح دبکتا پھروں گا۔ کبھی نہ کبھی پکڑا جاؤں گا، مقدمہ ہوگا، سزا ملے گی پھانسی
چڑھا دیا جاؤں گا یہ سوچتے سوچتے میرے بدن میں کپکپی پیدا ہوئی اور میرے ہاتھ سے استرا گر پڑا۔ استرا گرا اور گرنے سے جو آواز ہوئی اس سے
مجھے رات کی بھیانک خموشی کا علم ہوا۔ میں نے استرے کو اتنا مضبوط پکڑ رکھا تھا کہ انگلیاں اینٹھ گئی تھیں، چاقو کو بائیں ہاتھ سے داہنے
میں لیا۔ پہلی بار اتنا دہشت زدہ ہوا کہ میرے پیر کانپنے لگے مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بدستور
خراٹے لے رہا تھا، میں نے پھر ہاتھ اُٹھایا، پھر گرایا۔ ہاتھ اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ کوشش سے بھی نہ اُٹھتے تھے میں نے کچھ
تنگ آکر کچھ ڈرتے ہوئے، اور کچھ اپنی وحشت کو کم کرنے کے لئے مڑے ہوئے پیر کی طرف دیکھا پیر قربانی کے بکرے کی طرح
معلوم ہوا۔ ٹکڑے ٹکڑے بیجان، پھر بھی جاندار، دماغ چکرایا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سر غبارے کی طرح پھول رہا ہو، پیشانی پر
پسینے کے قطرے بہہ نکلے میں نے سوتے ہوئے سرمایہ دار کے پیروں کی طرف پھر دیکھا، اور دھیرے دھیرے نظر سارے جسم پر ۱۰۱
لے گیا وہ صحیح و سلامت تھا اور بے خبر سو رہا تھا، پیر بدستور مڑے ہوئے تھے، اس مرتبہ تو اس کی پھولی ہوئی توند بھی نظر آئی،
سوتے میں سانس کا تلاطم مد و جزر کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا، آڑی ترچھی، ٹیڑھی، سیدھی، روشنی کی لہریں مچھر دانی میں سے
چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ اس کے خون کے سیاہ رنگ نے اس کے جسم کے سانولے رنگ کو لوہے کی سی چمک دے دی تھی،
مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا جسم لوہے کی طرح سخت ہو۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ میرے چاقو کا گوشت پر کیا اثر ہوگا اس کے دل کی
کتنی گہرائی تک میرا چاقو جا سکے گا میں نے نوک کو اپنے بازو میں چبھایا اور ایک سکراتی کیفیت میں اتنی زور سے دبایا کہ آدھا نکل گئی پھر بھی
درد نہ محسوس ہوا۔ اس کے وجود اور اپنے پکڑے جانے کے بعد کی تکلیفوں اور مصیبتوں کے خیال نے درد کا احساس بھی نہ ہونے دیا حالانکہ
چاقو نے کافی زخم کر دیا تھا،

میں مسہری سے اور قریب ہوگیا۔ مڑے ہوئے پیر میرے پاجامے سے چھوتے ہوئے اپنی جگہ پر آگئے، اس کی نیند نہ ٹوٹی وہ
سوتا رہا۔ یکایک تاریکی میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹی، ایک عجیب روشنی کوندی، میں نے پھر دیکھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، اس
مرتبہ میں نے سیٹھ کو پہچان بھی لیا۔ میں تین چار گھنٹے پہلے دریبہ کی گلیوں میں چکر لگا رہا تھا، اس وقت بھی میری نیت چوری کی تھی،
اور میرا ارادہ تھا کہ کسی دوکان سے کوئی زیور یا تھیلی اٹھا کر بھاگ جاؤں گا۔ بھاری بھاری تجوریوں میں سونے اور چاندی اور
جواہرات، لاکھوں کی قیمت کے مقفل تھے اور میں بھوکا، دو روٹی کے لئے سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھان رہا تھا، سیٹھ لوگ
اپنی اپنی تجوریوں کے سامنے بیٹھے گھٹی گھٹی ڈکاریں لے رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے نازک نازک حقے پی رہے تھے۔ یہی وہ سیٹھ صاحب

کہ جب میں ان کی دوکان کے سامنے سے گزرا تھا یہ دہی بڑے کھا رہے تھے، میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے بھی دہی بڑے کھلا دیں اُنھوں نے دھتکار دیا تھا، میرے چکنے ہوئے چہرے اور میرے بدن کو چیتھڑوں میں لپٹا ہوا دیکھ کر زور سے ہنس دیئے تھے۔ دہی بڑوں کی خوشبو سے میرے منہ میں پانی بھر آیا، یہ مجھے چڑھا چڑھا کر للچا للچا کر کھا رہے تھے۔ گویا یہ بڑا مذاق تھا جو توندل گول مٹول لالہ ایک بے روزگار بھوکے پردیسی سے کر سکتا تھا۔ اسی وقت میری طبیعت چاہتی تھی کہ جرسہ میٹھوں اور گلا گھونٹ دوں، مگر پھر فاقہ زدہ ہمت نے جواب دیدیا اور میں چپ چاپ دوسری دوکانوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسوقت اس باغ میں، دہی سیٹھ، تو بہت مجھے اچنبھا ہوا وہ پرانی دلی تھی، یہ نئی دلی ہے وہاں ساہوکار ایک چھوٹی سی دوکان پر لاکھوں کی دولت اپنی آہنی تجوری میں دفن کئے بیٹھا تھا، یہاں ایک کھلے باغ میں آرام وہ مسہری پر میٹھی نیند سو رہا ہے۔ بازار میں چکر لگاتے ہوئے مجھے رنڈیوں کے بازار میں سے بھی گزرنا پڑا تھا، اسوقت میرا خیال ان کی طرف گیا جو اسی طرح اپنی جوانی کو تجوری بنائے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں دوکان لگائے بیٹھی رہتی ہیں، ساہوکار بھوکے اور فاقہ مست مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی اپنی تجوری میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتا ہے۔ چاندی سونے کی حیاتی سے اس کی تجوری دن بدن بھاری ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن آتا ہے کہ حالات کی دیمک سارا کا سارا مال چاٹ جاتی ہے۔ ساہوکار بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔ موت سے تو اُسے بھی مفر نہیں، مر جاتا ہے اور اپنی دولت کو زمانہ کی انقلابی مٹھیوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ رنڈی سماج کی نظروں میں گھنونی ہونے کے باوجود سرمایہ دار سے بہتر ہے وہ گاؤں کے کسانوں اور شہری کارخانوں کے مزدوروں کے تھکے ہوئے دلوں کو اپنے سوم رس سے شانتی تو دیتی ہے، اُن کا دُکھ درد بھلاتی ہے۔ جوانی کی تجوری میں دولت بند ہوتی ہے۔ پھر زمانہ کی انقلابی کروٹوں میں یہی دولت پرانی ہو کر دیمک بن جاتی ہے جو رنڈی کو بھی چاٹ جاتی ہے۔

میں خیالات میں اتنا کھو گیا کہ مجھے کچھ سدھ نہ رہی، مجھے اپنے وجود کا بھی احساس نہ رہا خودی ایک بار پھر کرانت میں کھو گئی میں سب کچھ بھول گیا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ مجھے اس کو قتل کرنا ہے، اور سونے کے بٹن اس سے چھین کر اپنی اینٹھتی ہوئی انتڑیوں کی تلملاہٹ دور کرنی ہے، خون کے قطرے میرے زخمی بازو سے بہہ نکلے اور مجھے گدگدانے لگے۔ میں سمجھا کوئی کیڑا ہے جو میرے بازو سے گذر کر میری میلی بغل کی طرف اپنی خوراک کے لئے جا رہا ہے۔ میں نے ہاتھ جھٹکا، اُسوقت مجھے ہوش آیا، اور میں یہ سمجھ کر گھبرا گیا کہ کتنا عرصہ سے زیادہ ارادہ کرتے ہی گذر گیا۔ خون کے قطرے بازو کے جھٹکے سے اُڑ کر ساہوکار کی دھوتی، کرتے اور چادر پر ادھر اُدھر گرے چند قطرے مسہری پر بھی رہ گئے۔

میں نے سیٹھ کو مار ڈالنے کے لئے پھر ہاتھ اُٹھایا، ذرا سا اشارہ کافی ہے، مار ڈالنے میں رکھا ہی کیا ہے، میں نے اس مرتبہ اس کو قطعی حملہ کی نیت سے دیکھا، کرتے کا گلا کھلا ہوا تھا، دھوتی کمر تک چڑھی ہوئی تھی، توند ننگی تھی، چھاتی ننگی تھی، کہاں مارو؟ کس جگہ ماروں؟ اگر مجھ پر وار نہیں ہٹا ئے مارا، ایک فٹ کا فاصلہ ضرور ہونا چاہئے۔ چاقو کا پھل پیچھے کو جھکاتے ہوئے مجھے پھر جھرجھری سی آگئی سوتے ہوئے انسان کو مارنا ایک بیجان لاش پر حملہ کرنے کی طرح میرے لئے مشکل ہو رہا تھا، لاش کی آخری ڈکراتی ہوئی سانس کی طرح اس سوتے ہوئے آدمی کے گلے سے بھی خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹ جانا چاہا مگر میری ٹانگیں اور میرے ہاتھ اکڑ گئے تھے مجھے اپنی حالت آپ بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوئی، اس نے کروٹ لی، مجھے ڈر معلوم ہوا کہ کہیں جاگ نہ جائے میں آپ ہی آپ اُچھل پڑا، اور اُچھلتے اُچھلتے میں نے پوری قوت سے اس کے جسم میں چاقو تیر ا دیا۔ چاقو کی دھار کی طرح میری قوتِ حس نازک حد تک تیز ہو گئی وہ مسہری سے اُچھلا مسہری کے اسپرنگ نے میرے حملہ کی بے پناہ قوت کے جواب میں اُسے تھوڑا اوپر پھینک دیا، میں نے پیچھے کی

طرف دبانے کے لئے اپنے ہاتھ سخت کرنے، اینٹھی ہوئی مٹھیوں میں چاقو جکڑا ہوا تھا اور جھٹکے سے چاقو کے تیز پھل کے نیچے ساہوکار کی آتما دنیا کے خلا میں شامل ہونے کے لئے مچل رہی تھی، ایک بار ٹانگیں اوپر اٹھیں اور چھاتی تک پہونچ گئیں، پھر نیچے کی طرف گریں اور سیدھی ہو کر کسی اکڑی کی اکڑی رہ گئیں، میں نے ایک مرتبہ پھر مارنا چاہا۔ مگر چاقو، چھاتی سے چپکا رہا، زور لگانے پر بھی نہ نکلا۔ سکرات کے جھٹکوں میں لاش عجیب و غریب تماشے کر رہی تھی اور میرا کانپتا ہوا ہاتھ اُسے ٹھنڈا کر دینے کے لئے پوری قوت سے چاقو کو دھنسائے جا رہا تھا، اُس پر میرا پورا اذن تھا۔

میں نے مچھر دانی کے شگاف میں سے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے نکل پڑے ہیں، جاگا تو نہیں۔ آنکھیں سفید سفید آگے کی طرف نکلی پڑ رہی ہیں، چاقو کے چاروں طرف خون اُبلنے لگا تھا، لاش ابھی پوری طرح سرد نہ ہوئی تھی۔ منہ کے جھاگ کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کے پہیوں کی آواز کی طرح سانس نکل رہی تھی، میں نے بدستور چاقو دھنسائے رکھا، میرے بازو اینٹھ گئے تھے، میرے کاندھے دکھ رہے تھے، میری چھاتیاں دھک دھک کر رہی تھیں شاید اس باغ میں اس وقت میری چھاتیاں ہی جاندار تھیں، دل کے دھک دھک کے سوا میں بالکل سنبھلا ہوا، ساکت و ساکن تھا۔ خون میرے بازو سے بہہ نکلا تھا، مجھے مگر تکلیف کا ذرا احساس نہ تھا۔ اپنا خون ساہوکار کا خون معلوم ہو رہا تھا، اس گم سم کی حالت میں مجھے اس کے قتل کا اندازہ ہوا، باغ کی خموشی، سڑک کے لیمپ اور پھیکی چاندنی کی روشنی میں تھرتھراتی معلوم ہوئی اور مجھے رات کی گرمی میں بھی سردی معلوم ہونے لگی۔

میں نے پھر سہری کی طرف نظر ڈالی، حملہ کے ذرا بھی آثار نہ تھے، مچھر دانی کے شگاف سے بھی کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ رات کی خاموشی تیز شراب کی طرح مجھ میں نشہ کی سی کیفیت پیدا کر رہی تھی اور میں ایک عجیب تھکن کے ساتھ بغیر جھومے جھوم رہا تھا، بچپن کے خوابوں کی اُلٹی تعبیر نظروں کے سامنے تھی، میں موت کے سامنے تھا، دہشت سے چُور، اور خون کے نشہ میں مخمور،

۱۰۸ بڑی مشکل سے اپنی مٹھیاں کھول سکا، لاش ذرا اُچھلی، گری، اور پھر بے جان ہو گئی۔ ایک گہرا دھبا، دھیرے دھیرے دامن پر پھیلنا شروع ہوا، اور ایک جاندار چیز کی طرح بڑھنے لگا، اس کے پاس ہی پاس دو نوکیلے کانوں کے سائے بھی بڑھتے معلوم ہوئے ہر چیز مجھے جاگتی دکھائی دی، باغ کی پتی پتی سے آوازیں نکلتی سنائی دیں، چاند سر پر آ چکا تھا، اُسے دیکھنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے ساری دنیا جاگ گئی ہے۔ یعنی پھر چادر پر پھیلتے ہوئے دھبے کی طرف نظر کی، باغ کا پھاٹک دور تھا، جھاڑیاں پاس تھیں، جھاڑیوں کے پیچھے سڑک تھی، وہیں سڑک کا لیمپ تھا، ان دونوں لیمپوں کے سائے کانوں کی شکل بنا کر چادر پر ٹھیک اس جگہ پڑ رہے تھے جہاں خون کا دھبا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا، میں بھوت کا قائل نہ تھا، مگر اس وقت مجھے بڑا ڈر لگا، میری انگلیاں بندھ گئیں، ایسا معلوم ہوا جیسے فالج گر گیا ہو، مُنھ سے مولا نہ گیا، میں کودا اور کود کر بھاگا، بھاگتا ہوا دور چلا گیا، جھاڑیاں، کانٹوں کی دیوار سب کود گیا، کودتا، پھاندتا، گرتا، پڑتا بھاگتا ہی چلا گیا، کئی باغوں سے گزرا، ٹھٹھکا، سڑک کے کنارے کئی سونے والوں کو کچلا، مگر نہ رُکا، دور، بہت دور نکل گیا۔ ایک شرابی نشہ میں چُور لڑکھڑاتا جا رہا تھا، اُس سے ٹکرایا اور ٹکراتے ہی رک گیا، سنبھلا، ٹھٹکا، خیال کیا، قتل؟ میں نے قتل کیا ہے، سوتے ہوئے انسان کو قتل کیا ہے؟ مگر دھن؟ سونے کے بٹن؟ قتل! بیکار؟ بٹن کے لئے سب کچھ ہوا اور بٹن ہی چھوڑ دئے۔ اُف! الٹا پھر بھاگا۔ ساہوکار کے باغ کی طرف بھاگا، پھر ان گنتی باغوں سے گزرا، سڑک کے کنارے سونے والوں کو کچلا، مگر بھاگتا ہی رہا۔ کئی سہریاں دیکھیں مگر بغیر رکے گزر گیا، سیٹھ کا باغ، سیٹھ کی سہری، سونے کے بٹن، کچھ نہ دکھائی دئے، بھاگتا ہی رہا، سیدھا، بائیں، دائیں کبھی کبھی چکر کی طرح گھوم ہی گیا، سیٹھ کا باغ نہ ملا، میں دیوانوں کی طرح اسی طرح چکر لگاتا ہی رہا۔ ایک مکان میں بڑی روشنی تھی، بیٹھے لوگ تھے، باغ میں مجمع تھا، ہر قسم کی آوازیں آ رہی تھیں، دیوانوں کی طرح میں بھیڑ میں دندناتا چلا گیا، سب کو، ہر ایک کو

دھکا دیتا گھستا گیا مسہری؟ اتنے سارے لوگ؟ میں رُکا، رُکتے رُکتے اپنے پینگ کے جھولے کی طرح جھول گیا، گرتے گرتے سنبھلا کسی کو کاندھے سے پکڑ کر پھینک دیا، کسی کو کہنی دیا، کسی کو مُکا رسید کیا، مسہری کے پردے پھاڑ ڈالے، سیٹھ بدستور سو رہا تھا، سیٹھ کے چہرے پر چادر پڑی ہوئی تھی، چادر جھٹکا کر پھینک دی، دھبا اب بہت بڑھ گیا تھا، سونے کے بٹن بدستور کُرتے میں ٹنک رہے تھے، میں نے بٹنوں پر ہاتھ ڈالا، کُرتے کو پھاڑنے کی کوشش کی، بٹن ہاتھ میں آگئے ....
.... کل صبح مجھے پھانسی دیدی جائے گی!؟

خداوندِ دل سے

(از صفوۃ اللہ بیگ صوفی)

مجھے تم سے محبت ہے۔
تم شبہ کر سکتی ہو — چاند کی روشنی پر
آفتاب کی حرارت پر
ستاروں کی تابندگی پر
کائنات کے وجود پر
یہ سب جھوٹے ہو سکتے ہیں، ممکن ہے کہ — چاند بے نور ہو جائے
آفتاب سرد ہو جائے
ستارے سیاہ ہو جائیں
کائنات درہم برہم ہو جائے
تم ان سب پر شبہ کر سکتی ہو، کیونکہ — چاند کی روشنی آفتاب کے
سامنے ہیچ ہے۔
آفتاب لیل و نہار کی گردش کا پابند ہے
ستاروں میں انفرادیت نہیں ہے
کائنات ایک مستقل نظام کے تابع ہے
لیکن مری محبت — نہ تو چاند کی طرح زوال پذیر ہے
نہ آفتاب کی ڈھلنے بڑھنے والی دھوپ چھاؤں ہے
نہ ستاروں کی طرح گردش ہے
نہ کائنات کے قوانین و پابندیوں میں
جکڑی ہوئی ہے
وہ مری محبت ہے — دائم
قائم
بے لوث
بے شک

اُس میں — چٹانوں کا عزم ہے
سمندر کی گہرائی ہے
امواج کی شوریدہ سری ہے
طوفان کی شورش ہے
میرے لئے — تم — میں چاند کی ٹھنڈک موجود ہے
میں آفتاب کی زندگی موجود ہے
میں ستاروں کی کشش موجود ہے
میں مری کائنات پوشیدہ ہے

مجھے تم سے محبت ہے
تم میرے دل کی ملکہ ہو
تم مری ہونے والی مالکہ ہو

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

١

دو پیٹ

بغیر زبان آرائی کے یہ چھوٹی سی کہانی کتنی عظیم دعوتِ فکر ہے!! ساغر

دونوں ایک ہی سے پیدا ہوئے، لیکن ایک کو آرام دہ پالنے میں جگہ ملی اور دوسرے کو میلے سے گودڑ اور چیتھڑوں میں۔
امیر والدین کے لاڈلے بچے کے ساتھ کھیلنے اور اس کی خدمت کے لئے ایک ہم جولی کی تلاش ہوئی۔ غریب ماں باپ کا یہ غریب بچہ جس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ خشک ہو چکا تھا اور جس کے باپ کی کمائی میں اتنی بچت نہ تھی کہ اپنے آدھے درجن بچوں کے ساتھ اس کا بھی پیٹ پال سکتا۔ اس خدمت پر مامور ہوا۔ اپنے پیٹ کے لئے اور دوسرے کی دل لگی کی خاطر،
جب ننھے میاں کھانا کھاتے تو اسے مکھیاں اڑانے کے لئے حاضر رہنا پڑتا وہ بسکٹ کو دودھ میں بھگو بھگو کر کھاتا اور یہ منہ تکا کرتا اس کی قسمت میں دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور ٹوٹے ہوئے نوالے ہی لکھے تھے۔ مکتب جاتے وقت اس کے پیچھے پیچھے بغل میں بستہ دبا کر چلنا پڑتا۔ تختی کی صفائی اور دوات سے سڑی ہوئی مکھیوں کے نکالنے کی خدمت بھی اسی کے سپرد تھی۔ اور جب ننھے میاں 110
کے دودھ مکھن کھائے ہوئے جسم میں خون جوش کرتا اور انھیں شہ سواری کی سوجھتی تو اسی کو گھوڑا بھی بننا پڑتا۔ اس کے چوتڑوں پر قمچیاں پڑتیں اور کوکھ میں ایڑیاں ماری جاتیں۔ زیادہ تیز دوڑنے کے لئے جب وہ اپنی کمزور ٹانگوں سے دوڑتا ہوتا ننھے میاں ہنستے ہوئے "امی دیکھا ہمارا گھوڑا"!؟ ہاں بیٹا دیکھا خاص عربی گھوڑا ہے!
اگر دوڑتے دوڑتے وہ تھک کر گر جاتا تو بیگم صاحبہ کے چٹاخ چٹاخ طمانچے کھانے پڑتے اور دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑے نوالوں سے بھی محروم کر دیا جاتا۔ نمک حرامی کی سزا!
اس کے گھر والے مطمئن تھے کہ مہینے کی ہر پہلی کو انھیں دو روپے مل جاتے۔ کیا کرتے غریب پیٹ ہی جو پالنا تھا۔
اپنے طبقے کی جہالت کے باوجود لڑکا ذہین تھا۔ جب ماسٹر صاحب ننھے میاں کو پڑھاتے ہوتے تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے آکر کھڑا ہو جاتا۔ ننھے میاں چھٹی کے لئے رسیاں تڑاتے ہوتے مگر اس کا مکتب میں بہت جی لگتا۔ روز کے سننے سے اسے ننھے میاں کے سبق کی بہت سی باتیں یاد ہو گئیں تھیں۔ مثلاً

بیاس، جہلم، ستلج، چناب، راوی یہ پنجاب کے پانچ دریا ہیں۔
دلی، ہندوستان کی راجدھانی ہے۔
اور پانچ تیے پندرہ ہوتے ہیں۔
ان کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی بہت سی باتیں اسے یاد ہو گئیں تھیں۔

ایک روز ننھے میاں کے کان اینٹھے جا رہے تھے اور وہ یہ نہیں بتا پاتے تھے کہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ کون سا ہے۔ کان ملیا پڑی ہوئی بات اُسے یاد آگئی، بتلانے کے لئے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بہت ضبط کیا لیکن نہیں ہو سکا زبان سے ایک دم نکل ہی گیا

"ہمالیہ"

ماسٹر صاحب نے اُس کو اِس طرح گھُور کر دیکھا جیسے کھا جائیں گے اور ساتھ ہی ننھے میاں کو بھی بہت شرمندہ کیا۔ جن کے احساس برتری کو پہلے ہی صدمہ پہونچ چکا تھا۔ چھٹی کے بعد ماں سے اس کی کوئی چغلی کھا کر بیچارے کو پٹوایا اور فاقے کی سزا دلوائی۔

رات کو وہ بھوکا ہی سویا۔ آدھی رات کو بھوک سے آنکھ کھل گئی، اس کو نعمت خانہ میں رکھے ہوئے کھانوں کا خیال آیا سب سو رہے تھے وہ دبے پاؤں اُٹھا۔ چپکے چپکے نعمت خانے تک پہونچا، دروازہ کھولا ہی تھا کہ ماما کی آنکھ کھل گئی، جس نے اُسکے اُسی وقت دو دھپ لگائے،

"لے کمبخت چوری کرے گا، دیکھ صبح کو بیگم صاحبہ سے کیا مرمت بنوائی ہو"

وہ رات بھر بیگم صاحبہ کی مار کے ڈر سے نہ سو سکا اور صبح سویرے کھسک گیا۔

اُس کے دماغ کی اور پیٹ کی اشتہا کا یہ حشر ہوا۔

دن نکلتے اس کی تلاش شروع ہوئی، کہاں گیا؟ کیا ہوا؟ دیکھو اپنے گھر تو نہیں گیا۔ دھونے کو جھوٹے برتن پڑے ہوئے ہیں۔ نہیں۔ کہاں بھاگ گیا۔

اُس کے ماں باپ اپنی غریبی کی طرح اس واقعہ کو بھی کسی آسمانی طاقت کے سر تھوپ کر رو دھو کر بیٹھ رہے۔

11 ایک دو روز بعد اُس کی ماں پچھلے مہینے کی تنخواہ مانگنے آئی۔

"تنخواہ کس مُنہ سے مانگتی ہو، بیٹا جو ہیرے کی لونگ لے کر بھاگ گیا، اُس کو نہیں کہتی کچھ!"

دُکھیا ماں کانپ گئی — ہیرے کی لونگ!

وہ ذہین تھا لیکن اُس کے علم و عمل کے لئے سماج یا ریاست نے کوئی راہ تو سوچی نہیں، اب دیکھئے وہ اپنے لئے خود کون سی راہ نکالتا ہے۔ بھرے ہوئے دریا کے بہاؤ کے لئے اگر کوئی راستہ نہ ملے تو وہ پشتوں اور بند صوبوں کے بہاؤ کو توڑ کر بہہ نکلتا ہی

اُس کے ماں باپ رو دھو کر چپ ہو گئے۔ سماج کو اپنے مخصوص معاشرتی اور سماجی مسئلوں سے زبانی ہمدردی کی بھی مہلت نہ ملی۔ ننھے میاں کے گھر والے بھی تھوڑی سی ڈھونڈ پکار کے بعد پھر ان کی تعلیم میں لگ گئے۔

ننھے میاں روپے اور سفارشوں کی مدد سے آخر ایم۔ اے تک پہونچ گئے۔ آئی۔ سی۔ ایس میں بھی دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد تیسری مرتبہ کامیاب ہوہی گئے، ولایت گئے، خوبصورت شہر دیکھے اور خوبصورت شہر والیاں دیکھیں، ناچ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوئے، خوب کھایا، خوب پیا، ناچے گائے، اور حاکم قوم میں رہ کر حاکم بن کر لوٹے۔

ان کے سامنے روز مقدمے کے لئے پیش ہونے والے جرائم پیشہ لوگ بھی ہوتے اور قرضخواہوں اور سود خواروں کے بوجھ سے دبے ہوئے انسان بھی، زمینداروں کے باقی دار کاشتکار بھی ہوتے اور سیاسی ملزم بھی اور جرائم پیشہ طبقے کی نفسی ترکیب اور قرضداروں اور باقی داروں یا غریب کاشتکاروں کی مجبوری پر نظر کئے بغیر قانون کی رٹی ہوئی دفعات کے زیرِ تحت چھ مہینے، سال بھر، دو سال، تین سال یا اس سے بھی زیادہ جرم کی نوعیت کے مطابق فیصلے سناتے رہے۔ اگر کوئی اِن قانونی دفعات کی زد سے بچ نکلا تو خیر۔

ضلع پرتاب گڑھ میں ان کے تبادلے کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ پورا علاقہ چوری، ڈکیتی اور نقب زنی کی وارادات سے گونج اٹھا
بڑی دوڑ دھوپ کے بعد یہ گروہ گرفتار ہوا، مقدمہ عدالت میں گیا۔
مجسٹریٹ کے سامنے گروہ کا سرغنہ پانچولال ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔
دونوں بچے ایک ہی سے پیدا ہوئے، لیکن ایک کو عدالت کی کرسی ملی اور دوسرے کو ملزموں کا کٹہرا!
اس کو تقدیر کا کھیل سمجھئے یا معاشی نظام کی خرابی!

شاکر علی

بادۂ شیراز

(از رنجور ساغری عظیم آبادی)

مہوشی و پری نظر، عشوہ فروش کافری
مہر لقا و مہ جبیں، اے ہمہ تن ستمگری

عارضِ خوش جمالِ تو، سبزۂ خط و خالِ تو
نرگسِ نیم بازِ تو، بُرد دلم بہ ساحری

ابرِ بہار کاکلت، گُل بہ کنار پیکرت
بادہ بہ جام نرگست، اے ہمہ جانِ دلبری

اے بہ دہانِ تنگ خود، وے بہ نگاہِ مستِ خود
غنچہ بہ غنچہ جامِ مُل، لالہ بہ لالہ ساغری

ساقیِ گلعذارِ من، بر رُخِ تو نثار باد
ایں ہمہ موجِ رنگ و بُو، ایں ہمہ شعر شاعری

کیفِ شراب، سوزِ نے، نغمۂ بلبلِ حزیں
جانِ بہار، روحِ گُل، سازِ حیاتِ پیکری

حوّا کی بیٹی

گناہ اُس کا وہ تھا جب وہ والدین کے کہنے سے اپنی مرضی کے خلاف شادی پر تیار ہوگئی۔ لیکن خیر اُس نے اِن بندھنوں کو جلد ہی توڑ کر سماج کے منہ پر دے مارا۔

سماج میں وہ آوارہ، بدچلن اور بدکار مشہور تھی۔

عورتوں کے ساتھ مرد بھی اس کے چال چلن میں خرابیاں نکالتے، لیکن جب وہ تنہا ملتے تو اس کے روپ اور جوانی کی تعریفیں کرتے!؟

"غضب کی حسین ہے"

"کچھ نہ پوچھو"

"اس کی سوئی ہوئی سی آنکھیں اور بھیگے ہوئے گلابی ہونٹ! اللہ اللہ"

"جسم کتنا پیارا ہے"

"ہاں بے ساختہ ہی چاہتا ہے کہ چپٹا لو"

"وہ کچھ ایسا سنگار بھی تو نہیں کرتی، پھر بھی۔۔"

"پھر بھی سدا بہار ہے"

"بال ہیں جیسے سمندر کے جھاگ"

"اور ان کی خوشبو بھی تو نرالی ہے، کس سے مثال دوں، جیسے خشکی کے دنوں میں چکنی زمین پر مینہہ کی دو چار بوندیں پڑ جانے کے بعد ایک خاص قسم کی سوندھی سوندھی خوشبو نکلتی ہے"

"عورت کیا ہے ناگن ہے بجلی ہے"

"ناگن، بجلی، بالکل ٹھیک، ایسی ناگن جو جسم کے گرد گھر اڈال کر لپٹ جائے۔ ایسی بجلی جو ہاتھ لگانے پر جھٹکا نہیں دیتی بلکہ چپکا لیتی ہے"

انکی آنکھیں بن پیئے ہی چڑھ جاتیں اور یہ سب ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے!؟

اپنے شوہر سے علیحدگی کے دن اس نے اپنی ڈائری میں یہ سطور لکھی تھیں۔

"زندگی اُس سپاٹ سڑک کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کے ہر موڑ اور ہر چوراہے پر پولیس مین کھڑا ہوا اور جس طرف ہاتھ کا اشارہ کردے ہم جانے پر مجبور ہو جائیں، جو کوئی اس کے خلاف کرے اس کا نتیجہ! چالان، تھانہ، عدالت اور بدنامی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں

بھی اس سڑک پر بغیر سوچے ہوئے دوڑتی پھروں اور بغیر اپنی مرضی کے دائیں یا بائیں موڑ دی جاؤں، بغیر یہ جانے ہوئے کہ مجھے کہاں جانا ہے اور راہ کہاں ختم ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سپاٹ سڑک کے نیچے اتر کر دیکھوں۔ کانٹوں اور جھاڑیوں میں الجھتی اور ان سے دامن چھڑاتی ہوئی، گھاٹیوں میں گرتی اور ان کو عبور کرتی ہوئی ممکن ہے میں اپنے نفسی اور انفرادی رجحان کے مطابق کسی منزل پر پہنچ جاؤں، یہ ضرور ہے کہ کانٹوں میں الجھنا اور آگ میں جھلسنا پڑے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں انہیں کانٹوں میں الجھ کر اور اسی آگ میں جھلس کر رہ جاؤں، کسی ایسے بھنور میں پھنس جاؤں جو مجھے ساحل تک لیجانے کی بجائے تہ میں بٹھا کر ڈبو دے۔ اس میں یہ تو اطمینان ہوگا کہ میں نے جستجو کی پر پتہ نہ ملا، یہ تو نہیں کہ آپ پر بھروسہ کرنے کے بجائے دوسرے کے کہنے پر چلی تھی اس لئے کھو گئی۔"

"موت اس زندگی سے بہتر ہے جو اپنے آپ کو کھو کر حاصل ہو، یہ گناہ اس پاکدامنی سے بہتر ہے جس میں انسان اپنی انفرادیت کھو بیٹھے۔

بعض وقت وہ مردوں سے بہت قریب آجاتی، کمر کے گرد ہاتھ پڑ جاتے وہ بھی ان کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے خلال کرنے لگتی۔ لب اتنے قریب ہو جاتے کہ سانسیں آپس میں ملنے لگتیں، لیکن جیسے ہی وہ لبوں پر لب رکھنے کے لئے جھکتے وہ بجلی کی طرح تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل جاتی اور سامنے کھڑی ہو کر فتحمندی سے مسکرانے لگتی۔ وہ اتنا آسان شکار نہ تھی جتنا مردوں نے اسے سمجھ رکھا تھا

ایمان دار لوگ اس سے شادی کی درخواستیں بھی کرتے، جو بڑے سے بڑے کام کو مذہب، قانون اور اخلاق کی چاشنی دیکر انجام دیتے ہیں تاکہ اپنے ضمیر کو کسی نہ کسی طرح جھٹلا سکیں۔ چوری اور ڈاکہ، سود اور تجارت کی شکل میں جو قانوناً جائز ہے۔ زنا شادی اور طلاق کی آڑ میں جو شریعت میں واجب اور حلال ہے۔

"تم میرے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟" ایک سنی مسلمان نے اس سے دریافت کیا۔

"شادی، آپ مسلمان ہیں اور میرا نام بھی اسی قسم کا ہے، ہو جائے، اچھا ہی ہے نا؟ وہ مسکرا کر بولی" لیکن دیکھئے تو عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جب کپڑے پھٹنے لگتے یا آپ جیسے ساہوکار اپنے پرانے اور بار بار کے پہنے ہوئے لباسوں سے اکتا جاتے ہیں تب وہ نئے کپڑے بنانے کا خیال کرنے لگتے ہیں۔"

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں، انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"تم کہتے ہو میں سمجھا نہیں،" اس نے غصہ سے کہا "تم کیسے سمجھو گے، لیکن میں سمجھاؤں گی، سنو تم نے عورت کو بھی پہننے کے کپڑوں کی طرح بنا دیا ہے جو تمھاری موسمی اور وقتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صندوقوں اور الماریوں میں بند رہتے ہیں، کیا عورت کی یہی وقعت ہے کہ وہ بھی ان کپڑوں کی طرح گھر کی چار دیواری میں پڑی اپنی باری کا انتظار کرتی رہے اور تم اپنے صندوقوں کی چابیوں کی طرح نکاح نامے لئے پھرتے ہو تاکہ جب چاہو اور جسے چاہو آسانی کے ساتھ استعمال کر سکو اسی طرح جیسے تم ٹوپی اچکن اور جوتا استعمال کرتے ہو کہ آج یہ پہننا ہے تو کل وہ۔ کیا مجھے بھی اسی صندوق میں، اسی پنجرے میں بند کرنا چاہتے ہو، مگر میرا نمبر کونسا ہوگا تیسرا یا چوتھا؟"

وہ خاموش رہا۔

وہ پھر بولی۔ "اگر شادی کی وضاحت کے بجائے تم یہ کہتے کہ آج رات کو تم...... تو میں تمھاری جرأت اور صفائی کی داد

دیتی لیکن اب ———؟
وہ اسی قسم کی گھاٹیوں سے نکلتی، کانٹوں اور جھاڑیوں سے دامن بچاتی اپنی ایک علیحدہ راہ پر چلی جا رہی تھی بعض بعض جگہ سفر میں ایسے کٹھن مقام بھی آئے کہ اندیشہ ہو گیا وہ اب نہ پہنچ سکے گی، لیکن وہ صرف ڈگمگا کر سنبھل گئی۔

ایک مخلوط پارٹی کا ذکر ہے جس میں وہ بھی مدعو تھی۔
عورتوں اور مردوں کا بہت ستھرا جمگھٹا تھا، عورتوں کی ریشمی ساریاں، نرم و گداز جسم، چمکتی ہوئی باہیں، لوچ دار کمریں، مردوں کے اُجلے اُجلے لباس، پھر ان مردوں اور عورتوں کی مسکراہٹیں، سرگوشیاں اور چہچہے۔ اک بہار کا سا موسم تھا۔
عورتیں اُس کو دیکھ کر جلی جا رہی تھیں لیکن مرد اُس پر فریفتہ ہوئے جا رہے تھے وہاں سب سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی، اسی ہنسنے ہنسانے میں اُس کی نظر ایک دُبلے پتلے سے آدمی پر پڑی جو سب سے الگ تھلگ اجنبیوں کی طرح بیٹھا بے نیازی سے سگار کا دھواں اُڑا رہا تھا۔
کتنا غیر دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے؟ اس نے اپنے دل میں کہا اور وہ پھر باتوں میں مشغول ہو گئی، اسی دوران میں ایک آدھ مرتبہ اُس کی نظر پھر اس پر پڑی تو اس کے پریشان بالوں اور اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی کشش کا احساس ہوا لیکن پارٹی کے ختم ہو جانے پر جب لوگ جانے کا ارادہ کر رہے تھے اس کے لئے اس شخص کی ہستی جنگل کی اندھیری رات میں دور سے دکھائی دینے والی روشنی کی طرح ثابت ہوئی جو جتنی قریب آتی جاتی ہے زیادہ تیز اور چمکدار ہوتی ہے۔
وہ بے ساختہ اُٹھ کر سیدھی اس کی طرف چل دی، اُسے دیکھ کر وہ اس طرح مسکرایا جیسے وہ بھی اس کا منتظر تھا۔
اُس نے اجنبی سے کہا۔ "مجھے عورتیں آوارہ اور مرد موہنی کہتے ہیں"
5 "اور میں ساری دنیا کے لئے گمنام ہوں" اجنبی نے مسکرا کر کہا۔
"لیکن میں ڈھونڈ لوں گی"
"دیکھئے کوشش کیجئے"
عورتیں اور مرد سب اُن کو گھور رہے تھے۔

آخر ان دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا، اور اب وہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے، ساری سماج میں خوب خوب چہ میگوئیاں ہوئیں، مردوں نے سرد آہیں بھریں اور عورتوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کی راہ کا روڑا صاف ہوا۔
اُس کی ایک سہیلی نے اس سے پوچھا "تمہاری بھی کیا پسند ہے کس سوکھے سے آدمی پر مٹی ہو"
"سوکھے سے آدمی پر" اُس نے ہنس کر کہا۔ "ہری اور پھول دار ٹہنیاں تو صرف گلدانوں کی سجاوٹ کے لئے ہیں لیکن یہ سوکھی اور خشک لکڑیاں جاڑے کی خوفناک راتوں میں جسم میں گرمی اور زندگی پہنچانے کے کام آتی ہیں، مجھے زندگی اسی سوکھی لکڑی کے ساتھ گذارنی ہے جو زندگی کے بوجھ سے خم نہیں کھاتی۔ ہاں زیادہ دباؤ پڑنے سے ٹوٹ جاتی ہے!"

لیکن شادی کا گناہ اُس سے پھر سرزد نہ ہوا

شاکر علی

فیس

مختصر کہانی ———— فرید مچھلی شہری

ڈاکٹر صاحبہ کو ٹیلیفون پر بلاؤ - فوراً - جلدی" میں نے اُس کرخت بیلو کے جواب میں کہا، جس نے میرا ٹیلیفون سُنا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے رسیور مضبوطی سے پکڑ لیا، تھوڑی دیر میں میرا ہاتھ پسیج گیا۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ سارا جسم بیچارگی میں کانپنے لگا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ وقت تیزی سے گزرتا معلوم ہُوا۔ دو منٹ دو گھنٹے سے معلوم ہونے لگے۔ ٹیلیفون میں ٹِک ٹِک کی آواز کرخت ہوتی گئی۔ ڈاکٹر کے کمرہ کی گھڑی کی آواز ہو گی۔ سُنتے سُنتے مجھے تھوڑی ہی دیر میں اُلجھن ہونے لگی، جھنا جھن، کھنا کھن کی آوازیں گونجیں۔ کان بج گیا۔ کوئی چیز کمرہ میں گری ہو گی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میرا دل یکایک چیخ پڑا اور چیخ کر ٹوٹ گیا۔ پھر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی جیسے کسی نے دروازہ کے شیشہ کو پتھر مار کر چکنا چور کر دیا، میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا دھلے ہوئے شیشے بدستور چمک رہے تھے کمرہ میں اکیلا رہ گیا تھا، دفتر کے سارے بابو ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔ میں نے پیر زمین پر پٹکے، بھلا کر اُٹھ کھڑا ہُوا، دیوار میں لگی گھڑی پر نظر کی۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ کمبخت ڈاکٹر سو گیا ہو گا جن صاحب نے ہیلو کہا تھا انھیں میری گھبرائی ہوئی التجا، فوراً اور جلدی کا بھی خیال نہ ہوا۔ یکایک قدموں کی آواز آئی، اونچی اونچی ایڑیوں کی چٹاخ پٹاخ میرے کانوں میں بجی۔ کسی نے دوسری طرف رسیور اُٹھایا۔ میں نے بے اختیار ہو کر خود ہی کہا۔ ڈاکٹر صاحبہ۔ میں ڈاکٹر . . . . . سے بولنا چاہتا ہوں۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ڈاکٹر خود بول رہی تھی . . . . . معاف کیجیے، میں چائے پی رہی تھی، دو چار دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہئے کہئے کیا بات ہے، آپ کون ہیں۔ بابو جی آپ ہیں؟ جی۔ میں کبھی ضرور آئیے۔ کل رات کی فیس دس روپے لیتے آئیے گا، جی میری رات کی فیس دس روپے ہے، آپ کی بیوی کی حالت بہت خراب ہے نہیں، میرے آنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ میری فیس لے کر آجائیے، میں نسخہ لکھ دوں گی۔ جی، نسخہ کافی ہو گا۔ انجکشن۔ انجکشن سے یقینی فائدہ ہو گا۔ اُمید تو کچھ نہیں ہے پھر بھی انجکشن دینا چاہیے۔ انجکشن کی قیمت؟ پہلے میری فیس لے آئیے . . . . . بیہودہ نے ٹیلیفون کاٹ دیا۔ دس روپے! دس روپے، پہلے میری فیس لے آئیے۔

اندھیرا میری آنکھوں میں چھا گیا۔ زمین قدموں سے نکلتی معلوم ہوئی۔ سارا بدن ٹھنڈا ہو گیا۔ دس روپے مانگتی ہے۔ علاج شروع کرنے سے پہلے اپنی رات کی فیس مانگتی ہے۔ کس بات کی فیس؟ چھ بجے شام کو بلایا۔ گیارہ بجے رات کو آئی۔ ڈانس میں گئی تھی۔ جلدی نہ آسکی۔ مریضہ کو دیکھتے ہی بولی۔ اُونہوں، ایک فیصدی بھی اُمید نہیں۔ آخری وقت آگیا۔ علاج سے فائدہ، نسخہ بھی نہیں لکھا اور چلی گئی۔ رات بھر میری بیوی درد و کرب میں تڑپتی رہی، ڈکراتی رہی، ہڈیوں کا ڈھانچہ ساری رات "کرکراتا رہا۔ پھر بھی دس روپے مانگتی ہے۔ انجکشن سے یقینی فائدہ ہو گا۔ لیکن انجکشن سے پہلے رات کی فیس مہیا ہونی چاہیے۔ شہر میں کوئی دوسرا ڈاکٹر اس مرض کا نہیں، یا اللہ کیا کروں، کہاں سے روپے لاؤں۔ چار برس روپے پانی کی طرح بہائے۔ دس روپے نہیں دس ہزار خرچ کر دیئے۔ مہاجن سے قرض لیا

زیور گروی رکھے، دوائیاں اُدھار لیں، کھانے پینے کی چیزوں کے لئے بھی اکاونٹ کھول لیا۔ مہینے دیکھتے دیکھتے گزر گئے۔ دوکان والوں کو بھی اعتبار نہ رہا۔ آدمی تنخواہ قرضخواہوں کی نذر ہو گئی، پھر بھی علاج خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ اب یہ نئی ڈاکٹر جو دن جرمنی سے آکر اس شہر میں بسی ہے۔ اس مرض کی سب سے بڑی ماہر ہے لیکن بابو کی بیوی کے علاج پر وہ اس کو ترجیح دیتی ہے۔ انجکشن کرنے سے پہلے رات کی فیس چاہتی ہے۔

فیس اگر مہیا کر بھی دوں، کیا خبر کہ اس وقت انجکشن کی قیمت پیشگی چاہے گی۔ لیکن اگر دس روپے ہاتھ میں پکڑا دوں شاید رحم کھائے شاید اسی وقت اکاونٹ کھولنے پر راضی ہو جائے، سارے دوکان دار اکاونٹ کھول لیتے ہیں پھر یہ ڈاکٹر بل بھیجنے پر کیوں نہیں راضی ہوتی یہ ڈاکٹری عام دوکان داری سے الگ تو نہیں۔

مگر بابو کی بیوی کا علاج ہے۔ جانتی ہے کہ تیس روپے تنخواہ والا بابو شاید بل نہ ادا کر سکے اس لئے پیشگی چاہتی ہے۔ مریضہ کی نازک حالت سے بے حس ہے، ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی پتھر دل ہے، جانتی ہے کہ مریضہ بچے گی نہیں، اگر مر گئی شاید بابو فیس دینے سے انکار کر دے اس لئے پیشگی فیس کی رقم کا مطالبہ کرتی ہے۔ اچھے اچھے فراک، ڈانس، سینما، شراب و کباب کے لئے ٹوٹتے ہوئے سانس پر بھی بیوپار کرتی ہے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ..... چھ بج گئے۔ اُف، مجھے اب کچھ کرنا ہی چاہئے۔ بیوی گھر میں تڑپ رہی ہوگی۔ میں نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ دفتر سے چھٹی لے کر سیدھے ڈاکٹر کے یہاں جاؤں گا اور ڈاکٹر کو لے کر جلدی سے جلدی پہونچوں گا۔ دفتر سے بڑے بابو نے چھٹی نہیں دی۔ ان کو خود چھٹی چاہئے تھی۔ بچے کے مونڈن کا جلسہ تھا اس میں شرکت کرنی بڑے بابو کے لئے ضروری تھی، اور مجھے مرتی ہوئی بیوی کے دلاسے کے لئے چند گھنٹوں کی چھٹی نہ ملی۔ میں نے دفتر کی تجوری پر نظر ڈالی۔ دس نہیں دس ہزار لئے جا سکتے ہیں، پکڑا جاؤں گا، جیل میں سڑا ڈالا جاؤں گا مگر بیوی تو بچ جائے گی ایک رات کی نہیں دس رات کی فیس دی جا سکے گی، ایک انجکشن نہیں دس انجکشن دئے جا سکیں گے، سوکھی ہوئی کایا میں نئی جان آجائے گی۔ میری بیوی بچ جائے گی۔ مگر۔ مگر بُری بات ہے۔ چوری بُری بات ہے۔ مذہب کے خلاف ہے، قانون کے خلاف ہے 17
جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا، اللہ مالک ہے، وہی کارساز ہے۔ روپے کسی سے قرض کیوں نہ لے لوں، میرے ساتھی مجھ پر اب اطمینان نہ کریں اس لئے کہ قرض دیتے دیتے سب تھک گئے ہوں گے، مگر میری بیوی پر تو انہیں ترس آنا چاہئے مجھے کوشش کرنی چاہئے .....

ایک بابو، دوسرا بابو، تیسرا، چوتھا سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ملے۔ کسی نے امید کی روشنی نہ دلائی۔ ریاض جو میری ہی میز پر میرے ساتھ سال بھر سے کام کر رہا ہے گھر پر نہیں ملا، بوڑھی خادمہ نے صرف اتنا کہہ کر دروازہ بھیڑ دیا کہ بابو جی ابھی دفتر سے نہیں آئے، دفتر سے نہیں آئے جھوٹی تعلیم، ہر لیش جسے میں نے کام سکھایا اور جسے غبن کے الزام سے میں نے بچایا اور صاحب سے سفارش کر کے جس کی میں نے جان بچائی، میری التجا اور میرے گڑگڑانے پر مسکرا دیا۔ شیطان۔ میں رو رہا تھا اور وہ مسکرائے جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ سید صاحب! بہت خرچ کر چکے، اب کاہے کو فضول خرچ کرتے ہو۔ تمہاری بیوی میں اب دھرا کیا ہے، جوانی خاک میں مل گئی، لاکھ جتن کرو، وہ اب بچے گی نہیں ..... میں اس کے منہ پر تھوک کر چلا آیا۔ جیکب بابو گھر سے اسوقت نکلے، جب دروازہ پیٹ پیٹ کر میں نے سارے گھر کو لرزہ میں ڈال دیا۔ میں سب کچھ کہہ گیا پھر بھی کچھ نہ سمجھے، شراب کے نشہ میں جھومتے تھے، ہاتھ پکڑ کر بولے "جانِ من کیوں غم کرتے ہو، آؤ پئیں سارا غم دور ہو جائے گا" میں ہاتھ جھٹک کر چلا گیا۔

بڑے بابو کے یہاں گیا کہ شاید وہی دیا کھائیں۔ لالہ جی دھوتی باندھے، ننگے بدن، جنیوء سے کھیلتے، توند پر ہاتھ پھیرتے مشکل سے سیڑھیوں سے اترے، ہمدردی سے سنا، اندر گئے، دیر میں نکلے۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں کام بن گیا۔ لالہ جی روپے ضرور دے دیں گے مگر آتے ہی بولے، "بھائی سید صاحب لالائن سے جب میں نے آپ کا قصہ کہا رونے لگی اور کہا کہ سید صاحب سے کہو معاف کریں۔ للن کی بہو صبح ہی گئی ہے جو نقدی تھی اس کے ساتھ کر دی ورنہ سید صاحب کو ضرور دے دیتی۔ بھائی اب میں کیا کروں، تم تو جانتے ہو کہ ہم بھی بکی ہیں"

آج لالائن ہلا رہے ہے، کل کیلاش، کبھی اِس کی دوا، کبھی اُس کی دارو، ...... وہ بولے ہی جا رہے تھے۔ مگر میں اُلٹے پاؤں واپس ہو گ
لالہ جی جن کی توند رشوت لیتے لیتے اتنی پھول گئی ہے جن کے ہزاروں بینک میں ہیں، ایسی باتیں کریں !؟ ... اب سات بج چکے
رہی سہی اُمید بھی گھنگھور دنیا کی گھن گرج میں مٹتی جا رہی تھی۔ یکایک خیال آیا کہ شاہ صاحب سے کہوں وہ ضرور مدد کریں گے۔ شاہ صاحب
یہاں گیا تو وہ مراقبہ میں ملے۔ دو گھنٹے ہو گئے اور انھوں نے سر نہ اُٹھایا۔ پہلے تو جرأت نہ ہوئی۔ پھر آخر تنگ آ کر میں نے انھیں پکارا ہی
آنکھیں نکال کر شاہ صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا، مجھے دیکھتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ دس ا برس سے میں ان کا مرید تھا۔ جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے
کئی سو ان کی نذر کر دئے تھے ایسے بھولے مرید پر کیسے برس پڑتے۔ دھیمی آواز میں بولے۔ سید صاحب پریشان معلوم ہوتے ہو میں نے ابھی
کی حالت میں دیکھا کہ تمھاری بیوی اچھی ہو رہی ہے حضرت پیران پیر کی نیاز دلاؤ، جلدی اُٹھ کھڑی ہو گی۔ اللہ شافی اور کافی ہے
جل کر کہا۔ حضور اس وقت دس روپے لینے آیا ہوں۔ ڈاکٹر کی فیس ہے اس کے بغیر ڈاکٹر انجکشن نہ دے گی۔ نیاز بہت دلائی
یہ علاج بھی کر کے دیکھ لوں۔ بس میرا اتنا کہنا تھا کہ برس پڑے، گرج کر بولے۔ "کمبخت جا۔ نظر سے دور ہو۔ پیران پیر کی نیاز پر ڈاکٹر کے علاج
ترجیح دیتا ہے" میری آنکھیں کھلیں۔ یہی وہ پیر صاحب تھے جن کے قدموں کی خاک دس برس میں نے چاٹی۔ جن کے غسل کا پانی میں نے
رات دن جن کی خدمت میں نے کی ۔ اپنے اوپر لاحول پڑھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب صرف دو راستے باقی رہ گئے تھے۔ انجمن اسلامیہ کے صد
خانصاحب اور شہر کے مشہور رئیس کپڑے کی مل کے مالک سیٹھ ...... خانصاحب جنکے بچوں کو پورے سال بھر میں نے پڑھایا تھا منہ پھلا کر
اتنا بولے کہ اتنی گئی رات کو وہ روپیہ کا انتظام نہیں کر سکتے، البتہ وہ اپنے خاص حکیم صاحب کو میرے گھر بھیج سکتے ہیں۔ حالانکہ اسی وقت ان کے
نوکر کی اُڑتی ہوئی آواز میں نے سُنی کہ بائی جی تشریف لے آئی ہیں۔ ابھی وہ ڈاکٹری علاج کا لکچر دے ہی رہے تھے کہ میں اُن کے پاس سے
بھی اُٹھ کھڑا ہوا سیٹھ ... جن کے مل میں عمر کا کافی حصہ میں نے منیم کی حیثیت سے گذارا تھا جنکے ہزاروں نوٹ میرے ہاتھوں میں چکر لگاتے
۱۱۸ رہتے تھے ...... نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں چور ہوں، ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ پر بجلی گر گئی۔ میں اُن کے پیروں پر گر پڑا ...
بے اختیار رو دیا، وہ چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر آواز دی "بیلا! ارے بیلا، چل، جلدی آ" نوکر دوڑا ہوا آیا۔ کہنے لگے جا بیوی جی سے
کہہ کہ پرانے منیم جی آئے ہیں۔ ان کی بیوی بہت بیمار ہیں، بیچارے پریشان ہیں، روپیہ مانگتے ہیں۔ ڈاکٹری فیس ...... بیلا صرف اتنا سنا
بھاگا۔ بیلا کی میں لپٹے راج میں بہت مدد کیا کرتا تھا بیچارہ بہت خیال کرتا تھا۔ ان دنوں بھی میری بیوی کی خیریت پوچھنے روز ایک چکر
لگا جاتا تھا، اُسے سب معلوم تھا، اُس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں واپس آیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں
گیا۔ اُس نے پہلے بھی کہا تھا بیوی جی سے ایک بار جب اُس نے میری بیوی کی بیماری کا ذکر کیا تھا وہ بہت خفا ہوئی تھیں اور اُسے منع کیا
تھا کہ وہ میرے یہاں جانا چھوڑ دے۔ دق کی بیماری کی چھوت بڑی گہری ہوتی ہے۔ لگتی ہے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بہو رانی نے میرا ان کے محل
جانا اچھا نہ سمجھا۔ خصوصاً ان کے پتی سے میرا بات کرنا انھیں اور بُرا لگا ہو گا۔ بیچارہ بیلا گڑ گڑ رہا تھا، سونے اور جواہرات میں منڈھی ہوئی بیوی
کے پاس سے بھی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ دق! اچھوت بیوی جی کی بہن بھی دق میں مبتلا رہیں، روپیہ تھا ان کے پاس، پہاڑوں پر گئیں
سمندر پار گئیں، اچھی ہو گئیں، ان کی بیماری کے زمانہ میں میری بیوی اور میں نے کیا کم خدمت نہ کی، ہم نے تو ذرا بھی چھوت چھات نہ کی مگر وہ
کی بہن تھیں اور میری بیوی بابو کی بیوی ہیں۔

اب میرے بدن کا جوڑ جوڑ مایوسی کی شکست سے ٹوٹا جا رہا تھا، دھیرے دھیرے میں گھر کی طرف چلا، پورے دس بج رہے تھے،
بیچاری بیوی ڈر رہی ہو گی کہیں مر نہ گئی ہو، فضا سنسناتی معلوم ہوئی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری بیوی کا جنازہ قبرستان کو جا رہا ہو فاختہ شا...
بول رہی ہو گی، میں نے ایسا سنا جیسے کوئی حق سرہ کہہ رہے ہوں، میں بُری طرح ڈر گیا۔ اپنے لانبے سائے کو دیکھا اور ڈرا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا

نہ تھا۔ یکایک مجھے خیال ہوا کہ جب سماج کا برتاؤ ایسا گھنونا ہے تو کیوں نہ سماج کے ساتھ دغا کی جائے کیوں نہ میں چوری کروں، یہ سوچتے ہی قدموں میں نیا خون دوڑنے لگا۔ میں دفتر کی طرف بھاگا۔ دفتر کی ایک کنجی میرے پاس رہتی تھی اس لئے کہ سب سے پہلے دفتر میں ہی پہونچتا تھا میں نے دروازہ کھولا، برآمدہ میں سے قدموں کی چاپ سُنی۔ لالٹین......... کی دھندلی روشنی میں دیکھا۔ شاید چوکیدار ہوگا احساس ضرور ہوا مگر ایک خواب کی طرح دھندلا۔ میں جیتا جاگتا خواب دیکھ رہا تھا۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا تھا کہ مجھے دفتر رات کو آنا پڑا تھا۔ چوکیدار جانتا تھا اس لئے احساس ہوتے ہی ہٹ گیا، میں چوکیدار کے وجود کو بھی تھوڑی دیر میں بھول گیا۔ میں دفتری کے کمرہ میں گیا۔ ہتھوڑی اور ایک کیل لے آیا اور اکاؤنٹنٹ کا... بکس کھول لیا، روپئے پیسے نوٹ، میں نے جلدی سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ڈاکٹر کے مکان کی طرف بھاگا شاید چوکیدار سے دھکا بھی لگا اور اُس کی لالٹین بھی گر پڑی۔ مگر اب امید کی ایک نئی روشنی آنکھوں میں آگئی۔ اب صرف اس کا احساس تھا کہ جلد سے جلد ڈاکٹر کے مکان پر پہونچوں اور ڈاکٹر کی فیس دس روپے اس کے حوالے کردوں پھر اُس کی خوشامد کروں، اُس کے پیروں پر گروں، اُس کے سامنے چیخ چیخ کر رودوں اور اُسے کسی نہ کسی طرح راضی کرکے بیوی کے پاس لے جاؤں، اتنی دیر ہوگئی ہے، بغیر ڈاکٹر کے بیوی کے پاس جانا کسی طرح مناسب نہیں۔

ڈاکٹر کے یہاں پہونچا تو وہ بستر پر جاچکی تھی، نوکر شاید خود ہی جلا ہوا تھا مجھے ہمراز بناتے ہوئے بولا، ارے بابوجی کیا پوچھتے ہو آج ایک نئی..... کو پکڑ لائی ہے، جلدی سونے چلی گئی، مجھے تو حکم دے کر گئی ہے کہ کوئی بھی آئے میں کہہ دوں کہ باہر گئی ہے مگر تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی، میں جاتا ہوں یا دو جگاتا ہوں، زیادہ زیادہ دو چار سُنا دے گی۔ آخر جوان بھی تو اُس............ زیادہ چڑ چڑی گئی تو میں...... پورے آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر لباس بدلے ہوئے نکلی، میں نے آگے بڑھ کر دس کا نوٹ حوالے کیا، بولی بابوجی ایسی بھی کیا تکلیف کرنی تھی، نوٹ نے آخر دل پگھلا دیا۔ میں جو کچھ سوچتا آیا تھا وہی کیا۔ پیروں پر گر پڑا، چیخ چیخ کر رونے لگا اور گڑ گڑا کر التجا کی کہ میری بیوی
119
کو چل کر انجکشن دیدے، بارے اس پر اثر ہوا۔ ناک بھوں تو بہت چڑھائی مگر چلنے پر راضی ہوگئی۔

چلتے چلتے بھی دیر ہوئی، جب ہم گھر پہونچے تو محلہ کے بہت سارے لوگ میرے دروازے پر موجود تھے میں مجمع کو چیرتا پھاڑتا ڈاکٹر کو بھی گھبراہٹ میں گھسیٹتا ہوا بیوی کے پاس لے گیا، وہاں بہت ساری عورتیں جمع تھیں، کچھ رو بھی رہی تھیں مجھے دیکھ کر پردہ والیاں اِدھر اُدھر ہوگئیں میں نے بیوی کے چہرہ پر سے سفید چادر اُٹھائی۔ چادر کی سفید خنکی میں موت کا کنوارپن رچ چکا تھا! ....

....

.... آج صبح مجھے چوری کے الزام میں قابل مجسٹریٹ نے دو برس قید سخت کی سزا سنادی۔

موت کا خوف

(ساغر کی اک تقریر جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو نشر کی گئی)

بیتے ہوئے زمانے کی تیرہ و تار کوٹھری میں، ۱ سال پہلے ایک لمحہ!

پہاڑی برسات کی دوپہر! برسوں پہلے اس بھیگی ہوئی دوپہر کی گود میں یہ ایک لمحہ چپ چاپ پڑا ہے۔ گو اس ماہ و سال کی گرد جمی ہوئی ہے مگر باوجود گرد کے یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جو سوچ و بچار کی طاقت اور طاقت کی رفتار بتاتا ہے۔ موت سے خوف کھانے والوں کے لئے تو یہ اکسیر ہے۔!؟

آیئے اس لمحے کو تصور کی خردبین سے دیکھیں۔ خوب۔ اس ایک لمحہ میں تو مناظر کی دنیا ہے۔ پہاڑ، دریا، بارش! "شملہ کی سرنگوں سے تیز رفتاری کے ساتھ ریل گزر رہی ہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہے۔ ہری بھری پہاڑیوں کا شاداب نگاہوں کو وحشی بنا رہا ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار پہاڑ دیکھ کر ایک اچنبے اور سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ پہاڑ کے غاروں میں گر رہی ہے۔ ایک لمحہ جس میں ریل لڑ بھی گئی اور میں چکرا کر بے ہوش بھی ہو گیا گویا ایک جگ تھا جس میں قیامت گزر گئی۔ ۱۲۰

وہ وادی میں ٹرین اڑا اڑا دھم گری۔ میرا تن گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ماں باپ غم سے پاگل ہو گئے تو ماتم کر رہے ہیں۔ جنازہ قبر میں رکھا گیا۔ دوست عزیز مجھے خاک میں داب کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ قبر کی تنہائی اور میں۔ سوال۔ آتشیں گرز۔ فرشتے۔ عذاب یا اللہ!

اس کے بعد مجھے ہوش نہ تھا۔ کچھ ہوش آیا تو یکایک میں نے سنا۔ ۔

"غالباً یہ صاحبزادے پہلی مرتبہ شملہ جا رہے ہیں —!!

——— کیا میں زندہ ہوں!؟

میں نے خوف زدہ لہجے میں چونک کر پوچھا۔

"یقیناً" ———!

کسی نے جواب دیا۔

——— توبہ توبہ۔ موت کے خوف میں لپٹی ہوئی اس زندگی سے کیا حاصل؟

اُس وقت میرا بچپن تھا ———!

میں ایک کامیاب زندگی کا عظیم الشان نقشہ خیالوں کی جیبوں میں دبائے پھرتا تھا۔ مگر خدا! مجھے اس موت کے خوف کا

میں میری جیبوں سے اس نقشہ کو نکال لیا اور چاک چاک کر دیا، یہ ہے انسان کی نسلی مجبوریوں کی میراث!
بندہ کے مقابلے میں خدا کی جیت کے لئے آخری مورچہ!!
اس وقت تک بالکل محفوظ مورچہ!!

(۲)

چند دن ہوئے کہ میں اور بیسویں صدی کا ایک سائنسداں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ رہے تھے کہ یکایک ایک قلی نے جو اسباب لادے ہوئے بالائی سڑک پر جا رہا تھا ٹھوکر کھائی اور لڑھکتا ہوا دھڑام سے ہماری پگڈنڈی پر گرا۔ گرتے ہی بیچارے نے دم توڑ دیا یہ موت دیکھ کر سائنسداں کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اس نے گھبرا کر ہدایت کی:-
ادھر ہٹ آؤ۔ پہاڑ پر گہرائی کی طرف نہیں چلا کرتے۔

(۳)

اور آگے چلے تو بیسویں صدی کا ایک فلسفی ملا۔ کسی نقطہ پر غور کرتا گم سُم کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ قریب آئے تو سائنسداں نے اُسے قلی کی موت سے آگاہ کیا اور ہم چل دیئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو موت کو مکمل سمجھنے والے فلسفی صاحب پہاڑ سے چمٹے ہوئے نہایت ہوش و حواس کے ساتھ چل رہے تھے۔

(۴)

ذرا اور آگے بڑھے تو ایک چٹان پر بیسویں صدی کا شاعر برفیلی چوٹیوں کو بیٹھا ہوا تاک رہا تھا۔ آیا جو ہوا کا ایک جھونکا تو مصور فطرت کی نئی نظم مع بیاض کے اُڑ گئی۔ بے اختیارانہ شاعر بیاض لینے کے لئے جھپٹا۔ اتفاق سے ٹھوکر لگی۔ اور لڑھکنے لگا۔ کئی قلابازیاں کھانے کے بعد اس نے دیکھا کہ رفاقت کا فرض ادا کرنے کے لئے ایک چٹان بھی دندناتی چلی آ رہی ہے یہ دیکھتے ہی غریب کو یقین ہو گیا کہ کل سورج نکلنے سے پہلے موت اس کا نام "رحمۃ اللہ علیہ" کے رجسٹر میں درج کر دے گی۔ مگر یاد رکھئے موت کے خوف کا آخری لمحہ بھی بچاؤ کی کوشش ہوتا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس نے ایک درخت کی شاخ پکڑ لی اور دو تین جھٹکوں کے بعد اس شاخ کے سہارے بڑے لڈتے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔
اس دن کے بعد کبھی اس شاعر کو چٹان سے چوٹیوں کو تاکتے جھانکتے نہیں دیکھا گیا۔

(۵)

اور آگے بڑھے تو دیکھا، ایک پہاڑی حکیم نے چٹان کی آڑ سے کالا سانپ نکالا اور گٹھیا کے مریض کے سامنے چھوڑ دیا اس نے لہرا کر اپنا پھن اٹھا لیا اور جھومنے لگا۔ وہ گٹھیا کا مریض جو چل پھر نہیں سکتا تھا۔ کالے سانپ کے خوف سے جو موت کے روپ میں اُسکے سامنے تھا، اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ آدھ گھنٹے تک سانپ کو مریض کے سامنے رکھا گیا۔ بالآخر مریض کو اتنا پسینہ آیا کہ اس کا جوڑ جوڑ کھل گیا اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے اُچک کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔
پہاڑی حکیم چٹان کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اس نے کہا۔
"حضرات! موت کا خوف گٹھیا کے مریض کے لئے نہایت اکسیر ہے۔ یہ بڑی مصیبت چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کا بند بند کھول دیتی ہے"

(۶)

ذرا اور آگے بڑھے تو بیسویں صدی کے ایک بزرگ وعظ کہہ رہے تھے جس کا لب لباب تھا کہ "موت کو ہر وقت حاضر و ناظر جانو

(۷)

کچھ اور آگے بڑھے تو ایک صاحب واکھیان کر رہے تھے۔ "شریر کے چولے کو اُتارے بغیر شانتی ممکن نہیں"

(۸)

میں نے اپنے سائنسداں دوست سے کہا بھئی بہت تھک گئے ——— ذرا کہیں دم تو لو۔

آؤ لائبریری میں چل کر بیٹھیں۔ مگر کتابوں کو پڑھتے وقت کبھی اپنا لب کتاب کے اوراق پر نہیں لگانا چاہئے۔ پڑھنے والوں میں ہر قسم کے مریض ہوتے ہیں، ان کی سانسوں سے طرح طرح کے جراثیم اُڑ کر صفحوں پر جم جاتے ہیں پھر اُنگلی کے ذریعہ وہ تمہاری زبان پر پہونچ جاتے ہیں اور اس کے بعد معدہ اور معدہ کی خرابی موت ہی۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں لائبریری میں پہونچ گئے۔ میں نے اک کتاب اٹھائی، ایک صفحہ پر لکھا تھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

دوسری کتاب نکالی پہلے ہی صفحہ پر تحریر تھا ؎

کہتے ہیں جسے موت سب اس دارِ فنا میں
دُھندلا سا تخیل ہے مری بے خبری کا

ایک کے خیال میں موت زندگی کے دکھوں کا علاج ہے، مگر دوسرا موت کو اپنی بے خبری کے تخیل سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ پہلے کا تو ذکر ہی کیا مگر دوسرے کا واقعہ سُننے کے قابل ہے۔

(۹)

خود انھیں حضرت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ تقریباً چار ہزار فسادیوں میں گھر گئے تھے۔ جب اینٹوں اور لاٹھیوں کی بارش نے مضبوط اور قیمتی موٹر کار چکنا چور ہو گئی اور یہ سر سے پاؤں تک گُلِ زار تو سوائے موت کے خوف اور اپنی جان کی حفاظت کے دنیا کی پیاری سے پیاری چیز کا خیال بھی دل و دماغ میں نہیں تھا۔

میں نے تیسری کتاب بھی الماری سے نکالی جس کے اوراق پر بڑے حروف میں لکھا تھا:-

موت کا خوف انسانی بزدلی ہے اور بزدل کبھی بہادر و فیاض نہیں ہو سکتا۔

سائنسداں دوست نے کہا آؤ کتابیں پڑھنے کا وقت نہیں ہو بات یہ ہے۔

انسان کی روحانی زندگی کا دارومدار دنیا سے بیزاری اور مرنے کے بعد ایک شانت زندگی حاصل کرنے کی اُمید پر ہے۔ موت ایک پُل ہے جس پر سے روح گذر کر نیستی ——— اور نیستی سے غیر فانی زندگی کی دنیا میں پہونچتی ہے۔ یہ بنیادی خیال چاہے قدما مشرق ایشیا میں ہو یا طرار مغرب میں۔ مگر اس خیال نے انسان کے دل و دماغ پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں مان سکتا ہوں کہ عام انسانی فطرت نامعلوم چیزوں کے خیال سے خوف کھاتی ہے اور خاصکر موت کا خوف آدمی کی کمزور فطرت پر چھایا ہوا ہے۔ تم جانتے نہیں موت کے خوف نے روحانی فلسفوں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ لیکن انسان کے دماغ کو اگر مرنے کے بعد کی زندگی اور سزا و جزا کے خیال سے آزادی نصیب ہو جائے تو موت کا خوف اتنی سختی سے باقی رہ نہیں سکتا۔ پھر عارضی زندگی کی مسرتوں کی قیمت بھی بڑھ جا سکتی ہے۔

سائنسداں یہ وعظ کہہ ہی رہا تھا کہ گلی میں سے ایک پاگل کتا خون آلود جبڑے کھولے نمودار ہوا۔ اُس نے اُچھل کر میرے دوست

کی ٹانگوں پر حملہ کیا، سائنسداں مضبوط اور بہادر آدمی تھا اُس نے اپنی پہاڑی چھڑی سے کُتے کے حملوں کو روکا۔ میرے ساتھ دوسرے کو بھی "بیچ بچاؤ" میں کافی ہوشیاری سے کام لینا پڑا۔ آخر کتے کو پھندے کے ذریعے گرفتار کر لیا گیا۔ اس حادثہ کے بعد ہم دونوں پسینے میں شرابور ایک چائے خانے میں پہونچے۔ میرا دوست ہانپ رہا تھا۔ سکون ہونے پر اُس نے کہا۔ بڑی خیریت ہوئی بھائی۔!

تم نے اپنی حفاظت کیوں کی؟

بھئی واہ اور کیا موت کے مُنہ میں چلا جاتا۔ —— (اُس نے کہا میں نے اعتراض کیا)

آپ تو سزا جزا کے قائل نہیں —— آپ کو موت کا خوف اِس شدت کے ساتھ کیوں ہے!؟

اِس لئے کہ میں زندہ ہوں —— اور مُردہ ہو سکتا ہوں!؟

میرے دوست نے ہنس کر کہا۔

بڑی خیریت ہو کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے نہیں آیا۔ اگر یہ حضرتِ انسان مستقبل اور موت پر غالب آجائیں تو پھر کسی طاقت سے ڈرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جائے یہ دنیا ایک آن میں ختم ہو جائے۔ سوچو تو کیا تمام انسانی جدوجہد محض سلامتی کی کوشش نہیں ہے؟ ترقی اور تہذیب کے تمام درجے سوائے حفاظت کے اور کچھ نہیں۔ معاشرت اور تمدن کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور رہن سہن میں احتیاطی طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو موت کے ہر وقت پیش آجانے والے خدشہ نے حفاظت خود اختیاری میں کامل اور ماہر کر دیا ہے۔

ورنہ یوں تو انسانی فطرت عجیب چوں چوں کا مُربہ ہے۔ خطروں میں پڑنے کے لئے ہر وقت بے چین مگر موت سے ہر دم خوف زدہ ڈرنا اور نہ ڈرنا، دونوں جذبے ہیں اپنے پُرکھوں سے ورثہ میں ملے ہیں۔

موت سے ڈرنا اِس لئے ضروری ہے کہ موت لازمی ہے اور نہ ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ "انسان" —— بھولکّڑ اور بے نیاز قدرت کا اکیلا بیٹا ہے۔ اگر قدرت جبر یہ موت اور فانی زندگی کے ساتھ انسان کو بھول جانے کا جوہر نہ عطا فرماتی تو پٹ سے ہماری دنیا کا دم نکل جاتا۔

موت سے خوف یعنی زندگی کے لئے بیتابی۔ بس اِسی بیتابی میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے، یہ نیو ہے تمام انسانی ترقیوں کی، جس پر انسانی زندگی کی عمارت اونچی سے اونچی ہوتی چلی گئی۔ خدا یا کسی دوسری طاقت کا خیال جو ہماری زندگی کے تمام کارخانے کی روحِ رواں ہی موت کے خوف کی شاندار پیداوار ہے۔

قریب ہی میز پر ایک بوڑھا مصنف بیٹھا ہوا تھا اُس نے اپنی جگہ بلند آواز میں کہا:۔

میں سُن رہا ہوں، خوب بات ہے۔ مگر موت کے خوف نے جہاں یہ شاندار پیداوار کی ہے۔ انسان کے ارادہ کرنے کی قوت کے پر بھی کاٹ دیئے ہیں۔ پست ہمت اور مایوس بھی کر دیا ہے میرے دوست! موت کا خوف انسان کی پیدائشی مجبوری ہے اور یہ آدمی کی بے چارگی کی ہمیشہ چغلی کھاتا رہتا ہے۔ میرے خیال سے انسان کی باغی روح اور پیدائشی خیر و شر میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اس چغل خور کی ضرورت بھی تھی۔" اب ہم سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں نے بوڑھے مصنف سے کہا:۔

جی ہاں —— کل کیا ہوگا۔؟ آج کی گھڑی ہم سے یہ سوال کرتی ہے اور ہم اُس کا جواب دے نہیں سکتے!؟ دنیا کے سارے جوتشی مل کر حکم لگاتے ہیں۔ زید ساٹھ سال کی عمر میں مر گیا۔ مگر چلتے چلتے زید کو ٹھوکر لگتی ہے اور مر جاتا ہے۔

جب یہ آئے دن کے واقعات ہیں تو جناب خوف کیسے نہ ہو!؟

بھلا بتلایئے تو! سچ ہے بھائی

بوڑھے مصنف نے میری تائید کی۔

بالکل بجا ہے۔ بالکل بجا ہے۔ ارے صاحب! ہمارے سروں پر ہر وقت موت کے خوف کی تلوار مشیت کے عجیب و غریب دھاگے میں بندھی ہوئی لٹکتی رہتی ہے۔ گویا انسان کیا ہے۔ قربانی کا ایک پالتو مینڈھا ہے جسے زندگی بھر موت کے بوچڑ خانے کے خیال میں عمر گزارنی پڑتی ہے!؟

اشرف المخلوق ——— اور قربانی کا مینڈھا!؟ دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ کچھ فرق بھی ہے اِن دونوں جانوروں میں یعنی مینڈھے کو اپنی موت کا علم اور احساس نہیں ہوتا۔ مگر انسان کو مرنے کے یقین کے ساتھ جینا پڑتا ہے ؎

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

بڑی مصیبت ہی بڑی مشکل ہے۔

جو زندگی کے رسیا کسی ارتھی یا جنازے کے یکایک سامنے آجانے تک ہی موت کا خوف کرتے ہیں وہ بھی پیدائشی طور پر موت کے خوف سے آزاد ہیں۔

یہ ٹھیک ہے جنازہ اور ارتھی دیکھ کر شاید وہ نہ ڈریں گے لیکن ۱۰۶ ڈگری پوائنٹ ۴ کے جلتے ہوئے بخار میں اِن حضرات کو موت ناک کی سیدھ میں نظر آتی ہے۔

سائینسداں دوست نے کہا۔

موت کے خوف کے متعلق میری پیشینگوئی ہے کہ دنیا کی دِن دونی ترقی اِس کو مٹا نہیں سکے گی تو کم ضرور کر دے گی۔ جیسے جیسے

۱ انسان قدرت کے بھیدوں کو معلوم کرتا جائے گا اور اپنی حفاظت کی کوشش میں کامیاب ہوتا جائے گا اُسی قدر وہ اِن خدشوں سے آزادی حاصل کرے گا جو اِس وقت تک اِنسان کو کپکپاتے رہتے ہیں، دیکھئے نا۔ انسان بجلی سے ڈرتا تھا مگر بالآخر اُس نے بجلی کو مسخر کر ہی لیا۔ اب بجلی سے فائدہ اٹھانے کا خیال تو انسان کو ہے مگر ———

بوڑھے مصنف نے بات کاٹ کر کہا۔

مگر جناب انسان بجلی کو موت کی خالہ ضرور سمجھتا ہے۔!؟

نہیں نہیں۔ یہ میرا مطلب ہرگز نہیں کہ انسان نے بجلی کی فطرت کو بدل دیا۔ بجلی انسانوں کو جلا سکتی ہے مگر اُسی وقت جب انسان جلنا چاہے تو ظاہر ہے کہ موت کے مقابلے میں جب اتنی کامیابی ہو جائے گی اُس وقت آدمی موت سے ڈرنا بند کر دیں گے۔ انسان اپنے بچاؤ کی کوشش میں برابر لگا ہوا ہے۔ سائینس کی ترقیوں نے اِس پر غور و فکر کے بالکل نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ ارے آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے زمانوں میں جب کسی بستی میں طاعون پھیلتا تھا تو لوگ گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے مگر اب امراض کے علاج اور علاج کے کامیاب طریقوں کی زیادتی نے طاعون سے خوف کو کم کر دیا ہے۔

سائینسداں نے جواب دیا۔ ———

ذرا اور آگے بڑھے ایک جمگھٹ کا تماشا ہو رہا تھا۔

کنارے پر ایک برج تھا۔ بیچ میں ایک بلی۔ بلی سے برج تک تنی ہوئی ڈوری پر نٹ نے چلنا شروع کیا۔ دوسرا نٹ جو جادوگر بنا ہوا تھا اور جسے برج سے بلی تک کے فاصلے کو عبور کرنا تھا۔ برج کے اندر سے نکلا۔ پہلے نٹ کے پاؤں تھرتھرائے اور وہ بلندی سے بیچ بازار میں گر کر

ختم ہو گیا۔ دوسرے نٹ نے چھلانگ ماری اور ڈوری کو عبور کر گیا۔

سائینسداں چلایا :—

دیکھا دوستو! موت ابھی تک اٹل حقیقت ہو مگر جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں وہ ناکام دم توڑتے ہیں اور جو اس سے پنجہ کشی کرتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔

یکایک آسمان ابر آلود ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ زور سے ایک دھماکہ ہوا۔ کہیں بجلی گری۔ ہم میں سے کسی کو کسی کی خبر نہ تھی جب ذرا مطلع صاف ہوا تو مصنف نے سائینسداں سے ہنس کر پوچھا :—

آپ تو نالی میں چھپے تھے نا!؟ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ نالی موٹر سے زیادہ محفوظ جگہ تھی۔

تلخیاں

دوستوں سے اس درجہ قریب مت ہو جاؤ کہ تم رسم و رواج سے بلند ہو کر ان کی فطری کمزوریوں اور طبعی خوفناکیوں کے مشاہدہ و تجربہ کے لئے مجبور کر دئے جاؤ۔ ساغر

قربت محبت کے چہرہ کا نور چھین لیتی ہے۔ بیوی اور شوہر اپنی اپنی کمزوریوں کو ایک دوسرے پر ظاہر کر کے تعلق کی بنیاد ہلا دیتے ہیں اور مجبوریوں کے سہارے جیتے ہیں۔ ساغر

زندگی موت کی تفریح گاہ ہے۔

عورت کا تصور "خدا" ہے اور تجربہ "(؟)"۔

شادی سے پہلے خیال ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر انسانی زندگی ناقص ہے لیکن شادی کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ عورت کے ساتھ اور بھی ناقص ہے۔ ساغر

مشرق کے جسم پر قیامت تک مغربی گاؤن فٹ نہیں ہو سکتا۔ شاید گاؤن کے بجائے جبہ اور عبا میں تراش خراش زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ ساغر

فریب خوردہ انسان کو ابھی تک یہ یقین ہے کہ خوشی کی طرح

غم بھی ہم بانٹنے کی چیز ہے۔ ساغر

موت کے سلسلہ میں کسی کو تسلی دینا اوّل درجہ کی سنگدلی ہے۔ ساغر

علالت کے دوران میں تو رشتہ دار روزانہ دعاؤں کے بنڈل بھیجتے رہتے ہیں، مگر کوئی مر جائے تو مرگ ناگہاں پر بین کرنا ان کو بھول جاتے ہیں۔

---

(۱) حقیقت کہاں ہے!؟ دنیا کی ہر شے اضافی ہے —— سوال کو پھر دہرائیے شاید جواب مل جائے! ساغر

(۲) خورد و نوش اور اسباب کی دنیا میں بلندیوں اور نمناکیوں کو تلاش کرنا اوّل درجہ کی حماقت ہے۔ ساغر

(۳) خردمند تجربہ کرنے سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں مگر آہ تجربہ کی تلخی جوانی کو شیب سے بدل دیتی ہے۔

ساغر

جزا

(لائق علی صاحب شمیم)

وہ نہر کے کنارے اپنی گاگر بھرنے کے لئے بیٹھ گئی اس وقت موجیں دن بھر کی دوادوش اور بھاگ دوڑ سے چُورچُور ہو کر ساحل کے دامن میں میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھیں اور تالاب کا پانی صاف شفاف اور ساکن تھا۔ اس مجموعی منظر سے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ تالاب کی سطح پر چمڑے کا ایک چمکیلا اور جھلک دار بچھونا بچھا ہوا ہے۔ فطری طور پر عورت کے نزدیک دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ دل پسند اور محبوب چیز آئینہ ہے جو اس کی خودبینی اور خود آرائی جیسی زیبا خصلتوں کا دیدہ زیب اور رعنا سامان ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ آج وہ اس چمکدار اور ملائم آئینہ کو اپنے نازک اور حنائی ہاتھوں سے توڑ دینے کا ارادہ کر چکی تھی۔ پہلے اس نے اس آئینہ میں اپنی مقناطیسی نگاہوں کو گردش دینا شروع کیا تو اسے ایک خوبصورت اور خوش منظر چہرہ دکھائی دیا جو سراپا حیرت بنا ہوا مدہوشی کے عالم میں اس کی طرف شیریں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، وہ اس حیرت و مدہوشی کو دیکھ کر مسکرا دی تو وہ بھی مسکرانے لگا کہ میرا افسوں کارگر ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ سب عکس ریزیاں ہیں اس کی اس موہنی صورت کی جس پہ اس کا دہقانی منگیتر دل و جان سے شیدا ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ اس دلآویز منظر سے لطف اٹھاتی رہی۔ دفعتًہ اسے پانی میں اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ ایک اور صورت نظر آئی اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا ایک مرتبہ اس نے ہمت کر کے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ پانی میں پھر غور سے دیکھا تو واقعی اُسے وہاں ایک مرد کی تصویر دکھائی دی وہ بھونچکی سی ہو گئی اور اس پر کچھ خوف و ہراس طاری ہونے لگا۔ لیکن اس نے اس کی تحقیق کا خیال نہ کیا اور منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ آئینہ شکنی کا شغل سوجھا اپنا نازک ہاتھ پانی کی طرف بڑھا لیا۔ گاگر بھری آئینہ ٹوٹ گیا موجیں بیدار ہوئیں اور اس شکست پر کفِ افسوس ملنے لگیں۔ اس نے اس ماتم کدہ پر فاتحانہ نظریں ڈالیں اور گاگر اٹھانے کا ارادہ کیا۔ اب وہ اجنبی جو اس کے پیچھے کھڑا اب تک تمام انداز دلربائی دیکھ رہا تھا آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ میں اس گاگر کے اٹھانے میں آپ کی مدد کروں، اب اس نے اس اجنبی کی طرف توجہ کی اس نے دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور بہت بیش قیمت اور خوشنما کپڑے اس کے جسم پر ہیں طرز و انداز سے شہر کا باشندہ معلوم ہوتا ہے اور یہاں نووارد ہے وہ اس کو نہیں پہچانتی تھی اور نہ اسے اس سے پہلے یہ معلوم تھا کہ زمین کے اس خطہ میں بھی ایسی دلفریب نظر نواز خوش منظر اور موہنی صورتیں پیدا کرنے کی شکتی ہے وہ اس اجنبی کے پہلے چپ چاپ کھڑے سب کچھ دیکھتے رہنے اور پھر سامنے آ کر پریم کی باتیں کہنے سے مشکوک سی ہو گئی اور اس کا چہرہ شرم اور خجالت سے دہکنے لگا۔ اس نے اجنبی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ گاگر سر پر رکھی اور اپنا رستہ لیا۔

جس طرح گلاب کے وہ دو پھول جن کی پتیاں باہم ملی جلی ہوتی ہیں ایک ٹہنی پر پہلے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر ل بڑھتے ہیں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں ان کے خیالوں اور ہیں

بدلیوں کی زینتِ محفل بنتے ہیں اسی طرح سوزاں اور اس کا چچازاد بھائی جلبرت دونوں ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ سوزاں نے بچپن میں جلبرت کے ساتھ دودھ پیا اور لڑکپن اس کے ساتھ کھیل کود کر گذارا، اور جوان ہو کر اس سے پریم کرنے لگی اور ان تینوں زمانوں میں انہیں عجیب قسم کی نشاط و فرحت اور خوش بختی کے جام پر جام ساقیٔ گردوں سے ملتے رہے گویا سوزاں جلبرت کی تمناؤں کی سجی سجائی ایک دلفریب محفل تھی اور جلبرت سوزاں کے ارمانوں کا ایک ہرا بھرا باغ۔ مستقبل قریب کے الٹ پھیر سے بے خبر یہ جوڑا اپنی زندگی میں جس مسلسل اور جانفزا مسرّت سے ہمکنار تھا وہ مسرّت بیش قیمت عربی اور ایرانی گھوڑوں، خوش نما اور خوبصورت گاڑیوں، اونچی اونچی شاہانہ محلسراؤں، ہرے بھرے گلزاروں، صاف ستھرے فرش فروش اور شاندار تخت و تاج سے حاصل کی ہوئی نہ تھی اور ان کی مسرّت و شادمانی کا یہ قابلِ رشک سرور جام و مینا خم و صراحی کی توجہ کا نتیجہ اور چنگ و رباب دف و نے کے دلکش نغموں کا اثر نہ تھا۔ اور ان کی اس سادہ زندگی کی تمام تر دلربا جھلکیاں دمکتے سونے، چمکتے موتی، جڑاؤ ہار، اور قیمتی اور بھڑکدار لباس کے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ سے بالکل خالی اور بیگانہ تھیں کیونکہ وہ دونوں غریب کسان اور مزدور دیہاتی تھے اور اسی لئے وہ ہر بناوٹی اور فانی چمک دمک سے منہ پھیر کر قدرت کے ہر شاہکار سے لطف اٹھاتے تھے۔ سورج کے ڈوبنے اور نکلنے کا دلفریب منظر ان کی مشتاق نگاہوں کو غیر اختیاری طور پر اپنی طرف کھینچ لیتا۔ وہ اس کو پہروں تکتے اور لافانی کیف حاصل کرتے۔ رات کی تاریکی کے بعد آہستہ آہستہ صبح کا نور پھیلتا جاتا اور دن کی روشنی کے بعد رات کی سیاہی کا رفتہ رفتہ عالم پر چھاتا ان دونوں کے لئے لامحدود فرحت اپنے دامن میں رکھتا تھا۔ آسمانی محفل کے چھوٹے بڑے جگمگاتے تاروں سے وہ دونوں اپنی زندگی میں نور اور فرشِ زمین کی دلکش سبزی اور دلفریب ہریالی سے اپنی حیات میں تر و تازگی پیدا کرتے تھے۔ شام کی ہلکی تاریکی میں جب گاؤں کے قریب کے تالاب کا پانی آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہوتا تو اس کے کنارے پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں پر یہ دونوں گھنٹوں کھڑے ہوئے ان پرندوں کے دلنواز نغمے سنا کرتے جو اپنی اپنی بولیوں میں ان کو ان کی محبت بھری سکون سے مالامال اور بناوٹ سے پاک یکجائی زندگی پر صبح و شام مبارکباد دیا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہرے بھرے پیڑوں کی گھنی اور پیاری چھاؤں میں گھاس کے ملائم صاف ستھرے قدرتی بچھونے پر اپنی حسین اور شیریں محفل جماتے اور پہروں اسی لطف میں کھوئے رہتے۔ بے سُری آوازوں میں چیل کوّوں کے فطری گانے بناوٹ سے بھری بولیوں میں ہاریوں اور چرواہوں کے بے تکے گیت پریم رس کی بھری آوازوں میں، چوپایوں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا جنگل کو جانے اور واپس ہونے، ہل چلانے اور کسان کے ہاتھ سے کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے دونوں چرسوں اور گھڑیوں کی صبح و شام آہ و زاری اور فریاد کرنے سے متاثر ہو کر دنیا اور اس کی ساری ہماہمی سے بے خبر کبھی عشق و محبت اور کبھی رنج و غم کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھاتے کبھی، ڈوبتے کبھی اُچھلتے کہیں سے کہیں نکل جاتے تھے۔ اِن دونوں کی زندگی کی ساری خوش بختی اور سعادت کا دارومدار محبت کے اس پاک اور شریفانہ جذبہ پر تھا جس کے جلوے غمگین قلوب کو مسرت سے ہم آغوش کرتے ہیں اور جس کی جھلکیاں بے پر و بال بازوؤں کو قوت پرواز عطا کر دیتی ہیں دونوں خوش نصیب تھے صرف اس لئے وہ محبت کی اس ابدی دولت سے مالامال تھے جو زندگی کی اس کھینچ تان میں ہر کھوئے ہوئے خزانے کا انوکھا عوض اور ہر لٹی ہوئی زندگی کا بہترین بدل ثابت ہوتی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

پریم سمندر کے یہ دونوں ہم عمر اور حسین پجاری اپنی زندگی کی خوبصورت گھڑیاں اسی کیف و سرور سے گذارتے رہے یہاں تک سوزاں کے ساتھ تالاب پر وہ واقعہ پیش آیا۔

فطرتاً عورت مرد کے دل میں گھر کرنے کو اپنا وجود اور روش کی آنکھوں

جگہ پانے کو اپنی زندگی سمجھتی ہے۔ اگر اس پھیلی ہوئی زمین کا گوشہ گوشہ اس کو محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھنے والوں سے خالی ہو جائے یا ٹیڑھی ترچھی پسلیوں کا یہ پنجرہ اس کے تڑپنے والے دلوں کا مسکن نہ ہے تو عورت کے نزدیک اس کا وجود عدم ہو رہے۔ چاہے اس کو عزت و احترام سے دیکھنے والی ان گنت آنکھیں اس کے ارد گرد بچھا جائے، کھڑی ہوں چاہے اس کی مدح و ستائش کرنے والی آوازوں نے دنیا میں شور محشر بپا کر رکھا ہو لیکن اس مجمع میں اس سے منزلوں دور آسمان کی نیلی اور مزین محفل سے ایک چھوٹا سا تارا اسے پیار کی نظروں سے دیکھنے لگے یا وہ اپنی حد نظر سے باہر زمین کے کسی گوشے سے اپنے اشتیاق سے بھری ہوئی ایک مضطربانہ مگر ضعیف آواز سن پائے تو یہ دونوں نئے جذبے اس کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے اور وہ اپنے جسم کی تمام قوتوں کو اس آواز کے سننے اور اس تارے کے دیکھنے میں صرف کر دے گی اور اس کا دل رشک اور سرور کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔

۱۴ سوزاں، اپنی صفات اور فطرت کے اعتبار سے مکمل عورت تھی۔ جب وہ اس اجنبی سے ملاقات کے بعد گھر پہنچی تو اس کا دل خوش اور مطمئن تھا۔ اس کی آنکھیں تمام دنوں سے زیادہ روشن اور ٹھنڈی تھیں۔ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے میں آگیا تھا اور اس کے رخسارے تمتمارہے کے آثار معلوم ہوتے تھے اور اس کی چال میں تکبر اور گھمنڈ کا انداز تھا۔ یہ سب اس لئے نہ تھا کہ اس اجنبی سے محبت کرنے لگی تھی اور اس نئے شوق نے اس پہلے اشتیاق پر غلبہ پا لیا تھا، اور نہ اس لئے کہ اپنی شیریں اور رس بھری زندگی کو اپنے دہقانی منگیتر کے علاوہ کسی اجنبی آدمی کے ساتھ بسر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی بلکہ اس کی اس حالت کا اصل سبب یہ تھا کہ آج اسے سر راہ بے ڈھونڈے ایک ایسی دلیل اپنے حسن و جمال کے بے پناہ اور دلربا ہونے پر ہاتھ آ گئی تھی اسے یہ دلیل دل سے بھائی اور اس کو خود فراموشی کی حالت سے نکال کر اب خود بینی کی اس سطح پر لا کھڑا کیا جہاں سے اس نے اپنے حسن کے تمام کرشمے اور دلفریبیاں ایک نظر میں بے نقاب دیکھ لیں۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ روزانہ اپنی گائے کو لے کر بلا خوف و خطر بے جھجک ایک نامعلوم جذبے کے تحت تالاب پر جانے آنے لگی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ تالاب کو جاتے ہوئے یا وہاں سے واپسی میں سوزاں کو وہی اجنبی ضرور ملتا تھا جس سے اس روز تالاب پر سامنا ہوا تھا اور مزید حیرت اس پر تھی کہ وہ جب کبھی سوزاں کے سامنے پڑتا تو کبھی ایک عجیب انداز میں سلام کرتا کبھی اس کو دیکھ کر بلا وجہ مسکرا دیتا۔ کبھی بے ضرورت ایک فرضی راستہ معلوم کرتا کبھی بے پیاس ایک گھونٹ پانی مانگتا کبھی تازہ بتازہ رنگ برنگ پھولوں کا کوئی گلدستہ بنا کر سوزاں کو نذر دیتا اور کبھی سوزاں سے ایک ایسا محبت آمیز مگر مختصر جملہ کہہ جاتا کہ جس میں اس کے دل کی تمام داستان اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ پوشیدہ ہوتی۔ مگر بھولی سوزاں اپنی سادگی سے اسے نہ سمجھتی مگر اس کے دل میں ایک نامعلوم طرز سے وہ الفاظ کھب جاتے اور اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی۔

زمانہ گزرتا گیا اور ان دونوں کے تعلقات مضبوط ہوتے گئے آخر ایک دن وقت یار کہ جنگل کے درختوں ریگستان کے ذروں اور اسی تالاب کی موجوں نے پہاڑ سے نکلے ہوئے ایک پتھر کے سائے میں سوزاں کو اس اجنبی کے پہلو بہ پہلو تنہائی میں تھوڑی دیر بیٹھے اور پریم بنسی بجاتے دیکھ لیا۔ اسی لمحہ پر گویا سوزاں کی پرانی سادہ دیہاتی زندگی کا اختتام بھی تھا اور نئی رنگین شہری زندگی کا آغاز بھی۔ مگر یہ جوان زمیندار تھا اور ساتھ ہی سرمایہ داری مع اپنے تمام لوازم کے اس پر غالب تھی۔ وہ یہاں چند روز سے اس لئے آیا ہوا تھا کہ اپنی کاشت کی زمینوں کی دیکھ بھال کرے وہ اصل میں شہر "دہ نیس" کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک بڑی زمینداری کا مالک تھا جس کی جاگیر مختلف قصبوں اور گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی جس کی دیکھ بھال کے لئے خود جانا پڑتا تھا اس لئے اپنے آرام کی خاطر جا بجا انہیں مکانات اور ڈیرے بنا رکھے تھے اور سب سے بڑا مکان یا کوٹھی وہ جس نے اس جگہ سے دو گھنٹے کی مسافت پر بنوا لیا تھا جہاں خوش حالی اور سرمایہ دارا

آن بان کے سبب اپنے اردگرد کی آبادیوں اور اس طرف سے گزرنے والے مسافروں میں لال محل کے نام سے مشہور تھا۔ چونکہ اس آراضی کا حصّہ زیادہ سرسبز و شاداب تھا اس لئے اکثر وہ شہر سے یہاں چلا آتا۔ اور اپنے اس محل میں دو چار دن گذار کر پھر "تیس" چلا جاتا تھا۔ اس مرتبہ وہ جب یہاں آیا اور حسبِ معمول سیر کرنے کے لئے تالاب کی طرف چلا جو بڑی فرحت بخش جگہ تھی تو اُس کو وہاں قدرت کا شاہکار حُسن کی دیوی یہ دوشیزہ یعنی سوزاں نظر آئی۔ جس کے حسن نے اس کے ہوش و حواس لوٹ لئے۔ مرکیز نے محسوس کیا کہ میری زندگی اس گلبدن کے بغیر بے کیف اور بے روح رہے گی اس لئے وہ اس کے پا لینے اور حاصل کرنے پر تیار ہو گیا۔ اب اس نے سوزاں کے بھولے بھالے اور سرمایہ دار بھیڑیوں کے ہتھکنڈوں سے ناواقف دل میں جگہ پانے کے لئے اس کے سامنے محبّت کا دیوتا بن کر اپنی ذات کو ایسے سانچے میں ڈھال لیا کہ رس لس سے پریم رَس بوندیں بن بن کر ٹپکنے اور سوزاں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے لگا اور دل کی تڑپ، جلن اور بے قراری سے نکلے ہوئے آنسوؤں کے بے شمار ہاروں سے اس کی گردن اور سینہ کو بھر دیا۔ شہری زندگی کی چمک، بھڑک اور چہل پہل کو ایسی دیدہ زیب اور رنگیلی صورتوں میں سوزاں کے سامنے پیش کیا کہ اس کی بھولی بھالی آنکھوں نے جنت کا دھوکا کھایا اور اس کے حال میں ایسی چمک دمک پیدا کی اور مستقبل میں بڑی بڑی امیدوں کا ایسا دلربا باغ سجایا کہ وہ اُن کے لئے بیقرار ہو گئی مرکیز پر اعتماد کیا اور اس کی فرمانبردار بن گئی اور ہر اس بڑی سے بڑی تقدیر کے آگے سر جھکا دیا جس کے واسطے ہر اس بھولی عورت کو تیار ہونا پڑتا ہے جو ذرا احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور اس کے محافظ غفلت کی گہری نیند میں سرشار ہوں گویا سوزاں نے خود کو خوشی خاطر خونخوار بھیڑیئے کے دانتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

نوجوان جبرٹ ایک دن صبح کو اپنے مقررہ وقت پر خواب سے بیدار ہوا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنی اُس گائے کے پاس گیا جس کے دودھ پر اس کی بڑھیا ماں اور سوزاں کی زندگی کا بڑی حد تک مدار تھا۔ اس کے گلے سے رسّی کھول کر وہ اُسے جنگل کو ساتھ چلنے کے لئے سوزاں کو آواز دی جو روزانہ بالاخانہ پر سویا کرتی تھی وہ دیر تک انتظار کرتا رہا نہ تو سوزاں خود آئی اور نہ اُس نے کوئی جواب دیا۔ جلبرت نے سمجھا کہ شاید نسیم سحر کے بار بار گدگدانے کے باوجود میری عیش و عشرت کی کلی ابھی تک میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہے یہ سوچ کر مکان کی بالائی منزل میں جہاں سوزاں شب کی پُر کیف راتیں گزارا کرتی تھی وہ خود اُس کو جگانے کے لئے جا پہنچا۔ اُس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا جب اُس نے دیکھا کہ سوزاں کا نرم بستر خالی پڑا ہے اور اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ اس نے نیچے اوپر سب جگہ اچھی طرح ڈھونڈا مگر اس انمول موتی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر اس نے اپنی بوڑھی ماں سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ مگر اُس کو تعجب ہوا جب اُس نے اپنی ماں کو بھی اپنی طرح اس معاملہ میں لاعلم پایا۔ اب اسے خیال ہوا کہ شاید کسی ضرورت سے باہر چلی گئی ہو اور کچھ دیر میں لوٹ آئے۔ اب جلبرت نے بے صبری سے سوزاں کا انتظار کرنا شروع کیا۔ جب جلبرت کو سوزاں کا راستہ دیکھتے دیکھتے بہت دیر گذر گئی اور پھر بھی سوزاں واپس نہ ہوئی تو اس کا اضطراب اور بڑھ گیا، کلیجہ مُنہ کو آنے لگا اور دل میں ہزار طرح کے وسوسے اور وسوسے پیدا ہونے لگے۔ آخر اُس نے گائے کو تو اُس کے تھان پر باندھ دیا اور سوزاں کی تلاش میں خاک چھاننے کو گھر سے نکلا گلی کوچوں میں ڈھونڈا، جنگل جنگل تلاش کی، آنے جانے والوں سے پوچھا مگر اپنی زندگی کی شمع یعنی سوزاں کا کہیں پتہ نہ پایا۔ یہاں تک کہ رات کے تاریک اور خوفناک پردے نے اس کی نظر سے وہ راستے بھی چھپا دیئے جن پر ٹھوکریں کھا کر سوزاں نہ ملتی نہ سہی لیکن اس مشغلے سے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ تو بجھا لیتا مجبور ہو کر مصیبت کا مارا اور فلک کا ستایا جلبرت یہ سوچتا ہوا اپنے غمکدہ کی طرف واپس ہوا کہ آج روئے زمین پر مجھ سے زیادہ بدنصیب اور غمزدہ کون ہو گا کہ پہلے تو کاروانِ حیات کی کل پونجی اور بزم عشرت کا تمام سرمایہ اپنی غفلتوں اور لاپرواہیوں سے گنوا بیٹھا اور اب اس کے

کے لئے دنیا مجھے راستہ بھی نہیں دیتی۔

مجھ کو دیکھو اور دیکھنے والے کہوں میں دیدنی
زندگی کٹتی رہی میں ناتواں دیکھا کیا

گھر پہونچ کر اس نے دیکھا کہ اس کی غم زدہ ماں حسرت و افسوس کا مجسمہ بنی ٹوٹے پھوٹے گھر کے ایک کونے میں سر جھکائے ہاتھ میں ایک لکڑی لئے رنج و الم کے عالم میں زمین کرید رہی ہے۔ جلبرت اس کے قریب بیٹھ گیا۔ غمگین ضعیفہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور کہنے لگی۔ بیٹا جلبرت تم کہاں تھے؟ اماں جان سوزاں کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ جلبرت نے کہنا شروع کیا، لیکن جنگل کا چپہ چپہ اور پہاڑ کا ایک ایک حصہ دیکھ لیا مگر پیاری سوزاں کا نشان تک نہ پایا۔ بیٹا تیری زندگی کی بہتری اب اسی میں ہے کہ آج سے سوزاں کا انتظار ترک کر دے، ضعیفہ نے اپنی اشک آلود آنکھوں سے حسرت و غم بھری نگاہیں اپنے رنجیدہ لختِ جگر پر ڈالتے ہوئے کہا، اور اس کی تلاش میں در بدر مارا پھرنے سے باز آ۔

خدا جانے ضعیفہ کے منہ سے نکلے ہوئے یہ بول اپنے اندر کس قدر طویل داستانِ غم پوشیدہ رکھتے تھے کہ اک دم جلبرت کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا۔ اماں جان کیوں؟ ابھی ابھی ہماری پڑوسن میرے پاس آئی تھی۔ جلبرت کی ماں نے کہنا شروع کیا، وہ کہتی تھی کہ میں کئی روز سے سوزاں کو رات کے وقت روزانہ تالاب کی طرف جاتا دیکھتی تھی اور وہاں وہ اس لئے جاتی تھی کہ رات کی تاریک اور عیب پوش فضاؤں میں تالاب کے کنارے پر اُگے ہوئے سبزے کے نرم اور ٹھنڈے بستر پر ایک اجنبی شہری سے ملاقات کرے۔ اس پڑوسن نے جس اجنبی کا حوالہ دیا وہ میرے خیال میں مرکز ہے جو ہماری آس پاس کی آراضی اور اس لال محل کا مالک ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ میں نے کل آدھی رات کے بعد سوزاں کو ایک تیز رفتار سرخ گھوڑے پر مرکز کے پیچھے سوار لال محل کے راستے پر اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا یقین ہے کہ سوزاں مرکز کے ساتھ بھاگ گئی۔ جلبرت نے یہ واردات سن کر دل ہلا دینے والی ایک چیخ ماری اور قریب تھا کہ اس کی روح پرواز کر جاتی لیکن ابھی اس کے حصہ کی اور تکلیفیں باقی تھیں اس نے سنبھلنا چاہا لیکن نہ سنبھل سکا، زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اُف رے بیکسی کس قدر ہوشربا تھا یہ منظر کہ جلبرت کی زندگی پر چڑھتی جوانی میں ڈاکہ ڈالا گیا اور اس کے ارمانوں کے ہرے بھرے باغ پر عین بہار میں خزاں آئی۔ اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ جلبرت اپنے تاریک اور شکستہ گھر میں بے یار و مددگار اور بے مونس و غمگسار پڑا تھا۔ دیکھ اس کی ساری کُل میں صرف بڑھیا ماں تھی وہی غریب صبح تک اپنے نیم مردہ لختِ جگر کو آغوشِ شفقت میں لئے بیٹھی رہی کبھی اس کی بے کسی پر آنسو بہاتی اور کبھی اپنے ڈوپٹے کے آنچل سے اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتی اس شغل میں رات بسر ہوئی۔ صبح کا تارا چمکا، نسیم جاگی، پھول کھلے، چمن مہکا، جلبرت کو ہوش آیا۔ حیران ہو کر اپنے آس پاس کی چیزوں پر نظر ڈالی، اپنے کو مجبور کی حالت میں زمین پر پڑا دیکھا۔ بڑھیا ماں کو روتا اور تڑپتا پایا، اب اسے رات کا تمام واقعہ یاد آگیا۔ اٹھا ہوش و حواس درست کئے اور تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر سر اٹھایا اور محبت کی ماری ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پوچھا اماں تم کیوں رو رہی ہو؟ تیری بیکسی اور اس بے وفا سوزاں کی طوطا چشمی پر رو رہی ہوں بیٹا! ضعیفہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اماں اگر رونا ہے تو روؤ، مگر میری حالت پر نہیں جلبرت نے لاپروائی سے ماں کو مخاطب کیا۔ بلکہ کسی اور پر اس لئے کہ مجھے سوزاں کے چلے جانے کا اب نہ رنج ہے اور نہ اس کی دغا اور بے وفائی پر غم کے آنسو بہاتا ہوں۔ میں اس دوشیزہ پر اس لئے فدا تھا کہ وہ بھی میرے لئے بیقرار تھی۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دل پتھر کی طرح سخت اور فولاد کی مانند مضبوط ہو گیا ہے اب اس میں نہ کسی کی محبت و الفت کی گنجائش اور نہ کسی بغض و عداوت کی سمائی، اب اگر سوزاں جنت کی حور یا پرستان کی پری بن کر فرشتوں کا سا معصوم پیکر بنائے دیویوں کی طرح عزت و حرمت کے خوش رنگ پھول دامن میں بھرے میرے سامنے آئے تو اس کو دیکھنا بھی گوارا نہ کروں یہ کہہ کر اس نے وہ آنسو بھی پونچھ ڈالا جو سوزاں کی یاد اور

تڑپ میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے پلکوں پر بہتا ہوا رخسار تک ڈھلک آیا تھا، اپنی گائے کی طرف چلا، اس کی رسی ہاتھ میں لی اور اس کو لے کر اکیلا چراگاہ کی طرف چل دیا۔

گھر سے چراگاہ تک کا راستہ جلبرت نے عجیب محویت کے عالم میں گزارا، اس دوران میں کبھی اس کی نظروں کے سامنے اس چہکتی چہلی پھولی اور رنگیلی زندگی کا نقشہ آتا جس کو پہلے وہ دائمی خیال کئے ہوئے تھا اور اب جس کا سوگوار تھا اور کبھی اس دوامی اور بھیانک حیات کا خاکہ آتا جس کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ آخر چراگاہ اپنی تمام ان یادگاروں اور آثارِ قدیمہ کے ساتھ آگئی جو جلبرت کی خواب کے ابھرے ہوئے نقوش کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے جو کچھ کہا تھا اس میں اس کے نفس نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے خیال کے پردے پر سوزان کی موہنی صورت اب بھی اپنی تمام و کمال رعنائی اور شانِ محبوبی کے ساتھ مرتسم تھی اور اس کے دل میں سوزان کی محبت کے شعلے اب بھی اسی اگلی شدت اور تیزی کے ساتھ بھڑک رہے تھے لیکن وہ گفتگو نتیجہ تھی۔ ایک ایسے فوری غضب کا جس کے جھیلے میں آکر ایک عاشقِ مہجور اور دور افتادہ شیدائی اپنی راحتِ جاں سے کبھی نہ ملنے کا عہد کر بیٹھے۔ بھولا جلبرت اس وقت یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے وعدہ فراموش سوزان کی محبت سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور دامن چھڑا لیا۔ حالانکہ اس حالت میں بے وفا سوزان کا عشق جلبرت کو پہلے سے زیادہ گھیرے اور دبائے ہوئے تھا۔ مگر جوشِ غضب میں اسے محسوس کچھ اور ہو رہا تھا۔ جب وہ چراگاہ میں پہنچا اور گائے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا تو اس کی توجہات کا مرکز واحد سب سے بڑا سیارہ سورج تھا جو اس سے بہت دور مشرق کی جھاڑیوں اور جھنڈوں سے آہستہ آہستہ اٹھتا، اپنی سرخ اور یاقوتی شعاعوں سے کائنات پر پردۂ شفق اور چمکیلا فرش بچھاتا ظلمت کو مٹاتا، اجالا بڑھاتا، سطحِ زمیں پر نور پھیلاتا، ہرے بھرے سبزہ زاروں کو زیب و زینت دیتا، ریگستان کے ذروں کو جگمگاتا، ریتی کے بے ڈول اور بھونڈے ٹیلوں پر طلاوت بکھیرتا، بدرنگ اور سیاہ پہاڑوں پر ہریالی لٹاتا آسمان سے زمین تک کی پوری فضا کو آئینہ بناتا چلا آتا ہے۔ سب سے زیادہ منور سیارہ کے سامنے چمک دمک کا یہ دلربا منظر فرقت کے ستائے جلبرت کو بہت بھایا۔ اس نے مشرق سے مغرب تک پوری فضا پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اچانک مغربی افق پر اسے ایک بجلی کوندتی معلوم ہوئی جو اپنی چمک سے دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کئے دیتی ہے۔ اس نے یہ سمجھا کہ مشرق کے اس سورج کا مقابلہ کرنے کے لئے مغرب نے بھی ایک سورج چمکا دیا ہے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اس چمکتی بجلی پر نظر کی تو اسے ظاہر ہوا کہ وہ زرد رنگ کے شیشہ کی ایک گول بہت بڑی لوح ہے۔ اور کائنات انہی کی دوسری چیزوں کی طرح سورج نے اس کو بھی جگمگا کر دوسرے سورج یا کوندتی بجلی کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے اپنی نگاہیں اس مصنوعی سورج سے ہٹا لیں اور بیتاب ہو کر اپنا ہاتھ بائیں پسلیوں پر خاص اس جگہ رکھ لیا جو قلب کا مقام ہے گویا اس ترکیب سے وہ دل کی طوفانی کیفیت اور دھڑکن پر قابو پانا چاہتا تھا اور سینہ پھاڑ کر دل کے نکل جانے کو روکنا چاہتا تھا۔ اس کے دل کا سارا اضطراب اور خفقان اس لئے تھا کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ زرد رنگ کے شیشہ کی یہ لوح اسی لال محل کے ایک کمرے میں چمک رہی ہے جس میں اس کا آفتابِ زندگی اپنی تمام و کمال تابانی کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اس کو صاف محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا دل اس کو ان تمام باتوں پر ملامت کر رہا تھا جو اس نے فوری جوش میں سوزان اور اس کی محبت کے بارہ میں اپنی ماں سے کہہ ڈالی تھیں۔ وہ اچھی طرح یہ سمجھ چکا تھا کہ عشق کی وہ خفیف سی چنگاری جو اس کے پہلو میں چمک رہی تھی اس آفتاب کے بعد آگ کے بھڑکنے اور سب کچھ پھونک دینے والے شعلے کی صورت اختیار کر گئی ہے اور نامعلوم طور پر اندر ہی اندر اس کے تن من کو جلائے ڈالتی ہے۔ اس کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کرتی اور بڑھتی چلی جا رہی ہے جیسے کارگاہِ حیات میں موت کی اٹل گھڑی۔

اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ دل میں رنج و غم کا طوفان اٹھا

خونِ جگر کا دریا امنڈ آیا اور آنکھوں کے راستے آنسو بن بن کر بہنے لگا، وہ اس کرب و بے چینی کے ساتھ ہچکی باندھ کر رویا کہ فضائیں ہوائیں مضطرب ہو گئیں، دریا میں موجیں لرزنے لگیں، زمین کا سبزہ کانپ اٹھا، چراگاہوں میں اور تھانوں پر چوپائے حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے۔ خدا جانے اس کے رونے کا یہ سلسلہ کب تک قائم رہتا۔ دفعتہً اس کے کانوں میں بلاؤں کے بے سُرے گانے اور چوپایوں کی بھونڈی آوازیں آنے لگیں، اب اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی اور آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے، اپنی جگہ سے اٹھا اور آس پاس ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر بیٹھ گیا، اپنا سر دونوں گھٹنوں کے بیچ میں رکھ لیا۔ اب اس کے سامنے رنج و غم کا ناپیدا کنار سمندر تھا اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی نیا کو سمندر کے حوالے کیا۔ تغیر و انقلاب کی بھیانک موجیں اٹھیں اور خدا جانے اسے کہاں سے کہاں لے گئیں، آج کے بعد غریب جلبرت کو آرام اور چین نصیب نہ ہوا وہ غم و الم کے دور دراز اور طول طویل راستے طے کرتا آنکھوں میں سوزاں کا نقشہ دل میں اس کا شوق اور زبان پر اس کی یاد لئے ہوئے چند روز الٹ پھیر میں یاس و حسرت کی اس منزل پر جا پہنچا جو زمانے کو برسوں کی مسلسل اور دن رات کی دوا دوش کے باوجود اب تک نہ مل سکی۔ رفتہ رفتہ جلبرت کی یہ حالت ہو گئی کہ جو کوئی اس غم نصیب کو کسی جنگل میں دیکھتا تو فلک کا ستایا، غم کا مارا، برگشتہ نصیب، مجنون، وحشی مجذوب کا ایک انسان تصور کرتا تھا۔ وہ اب ہر مذہب و ملت کے قید و بند سے آزاد تھا وہ سوزاں کے مجسمے کو جو اس کے من مندر کی زینت تھا پوجتا اور اسی شغل میں عمر بسر کرتا تھا۔ وقت ناوقت کا لحاظ کئے بغیر وہ دوپہر کی تپتی دھوپ اور رات کی بھیانک اندھیاری میں جدھر منہ اٹھتا چل بھاگتا۔ دل کی خواہش ہوتی تو گہرے گہرے غاروں میں گھنٹوں چھپا رہتا، جی چاہتا تو نہر کے کنارے بیٹھ کر اس کی موجوں کی دوا دوش کا نظارہ کرتا اور شوق اٹھتا تو اونچے اونچے پہاڑوں سے باہر نکلی ہوئی چٹانوں کے خوشگوار سایہ میں وقت گزار دیتا تھا۔

جلبرت وحشی جانوروں سے اپنے قریبی عزیزوں کی سی محبت اور الفت کرتا اور اگر کوئی آدم زاد اس کے قریب آجاتا تو وحشی جانوروں کی طرح وہ بھاگ جاتا تھا۔ ہرنوں اور نیل گایوں کے ساتھ دریاؤں اور تالابوں پر جاتا اور جب وہ سب اپنی اپنی پیاس بجھا کر واپس ہوتیں تو یہ بھی ان کے غول میں گھرا ہوا واپس لوٹتا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ جلبرت مجنونوں اور دیوانوں کی طرح ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت غیر ارادی طور پر ٹھوکریں کھاتا لال محل کی دیوار کے نیچے جا پہنچتا اس وقت اسے یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن جب اسے ہوش آتا اور اپنی آنکھوں کے سامنے لال محل کی دیواریں کھرے اور گنبد دیکھتا تو تڑپ اٹھتا اور زور سے ایک چیخ مارتا اور لپٹ کر گاؤں کی طرف بے تحاشا بھاگتا اور کسی چیز کو پیٹھ پھیر کر نہ دیکھتا تھا۔ جلبرت حقیقی معنوں میں بے کس و بے بس اور بے سہارا تھا۔ اس کی کل پونجی لے دے کے ایک بڑھیا ماں تھی اور وہ چراغِ سحری۔ اپنے لختِ جگر کی بھری جوانی کو لٹتا دیکھ کر آٹھ پہر آنسو بہاتی تھی اور کفِ افسوس ملتی تھی۔ مگر وہ لاچار تھی کر ہی کیا سکتی تھی جب دل نہ مانتا اور محبت مادری جوش پر آتی تو جلبرت کو دیکھنے کے لئے اس کے واسطے کچھ کھانا لے کر چلتی۔ اور اپنی آنکھوں کے نور کو جنگل جنگل ڈھونڈتی، جگہ جگہ تلاش کرتی، دن دن بھر ماری پھرتی۔ کبھی باوجود اس بھاگ دوڑ کے اس کا مقصود نہ مل سکتا لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ جلبرت کو نہر کے کنارے پتھروں کے ڈھیر میں پڑا پا لیتی یا کسی پہاڑ کی کھوہ میں دنیا اور اس کی تمام دلچسپیوں سے بے خبر کھویا ہوا سا دیکھ لیتی۔ وہ وقت دکھیا ماں کے لئے پیامِ عید ہوتا اور اس کا دل مسرت سے بھر جاتا لیکن وہ غم کس قدر ہوشربا ہوتا تھا جو اس لمحہ بھر کی خوشی کے بعد اس جوانِ رعنا کی تباہی کو محسوس کر کے ضعیفہ کے دل پر طاری ہوتا تھا۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو جاتی اور اس کے رویں رویں سے غم و الم کے زہرہ گداز دریا پھوٹ پڑتے وہ مدہوشی کے عالم میں کھانا وہیں رکھ دیتی اور اشک بھری آنکھوں اور زخم خوردہ دل کے ساتھ کانپتے ہوئے ہاتھ زمین و آسمان کے مالک کے دربار میں اٹھا دیتی اور بلک بلک کر دعا کرتی کہ اے ہر چھوٹی بڑی انقلاب آفریں طاقت کے مالک اور اے دردمندوں کے مددگار اور ستم رسیدوں کے حامی اپنے بندے مصیبت کے عالم میں دکھے ہوئے دلوں کے بہائے ہوئے آنسو تیرے دربار میں آ

درجہ پاتے ہیں۔ میں اپنی تمام عمر کے نالوں، آہوں اور اُن گنت آنسوؤں کے بدلے میں اپنے جگر پارے کو تجھ سے مانگتی ہوں " داتا " میری ضعیفی پر رحم فرما اور میرے لخت جگر کو ایک بار پھر مجھے واپس دے " خدایا " اس کو اتنی سمجھ عطا کر کہ وہ اپنی تباہی و بربادی کا احساس کرے " میرے مالک " مجھ بھکارن کی جھولی بھر دے۔"

روئے اور آنسو بہانے سے اس کا دل کچھ ہلکا ہو جاتا اور پھر اپنے گھر واپس آجاتی۔

رات کا پچھلا پہر ہے اور سوزاں لال محل کی اُس اونچی کھڑکی میں کچھ مغموم سی بیٹھی ہے جہاں سے چاندنی کی چمکیلی صاف اور دُھلی ہوئی شعاعیں سامنے والی نہر پر پڑتی صاف نظر آرہی ہیں۔ کبھی وہ اپنی پیاری بیٹی کے گہوارے پر نظر ڈالتی ہے اور پھر اونچے اور نیلگوں آسمان کو دیکھنے لگتی ہے۔ اس وقت چودھویں کا پورا اور چمکدار چاند اپنی تمام و کمال تابانی سے کائناتِ ارضی کو نور کے جھولے میں جھلا رہا ہے۔ فضا میں ہر طرف سکون ہے اور مخلوقات کا ذرہ ذرہ گہری نیند سو رہا ہے۔ سوزاں ایک دفعہ چاند پر نگاہیں ڈالتی ہے ایک آہ بھرتی ہے اور درد بھری آواز میں چاند کو خطاب کرتی ہے۔

اے آسمان کی پھیلی ہوئی خوشنما اور سب سے اونچی چھت سے عالم پر چمک اور نور کی بارش کرتے۔ خراماں خراماں چلنے والے مسافر " اے چاند " آج میں تجھے اپنی رات میں جس نے تجھ کو بد بنا دیا ہے جو بیسویں مرتبہ اکیلی دیکھ رہی ہوں اے تجھے اپنی اس دیدہ زیب اور نظر نواز سہاگ کی قسم جس نے تجھ کو ایک عالم کا مرکزِ توجہ بنا دیا ہے مجھے تو اتنا بتا دے کہ میری بہارِ شباب کا مالک اور میری زندگی کے باغ کا مالی پیارا مرکز کب آئیگا اور پھر کب وہ مبارک گھڑی ہوگی جب ہم دونوں مل کر پریم کا رَس گھول پی کر تیرے حُسن کی بہاریں لوٹیں گے۔

اے سب ستاروں میں زیادہ ٹھنڈی اور سہانی چمک رکھنے والے ستارے " اے چاند " جدائی کی غم افزا اور دردِ انگیز راتوں میں تو ہی میرا غمگسار اور ہمدرد رہا ہے اور تیرے حُسن عالم افروزی کی بہاریں دیکھتے فرقت کی بھیانک گھڑیاں تیر ہوئی ہیں " کیا تو اتنا کر سکتا ہے کہ مجھے پیارے مرکز کی کوئی خبر دیدے کہ وہ کہاں رہتا ہے اور مجھ دُکھیاری کے پاس کب آئے گا اور کیا وہ بہت جلدی اپنے دیدار سے میری آنکھیں ٹھنڈی کرنے والا ہے۔ اگر تو میرا یہ کام کر دے تو ہمیشہ تیری احسانمند رہوں گی۔"

ہاں کل کائنات پر نظر رکھنے والے مسافر " اے چاند " کیا پیارا مرکز بھی مجھے اسی ذوق و شوق اور پیار محبت سے یاد کرتا ہے جیسے میں اس کے ذکر میں دن رات محو رہتی ہوں۔ کیا اسے محبت کو نباہنے کا عہد اب تک اسی طرح یاد ہے جیسے مجھے۔ کیا وہ بھی کبھی فرقت کے ظلم سے تنگ آکر تجھ سے اسی طرح میرے متعلق کچھ پوچھتا ہے جیسے میں " اے میرے رفیق " اگر کبھی وہ تجھ سے میرے حالات پوچھنے بیٹھے تو اس سے کہدینا کہ تیری سوزاں تیرے لئے رات دن تڑپتی اور بلکتی ہے " آ " اس محبت کی دُکھیا کی سوکھی زندگانی کے لئے ابرِ بہاری بن کر " آ " یہ کہدینا کہ تیری پیاری بیٹی کی خوبی جمال اُس دیوی کی طرح ہے کہ جس کے نازک اور رنگین لبوں پر مسکراہٹ ہر وقت کھیلتی اور موجیں مارتی رہتی ہو اور اُس کے حُسن کی وہی تابانی ہے جو پانی کے اس شفاف قطرے میں آجاتی ہے۔ جو پارے کے اُن چند آبدار اور چمکیلے قطروں پر گر پڑتا ہے جو نور بار اور ضیا پاش شعاعوں میں نگاہوں کو خیرہ بنا رہے ہوں " اور یہ بھی کہنا " تیری بیٹی رات دن تجھے بلاتی رہتی ہے اور ہر لمحہ تیرا نام اس کا ورد ہے اور جب کبھی وہ مسکرا دیتی ہے تو بالکل یہ محسوس ہوتا ہے کہ تیری چھوٹی سی متحرک تصویر ہے ہر دیکھنے والا تیری بیٹی کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ تو اور وہ دونوں اُن دو نگینوں کی مانند ہیں جن کو کوئی ہوشیار سنار ایک ہی سانچے میں ڈھال کر تیار کرے " یہ بھی کہنا " کہ اگر تو اُسے دیکھے تو پھر تجھ کو تعلی کے لئے جوہر دار آئینہ کی ضرورت نہ پڑے اس لئے کہ اُس کا حُسن یہ مرتبہ رکھتا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو آئینہ کی مانند اپنے خدوخال اس کے صاف و شفاف چہرے میں نظر آجاتے ہیں۔

سوزاں محبت اور شوق کے دیوانہ پن میں چاند سے ہم قسم

کی باتیں کر رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ اس کا حسین مخاطب افقِ مغرب کے قریب پہونچ چکا ہے اور بہت جلد مرکیز کی طرح اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جانے والا ہے تو دلربایانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھی اور غم کے لہجہ میں کہا " اے میری تنہائی کے حسین مونس کل تک کے لئے رخصت " اور جلدی، اپنی لختِ جگر کے پالنے کے قریب آئی اور محبّت مادری میں اس پر جھک پڑی " پیاری بیٹی شب بخیر " کہتے ہوئے اس کی معصوم پیشانی پر سے ریشم کے سے ملائم بال ہٹاکر اپنی رگ رگ اور دل کی تمام گہرائیوں سے شفقت و محبّت کو لبوں پر جمع کیا اور بوسہ لینے کے لئے اس کی پیشانی پر منہ رکھ دیا اور اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ابھی اس کی خمار آلود نگاہوں نے نیند کی پہلی ہی منزل قطع کی تھی کہ عالمِ خواب کے کارکنوں نے اس کو بہلانے کے لئے اس کی تمام آرزوؤں کو مصوّر کر کے اس کے سامنے پیش کر دیا اس نے دیکھا کہ اُس کا پیارا مرکیز اپنے طویل سفر سے واپس آگیا ہے اور فرقت کی گھڑی بیت گئی ہے اس نے اور اس کی پیاری بیٹی نے لال محل کے بڑے دروازے پر اس کا پر جوش استقبال کیا ہے۔ اِن دونوں کو دیکھ کر مرکیز گھوڑے سے اترا ہے اور سوزاں کو بڑے شوق اور محبّت سے چمٹا چمٹا کر پیار کیا ہے اور کبھی اپنی بہارِ زندگی سوزاں اور کبھی اپنی مسرّت کی کلی مادینہ کے بوسے لیتا کثرتِ مسرّت اور زیادتی جوش سے روتا ہوا محل میں داخل ہو گیا ہے۔ سوزاں اپنے اس مبارک خواب کے مزے لے رہی تھی کہ اچانک اسے کسی ہاتھ نے جگانا شروع کیا وہ جاگ اٹھی اس نے دیکھا کہ اس کے سرہانے اس کی خادمہ کھڑی ہے اور آج غیر معمولی طور پر مسرور و شاداں نظر آتی ہے۔ ابھی سوزاں خادمہ کی اتنا معلوم فرحت کا کوئی سبب نہ معلوم کر پائی تھی کہ خادمہ کے لب ہلے اور اس سے یوں گویا ہوئی کہ میری سیدہ آپ کو خوشخبری ہو کہ میرے سردار مرکیز تشریف لے آئے۔ اس وقت سوزاں کی فرحت اندازے سے باہر اور قیاس و گمان سے بالا تھی۔ اس کے نزدیک اِس خبر کی تصدیق سے پہلے ہی سوکھی نہر میں پانی آ گیا تھا دیدۂ چمن میں بہار اور مردہ تن میں جان آ گئی تھی اُس نے کہا " اے غمدیدہ دلوں کے غمگسار، اے بیکسوں

۱۴

کے مددگار! اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میرا خواب سچا کر دیا اور میری کھوئی ہوئی دولت واپس کر دی۔ وہ بادِ بہاری کی طرح بستر سے اٹھی اور مرمر کی فرش توشہ خانے کی طرف روانہ ہوئی اور بجلی کی سی تیزی سے پھول کی مانند بن سنور کر نئی نویلی دلہن بن کر آن بان سے اپنی لختِ جگر کو ہاتھوں میں اٹھائے، مسرّت و خوشی کے راگ گاتی فرحت و انبساط کی لے میں گنگناتی، عیش و سرور کے نغمہ کی تانیں اڑاتی، اپنے خیال میں فضاؤں کو مرکیز کے کا[illegible] کے لئے جنت بناتی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اس کا پریم [illegible] جلوہ آرا تھا۔ اس نے وہاں پہونچ کر دیکھا کہ اس کا پیارا مرکیز ایک کرسی پر دونوں ہاتھوں سے زور دے کر بیچ کمرے میں کھڑا ہے اس کو سامنے دیکھ کر سوزاں کا اشتیاق اور بڑھ گیا اپنی چال او[illegible] تیز کر دی لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مرکیز نے اس کے اس شوق بھری تیزی کے جواب میں اپنا آغوشِ اشتیاق وا نہ کیا۔ نہ تو اس کے لبوں پر خوشی کا تبسّم آیا اور نہ اس کے چہرے پر مسرّت کی جھلکیاں نمودار ہوئیں۔ اس لئے کہ آج [illegible] مرکیز کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا گویا اس کے سامنے ایک ایسا غیر مرد کھڑا ہے کہ اب سے پہلے جس کا نہ اس سے کوئی تعارف تھا اور نہ جان پہچان۔ مرکیز کو اجنبی مرد سمجھنے میں تو وہ غلطی پر تھی، تھا وہی مرکیز جس سے اس نے اپنے گاؤں کے قریب کی وادیوں میں جلبرٹ [illegible] عہد شکنی کر کے محبّت بڑھائی اور پھر اس کے دل کی رانی بن بیٹھی اور [illegible] تین سال تک مسلسل اسی لال محل میں جس کے قریب کی فضائیں غریب [illegible] کی آہوں سے معمور تھیں محبّت کی پینگیں بڑھا چکی تھی لیکن یہ بھی واقعہ [illegible] کہ اس وقت اس کا چہرہ ایسا اترا ہوا اور بے کیف معلوم ہو رہا تھا جس میں تبسّم کی بجلیوں کی کوئی تملاہٹ اور چمک موجود نہ تھی بلکہ سر سے پیر تک پتھر کا ایک ایسا مجسمہ معلوم ہوتا تھا جس پر بشاشت او[illegible] فرحت کی کوئی آب و تاب اور رنگ و روغن نہ ہو۔ سوزاں کو مرکیز کی تبدیلی کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی وہ کھو سی گئی۔ پھر ذرا سنبھلی اور سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا مرکیز نے اس کے جواب میں ہاتھ اٹھایا۔ مگر ایسا [illegible] سے کہ ہر دیکھنے والا اس دلی نفرت قلبی تکلیف کا احساس کر سکتا تھا [illegible]

خلاف اُس نے بجبر اپنے ہاتھ کو اُس کی جگہ سے حرکت دی تھی۔

اب سے پہلے مرکرز جب کبھی اپنی پیاری بیٹی کو دیکھتا تو پھول کی طرح کھل جاتا، مسکراتا اور محبت سے بے قرار ہو کر اُسے اپنے گلے سے لگا لیتا تھا لیکن آج تو دنیا ہی بدل گئی تھی ہر طرز میں اجنبیت تھی اور ہر طریق میں غیریت، معصوم بچی پر ایک نظر ڈالی اور سب سے پہلی بات سوزاں کو مخاطب کر کے یہ کہی۔

"کیا تم ابھی تک یہیں لال محل میں موجود ہو"

یہ سُنکر سوزاں کی تمام امیدوں پر اوس سی پڑ گئی۔

اس کی حیرت بڑھ گئی اور اُسے خوف معلوم ہونے لگا اور وہ مطلق نہ سمجھی کہ مرکرز کا اس جملہ سے کیا مطلب ہے۔ اُس نے کہا کہ "آقا آپ مجھے کہاں دیکھنے کے اُمیدوار تھے"، مرکرز نے کہا کہ آج تک تو تمہارا یہاں رہنا نامناسب اور غلط نہ تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ آج کے بعد تم اس لال محل میں نہ رہ سکو گی۔"

سوزاں نے کہا کیوں؟ مرکرز نے جواب دیا اس لئے کہ آج یہاں میری بیوی آجائے گی اور وہ تمہارا یہاں رہنا گوارا نہ کرے گی مجھے اُس کی خاطرداری اور دلداری منظور ہے۔"

اب سوزاں کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کی رگوں کا تمام خون یکدم اس کے قلب میں سمٹ آیا ہے اس کا دل خفقانی ہو گیا اور اس پر اختلاج کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور اس کے جسم کا حصہ حصہ اور رگ رگ بے روح ہو گئی۔ جب کسی انسان پر مصیبت اندازہ اور طاقت سے زیادہ آپڑتی ہے تو اُس کو رونے چلانے نالہ و آہ کرنے اور کراہنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ سوزاں کی اسوقت یہی کیفیت تھی وہ اس اچانک مصیبت آپڑنے سے نہ روئی نہ چلائی اور نہ بے چین ہوئی بلکہ پہلے حسرت بھری نظر سے مرکرز کو دیکھتی رہی، اور پھر اپنی لختِ جگر پر ایک شفقت آمیز نگاہ ڈالی اور مرکرز سے کہا اچھا تم اپنی اس بچی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہو۔ مرکرز نے کہا کیسی بچی کس کی بچی۔ میرے نہ کوئی بچی ہے نہ بچہ اس لئے کہ میری شادی ہوئے ابھی تین روز ہوئے۔ یہ تمہاری بیٹی ہے تم اس کی مختار ہو، اسے اپنے ساتھ لیتی جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ اس میز پر جو تھیلی رکھی ہے اس میں میں نے کچھ رقم تمہارے لئے رکھدی ہے اس کو لو اور اپنی ضروریات میں صرف کرو۔

مرکرز نے یہ کہا اور سوزاں کو اس کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

سوزاں اس گفتگو کو سُنکر بےجان ہو گئی وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکتی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ اس نے بمشکل وہاں سے قدم اٹھایا اور ان ناپاک سکوں پر بغیر نظر ڈالے کمرے سے باہر چلی گئی اور گرتی پڑتی اپنے کمرے میں پہونچی یہاں اس کا دل بھر آیا اور بے اختیار رونے لگی "ہائے بدنصیبی" افسوس صد افسوس یہ شیطانِ مجسم مجھکو میری عصمت کی قیمت دیتا ہے مجھے عصمت فروش سمجھ رہا ہے اور فوراً غش آگیا۔

سوزاں اور مرکرز میں صبح کے وقت یہ بات ہوئی تھی اور دن چڑھے سوزاں پر غش طاری ہوا ہو گا۔ پھلا پھولا باغ دیکھ کر تو غیروں کی روح سلب ہو جاتی ہے اور دل دُکھتا ہے اور یہ سدا بہار باغ تو خود سوزاں کا تھا جو اُس کے سامنے نذرِ خزاں ہو رہا تھا۔ بہتر ہوتا کہ سوزاں مرجاتی مگر افسوس وہ بڑی سخت جان تھی اور ابھی اُس کو زمانے کے ظلم و ستم کے کچھ اور تیروں کا نشانہ بننا تھا۔

جب رات کا سیاہ اور بھیانک پردہ عالم پر ڈالا گیا تو اس غم کی ماری کو بھی ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں اور اپنے گردو پیش نظر ڈالی لیکن مرکرز کے الفاظ "کیا تم ابھی یہیں لال محل میں موجود ہو" کانوں میں گونج رہے تھے۔ اب اسے محسوس ہوا کہ مرکرز کی گفتگو نے اس کے دل میں ایک گہرا زخم پیدا کر دیا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ اس کی پیاری بچی خلوس کی گود میں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہی ہے اور اُس کو بلکتا دیکھ کر خادمہ بھی زار و قطار رو رہی ہے۔ "تڑپ اٹھی ہائے اولاد کی آگ"، اس ننھی سی جان کے اُجڑ جانے پر سوزاں کا رُواں رُواں ماتم کر رہا تھا، اُٹھی اور اپنی لختِ جگر کو کلیجہ سے لگا لیا۔ کچھ دیر اس کو بہلاتی رہی پھر توشہ خانے میں پہونچی اور ان دیہاتی اور سادہ کپڑوں کو ڈھونڈا جو اس کی پچھلی پُر سکون اور محبت بھری زندگی کی یادگار تھے اور جن کو پہن کر آج سے تین سال سے پہلے اس دنیا کی جنت لال محل میں آئی تھی اور جن کو سوائے اپنے ذہنیت کی وجہ اور شرم و عار سے چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ اُس نے وہ کپڑے

نفرت کے ساتھ اپنے جسم سے اُتار پھینکے جو ابھی چند گھنٹے پہلے مرکز کی پیشوائی کے لئے زیبِ تن کئے تھے اور دیہقانی کپڑے پہن لئے گردن میں موتیوں کی جو مالا گلے میں جواہر کے جو ہار سینے پر کندن کی جو حائل اور کانوں میں ہیرے کے جو آویزے تھے اِن سب کو نہایت حقارت سے کھسوٹ لیا اور پیروں میں روند ڈالا - اِس لئے کہ وہ اب ان سب چیزوں کو اپنی عصمت کی قیمت اور جوانی کا مول سمجھتی تھی - اپنی پھول سی بچی کو اُٹھایا اور رات کی تاریکی میں لال محل سے نکل - ایسی بے تکلف اور تیز چال سے چلی گویا نرم نرم ریت پر اپنا سفر طے کر رہی ہے - جب دروازے سے گزر کر اُس جگہ پہنچی جہاں آج صبح خواب میں اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر مرکز کا استقبال کیا تھا تو اُس کو دُور سے ایک سیاہی نظر آئی - غور کیا تو وہ ایک سواری تھی جس کا رُخ لال محل کی طرف تھا اور اِس میں چالباز مرکز اور اُس کی نئی دلہن سوار تھی - سوزان نے خواب کی تعبیر لینے میں غلطی کھائی تھی اصل میں اس کے خواب کی تعبیر اِس وقت اس کے سامنے تھی اور وہی اس کی زندگی کی لوٹ -

اُس نے اس عیش پرست جوڑے پر نفرت کی ایک نظر ڈالی اور بائیں ہاتھ کو مڑ کر لال محل کی دیوار کے نیچے نیچے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئی -

خدا ہی جانتا ہے کہ اِس وقت یہ غریب عورت اپنے دل میں غم و الم کا کیسا ناپیدا کنار سمندر لئے جا رہی تھی اِس لئے کہ کل تک اپنے آپ کو وہ جس مکان کی مالک اور جس محل کی رانی سمجھتی تھی آج اُس سے بہ ذلت نکال دی گئی تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ جو شخص اُس کو سب سے زیادہ عزیز اور جس کو یہ سب سے زیادہ پیاری تھی اُسی نے اس کو نہایت بے رُخی سے نکالا تھا - زمانے کا اُلٹ پھیر کیا سے کیا کر جاتا ہے

کل تک جو سوزان ایک شریف منکوحہ اور سوسائٹی کی محبوب ترین خاتون تھی آج وہی بدنصیب بدکار ایک مشتبہ بچہ کی ماں اور دنیا کی ذلیل ترین عورت قرار دی جا چکی تھی، ہائے بدقسمتی ادھر سے یوں نکالی گئی اور اب اِس حالت میں یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اپنے دامن پر صدہا بدنما داغ اور گود میں پوشیدہ گناہوں کی گٹھلی ہوئی

ذلیل لئے ہوئے اپنے پُرانے مکان کی طرف واپس ہو جائے اور ان دونوں آدمیوں کو اپنی صورت دکھلائے کہ جنھوں نے اِس کے ساتھ بڑے بڑے احسان کئے اور اس نے ان کا بدلا برائی اور بدسلوکی سے دیا اُنھوں نے اِس سے محبت کی اور اس نے ان سے بیوفائی برتی - ان دونوں سے مُنہ چھپا کر فانی عیش کی طرف بھاگی اور اُن کے اپنے تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دئے اور مٹا ڈالے اور اپنے ماحول میں ایسی منہمک ہوئی کہ مرکز کے علاوہ دنیا کی تمام چیزیں بھلا بیٹھی - اب اِسے محسوس ہو رہا تھا کہ نہ تو زمین پر میرے لئے کوئی شفیق دل اور محبت بھری آنکھ ہے اور نہ آسمان سے ہی کسی فضل و کرم کی اُمّید - اپنے دل سے یہ باتیں کرتی ہوئی لال محل کی دیوار کے نیچے بے حس خبطیوں اور دیوانوں کی طرح چلی جا رہی تھی نہ اِسے یہ خبر تھی کہ کدھر جا رہی ہوں اور نہ یہ کہاں جانا چاہئے - اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس کی پیاری بچی پر نیند کا غلبہ ہے اور اِس کی گردن ڈھلکی جا رہی ہے اِس لئے وہ لال محل کے قریب بہتی ہوئی نہر کے کنارے ایک اونچے مقام پر آئی اور ٹھنڈی اور اوس سے بھیگی گھاس پر اپنی لختِ جگر کو لٹا دیا اپنی چادر اُس کو اُڑھا کر اُس کے قریب بیٹھ گئی اور اپنے مستقبل پر غور کرنے لگی وہ اپنی جگہ بیٹھی تھی اس وقت رات دن کی تھکی ماندی مخلوق کو لوریاں دے دے کر سُلا چکی تھی اور خود بھی سو گئی تھی - ہر چیز پر خاموشی طاری تھی، لیکن چاند بیدار تھا اور پھیلی ہوئی وسیع فضاؤں میں اپنے نور کے دریا بہا رہا تھا - نسیم بھی جاگ رہی تھی اور اپنے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پانی کی سطح پر باریک باریک موجیں پیدا کرتی پھرتی تھی -

سوزان بیٹھی تھی کہ اچانک اس کے کان میں ایک ضعیف آواز آئی گویا کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہے، اس نے اُس طرف توجہ کی جدھر سے وہ آواز آئی تھی تو اُسے اُس جگہ ایک معمّر نہر کے کنارے دو پتھروں کے درمیان دراز نظر آیا گویا کوئی آدمی سو رہا ہے - اس پر یہ دیکھ کر خوف و ہراس طاری ہو گیا اور وہ گھبرا

(بقیہ افسانہ صفحہ نمبر ۱۸۱ پر ملاحظہ کیجئے)

منتخب الہام

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

اپریل، مئی، جون ۱۹۳۹ء

خشک آنسو

(جناب عسکری طباطبائی سروش بی اے لکھنوی)

۳۹

ترقیوں پہ ہے سوزِ پنہاں، لہو کا کس میں اثر نہیں ہے
میں رو رہا ہوں بجذِ ارماں مگر ذرا آنکھ تر نہیں ہے

نظر کا دھوکا ہے حسنِ ظن ہے، شبِ الم مختصر نہیں ہے
یہ جھوٹی امید کی کرن ہے، طلوعِ نورِ سحر نہیں ہے

خطا، عقوبت ہے یاں مرادفِ گناہ سے یاں سزا عبارت
کہ رسمِ آئینِ عاشقی میں رعایت و درگذر نہیں ہے

جنونِ الفت کا بول بالا کہ ایسی منزل پہ کھینچ لایا
جہاں بشر کا تو ذکر ہی کیا، خیال کا بھی گذر نہیں ہے

نہ کر رہِ عشق کا ارادہ، نہ سر کے بل ہی نہ پا پیادہ
یہ تیغ کی دھار کا ہے جادہ، قدم جو رکھا تو سر نہیں ہے

میں شوق کی حشر خیز وادی میں وقت کی طرح گامزن ہوں
ستارہ و ماہ و مشتری، ہاں کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے

یہ معرفت کی ہے کون منزل، یہ آگہی کا ہے کون درجہ؟
کہ ہوش کو ہوش کچھ نہیں ہے، خبر کو اپنی خبر نہیں ہے

عروج ہوں ہر زوال کا میں، کمال ہوں بے کمالیوں کا
کوئی ہنر مجھ میں ہے تو یہ ہے کہ مجھ میں کوئی ہنر نہیں ہے

"ایک شب" — حاصلِ زندگانی

(جناب ماہر القادری)

وہ بدمست آنکھیں وہ کافر ادائیں — ختن کے ہرن چوکڑی بھول جائیں
نگاہوں کو پہلے سے تیار کرلوں — وہ پھر سامنے یک بیک آنہ جائیں
وہ رنگین چہرہ کہ صبحِ بہاراں — وہ زلفیں کہ سچ مچ برستی گھٹائیں
اِدھر اک تلاطم، اُدھر بیقراری — شرابِ محبت پئیں یا پلائیں
اسی رات پر ختم ہو بزمِ ہستی — ستارے نہ اب حشر تک جھلملائیں

وہ کچھ اس طرح جھوم کر مسکرائے
تبسم نے ہونٹوں کی لیلیں بلائیں

مرے شوقِ بیتاب پر وہ نہ جائیں — محبت کی معصوم ہیں التجائیں
وہ مستی سراپا وہ نغمہ مجسم — وہ کیوں مسکرائیں وہ کیوں گنگنائیں

مجھی پر ہے کیا منحصر وہ جو کہہ دیں
ہوائیں بھی "صبحِ بہاراں"[1] سنائیں

وہ ظالم ادائیں وہ کافر نگاہیں[2] — اُلٹ دیں ذرا دیر میں خانقاہیں

؎۱ میری ایک بہاریہ نظم کا عنوان ؎۲ یہ ظالم ہوائیں یہ کافر گھٹائیں! (از ساغر مطبوعہ مشترک نمبر ایشیا)

نوازش نے اُن کی مجھے یہ بتایا — ابھی تک کھلی ہیں محبت کی راہیں
تڑپتی ہوئی بجلیاں تھیں کہ نظریں — لچکتی ہوئی ڈالیاں تھیں کہ باہیں
نظارے کی شدت کا عالم نہ پوچھو — نگاہیں مری ڈھونڈتی تھیں پناہیں
ہواؤں میں کس طرح گھل مل گئے تھے
مرے گرم نالے مری سرد آہیں

شفق نے لکھا اُن کو خطِ غلامی — مہ و مہر اُن کی نظر کے سلامی[1]
نگاہوں سے دو آتشہ سی پلا کر — بڑھا دی مری اور بھی تشنہ کامی
میں عرضِ تمنا ز سر تا قدم تھا — نفس بھی پیامی نظر بھی پیامی
وہ شیریں تکلم، پیانو کا نغمہ
مبارک مجھے لذتِ ہم کلامی

وہ رفتار یا موجِ مے کی روانی — بہت ہی لطیف اور نازک جوانی
جبیں میں چراغِ تمنا فروزاں — وہ اک پیکرِ عشرت و شادمانی
لبوں پر نچھاور گلوں کی نزاکت — نگاہوں کا صدقہ مے ارغوانی

نہ جانے کہاں سے صدا آ رہی تھی — محبت کی اک اک گھڑی غیر فانی
تفکر کے دامن کو تھامے ہوئے ہے
وہ شب جو کہ تھی حاصلِ زندگانی

---

[1] "مہر و مہ و انجم جسے دیتے ہیں سلامی" از ساغر ——— !۹!

شاعر

مجید امجد بی-اے جھنگ

میں شاعر ہوں میری جمالیں نگہ میں — ذرا بھی نہیں فرق ذرات دمہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں

میں سینے میں داغوں کے دیپک جلائے — میں اشکوں کے تاروں کا بربط اٹھائے
خیالوں میں نغموں کی دنیا بسائے

رہ زیست پر بے خطر جا رہا ہوں — کہاں جا رہا ہوں کدھر جا رہا ہوں
نہیں جانتا کچھ، مگر جا رہا ہوں

یہ دنیا، یہ بے ربط سی ایک زنجیر — یہ دنیا، یہ اک نامکمل سی تصویر
نہ دنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا — گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کی دشمن سماجوں کی دنیا

یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے — کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے
مرے عشق کو بھیک ملتی نہیں ہے

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا — تو عنواں نیا اِس فسانے کا ہوتا
بڑا لطف دنیا میں آنے کا ہوتا

یہ آنسو نہ ہوتے یہ آہیں نہ ہوتیں | یہ جلووں کی پیاسی نگاہیں نہ ہوتیں
یہ انسانیت کی کراہیں نہ ہوتیں

مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں | ہیں سو تلخیاں جس سے اک اک کے رس میں
نہیں میرے بس میں نہیں میرے بس میں

جونہی چاہتی ہے مری روح مدہوش | کہ لائے ذرا لب پہ فریادِ پُرجوش
اجل آ کے کہتی ہے "خاموش خاموش"

مبہم سی حقیقت

(حضرت حرماں خیرآبادی)

۴۳ ایک اُس کے غم کی لذّت کے سوا کچھ بھی نہیں | بس محبت ہی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی دنیا، اپنی ہستی، اپنی ساری زندگی | ایک مبہم سی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگانی کیا ہے؟ جینے کا مسلسل اک عذاب | موت کیا ہے؟ عین راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک فتنہ، ایک محشر، اک بلائے ناگہاں | حُسن سرتاپا قیامت کے سوا کچھ بھی نہیں
جذبۂ وحشت، جنونِ شوق و سوز و سازِ عشق | دل کی پوشیدہ حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہر گھڑی اُس کا تصور، ہر نفس اُس کا خیال | زندگی گویا عبادت کے سوا کچھ بھی نہیں
درحقیقت وہ تسلی جو پسِ آزار ہو | صرف سامانِ جراحت کے سوا کچھ بھی نہیں

تاجِ شاہی بھی ملے حرماں اگر تقدیر سے!
وہ بھی تھوڑی شان و شوکت کے سوا کچھ بھی نہیں

ابر کا ٹکڑا اور ستارہ

(جناب فاروق بانسپاروی)

فلک پر شب کو محوِ گشت تھا اک ابر کا ٹکڑا
مخاطب کر کے اس کو بزمِ انجم یوں ہوئی گویا

لباسِ نو پنھایا مہرِ عالمتاب نے تجھکو
سنوارا ہے کرشمہ سازئ اسباب نے تجھکو

زمیں سے جانبِ گردوں تجھے تقدیر لائی ہے
اڑا کر جذبۂ پرواز کی تاثیر لائی ہے

سنا کچھ ساکنانِ ارض کی محفل کا افسانہ
بہت مشہور ہے دنیائے آب و گل کا افسانہ

وہ انساں جو کبھی اس راہ سے اکبار گذرا تھا
شرابِ معرفت کے نشہ میں سرشار گذرا تھا

جہاں میں اسکے ہمجنسوں کا عالم آجکل کیا ہے
شعارِ حاملانِ جلوۂ حسنِ ازل کیا ہے!؟

نہ پوچھو اے ستارو شیوۂ مذموم انسانی
زباں میں قوتِ گفتن، نہ تابِ مرثیہ خوانی

فسانہ خاک کے پتلوں کا عبرت خیز ہے بیحد
نشاطِ ذوقِ آگاہی الم انگیز ہے بیحد

ہوس کی کار فرمائی سے ہلچل ہے زمانے میں
بشر مصروف ہے اک دوسرے کا خوں بہانے میں

کبھی مابین شیخ و برہمن تکرار ہوتی ہے
کبھی لامذہبیت برسرِ پیکار ہوتی ہے

کہیں مذہب کی آزادی کہیں مذہب کی پابندی
سکھاتا ہے کوئی بندوں کو آدابِ خداوندی

کبھی باطل کبھی خنجر بکف اسلام ہوتا ہے
خدا کے نام پر دنیا میں قتلِ عام ہوتا ہے

کہیں سرمایہ دار و محنتِ مزدور کا جھگڑا
"تحفظ" کی کہیں شورش کہیں "دستور" کا جھگڑا

ادائے دل نوازی میں دل آزاری کی گھاتیں ہیں
زبردستوں کی دنیا ہے زبردستی کی باتیں ہیں

سُناؤں کیا تجھے افسانۂ تہذیبِ انسانی
لہو مجبور کا ہے دمبدم مائل بہ ارزانی

مری نظروں نے حبشہ کا ابھی انجام دیکھا ہے
تماشائے فریبِ "محفلِ اقوام" دیکھا ہے

ستمگینی کی خودسر طاقتیں دیکھی ہیں بے پردہ
سرِ بازار مجبوروں کا قتلِ عام دیکھا ہے

قیامت آہ دیکھی ہے ابھی بیت المقدس[1] میں
تڑپنا بے گناہوں کا تہِ صمصام دیکھا ہے

اجل ہے سایہ افگن سر پہ اور پاؤں میں زنجیریں
فلسطینی وفاداروں کا یہ انجام دیکھا ہے

انھیں آنکھوں سے دیکھے ہیں ستم جاپان والوں کے
غضب کا سرزمینِ چین میں کہرام دیکھا ہے

معاذ اللہ شانِ منصفی تہذیبِ حاضر کی
غریبوں کا لہو بر شاہراہِ عام دیکھا ہے

ابھی اسپین میں دورِ تباہی کے پسِ پردہ
شعارِ غیر جانب داریٔ اقوام دیکھا ہے

خدا کے ناتواں بندے گراں ہیں طبعِ عالم پر
جہاں دیکھا ہے ان کو موردِ الزام دیکھا ہے

زباں یہ کہتے کہتے ابر کے ٹکڑے کی تھرّائی
جگر میں درد اُٹھا فرطِ غم سے آنکھ بھر آئی

مسلسل دیدۂ نمناک سے بہنے لگے آنسو
بطرزِ نوالم کی داستاں کہنے لگے آنسو

فسانہ اس قدر پُر درد تھا آفت کے ماروں کا
وفورِ رنج سے فق ہو گیا چہرہ ستاروں کا

فضا کرنے لگی ماتم بشر کی بربریت پر
دلِ شاعر تڑپ اُٹھا اس اندازِ حمیت پر

---

[1] صحیح لفظ "بیت المقدس" ہے۔ صحت ہوجائے تو بہتر ہے۔ ساغر

اک ناتمام نظم

(حضرت اکبر حیدری)

ہوش مجھ کو بھی نہ تھا تم بھی نہ تھے کچھ ہوش میں
ہائے وہ لمحہ کہ جب تم تھے مرے آغوش میں

وہ رُخِ رنگیں پہ کچھ سہمی ہوئی سی زردیاں
وہ نشیلی آنکھ میں اک نیم خوابیدہ فغاں
وہ لبِ لعلیں پہ کچھ معصوم بوسوں کے نشاں
آج تک میری نظر میں ہے وہی کا فرسماں

ہائے وہ لمحہ کہ جب تم تھے مرے آغوش میں

وہ تمہارا جسمِ نازک میرے پہلو میں نڈھال
وہ مرے بازو پہ کچھ بکھرے ہوئے زلفوں کے بال
وہ جبینِ ناز پہ بھیگا ہوا سا انفعال
وہ نگاہوں میں نگاہوں سے محبت کا سوال

ہائے وہ لمحہ کہ جب تم تھے مرے آغوش میں
تا قیامت کاش ہم دونوں نہ آتے ہوش میں

حُسن کا مقابلہ

(حضرت حافظ غازی پوری)

سحرگہ اور وہ ماہِ دوہفتہ کی ضیا پاشی	کرن یا برق پاروں کی وہ رہ رہ کر فضا پاشی
سمائے مغربی میں پنبہ ہائے ابر کا منظر	پئے تعظیم ہو جیسے حجازی شان کا لشکر
ورودِ خامشی وہ آبشاروں کوہساروں پر	مسلط خواب ہو جیسے شجر پر شاخساروں پر
فضائے چشمۂ سیمیں کی موجوں پر کرن لرزاں	کہ آئی چھوٹ کے دامن پہ جبینِ حسن سے افشاں
روانی آب میں تھی یا شعاعِ مہر ساماں میں	جوانی نور میں تھی یا نمودِ موجِ لرزاں میں
سکوت و ارتعاشِ آب کا تھا یہ کھُلا احساں	کہ نیلوفر کی ہر آغوش میں تھے کچھ دُرِ غلطاں
غرض یہ ہے کہ فطرت نے باندازِ فراوانی	بنا رکھا تھا ہر شے کو رہینِ فتنہ سامانی
یہ اُس کے واسطے اک کھیل تھا معصوم عشرت زا	جہاں کے واسطے لیکن یہ تھا وہ رنگ فرحت زا

وہ کہ جس میں حسن کی رعنائیاں خاموش و مضطر تھیں
نگاہیں شش جہت کی دیکھ کر حیران و ششدر تھیں

اسی عالم اسی منظر میں اک طاؤس صحرائی	بلاکِ منظرِ فطرت، جوابِ حسن و رعنائی،
لبِ چشمہ گیاہِ سبز پر بدمست و رقصاں تھا	ہر اک ذرہ جسے یوں دیکھ کر خاموش و حیراں تھا
وہ چشمِ نیلمیں اس کی، وہ پیہم گردشِ مینا	وہ ابروئے عنبریں اس کے، وہ اُن کی جنبشِ زیبا
وہ چونچ اُس کی نوکیلی اور رنگِ سونی اُس کا	زبانِ لالہ گوں غیرت دہِ صد لالۂ حمرا

وہ افعی آفریں گردن وہ گہرا رنگ فیروزی
وہ سینہ خوش نما اس کا وہ اس کی شانِ لدھی

وہ زرّیں بال سر پر اور اک الماس گوں کلغی
انگور کی شاخ سے جیسے نمایاں خوشۂ نوری

وہ اس کے اخضریں بازو، عبیری سا نشان ان پہ
ردائے سبز پہ جیسے شہابی رنگ کا منظر

وہ لمبی دُم بجائے خود جوابِ سبزۂ بستاں
بساطِ حسنِ دل کش پر ہلال و بدر تھے رقصاں

دمِ مستی وہ رقصِ شوق وہ توبہ شکن لرزش
ہوا و ابر میں قوسِ قزح کی کیف زا جنبش

خلاصہ یہ کہ سر سے پاؤں تک حسنِ مجسم تھا
بہارِ رنگ و رعنائی میں پنہاں خاص عالم تھا

تماشے کم نہ تھے یہ صبح دمِ ایجادِ فطرت کے
چھڑے تھے ہر طرف نغمے لطافت ہی لطافت کے

مگر فطرت نہ قانع رہ سکی اتنی بہاروں پر
اشارہ اس کا پا کر تیسرا پیدا ہوا منظر

پئے گلگشت یعنی ایک دوشیزہ ادھر آئی
فضاؤں میں ہوا اک شور یہ ظالم کدھر آئی

سرو سینہ پہ اس کے اس طرح زلفِ بلا ساماں ۱۴
کہ سطحِ چشمۂ حیواں پہ ناگن جس طرح لرزاں

جبیں صاف روشن، قہر و آفت ابرو قشقہ
جہانِ صبر میں ہلچل اٹھا دے، ڈال دے رخنہ

بھویں مخمور، مژگاں مست، آنکھیں ساغرِ صہبا
نویدِ صبحِ مستی آشنائے وعدۂ فردا

بہارِ عارضِ رنگیں کی ایسی آئینہ داری
بساطِ صبح پر ہو جس طرح پیہم شفق باری

وہ تِل کے پھول سی بینی جوابِ خوشۂ پرویں
مشامِ شوق کا مرکز بہارِ خاطرِ رنگیں

دہن تھا یا کوئی رخنہ کنارِ محرمِ گل میں
وہ لب تھے یا ورق پھولوں کے لرزاں شُشئیل میں

وہ گردن جامِ صورت، اور اس میں بادۂ فطرت
وہ سینہ اک قیامت اور اس کے دوش پر آفت

وہ ساعد کی حنا رنگی وہ دستِ خوشۂ مرجاں
صباحت دیکھ کر جس کی طباشیرِ سحر حیراں

لباسِ خوش نما کی اللہ اللہ حسن ساماں
حجابوں سے برستی تھی لطافت خیز عریانی

وہ چل پڑتی تو ہنگاموں پہ ہنگامے بپا ہوتے
ٹھہر جاتی تو ذرّے مہرِ عشرت آشنا ہوتے
گلو، زلف، دست و گوش میں تھے پھول کے زیور
سمائے حسن پر بکھرے ہوئے تھے مختلف اختر
خنائی چٹکیوں میں اک گلِ احمر تھا حیرت میں
بہاریں منعکس تھیں جس کے رخسارِ لطافت میں

مناظر سب کے سب تھے فردِ انداز و لطافت میں
تقابل ساز قوت ہو رہی تھی غرق حیرت میں
یکایک فیصلہ پر فطرت آمادہ نظر آئی
سماں کا رُخ بدلنے کیلئے لی اُس نے انگڑائی
وہ ٹکڑے ابر کے جو منتشر تھے گھر کے سب آئے
ذرا جو شوخ تھے وہ ماہِ تاباں پر بھی لہرائے
نتیجہ یہ ہُوا ماہِ جبیں کی چھپ گئی صورت
زمیں سے آسماں تک چھا گئی بے ساختہ ظلمت
ہر اک منظر پہ یعنی پڑ گئے پردے اداؤں کے
تجلی خیز جلوے چھپ گئے ساری فضاؤں کے
نظر آئے نہ ایسے میں مناظر اور جلوت کے
مگر اللہ رے جلوے "نمودِ حسنِ" عورت" کے

۷۹ "وہ تاریکی میں بھی مہتاب کی صورت نظر آئی
یہی کہیئے نہ کیوں حافظ کہ "خود فطرت اُتر آئی"

تار و مضراب!

(حضرت اکبر حیدری)

محبّت نہیں ہے، جوانی نہیں ہے — ہماری کہانی، کہانی نہیں ہے
ہمیں آنیوالے، ہمیں جانیوالے — یہ دُنیا کہیں آنی جانی نہیں ہے
محبّت نہ ہوتی تو تم کیوں ستاتے — ستانا بھی کیا مہربانی نہیں ہے
تمنّا تھی سہتے ابد تک جفائیں — مگر زندگی جاودانی نہیں ہے
تمھاری محبّت، محبّت نہ نکلی — ہماری جوانی، جوانی نہیں ہے
چھپانے سے کب تک چھپیگی محبّت — کہ دامن میں آنسو ہیں پانی نہیں ہے
لرزتا ہے دل حسن کی ہر ادا پر — محبّت ہے یہ ناتوانی نہیں ہے
مری زندگی کا فسانہ نہ پوچھو — کہ سب کچھ ہے اس میں جوانی نہیں ہے

زباں دوست اکبر زباں ساز بھی ہے
یہ دعویٰ ہمارا زبانی نہیں ہے

پھر یاد آیا!؟

حضرت تبسّم نظامی

غمِ عشق کو گدگدائے چلا جا ۔۔۔ خوشی میں بھی آنسو بہائے چلا جا
قسم ہے تجھے میرے ذوقِ نظر کی ۔۔۔ یونہی مجھ کو جلوے دکھائے چلا جا
ترا دُور رہنا گوارا ہے پھر بھی ۔۔۔ رگِ جاں کے نزدیک آئے چلا جا
ہر اک زخم میرے ہی دل کو عطا کر ۔۔۔ مجھی کو نشانہ بنائے چلا جا
نہ باقی رہے کوئی رسمِ محبّت ۔۔۔ ستائے چلا جا مٹائے چلا جا
نہ کہہ اپنے غم کا فسانہ کسی سے ۔۔۔ اُنھیں کی کہانی سُنائے چلا جا
محبّت ہی دنیا، محبّت ہی عقبیٰ ۔۔۔ محبّت پہ ایمان لائے چلا جا
مٹایا ہے جس طرح دنیا نے دل کو ۔۔۔ یونہی نقشِ ہستی مٹائے چلا جا
بہت سے ابھی غم اُٹھانے ہیں تجکو ۔۔۔ گذشتہ غموں کو بھلائے چلا جا

مسرّت ہو یا کوئی غم ہو تبسّم
ہر اک حال میں مُسکرائے چلا جا

شبنم کے آنسو

(از محبوب الحسن ارشدی بدایونی)

اب جینے کا یہ عالم ہے اب زیست بسر یوں ہوتی ہے
ہم روتے ہیں دل جلتا ہے، تقدیر ہماری سوتی ہے

ہم اُس میں ہیں جس بستی میں یہ کہہ کے خلقت روتی ہے
آرام سے جس میں رہتے ہیں وہ دنیا کیسی ہوتی ہے؟!

جو دم بھی ہے وہ غنیمت ہے، ہر عیش کے بعد مصیبت ہے ۱۵
یہ دیکھ کے غنچے ہنستے ہیں وہ دیکھ کے شبنم روتی ہے

جس چیز کا ملنا ہو مشکل، ارمان سے اُس کو کیا حاصل
جو مِل نہ سکے وہ پتھر ہے جو ہاتھ لگے وہ موتی ہے

شبنم کے آنسو دونوں ہیں، اس فرق کو لیکن کیا کہیے
جو خاک پہ ہے وہ پانی ہے، جو پھول پہ ہے وہ موتی ہے

اے ارشدی اب اِس محفل میں دلسوز ہمارا کوئی نہیں پروانے جل کر خاک ہوئے اک شمع ہے وہ خود روتی ہے

لمعاتِ سحر

(حضرت قمر بدایونی)

دردکی ٹیس اِدھر بھی ہے، دردکی ٹیس اُدھر بھی ہے
زخمی ناوکِ نظر دل ہی نہیں جگر بھی ہے

پوچھ کے مجھ سے حالِ دل، بولے کہ سُن چکا ہوں میں
یعنی وہ بے خبر بھی ہیں، اور اُنھیں خبر بھی ہے

جب سے یہ اُس نے لکھدیا، وقت کی قید کیا ضرور
ضامنِ اعتبارِ دید شام بھی ہے سحر بھی ہے

۱۵۳ اب نہیں دیر دید میں، جلوہ گہہِ امید میں
دیدۂ منتظر بھی ہے، جلوہ منتظر بھی ہے

اب وہ خلش نہیں رہی، بات سمجھ میں آگئی
زیست وبال ہے تو کیا ساتھ ہی مختصر بھی ہے

قیدِ قفس کے بعد ہی ایک مدا اور بڑھ گئی
جب غمِ بال و پر نہ تھا، اب غمِ بال و پر بھی ہے

سُن کے یہ عذرِ مختصر، آگئے اب وہ راہ پر
جرم ہے عاشقی مگر قابلِ درگذر بھی ہے

کہتے ہیں وہ یہ برملا سب ہیں غرض کے آشنا   آج یہ راز کھل گیا شک انھیں غیر پر بھی ہے

نفع ہو اس میں یا ضرر آپ تو سمجھ لیا قیصر
دل ہے تو دردِ دل بھی ہے سر ہے تو دردِ سر بھی ہے

ثمرات

(حضرت نہال سیوہاروی)

وہ زندگی ہے فنا کا گماں گذرتا ہے   عجیب دور سے ہندوستاں گذرتا ہے
بلند تر ہے مہ و کہکشاں سے یہ دمِ فکر   خیال اپنا کہاں سے کہاں گذرتا ہے
ہمارا دل ہے کہ یارب گذرگہِ عالم   اسی دیار سے ہر کارواں گذرتا ہے
ترے نثار اِس انداز سے عتاب نہ کر   عتاب پر بھی کرم کا گماں گذرتا ہے ۱۵
وہ کی خلوص کی توہین اہلِ دنیا نے   زباں پہ لفظِ محبّت گراں گذرتا ہے
ادا نگاہوں سے ہوتا ہے فرضِ گویائی   زباں کی حد سے جو ذوقِ بیاں گذرتا ہے
ہیں تنگ حوصلہ کے واسطے حوادثِ دہر   دلیر صورتِ سیلِ رواں گذرتا ہے
عوض محال ہے اس کا حیاتِ خضر سے بھی   وہ لمحہ عمر کا جو رائیگاں گذرتا ہے
درِ قفس تو الٰہی، ہے مجھ اسیر پہ بند   کہاں سے دل میں غمِ آشیاں گذرتا ہے
عجیب فیض کی دنیا ہے بابِ میخانہ   گذرنے والا ہر اک کامراں گذرتا ہے

بہار کے تھے ترانے نہال کے دم تک
وہ دوستدارِ گل و گلستاں گذرتا ہے

اُمّید کی بجلی

(حضرتِ رنجورؔ فاطمی)

فرقت کی اندھیری راتوں میں حسرت کی گھٹائیں امڈ آئیں
امید کی بجلی سے لیکن رہ رہ کے فضائیں چمکائیں

قسمت میں لکھی تھی محرومی اُبھری نہ مری ڈوبی کشتی
تکتا رہا حسرت سے ساحل ہر چند کہ موجیں تڑپا کیں

بجلی کا چمن میں وہ گرنا، رہ رہ کے دھواں سا کچھ اُٹھنا
پُر درد نوائیں بلبل کی اس منظر سے ٹکرایا کیں

راس آئی چمن کی آب و ہوا کس کو کہ مجھے راس آئیگی
پھولوں پہ مصیبت آیا کی اور کلیاں ٹک ٹک دیکھا کیں

معیوب ہے طوفاں سے ڈرنا جینا ہی تلاطم میں جینا
موجیں وہ کہاں تھیں قیدی تھیں جو جھیل میں سر کو مارا کیں

رنجورؔ محبت کا گلشن اُجڑا تو نہ پھر شاداب ہوا
ہر سال برسنے کو یوں تو ساون کی گھٹائیں برسا کیں

معاہدہ

سرِ شوق پیہم جھکاتا رہوں گا   بہ ہر گام کعبہ بناتا رہوں گا
ازل میں محبت سے وعدہ تھا میرا   کہ اپنی جوانی لٹاتا رہوں گا
یہ بادِ مخالف سے ہے شرط میری   چراغ اپنے خود ہی بجھاتا رہوں گا
ہے برق و شرر سے مرا عہد نامہ   کہ خود اپنے خرمن تپاتا رہوں گا
شبِ تار سے میں نے وعدہ کیا ہے   اندھیرے کو مشعل دکھاتا رہوں گا
زباں دی ہے خونخوار موجوں کو میں نے   کہ طوفاں میں بھی مسکراتا رہوں گا
گزرتا رہیگا مرے سر سے طوفاں   میں موجوں کا بربط بجاتا رہوں گا

کیا ہے تباہی سے یہ عہد میں نے
کہ تعمیرِ ہستی کو ڈھاتا رہوں گا

یہ سازِ مشیّت سے پیماں ہے میرا
مصیبت میں بھی گنگناتا رہوں گا

ہے تقدیر دامن کی صد چاک ہونا
میں دامن کو کب تک بچاتا رہوں گا

حقیقت کے رخ سے حقیقت کے رخ پر
حجابِ توہّم گراتا رہوں گا

سلامت ہے جب تک غرورِ محبت
زمانے کو نیچا دکھاتا رہوں گا

تغیّر کا جھنڈا نہ لہرائے جب تک
بغاوت کے پرچم اڑاتا رہوں گا

ہیں جنبش میں آویزۂ تاک جب تک
میں پیتا رہوں گا، پلاتا رہوں گا

مرے دم میں دم ہے تو ساغر ابد تک
پلاتا، لنڈھاتا، بہاتا رہوں گا

ساغر

۱۰ر جون ۱۹۳۶ء

اضطرابِ آرزو

(حضرتِ ادیب مالیگانوی)

غم نے چھوڑا دل کو، یا دل بے نیازِ غم ہوا
کیا خبر؟ پہلے کدھر سے ربط باہم کم ہوا

جب کسی کو سامنے دیکھا، یہی عالم ہوا
جیسے ذرّہ نور میں، اب ضم ہوا اب ضم ہوا

کھینچ لی جیسے کسی نے روح بزمِ عشق سے
دفعتہً پہلو میں جب دل کا تڑپنا کم ہوا

پردے پردے میں نگاہِ ناز نے مارا مجھے
دل کا شیرازہ عجب انداز سے برہم ہوا

ظلم ہی اک دردمندِ عشق کا انجام بھی
وہ پشیماں ہوگئے، یہ ظلم بھی کیا کم ہوا

ہو چکے برباد لاکھوں دل محبت میں مگر
ہائے وہ دل جس کے مٹنے کا انہیں بھی غم ہوا

اس طرح تکمیل کو پہنچا عروجِ بندگی
سر زمین و آسماں کا میرے آگے خم ہوا

اضطرابِ آرزو کو زندگی کہتا ہوں میں
زندگی کیا؟ اضطرابِ آرزو جب کم ہوا

جانتے رازِ چمن، اہلِ چمن کیونکر ادیب
مثلِ بو نکلا چمن سے جو کوئی محرم ہوا

رجحانات

(حضرت مخمور لکھنوی)

جو دنیا میری امیدوں کی برہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت ماورائے ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

بہارِ زیست ہے جس پر، مدارِ زیست ہے جس سے
وہ تصویرِ خیالی اب مجسّم ہوتی جاتی ہے

کوئی کیا خاک سمجھیگا مری بربادسامانی
طبیعت واقفِ اسرارِ عالم ہوتی جاتی ہے

زمانہ جس قدر شرحِ مطالب کرتا جاتا ہے
محبت اور مبہم، اور مبہم ہوتی جاتی ہے

خوشی میں بھی تو آنسو ہی ٹپک پڑتے ہیں آنکھوں سے
طبیعت اس قدر کیوں مائلِ غم ہوتی جاتی ہے

نگاہِ غور سے تدبیر کے بندو ذرا دیکھو
ہماری رائیگاں ہر سعیِ پیہم ہوتی جاتی ہے

جدائی سے مری یہ کسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں
ارے توبہ، یہ کس کی آستیں نم ہوتی جاتی ہے

جہانِ ہوش میں جتنی نظر آتی ہیں تعمیریں
ہماری بیخودی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

خوشی کا منہ خدا ناکردہ بھولے سے بھی کیوں دیکھوں
پریشانی مری ایسی منظّم ہوتی جاتی ہے

ہوا جب سے تہی آغوش اک جانِ تمنا سے
خوشی میرے لئے اک مستقل غم ہوتی جاتی ہے

کہوں مخمور میں کس سے سلوکِ گردشِ صہبا
جو مے تریاق تھی ظالم وہی سم ہوتی جاتی ہے

روحِ انقلاب کا فرمان

اٹھو اور اٹھ کے نظامِ جہاں بدل ڈالو — یہ آسماں، یہ زمیں، یہ مکاں بدل ڈالو

یہ بجلیاں ہیں پرانی، یہ بجلیاں پھونکو — یہ آشیاں ہے قدیم، آشیاں بدل ڈالو

ہزار سال کے تاروں کا کیا کرینگے ہم — ہزار سال کی یہ کہکشاں بدل ڈالو

فلک پہ ہنستے ہوئے بادباں ہوں اور کشتی — فضا میں روتے ہوئے بادباں بدل ڈالو

خسِ کہن سے یہ سیلاب تو نہیں رکتا — زمانِ نوح کی سب کشتیاں بدل ڈالو

انگیٹھیاں ہوں بدستِ شمیم و نکہتِ گل — کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو

حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے — اس ایک لفظ سے کل داستاں بدل ڈالو

پکڑ کے شیب کی رگ میں بھرو شباب کا خوں — دلِ ضعیف سے قلبِ جواں بدل ڈالو

نظامِ قافلہ بدلا تو کیا کمال کیا — مزاجِ راہبرِ کارواں بدل ڈالو

ہر اک ذرّہ سے پیدا کرو نئی دنیا
نئے جہاں سے پرانا جہاں بدل ڈالو

ساغر

عہد و پیماں

میں نغموں کے دریا بہاتا رہوں گا ترنم کے طوفاں اٹھاتا رہوں گا
رہا گر ترے نطق کا فیض جاری تو ملہم کو حیراں بناتا رہوں گا
بہت دور سے یاد آتا رہوں گا میں ساون میں اُن کو رلاتا رہوں گا
محبت کی مایوسیوں کی قسم ہے ابد تک انھیں آزماتا رہوں گا
وہ محفل میں میری زباں بند کر دیں نظر سے کہانی سناتا رہوں گا
اجڑتی رہے گی مرے من کی بستی نئی دل کی بستی بساتا رہوں گا
۶۱ بہارِ محبت کا پالا چمن ہوں خزاں میں بھی میں لہلہاتا رہوں گا
وہ دامن کو اپنے جھٹکتی رہیں گی جو میں خاک ہو اُڑ کے چھاتا رہوں گا
شکستہ دلی حاصلِ زندگی ہے یہ آئینہ سب کو دکھاتا رہوں گا
ہمیشہ مجھے وہ بھلاتی رہیں گی سدا اُن کو میں یاد آتا رہوں گا
جنونِ وفا جب تلک ہے سلامت محبت کو وحشی بناتا رہوں گا
کب آجائے وہ جانِ جانانِ عالم! محبت کی دُنیا سجاتا رہوں گا

نہ ہے فیضِ ساقی نہ ہے کیفِ باقی
میں ساغر ہوں پیتا پلاتا رہوں گا

۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ساغر

کافرِ ماجرائیاں

(حضرتِ حمید لکھنوی)

یہ سماں، وقتِ شام ارے توبہ — اور وہ محوِ خرام ارے توبہ
ہو رہی ہیں فضائیں سر بسجود — حسن بالائے بام ارے توبہ
چاندنی رات، خامشی لبِ جو — اور وہ ماہِ تمام ارے توبہ
عشق کی مستیاں خدا کی پناہ — اُن نگاہوں کے جام ارے توبہ
نیچی نیچی نظر، معاذ اللہ — چپکے چپکے کلام ارے توبہ
بے نیازانہ پھیر کر نظریں — وہ جوابِ سلام ارے توبہ
ہائے مُڑ مُڑ کے دیکھنا اُن کا — چل کے دو چار گام ارے توبہ
آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشاروں سے — ایک رنگیں پیام ارے توبہ
بکھرے جاتے ہیں دوش پر گیسو — ہو نہ برہم نظام ارے توبہ
اللہ اللہ ایک دل کے لئے — اس قدر اہتمام ارے توبہ

چپکے چپکے حمیدؔ اب دل سے
کون ہے ہمکلام ارے توبہ

نقد و نظر

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

اپریل، مئی، جون ۱۹۳۹ء

نقد و نظر

زندگی حکیم ایڈیٹر قیصر کانپوری مدیر اعزازی شعری صاحب بھوپالی سالانہ چندہ ۵، فی پرچہ ۴ر، سائز ۳۰×۲۰ حجم ۴۸ صفحات

آفریں ہے اُن نوگرفتارانِ شوق پر جو ساحل پر سعد د جہازوں اور کشتیوں کے نذرِ طوفان ہونے کی خبریں سُن کر بھی اپنی کشتی سمندر میں ڈالدیں!؟

قیصر صاحب بھی انہیں حیرتناک انسانوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے دہلی سے ایک ادبی رسالہ "زندگی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا نمبر میرے سامنے ہے۔ کئی دن میں حیرت سے چپ رہا اور بالآخر میں نے قیصر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں ایشیا میں اظہار رائے کروں گا۔ جہاں تک نئی ترنگ کے خیر مقدم کا تعلق ہے زندگی کا خیر مقدم نہ کرنا دل کو ویراں کر لینے کے مترادف ہے۔ لیکن جہاں تک حق گوئی کا تعلق ہے، میں صاف عرض کروں گا کہ آج کل رسالہ کا جاری کرنا سرمایہ اور وقت دونوں کو ضائع کرنا ہے۔

اس کی تین وجہیں ہیں (۱) پہلی تو یہ کہ یو-پی سے رسالہ شائع کرنیوالے عام طور پر تجارت کے اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں، مگر ان کو مقابلہ کرنا ہوتا ہے پنجاب کے اُن رسائل سے جو پہلے سے شائع ہو رہے ہیں اور جن کے مالک اصولِ تجارت کے ماہر ہیں۔

(۲) عام طور پر یو-پی دہلی میں اپنے صوبے سے شائع ہونے والے رسائل کو خریدنے اور مدد دینے کا خلقی جذبہ نہیں ہے اور تیسری سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں درمیانی طبقہ نہیں ہے جو ذوق رکھتا ہے اور جس میں لٹریچر کو خریدنے کا جذبہ ہوا کرتا ہے۔ ۵

پنجاب کے رسائل کی کامیابی کی وجہ یہی مڈل کلاس ہے؛ اس کس مپرسی اور قدرتی مخالف حالات میں اب کسی رسالہ کو جاری کر کے اس کو مستحکم بنانا بجائے خود معجزہ سے کم نہیں!؟ اور کوئی شک نہیں کہ جو اس حال میں جرأت کرے وہ صحیح معنی میں مجاہد ہے۔

"زندگی" کے تعارفی لیڈنگ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اجرا کا مقصد ادبِ لطیف کی اشاعت نہیں ہے بلکہ زندگی کی جد و جہد سے اس کو تعلق رہیگا؛ گو پہلے نمبر کے مضامین میں ابھی اتنی معیاری شان پیدا نہیں ہو سکی ہے جتنی کہ ہونا چاہیے لیکن ہمیں یقین ہے کہ دوسرا نمبر اس نمبر سے بہت ارتقائی ہوگا اور جلد ہی یہ رسالہ اپنی ایک جگہ پیدا کریگا۔ میں ایشیا کے ناظرین سے پر زور سفارش کروں گا کہ وہ اس کا مطالعہ کریں اور اس کی ہمت افزائی فرمائیں کاغذ ۲۴ پونڈ سفید لکھائی چھپائی متوسط۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ "زندگی" دہلی۔

ماہِ نیم ماہ یہ ماہنامہ بھی دہلی ہی سے شائع ہوا ہے اور ہمارے دیرینہ دوست حامد شاہجہانپوری نے شائع کیا ہے قیمت سالانہ للعہ، سائز ۲۲×۱۸/۸ کاغذ، کتابت وطباعت خاصی ہے حجم ۴۸ صفحات ملنے کا پتہ دفتر "ماہِ نیم ماہ" نواب گنج دہلی۔

"ماہِ نیم ماہ" کے چار نمبر اس وقت تک نکل چکے ہیں، کسی ماہنامہ رسالے کے تمام مضامین بہتر ہونا تقریباً ناممکن ہیں۔ کیونکہ ملک میں اچھے لکھنے والوں سے مضامین حاصل کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور لکھنے والوں کا یہ عذر بھی کہ وہ آخر کہاں تک لکھیں اپنی جگہ درست ہے لیکن ماہِ نیم ماہ میں ایک چھوڑ تین مضمون معیاری ہیں؛ (۱) اقبال (از رشید احمد صدیقی)، (۲) اشتراکیت (انیسویں صدی قبل، از پروفیسر احمد جان ایم اے اور (۳) ادب مارواڑ اور بزمیہ شاعری از محمد عبد اللطیف خاں صاحب اثر کے علاوہ نظم میں عام طور پر ایک معیار پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ حامد صاحب خود ملک کے بلند پایہ شاعر ہیں؛ رسالہ مجموعی طور پر مطالعہ کے قابل ہے اور اس میں فکر ونظر کی روح کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں؛ ایک شکایت مجھے حامد صاحب سے ضرور ہے کہ وہ شاعر ہوتے ہوئے اس کے معیارِ طباعت کو بلند نہیں کر سکے۔ اور ادبی مسائل پر ان کی طرف سے نام کو بھی اظہارِ خیال نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا، کہ اب وقت اندھیرے سے نکل کر بالکل روشنی میں آجانے کا ہے۔ جس قدر فرسودگی اور قدامت کی آسودگیاں ہیں، اُن سب سے پاک کردینے کے سامان و ذرائع پیدا کرنا اہلِ قلم کا فرض ہے، ۴۸ صفحے ہر ماہ جس ادارے سے شائع ہوں، اس ادارے کے پیشِ نظر اعلیٰ ترین مقصد ہونا چاہیئے، وہ اعلیٰ ترین مقصد کیا ہے!؟ عوام کو بیدار اور بلند کرنے کی کوشش، ان کی راحت ومسرت کے سامان کے لئے اور ادب کے ذریعہ ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کردینا ماہِ نیم ماہ کا طلوع جس قدر خوبصورت اور شاندار ہے اس کو اور بھی نمایاں کرنے کے لئے اس کے ادارے کو اپنی کوششوں کی رفتار ذرا اور تیز کرنی ہوگی۔

میں زندگی اور ماہِ نیم ماہ دونوں کے لئے ناظرین سے سفارش کروں گا کہ وہ انہیں ضرور مطالعہ کریں۔

جدید مطبوعات

حرف وحکایت از شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، ناشر کتب خانۂ رشیدیہ دہلی سائز ۲۲×۱۸/۸ وضخامت ۲۷۲ صفحات قیمت مجلد عہ/ علاوہ محصول۔ کاغذ، جلد کور تمام خوبصورت۔

یقیناً دنیائے ادب میں یہ خبر مسرت کیساتھ سُنی جائیگی کہ دہلی کے مشہور ومعتبر کتب خانۂ رشیدیہ نے ملک کے غیر فانی شاعر حضرتِ جوش کی ۱۲۵ شاہکار نظموں کو "حرف وحکایت" کے نام سے کافی اہتمام کیساتھ شائع کیا ہے، یہ مجموعہ حضرت جوش کی چند قدیم اور زیادہ تر جدید نظموں کا نہایت اہم مجموعہ ہے! جو جوش کی شاعرانہ انفرادیت کے علاوہ ان کے ذہنی اور فکری ارتقا وجمال کا لازوال آئینہ ہے؛ ظاہر ہے کہ جدید اور تازہ کلام ہونے کے باوجود ان کی یہ نظمیں اس عہد کی ہیں جب فلسفی شاعر کے افکار واسلوب اظہار میں بجائے رنگینی اور بے ساختگی کے سادگی اور فلسفیانہ خشکی پیدا ہو جاتی ہے، مگر آپ کو جوش کا تازہ کلام دیکھ کر ان کی غیر فانی جوانی کا قائل ہونا پڑے گا ؎

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی
لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
بلٹیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی
آئینہ میں دمک رُخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر وماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

"فرشتۂ خانقاہ" بعد از دعا خانقاہ سے یوں روانہ ہوتی ہے ؎

فارغ ہوئی دُعا سے جو وہ مشعلِ حرم
کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم
انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدہ میں کرن پھوٹنے لگی

گردن کی لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے
چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لئے ہوئے

رُخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لئے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا تو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

اوّل تو شعر کی روح نقد و نظر سے بہت ہی بلند اور نازک شے ہے۔ دوسرے ہندوستان کے نقّاد حضرات، نقد فرمانے کے بجائے خود کو نمایاں کرنے کے زیادہ عادی ہیں۔ ان میں سے اکثر نہ صرف شاعر نہیں ہیں بلکہ سخن سنج بھی نہیں ہیں، وہ انتقادی نظر سے تو خوب لکھ سکتے ہیں مگر شعریت سے روح کی محرومی ان کو کلامِ شاعر سمجھنے اور سمجھانے سے عاری رکھتی ہے۔ جوش کو ہندوستان کا ایک نقّاد نہیں سمجھتا، کیونکہ ہر شاعر کو سمجھنے کیلئے اس کی زندگی کے جزو کل کے مشاہدہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے اسکے ظاہر و باطن کے امکانی علم کی حاجت ہوتی ہے۔ جوش نسلی طور پر افغان قوم سے تعلق رکھتا ہے جس کی سرکشی و اشتعال مسلّم ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اسکی سیاسی نظموں میں سچا جذبہ، اشتعال، جوش اور ترشی پائی جاتی ہے، اور ایسا ہونا اس کے اخلاص کی دلیل ہے

وہ ہندوستان کے محاذِ آزادی ہی نہیں بلکہ انسانی آزادی کے مرکز پر بنی نوعِ بشر کو فلسفی کی طرح نہیں جنرل کی طرح پکارتا ہے ؎

کاوِ خود بیگمیِ کائنات کچھ کر کے

نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر

لفظِ مرد کا محلِ استعمال صاف شاعر کی نسل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

جوش کے موجودہ کلام میں اُن کا نقطۂ نگاہ بھی واضح تر ہو گیا ہے اور فکر کی وہ بلندی بھی نمایاں ہو گئی ہے جو اس عمر میں ہونی چاہیئے۔ اسکی شاعرانہ تراش بجائے پست و ضعیف ہونے کے اور رنگین و پختہ ہو گئی ہے۔

آج ایک آدھ کو مخصوص کر کے جوش کے تمام معاصر رونے لگے ہیں مگر وہ تمام آلامِ حیات پر اپنی مسکراتی ہوئی نگاہیں ڈالتا ہے روتی ہوئی نہیں۔ فلسفیانہ مباحث کو شراب میں ڈبو کر پیش کرنا تو اس کا ادنیٰ شغل ہے ؎

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

جوش کے کلام کی نشاط انگیز "مقدس انانیت" اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے، شاید کوئی نظم اس جذبہ سے خالی نہیں۔ یہ اس کے نسلی اور شاعرانہ احساسِ خودی کی بہترین مثال ہے۔ یوں تو "غلط بخشی" کے عنوان سے مستقل نظم اس جذبہ کی آئینہ ہے۔ مگر ایک جگہ کہتا ہے ؎

اُٹھا لے جام زرا اس کو پلا جامِ سفالیں میں
کہ یہ کونین کو ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی!

اس مجموعہ کے مطالعہ سے بعض مسائل اچھی طرح سمجھ میں آ جاتے ہیں، اور نامحسوس طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے مقابلے میں جوش کی موجودہ منزل اور اس کی شاعری کے عناصر اب کیا ہیں؟

(۱) قدیم اخلاقی فلسفوں سے ذہنِ انسانی کو آزاد کرنا۔
(۲) ہمہ اسلام ازم اور عالمگیر محبت کو ثانوی اور وطنیت کو پہلا درجہ دینا اور ہمہ اسلام ازم کے مقابلے میں انسانی۔

اکا دلی ہو گیا۔

(۳) عمل اور بیداری، تجدد اور تخلیق

(۴) نشاط و سرمستی

"دینِ آدمیت" میں کہتا ہے ؎

جب کبھی بھولے سے اپنے ہوش میں آتا ہوں میں
دیر تک بھٹکے ہوئے انسان پر روتا ہوں میں
اقتضائے وقت سے تھا کل جو اک خالص رواج
ارتقائے وہم سے وہ دولتِ ایماں ہے آج
اب بھی عینِ عقل ہے ماضی کا ہر وہم و قیاس
کل کے "مجوجو" نے پہن رکھا ہے دیوتا کا لباس
جس کی انگلی تھام کر بچپن اٹھاتا تھا قدم
آج بھی محتاج ہیں بچپن کی اس دایا کے ہم
ایشیا والو یہ آخر کس خدا کی مار ہے
کل جو گھٹی پی تھی اس پر آج تک اصرار ہے
یہ مسلماں ہے وہ ہندو، یہ مسیحی، وہ یہود
اس پہ یہ پابندیاں ہیں اور اس پر یہ قیود
قہرِ انسانی پہ ظلم و جہل برساتی ہوئی
جھنڈیاں کتنی نظر آتی ہیں لہراتی ہوئی
کوئی اس ظلمت میں صورت ہی نہیں ہے نور کی
مہر ہر دل پر لگی ہے اک نہ اک دستور کی
گھٹتے گھٹتے مہرِ عالم تاب سے تارا ہوا
آدمی ہے مذہب و تہذیب کا مارا ہوا
کچھ تمدن کے خلف کچھ دین کے فرزند ہیں
قلزموں کے رہنے والے بھبکوں میں بند ہیں

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جوشؔ "شعرائے جدید" میں سے ایک مجدد شاعر ہے اور اس کی شاعرانہ تخلیقات اس ادبِ جدید کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں جو کہ پرانے ادب خاص کر غزل کی شاعری پر کشور کشا کی طرح چھا گئے ہیں۔ اس لئے کہ غزل کو شعرا مومنؔ و غالبؔ کے ایک حد تک بھی معتقد تو ہو گئے مگر غزل میں کوئی تخلیق نہیں کر سکے۔ شاید اس کا امکان ہی نہیں تھا۔ جو حکیمانہ شاعری کے مقابلے میں اب اُن کی شاعری کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور یہ تاریکی میں اِدھر اُدھر پہنچتے پھرتے ہیں، کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن نہیں بدل سکتے، اٹھنا چاہتے ہیں نہیں اٹھ سکتے! کیونکہ انہیں نئے اور جوان دست و بازو کی ضرورت ہے" اور دست و بازو غائب!۔

بہرحال اس مجموعہ کی اشاعت پر ہم کتب خانہ رشیدیہ دہلی کو مبارکباد دیتے ہیں، اس نے بڑا کام کیا، جوشؔ کا یہ مجموعہ ان کے تمام مجموعوں سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ اس میں ان کا تازہ کلام ہے۔ یہ چند نظمیں:۔

سرشکِ تبسم۔ یارِ صادق شاعر خود، گمنام دولے، ساون کا مہینہ، نوجوان سے خطاب۔ علم کی تشنگی شاد کا ایثار، تہذیب، خرابات، غلط بخشی، رقصِ بیباکی، سرمایہ و شہریار، اور دینِ آدمیت، اردو شاعری کا سرمایۂ ناز و افتخار ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہوں گا کہ جوشؔ نے اپنے ذوقِ انتخاب کے الڑھ پن کی بنا پر بعض نظمیں اس مجموعہ میں ایسی شامل کر دی ہیں جو نہیں ہونی چاہیئے تھیں۔ اس پر طرفہ ستم یہ بھی ہے کہ جوشؔ نے اس کتاب کی تصحیح خود نہیں کی جس کی وجہ سے کتابت کی بعض فاش غلطیاں رہ گئیں ہیں۔ گو اتنی نمایاں ہیں کہ ذہن خود اُن کی تصحیح کر لیتا ہے۔ تاہم رشیدیہ کتب خانہ دہلی کو چاہیئے کہ ایک مختصر غلط نامہ کتاب میں ضرور لگا دے۔

شاہکار

اڈیٹر مصداق احمد صاحب اشرف گیلانی اعزازی اڈیٹر پنڈت ٹھاکر دت صاحب
ڈکشنت "نگارہ" سائز ۲۰×۳۰، ۴۴ صفحات کاغذ معمولی، طباعت و کتابت حسین، چندہ سالانہ تین روپیہ فی پرچہ ۵/
میرٹھ تاریخی اور فنی اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔

سیاسی اعتبار سے تو اس کی اہمیت تاریخ میں مستند ہے۔ اسی سرزمین سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سوچیں مارتی ہوئی اٹھی اور اسی خاک سے اسمٰعیل بیان یزدانی اور شوکت میرٹھی جیسے باکمال ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ بسیط طور پر اگر اس کی تعریف کی جائے تو یہی وہ سرزمین ہے جس پر مہابھارت کی لڑائی لڑی گئی۔ لیکن دارالسلطنت دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کا جوبن چکنے کی طرح نہ چمک سکا؛

بہرحال اس سرزمیں نے ایک بشمبر ناتھ بیاکل جیسا شاعر و ماہر موسیقی اور انقلابی سپوت پیدا کیا (بیاکل صاحب کے لئے کسی اشاعت میں ہم وضاحت کیساتھ لکھیں گے)، اور مصداق احمد اشرف ان کی جیتی جاگتی زندہ یادگار ہیں جو میرٹھ کے ایک اعلیٰ و ممتاز خاندان کے فرد ہیں اور آپ ہی نے "سُر ساگر" رسالہ جاری کیا ہے۔

نیاز مند کے متعلق ایک عام رائے ہے کہ میری شاعری گلے کی وجہ سے مقبول ہے، لیکن کیا محرومی و مجبوری ہے کہ میں "ماہر موسیقی" "سُر ساگر" کے متعلق کوئی مستند رائے نہیں دے سکتا"!؟!

ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس رسالہ کی صحت اور افادیت کے لئے اشرف صاحب (اشرف صاحب بار ایٹ لا، سکریٹری مسلم لیگ میرٹھ سے مراد نہیں ہے)، مصداق احمد اشرف ا کی ذات کافی ضمانت ہے۔ اور اس کے مطالعہ اور طریقۂ تعلیم سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ موسیقی کے طالب علموں کے لئے یقیناً مفید ہو سکتا ہے۔

البتہ "موسیقی" کا تصور جس قدر حسین ہے اس کے لحاظ سے اس کا ادب منوہر نہیں، بہت ہی معمولی تبدیلیوں کے بعد یہ آئی اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ رسالے جاری کر دئے۔ اس کے بعد کہ زہر کھانے کا انجام موت ہے، زہر کھانا، انتہائے "صحت" و یا انتہائے شجاعت نہیں تو اور کیا ہے!؟

ہاں تو آفتاب اسی ساز سے پھوٹتا ہے جہاں سے نغمہ جاری ہوا، نغمہ بلغمہ ہے اس کی کیا تعریف کی جائے۔ مگر ہاں آفتاب کے اولین مضمون سے لیکر آخری مضمون تک ایک تار

بہرحال رسالہ ہر لحاظ سے موسیقی پر ایک کامیاب رسالہ ہے، فن موسیقی کے شیدائیوں کو اسے خریدنا اور استفادہ حاصل کرنا چاہئے۔

میں اس رسالہ کو اسلامی سماج کے لئے ایک مبارک قدم خیال کرتا ہوں، مسلمان لڑکیوں میں گانے بجانے کا ذوق بالکل نہیں ہے، حالانکہ موسیقی روح کی عبادت ہے اور کشش کا سامان، مسلم نوجوان کی ازدواجی زندگی محض اس لئے بے کیف ہوتی ہے کہ مسلمان لڑکیاں "نری مسلم لیگ" ثابت ہوتی ہیں؛ حالانکہ اگر وہ دائمی طور پر اپنی اہلیت کا اندازہ کریں تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کلچر، زبان اور خیال کے لحاظ سے کسی قوم کی لڑکی ان سے بازی نہیں لے جا سکتی؛ اور اس وقت بعض لحاظ سے وہ گل سبز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر کیا مصیبت ہے کہ زندگی کی یہ جیتی جاگتی تصویریں نقش اوہام بن کر اپنی تمام تمناؤں اور امنگوں کے ساتھ انحطاط اور گھٹن کے تہ خانوں میں ختم ہو جاتی ہیں؛

زندگی ــــ زندگی ــــــ زندگی!!! یہ ایک لفظ ہے اس کو پُر نشاط، پُر کیف اور پُر جمال بناؤ اور مسلمان مردوں کو موقع دو کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں مردانہ وار دوڑ سکیں، پھر جب وہ گھروں کو لوٹیں تو اپنے تبسم اور ترنم سے انھیں تازہ دم کر دو۔ اس اعلیٰ مقصد کے تکمیلی عناصر میں مسلمان لڑکیوں کا گانا جاننا بھی ایک عنصر ہے اور اس عنصر کی تکمیل اشرف صاحب کو "سُر ساگر" کے ذریعہ کرنی چاہیئے۔

ہل کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اتنی بڑی تعمیری حیثیت رکھتا ہے کہ ادبی رسائل اس کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتے! یہ علم اور انقلاب کی روح اُن طبقوں تک پہونچاتا ہے جو ہندوستان کے آنیوالے انقلاب کو شہریوں تک پہونچائیں گے۔

اس کا ادارہ (ایڈیٹوریل بورڈ) ہندی اور اُردو ادب کے ماہرین پر مشتمل ہے! جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور منوہر داس چترویدی جیسے فاضل ادب حضرات کے نام نظر آتے ہیں۔

ہل اپنے ظاہری روپ کے لحاظ سے نہایت نظر کش اور اپنے باطنی حسن میں مفید و دلنواز ہے، زراعت اور گاؤں کی زندگی پر آسان اور بے ساختہ زبان میں جس قدر کام کے مضامین اس رسالے میں نظر آتے ہیں، کم دیکھے گئے ہیں! سب سے پہلے ایک رنگین تصویر اور اس کے بعد بلاک کی تقریباً ۲۶ تصاویر ہوتی ہیں۔ ہل کی مندرجہ ذیل ترتیب بھی نہایت خوب ہے۔

(۱) سب سے پہلے ایک نظم
(۲) اس کے بعد گاؤں سے تعلق رکھنے والی مختلف باتوں پر مفید مضامین۔
(۳) کہانی (باتصویر)
(۴) اس کے بعد باغبانی کے متعلق مضمون
(۵) "دیش بدیش کی بات" میں ملکی و غیر ملکی سیاسیات اور معلومات۔
(۶) عورتوں اور بچوں کی دنیا
(۷) سوال و جواب
(۸) ہمارے جانور (جانوروں کی بیماریوں اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں مضامین
(۹) ہمارے صوبے میں گرام سدھار
(۱۰) تندرستی (حفظانِ صحت)
(۱۱) تصویروں کا مجموعہ
(۱۲) کام کی باتیں (نقد و نظر)
(۱۳) کون کیا کہتا ہے؟ (ملکی سیاسیات)
(۱۴) اپنے خیالات (حجم تقریباً ۴۰ صفحات)

اپنی اٹھان اور روپ کے لحاظ سے یہ انگریزی رسالوں کی طرح ہے؛ تصاویر مضامین کے ساتھ ہی چھاپی گئی ہیں۔ کیونکہ یہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے جاری ہوا ہے اس لئے وہ تمام آسانیاں اسے حاصل ہیں جو کسی دوسرے رسالے کو حاصل نہیں ہو سکتیں!

البتہ نظم کا حصہ کمزور ہے۔ یہ غالباً اس لئے کہ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں کوئی شاعر نہیں ہے۔ یہ اچھا تو ہے کم از کم "الہامات" سے تو محفوظ ہے۔ کیا مزے کی بات ہے کہ قوم کو بننے اور زندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے تعمیری سامان چاہیئں، مگر ہمارے شعرا خود کو "قیدِ زمان و مکان" سے آزاد خیال کرتے ہیں؛ ان غیر منطقی فلسفیوں کو اگر ایک وقت بھی ہم "دسترخوان" اور "باتھ روم" سے آزاد دیکھ لیتے تو ان کے ادّعا کو تسلیم کر سکتے تھے۔ (!؟) میری تجویز ہے کہ ہل کے ذمہ دار کارکن مشہور شعرا سے اپنے موضوع پر معیاری نظمیں لکھوائیں جو دیہاتیوں کے لئے زبان و خیال سے مفید ہو سکیں۔

اس طرح دو فائدے ہوں گے ایک تو دیہاتیوں کے لئے اچھا لٹریچر پیدا ہو جائے گا۔ دوسرے ذرا الہامات اور صدیوں کے فرسودہ اخلاقی فلسفوں کو آرام کرنے کا موقع ملیگا۔ تیسرے قدرتی طور ہمارے شاعری کی زبان آسان ہو جائیگی!

ایڈیٹر مصداق احمد صاحب شفق گیلانی
اعزازی ایڈیٹر پنڈت ٹھاکر دت صاحب
ڈائجسٹ "نگار" سائز حجم ۴۰ صفحات کاغذ معمولی، طباعت و کتابت حسین، چندہ سالانہ تین روپیہ فی پرچہ ۵/
میرٹھ تاریخی اور فنی اعتبار سے ہمیشہ مرجع و ممتاز رہا ہے۔

۲۰×۳۰ بڑے لکھائی چھپائی معمولی حجم ۴۰ صفحات ملنے کا پتہ: منیجر آفتاب پریس فیض آباد۔

بالکل تازہ رسالوں میں "آفتاب" بھی ایک نیا رسالہ ہے۔ بظاہر ہر نئے رسالے کا اجراء اُردو زبان کی ترقی اور کامیابی کا ثبوت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو نو گرفتار راہ کی مشکلات سے واقف نہیں ہوتے یا واقف ہوتے ہیں مگر ذوق کی سرشاری انھیں سوچنے کی مہلت نہیں دیتی، وہ بسم اللہ کہہ کر اپنی کشتی بھی اس سیلاب میں ڈال دیتے ہیں۔ ذوق بھی کیا بُری بلا ہے، اس کا ایک قصہ سنئے:۔

اسی چھ ماہی میں مجھ سے کئی اصحاب نے نئے رسائل جاری کرنے کا ذکر کیا۔ میں نے گھبرا کر ان سے کہا کہ اگر ہزار دو ہزار روپیہ واقعی اس کام میں لگانے کے لئے موجود ہے اور آپ تجارت کرنی چاہتے ہیں تو ادبی رسالہ نکالنے کے بجائے "جوتوں کی دوکان" کر لیجئے۔ فائدہ رہے گا۔ اور اگر تجارت نہیں خدمتِ ادب مقصود ہے تو روپیہ سے پہلے سوال یہ ہے کہ دُنیائے ادب میں شائع ہونے والے رسائل کے مقابلے میں آپ کونسا اجتہادی یا نیا سامان مطالعہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟ وہ احباب مجھے کوئی جواب نہ دے سکے، جس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ دورہ بہت سخت ہے، اور مرض لاعلاج۔ تب میں نے انسانیت کا آخری فرض ادا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ بھائی، ایشیا کے سرورق سے بحیثیتِ مدیر میں اپنا نام ہٹائے دیتا ہوں اور آپ کا نام لکھے دیتا ہوں، دو ہزار روپیہ لے کر میرے پاس آجائیے اور ایشیا کے "آمرِ مطلق" بن جائیے، مگر ان میں سے ایک نے بھی یہ تجویز نہ مانی اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ رسالے جاری کرلئے۔ اس یقین کے بعد کہ زہر کھانے کا انجام موت ہے، زہر کھانا، انتہائے "صحتِ دماغی" یا انتہائے شجاعت نہیں تو اور کیا ہے!؟

ہاں تو آفتاب اسی ساز سے پھوٹا ہے جہاں سے نغمہ جاری ہوا۔ نغمہ نغمہ ہے اس کی کیا تعریف کی جائے۔ مگر ہاں آفتاب کے اولین مضمون سے لیکر آخری مضمون تک ایک تناسب اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اور کچھ قومی احساس کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہ احساس، زیادہ روشن بھی ہوسکتا ہے اور اس کا ادبی معیار جواب بھی ایک سطح رکھتا ہے .... آسانی سے بلند کیا جاسکتا ہے۔ مجبوراً مجھے یہی کہنا چاہیئے کہ حقائق کسی قدر تلخ ہوں مگر ہمت نہیں ہارنی چاہیئے اور ناکامیوں کے خیال کے باوجود کام کرنا چاہیئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ناکامی کامیابی کی انتہائی منزل ثابت نہیں ہوسکتی۔ امید ہے کہ دُنیائے ادب آفتاب کی آمد کو دلیل آفتاب سمجھے گی اور قدر کرے گی۔

ماہنامہ "ہندوستانی" پٹنہ (ہندوستان میں، سالانہ چندہ تین روپیہ، چھ ماہ کے لئے دو روپیہ فی پرچہ ۴ر (دوسرے ملکوں کے لئے للعہ چھ ماہ کے لئے ہے، فی پرچہ ۶ر ایڈیٹر جناب سہیل عظیم آبادی سرورق بلاک کا، لکھائی چھپائی کاغذ حسین، ملنے کا پتہ، ماہنامہ "ہندوستانی" پٹنہ

"ہندوستانی" پٹنہ کی دوسری جلد کا چوتھا نمبر نگاہ کے سامنے ہے، اس کے ایڈیٹر کی شخصیت ہی اس کے مفید اور بلند ہونے کی دلیل ہے، "ہندوستانی" کے لفظ ہی سے ہمیں اس کے مقصد اور راستے کی ٹوہ لگ جاتی ہے۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستانی میں جس قدر نظمیں، کہانیاں یا مضامین ہیں وہ اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں اور نئے ادب کی آئینہ دار ہیں، اس نمبر میں سلام مچھلی شہری کی نظم "تبسم" خوب ہے۔ ان کی اکثر نظمیں "قیود" سے آزاد ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ اپنے موضوع کی حدوں میں ہے۔ اور اس کے کئی بند خوب ہیں، باقی میں وہی "آزادی" ہے جو قدرت سے خاص طور پر عزیزی سلام صاحب کو عطا ہوئی ہے!؟ "تتلی" کے عنوان سے طفیل احمد خاں کی نظم بہت ہی نازک ہے۔

نظموں کے علاوہ مضامین اور خاص کر کہانیاں تمام کی تمام نہایت آسان اور موثر "ہندوستانی" میں ہیں اور اپنا ایک

درجہ رکھتی ہیں۔
میں ایشیا کے ناظرین سے پُرزور سفارش کروں گا کہ اس کو خریدیں، یہ ایک قابل قدر رسالہ ہے۔

مقامِ محمود

ایک مثنوی، مصنف محمد صدیق حسن صاحب ضیا سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ و طباعت و کتابت متوسط قیمت درج نہیں، مصنف سے ریٹائرال ڈھوک متصل مسجد کپتان فیروز خاں راولپنڈی سے حاصل کیجا سکتی ہے۔

جون ۱۹۳۹ء میں عدمؔ صاحب اور ضیا صاحب سے کوئٹہ (بلوچستان) میں ملاقات ہوئی۔ عدم صاحب کا کلام میں پڑھتا رہا تھا مگر ضیا صاحب کے شعر سے ناواقف تھا، بارہا میں اپنے اس خیال کو دہرا چکا ہوں کہ انتقاد کا صحیح فرض اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم شاعر کی روزانہ زندگی اور اس کے فطری تقاضا سے واقف نہ ہوں! کوئٹہ میں ضیا صاحب سے بہت قربت اور مطالعہ کا موقع ملا۔ جس کے بعد میں ان کی ذات اور ان کی شاعری کے متعلق اظہار رائے کر سکتا ہوں؛

وہ ایک مذہبی انسان اور صوفیانہ عقائد کے "نوجوان" ہیں! میں نے جب انھیں دیکھا، تسبیح در دست اور گوشہ نشین؛ دبلے پتلے اور کچھ دائم المرض بھی! مذہبیت کے باوجود اُن کے مزاج میں درشتی اور خشکی نہیں، شاید یہ شاعری کا فیضان ہے۔ انھوں نے برابر میرے قہقہوں اور جنون انگیز باتوں سے دلچسپی لی اور مجھے امید پیدا ہو گئی کہ اگر کوئی کافر مسکرا کر انکا دامن پکڑ لے تو ان کے زہد و تقویٰ کی عمر اک نفس بھی نہیں ہے"-!؛

ضیا صاحب میں شعریت اور شاعری کے عناصر موجود ہیں۔ ان کا راستہ وہی ہے جو "جاوید نامہ" کے شاعر کا ہے جس طرح ڈاکٹر اقبال عطار و رومی سے متاثر ہوئے اسی طرح ضیا صاحب اقبال سے شدید طور پر متاثر ہیں ان کی شاعری قدیم اسلامی متصوفانہ خیالات اور دینی نظریات کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ جہدِ حیات کے دشمن نہیں ہیں۔ مگر اُسی جہدِ حیات کے مؤید ہیں! جو اسلامی میدان میں ہو، اور اسلام کی بنیادوں پر ہو!

یہ تو ہے ان کی شاعری کی اصل بنیاد، لیکن جہاں تک انکی شاعرانہ تراش اور صناعی کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ باوجود انتہائی مذہبی ہونے کے انکی شاعرانہ تراش میں رنگینی اور رجحان ہے۔ مقام محمود کے افتتاحی اشعار میں فرماتے ہیں ؎

پڑا جب نگہ کا نشانہ درست ہوا زیست کا کارخانہ درست
کھلا زخم سے قفل بابِ حیات کھلا زخم سے جوہرِ کائنات
یہی زخم، زخموں کا مرہم ہوا
اُسی زخم سے کشفِ آدم ہوا

یہ نظریہ کہ عشق بنائے کائنات اور تخلیقِ آدم کی بنیاد ہے۔ تمام متصوف شعراء کی اساس شعر رہا ہے؛ ضیا صاحب کی یہ مثنوی مقامِ آدم مندرجہ ذیل ضمنی عنوانات پر مبنی ہے۔ اور اسکی اساس بھی یہی قدیم نظریہ ہے۔

عبدالعزیز خاں صاحب کے تعارف کے بعد ظہورِ آدم۔ مقامِ آدم تفسیر آیہ نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (یعنی اس میں اپنی روح پھونکی)، سیر مقامِ وجود، اضطرابِ عشق۔ مقامِ محمود۔ مقامِ محفوظ حضورؐ کی ولادت سے پہلے دنیا کی حالت۔ ظہور تعلیم اسلام۔ عرفان تفسیر آیہ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ مسئلہ ذات جمالِ عشق۔ ضمنی عنوانات ہیں، جنکے ماتحت مثنوی کو مکمل کیا گیا ہے۔

ضیا صاحب زیادہ تر مثنوی ہی کہتے ہیں، اور جہاں تک ان کے معتقدات اور ان کے عقائدِ دینی کے اندر ان کی شاعری کی تعریف کرنے کا تعلق ہے، وہ نہایت کامیاب اور خوش گو شاعر ہیں؛ اظہار و بیان کی تمام تر قابلیتیں ان میں موجود ہیں۔ روانی، سلاست، شیرینی، تراکیب کی ندرت، اور بندشِ الفاظ کی چستی پورے شباب کے ساتھ ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ لیکن خیالات قدیم ہیں اور ان کی شاعری پرانے اخلاقی نظریوں اور فلسفۂ تصوف میں جکڑی ہوئی ہے جس کی کوئی آج افادی نوعیت و حیثیت نہیں

ہر چند کہ ان کے کلام میں عمل اور زندگی کی روح بھی پائی جاتی ہے مگر خال خال ؎

بناتا ہے دریا محبت کی بات — روانی مری ہے تلاشِ حیات
بڑھو، زندگی کی نشانی بنو — اگر نقطہ ہو تو کہانی بنو

دوسرے شعر سے آپ ضیا کے جوہر کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔ مگر کیا بدبختی ہے کہ "اسلامی شاعری" کا تخیل ضیا صاحب پر چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ اگر وہ خالص "شاعری" پر اکتفا کریں تو وہ تاریخ شعرا میں اپنی جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔

تابشِ خیال

مصنفہ حضرتِ افسر صدیقی امروہوی مُدیر تحریر کراچی، سائز $\frac{20\times30}{16}$

کتابت و طباعت متوسط، شروع میں مصنف کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ قیمت عہ؍

سب سے پہلے حضرتِ افسر نے اپنے قلم سے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے بعد اسرار احمد صاحب کریمی کا مقدمہ ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"جناب افسر امروہوی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا رجحان قدیم ایشیائی شاعری کی طرف ہے، وہ موجودہ مغربیت سے متاثر نہیں ہوئے"

ان کے کلام کا اکثر حصہ تغزل کے تحت میں ہے اور تغزل کی ساری خصوصیتیں کم و بیش ان کے یہاں موجود ہیں۔ شکوہ و شکایت، راز و نیاز، جفائے آسمان، حُسن پرستی، بدگمانی اور محبت کے دیگر غیر محسوس نقوش کی گلکاریاں اکثر نظر آتی ہیں"

یہ درست سہی مگر اسرار صاحب نے بعض جگہ اشعار کی مابعد الطبیعاتی تشریح کرکے ایسا ظلم کیا ہے کہ انھیں کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا ارشاد ہوتا ہے۔"

"رنگ و بو کا اختلاف نوعیت و ماہیت کے تضاد کا سبب نہیں کیونکہ پھول اور شمع کا رنگ روپ ایک ہی ازلی آفتاب کا مرہونِ منت ہے" ؎

تم گلستاں میں ہو تو رنگ بھی ہے پھول بھی ہے
تم گلستاں میں نہیں، خاک گلستاں میں نہیں

حالانکہ "تم" سے مراد اگر صرف انسانی پیکرِ لطیف تصور کیا جائے، تو اس شعر میں دوسری ہی قسم کی روح دوڑنے لگے مجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا خبط انسان کو ہے کہ اپنی دنیا سے آنکھ بند کرکے ادھر ادھر بھٹکتا ہے اور حقائق کی موہوم تعبیرات کرنے کا بُری طرح عادی ہو گیا ہے۔

لیکن بہرحال، جہاں تک حضرتِ افسر کی شاعری کا تعلق ہے ان کی شاعری فنی اغلاط سے زیادہ تر پاک اور پختہ کارانہ ہے اور وہ خوب فرماتے ہیں، مجھے تو یہ شعر بیحد پسند ہے ؎

یہ کس کو تاکتے رہتے ہیں دن رات
ستارے چرخ سے، ذرّے زمیں سے

ان کی شاعری ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے، گو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا ماہر شخص "مغربیت" (یعنی جدت و انقلاب) سے کیوں متاثر نہیں ہوا جبکہ ان کی شاعری، شاعرانہ تراش اور تخلیق سے عاری نہیں معلوم ہوتی ؎

یا بوئے گل اسیں رہی یا خاک ہماری
دامن کبھی خالی نہ ہوا بادِ صبا کا

پھر یہ ہے کہ اس دیوان کی غزلیں ۱۹۲۹ء کا دس سال پہلے کی ہیں۔ اس دس سال میں ان کے کلام میں جو انقلاب اور ترقی ہوئی ہے، اس کا اندازہ کوئٹہ میں ہوا۔ بہرحال کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ سنا ہے کہ ان کا تیسرا دیوان بھی شائع ہونے والا ہے۔

نقش و نگار (طبعِ ثانی)

مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی ناشر کتب خانہ رشیدیہ دہلی، سائز

"بادۂ مشرق" $\frac{20\times26}{8}$ حجم ۲۰۰ صفحات سے زیادہ کاغذ، جلد طباعت کتابت وغیرہ پہلے ایڈیشن سے اعلیٰ اور بہتر، قیمت عمہ علاوہ محصول۔

غالباً ۱۹۳۶ء میں "نقش و نگار" آگرہ میں چھپا تھا اور مکتبۂ جامعہ کو اس کی فروخت کے حقوق دے دیے گئے تھے۔ ناظم کے

جدید اسکول کی کامیابی اور ترقی کی یہ بین دلیل ہے کہ ایک ڈیڑھ سال ہی میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی"۔ اس کے بعد "فکر و نشاط" اور "شعلہ و شبنم" حضرت جوش کے دوسرے مجموعے جامعہ ملیہ نے شائع کئے جو تھوڑی تھوڑی مدت میں فروخت ہو گئے۔

اب ملک کے بے تاب مطالبہ کو دیکھ کر دہلی کے مشہور قدیم کتب خانہ رشیدیہ نے حضرت جوش کے چار مجموعے نہایت سلیقے اور نفاست کیساتھ شائع کئے ہیں "حرف و حکایت" کے متعلق اسی نمبر میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک "نقش و نگار" کا تعلق ہے یہ جوش کی ۲۹ شاہکار نظموں کا مجموعہ ہے، جو پانچ ابواب میں منقسم ہے؛

ملک کے مشہور ادیب و ناقد لطیف الدین احمد کے مقدمہ کے بعد نگارخانہ، خمریات، تاثرات، مطالعہ و نظر اور نسیب کے عنوان سے پانچ ابواب میں، قادر الکلامی، لطیف ترین مشاہدہ شاعرانہ الفاظ، تاثرات، محسوسات اور دقیق ترین مصوری کی ایک بسیط دنیا ہے جس کے مطالعہ سے روح انسانی ایک عجیب و وسیع عالم کی سیر کرنے لگتی ہے۔ جوش کی شاعری اور شعریت کا شباب ان اوراق میں مکمل طور پر جلوہ گر ہے۔ اور شاید ایک نظم ایسی نہیں جسکو غیر دلچسپ کہا جا سکے۔ بلکہ بعض جگہ ایسے ایسے مصرعے نظر آتے ہیں جن کو پڑھ کر روح فخر اور مسرت سے مخمور و سر بلند ہو جاتی ہے کہ

ہر بات ایک افسون، ہر سانس ایک جادو
قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

چہرہ پہ رنگ تمکیں آنکھوں میں بیقراری
ایمائے سینہ کوبی فرمان بادہ خواری

حسن ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

"جنگل کی شاہزادی" صفحہ،

یہ اس مفلس، جاہل، بے یار و مددگار ہندوستان کی شاعری ہے، جو مردم کش ہے اور جہاں آرٹ کی کوئی قدر نہیں، یہ اس قوم کی شاعری ہے جس کا ایک وطن ریش طلاں اشعار کے مصنف سے کہیں زیادہ کامیاب و مسرور ہے، لیکن وقت آئیگا کہ یہی شاعری ہندوستان کو دوسرے ملکوں کی نگاہ میں بلند کریگی،

"ایمائے سینہ کوبی، فرمان بادہ خواری"

کتب خانہ رشیدیہ دہلی یقیناً قابل مبارک باد ہے کہ اس نے نہایت آزادی اور خوش انتظامی کے ساتھ اختراعات جوش کی اشاعت کا انتظام کیا جوش کی تازہ تصویر بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

فکر و نشاط (طبع ثانی)

از جوش ملیح آبادی، ناشر کتب خانہ رشیدیہ دہلی قیمت ۱۲ حجم ۱۱۵، کاغذ، کتابت طباعت اور جلد وغیرہ دلکش۔ یہ مجموعہ ۴۲ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی کوئی ترتیب نہیں ہے ہر قسم کی نظمیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں، قدیم بھی جدید بھی، قدیم نظموں اور نئی نظموں کا فرق و امتیاز صاف طور پر ظاہر ہے۔ جہاں تک صناعی رنگینی اور نازک بیانی کا تعلق ہے، جوش کی جدید نظموں میں وہ بات نہیں پائی جاتی۔ گو عقائد و خیالات نگاری کی زیادتی سے ان کے شعر میں ایک نیا حسن و وقار ضرور پیدا ہوا ہے؛ اسی کتاب میں "نقاد" "فرشتے کی سیر" "بھٹکی ہوئی نیکی"، تین چار نظمیں پرانی ہیں جن کو بلا شک اردو شاعری کی جان کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ مجموعہ پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔

شعلہ و شبنم (طبع ثانی)

مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی ناشر کتب خانہ رشیدیہ دہلی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول حجم ۲۸۵ صفحات سائز بادۂ مشرق ۲۰×۲۶/۱۶ کتابت طباعت اور کاغذ تمام اجزاء مع جلد حسین و اعلیٰ۔

تصویر و تہدیہ کے بعد یہ مجموعہ چار ابواب میں منقسم ہے۔ آتش کدہ جسمیں سیاسی و قومی نظمیں ہیں، جس میں ۲۰ نظمیں ہیں دوسرا باب رنگ و بو ہے، جس میں ۵۴ منظریہ نظمیں ہیں۔ تیسرا باب، اسلامیات ہے جس میں ۱۹ نظمیں ہیں۔ چوتھا باب ہے

بادۂ سرجوش میں جدید رنگِ تغزل کے عنوان سے مسلسل غزلیں، اور قدیم رنگِ تغزل کے عنوان سے غیر مسلسل غزلیں ہیں۔

آتش کدہ میں کسان جیسی افاقی نظمیں ہیں۔ رنگ و بو گویا حریمِ فطرت ہے، جس میں فطرت کے رُخ سے ہر حجاب اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نازکی سے نازک ادائے فطرت الفاظ میں مسکرا رہی ہے۔ اس باب کو پڑھتے پڑھتے مجھے پنجاب کے ایک نہایت مشہور شاعر پر ہنسی آگئی۔ جن کا خیال ہے کہ جوش نے تمام عمر ضائع کی لیکن شعر کہنا نہیں آیا، میرا خیال ہے کہ اگر محض جوش کے مشاہدہ کرنے کی قدرت پر وہ تنہائی میں ایک لمحہ غور کریں تو شاید اُن کا دم نکل جائے۔ !؟

بابِ اسلامیات اس عہد کی نظموں کا آئینہ دار ہے، جب حضرت جوش غیر سے "مومنین" میں شمار ہوتے تھے۔ یہ تمام نظمیں ۱۹۲۶ء تک کی ہیں۔ اس باب میں ذاکر سے خطاب اور "سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب" جیسی شاہکار نظمیں ہیں، جو شاعر کے فنا ہو جانے والے مذہبی جوش کی آئینہ دار ہیں۔ یہی وہ نظمیں تھیں جو عام طور پر مسلمانوں میں جوش کی شہرت و عظمت کا باعث ہوئیں۔

بادۂ سرجوش کی مسلسل غزلوں میں خواجہ حافظ کے رنگ کا کامیاب تتبع کیا گیا ہے، جس میں ایرانی غزل کا ساز و برگ اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ کارفرما ہے۔

قدیم رنگِ تغزل میں سنہ ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک کی غزلیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان غزلوں میں جوش کی مجتہدانہ شان نہیں پائی جاتی مگر جابجا الفاظ کے پردے سے عروسِ تجدد جھانکتی ہوئی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ ؎

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے ملا نہ رنگِ شباب تیرا

اس باب کی قدیم رنگ کی غزلیں بھی، قدامت پرست شعرائے جدید کے کلام کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں۔ ؎

یوں نہ چھیڑو کہ بات سے کھو کر
پھر بہت تم کو یاد آئینگے ہم

اس باب میں مستی اور رواں شاعری رجسے ارباب غزل

حقیقی شاعری سے تعبیر کرنے پر مصر و معتقد ہیں، کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں ؎

دل پہ وہ زخم کھائے ہیں کہ نہ پوچھ | لطف بھی وہ اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ
عشق کی بیخودی کے عالم میں | ہم نے وہ بھید پائے ہیں کہ نہ پوچھ

وغیرہ۔

لیکن اس جنس ارزاں کے ساتھ ہی جب یہ قوی بے بہا نظر آتا ہے کہ ؎

جو باخبر تھے وہ مسکرائے، جو بے خبر تھے وہ کچھ نہ سمجھے
اٹھا کے بیگانہ وار آنکھیں کیا جو مجھ سے خطاب تو نے

تو شاعر کا اصل مقام معلوم ہو جاتا ہے۔

تمثیلی مشاعرہ

مصنفہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ ملنے کا پتہ انجمن اربابِ ذوق لائل پور (پنجاب)،

قیمت ۸؍ علاوہ محصول۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ کتابت طباعت اعلیٰ حسین نقش کش، مضبوط و زرّین ڈائی کی جلد، شروع میں مصنف اور محمد عبداللہ کامل کی تصویر بھی زینتِ کتاب ہے۔

میرے محترم و بزرگ دوست علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اپنے خلاق اور جدت آفرین شاعرانہ اور عالمانہ مزاج کے لحاظ سے اردو ادب کے چوٹی کے بزرگوں میں سے ایک ہیں، ان کے بعد کا ہے کو ایسے نیک دل، وسیع القلب، اور منصف مزاج بزرگ پیدا ہوں گے!

(یہ ہیں وہ سطور جن کا سلسلہ صفحہ ۱۷۲ پر کاتب صاحب کی عنایت سے ٹوٹ گیا ہے امید ہے کہ اب آپکی حیرت کم ہو گئی ہوگی !؟)

یہ ایک دلچسپ ڈرامہ ہے جس میں شعرائے متقدمین و متاخرین سودا۔ درد۔ میر۔ جرأت۔ مصحفی۔ انشا۔ آتش۔ نسیم۔ ناسخ۔ ذوق۔ مومن اور غالب کو ایک جگہ جمع کر کے بزمِ مشاعرہ منعقد کی گئی ہے۔ یہ ڈراما ۲۲ فروری ۱۹۲۳ء کو گورنمنٹ کالج لائل پور میں پنڈت جی کی نگرانی میں پہلی مرتبہ نہایت کامیابی کے ساتھ کیا

گیا، دیز آرٹ پیپر پر تمثیلی مشاعرہ کے کرداروں کا ایک دلچسپ البم بھی شامل کتاب ہے۔ یہ ڈراما پنڈت جی کے جدت آفریں دماغ کا نتیجہ ہے۔ ہرچند کہ مختلف عہد کے شعرا ہیں لیکن ایک ہی تمثیل میں ان کو جمع کر دیا گیا ہے، مکالمہ کا بے ساختہ تسلسل مزہ دے گیا ہے۔ ہر کردار کی بولی اس کے متعارفہ اسلوب زبان وسخن کے مطابق رکھی گئی ہے اور ان خصوصیاتِ فطری کو بیان کیا گیا ہے جو تمثیلی مشاعرہ کی کرداروں کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ ڈرامہ ہر لحاظ سے دلچسپ چیز ہے۔ اور اردو میں فرحت اللہ بیگ کے بعد یہ دوسرا شہکار ہے جسے زبان وادب کی جان کہنا چاہیے۔

مشاعرہ میں ہر شاعر کی وہی غزلیں پڑھوائی گئی ہیں جو اس کے اسلوب اور رنگ کی آئینہ دار ہیں۔ آخر میں "تلمیحی اور تشریحی نوٹ" کے عنوان سے مکالمہ اور غزلوں سے تعلق رکھنے والی تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔ اور سب سے آخر میں "افرادِ تمثیل کی پوشاکیں" کے عنوان سے ہر کردار کے لباس کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ یہ بجائے خود نہایت اہم چیز ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ ڈرامہ اس درجہ مکمل ہے کہ بغیر کسی ہدایت کے ہر جگہ کھیلا جا سکتا ہے۔ ۱۷،

مصنفینِ اردو

حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ۲۰ ؍ کے ٹکٹ بھیجے جانے پر مل سکتی ہے۔

یہ تقریباً ۱۳۰ مصنفینِ اردو کے حالات کا مجموعہ ہے۔ جسے سید نقار حسین نے ترتیب دیا اور حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے خوبصورتی اور سلیقہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سب سے پہلے مولانا حالی کی تصویر ہے اس کے بعد مرتب اور مرتب کے بعد خسرو دکن کی تصویر ہے۔

"اردو زبان کے پانچ رکن" کے عنوان سے ایک بلاک مولانا آزاد دہلوی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی نعمانی کا ہے جسے تحسین صاحب دہلی کے مشہور آرٹسٹ نے ترتیب دیا ہے۔ تصویر کے ساتھ ہر مصنف کے حالاتِ زندگی اور اس کی تصانیف کا بھی ذکر ہے۔ کتاب میں ہر نوع کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو اپنے ذوق اور ضرورت کے لحاظ سے کتابیں انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد "ناقدین" کے عنوان سے ایک فوٹو بلاک کی بڑی تصویر ہے جو تسلیم پانی پتی مرحوم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری پر مشتمل ہے۔

اس گروپ میں عبدالقادر سروری کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ شاید اس لئے ان کو یہ جگہ دی گئی کہ انھوں نے جدید اردو شاعری پر ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کے مشہور شاعروں اور ان کے کلام کی خصوصیات پر بھی درک نہیں رکھتے۔ جہاں تک تنقید اور تنقید نگاری کے ایک خاص اسٹائل کا تعلق ہے، یہ جگہ نیاز فتحپوری ہی کو دی جا سکتی تھی۔

اس کے بعد مترجمین کا چارٹ ہے، جو سید عابد حسین، مولوی عنایت اللہ، سید علی بلگرامی، مرزا محمد عسکری اور مولانا خلیل الرحمٰن وغیرہ پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد "ناول نگار" کے عنوان سے اردو کے مشہور ناول نگاروں کی تصویروں کا ایک چارٹ ہے جو مولوی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری، مرزا محمد سعید دہلوی، مولوی عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، ظفر عمر بی اے اور مرزا محمد ہادی رسوا پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ناول کی ایک علمی تشریح اور اس کے بعد ناول نگار حضرات کے حالات و تصانیف کا ذکر ہے۔

اس کے بعد افسانہ نویسوں کا تصویری چارٹ ہے۔ جو نیاز فتحپوری، سجاد حیدر، مسز حجاب امتیاز علی، خواجہ حسن نظامی، ایم اسلم، مہاشہ سدرشن، منشی پریم چند، مجنوں گورکھپوری، سلطان حیدر جوش، سید علی عباس حسینی، ل احمد اکبرآبادی اور قاضی عبدالغفار پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد ترتیب کے مطابق ان حضرات کے حالات اور تصانیف کا ذکر ہے۔

گئی، اب اُس نے دوبارہ اسی طرح درد والم میں ڈوبی ہوئی وہی آواز پھر سنی، لہٰذا اُس نے اس راز کا معلوم کرنا ضروری خیال کیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اُس مجسمہ کی طرف چلی یہاں تک کہ اُس کے پاس جا پہونچی، اُس نے دیکھا کہ ایک مغنی انسان مسکین صورت چپ لیٹا لال محل کی دیوار کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ اب سوزاکس نے اپنی نظریں اسی طرف دوڑائیں جدھر یہ غریب دیکھ رہا تھا ... والوں کا خوب مقابلہ کر سکتے ہیں ——!؟

نثر نگار حضرات کے بعد، شعراء کے تین چارٹ ہیں!

(۱) شعرائے متقدمین (۲) متوسطین (۳) متاخرین (۴) شعرائے جدید۔

(۱) درد۔ سودا۔ انشا۔ انیس۔ مصحفی۔ مومن، آتش ذوق اور غالب پر مشتمل ہے!

(۲) متوسطین۔ اسمٰعیل میرٹھی، حالی پانی پتی، امیر مینائی نظم طباطبائی، ریاض خیرآبادی، نظر لکھنوی، داغ دہلوی، شاد عظیم آبادی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی پر مشتمل ہے۔

(۳) شعرائے متاخرین۔ بسمل الہ آبادی، ثاقب لکھنوی بیخود دہلوی، عزیز لکھنوی، چکبست لکھنوی، اقبال، صفی لکھنوی۔ سیماب اکبرآبادی۔ آغا شاعر اور شاد حیدرآبادی پر مشتمل ہے۔

(۴) شعرائے جدید۔ اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، جگر مرادآبادی، جلیل مانک پوری، فانی بدایونی حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، مولانا ظفر علی خان اور ساغر نظامی پر مشتمل ہے۔

شعرائے متاخرین اور شعرائے جدید کی ترتیب اصولی طور پر غلط ہے۔ "شعرائے جدید" سے اگر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ وہ شعراء جنھوں نے نئے خیالات اور اسلوبِ بیان کی بنیاد اردو شاعری میں رکھی، تو چارٹ اس طرح مرتب ہونا چاہیئے۔

چکبست، اقبال، جوش، حفیظ، ظفر علی خان، اکبرآبادی، ساغر نظامی۔

(میں نے اپنا نام اسلئے لکھا ہے کہ غلطی سے زردار صاحب نے شعرائے جدید میں مجھے بٹھا دیا ہے)

اس کے بعد ایک چارٹ ہونا چاہیئے تھا۔ "جدید غزل گو شعراء" اسکی ترتیب یوں ہونا چاہیئے تھی۔

حسرت، اصغر، جگر، فانی، عزیز، صفی وغیرہ

(اسمیں آرزو لکھنوی کا نام ہونا لازمی تھا)

شعرائے متاخرین، یہ ہو سکتے ہیں:۔

بیخود، ثاقب، آغا شاعر، جلیل مانک پوری، نوح وغیرہ

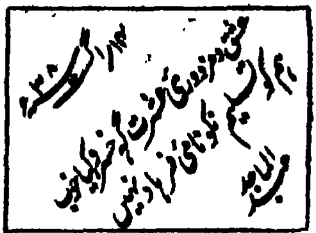
شعرائے متاخرین میں جناب بسمل الہ آبادی کے ذکر کی منطق میرے سمجھ میں نہیں آئی، جبکہ وہ نہ اُن لوگوں کے ہم عمر ہیں نہ ہم عصر، ان کو کہیں اور جگہ دینی چاہیئے۔ ان کا اسلوب سخن قدیم اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ تہذیب و اصول کا تقاضہ ہے کہ ان کی جگہ نوح صاحب کو ملنی چاہیئے۔

اس سلسلہ کے بعد مفسرین، ڈرامہ نگار، اور مورخین کا چارٹ ہے جو (۱) مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالحق حقانی مولوی فتح محمد جالندھری (۲) آغا حشر، قریشی، امتیاز علی تاج (۳) مولوی ذکاء اللہ، مولانا اسلم جیراجپوری، اور سید ہاشمی فریدآبادی پر مشتمل ہے۔

ان حضرات کے حالات اور تصانیف کے ذکر کے بعد مزاحیہ کام کا ارادہ کرکے نہایت تیزی سے ساتھ روانہ ہوئی:

پیاری بیٹی! میں نہیں جانتی کہ اس آخری وقت میں تجھ سے متعلق کس کو وصیت کروں اس لئے کہ تیرے باپ نے تجھے بیٹی بنانے سے انکار کر دیا اور اس دنیا میں جو واحد شخص مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا وہ تو چل بسا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس عالم کا ایک رحیم خدا ہے جو دماغوں کے تمام پوشیدہ خیالات اور دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں اور خواہشوں کو جانتا ہے اور غمگینوں کے دلوں میں غم کی دہکتی ہوئی آگ اور بدبختوں کے پہلوؤں میں بدنصیبی کے ...

سب کا انگریزی چارٹ مخلوط ہے اور بڑا دلچسپ ہے، فلسفہ کے ماتحت سجاد مرزا بیگ دہلوی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی تصویر شعر کی صورت میں اس طرح ہے۔



یہ تو معلوم ہو گیا کہ مولانا نے تصویر کھنچوانا اپنی ثقاہت دینی کے خلاف خیال کیا، لیکن اس شعر سے تصویر کھنچوانے یا نہ کھنچوانے کا کیا تعلق ہے!؟ بعد غور بھی سمجھ میں نہ آسکا نیاز صاحب فتحپوری روشنی ڈالیں تو کچھ بھید کھلے ——!؟

معاشیات کے ماتحت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور مولوی محمد الیاس برنی، سیاست کے ماتحت مولانا محمد علی اور طب کے

۱۸ سلسلے میں ڈاکٹر غلام جیلانی اور حکیم کبیرالدین صاحب کی تصویریں ہیں۔

بہرحال مصنفینِ اردو کی یہ نئی قسم کی فہرست نہایت وقت اور کاوش کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے، اور اس نے شائع ہو کر فہرست شائع کرنے کے تمام قدیم طریقوں کو ناکام بنادیا ہے، حالی پبلشنگ ہاؤس کے کارکنان کی ذہانت کی یہ بہترین دلیل ہے۔

نے خوبصورتی اور سلیقہ کے ساتھ شائع کیا ہے، سب سے پہلے مولانا حالی کی تصویر ہے، اس کے بعد مرتب اور مرتب کے بعد خسرو دکن کی تصویر ہے۔

"اردو زبان کے پانچ رکن" کے عنوان سے ایک بلاک مولانا آزاد دہلوی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی نعمانی کا ہے جسے مجتبیٰ صاحب دہلی کے مشہور آرٹسٹ نے ترتیب دیا ہے۔ تصویر کے ساتھ ہر مصنف کے حالات زندگی اور اس کی تصانیف کا مجمل ذکر ہے۔ کتاب میں ہر قسم کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو اپنے ذوق اور ضرورت کے لحاظ سے کتابیں انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد "ناقدین" کے عنوان سے ایک فوٹو بلاک کی بڑی تصویر ہے جو سلیم پانی پتی مرحوم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری پر مشتمل ہے۔

اس گروپ میں عبدالقادر سروری کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ شاید

ماہنامہ مووی لینڈ

کنگس وے، سکندرآباد دکن زیرادارت ایل۔ سی۔ بھلہ بی اے۔ زیر نگرانی محمد حسام الدین خانصاحب غوری۔ سالانہ چندہ ٨ اردو انگریزی دونوں زبانوں میں،

یہ ایک فلمی و ادبی رسالہ ہے جس کا اردو ایڈیشن جولائی نمبر پیش نظر ہے۔ فلمی مباحث پر جس قدر کڑی تنقید کی ضرورت ہے اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ اگر فلم کمپنیوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو شاید ہندوستان بشدید مشکلات میں پڑ جائے۔

آزاد ملک نہ ہونے کی وجہ سے صنعت فلم کے ذریعہ ہم کوئی نمایاں افادی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اس معذوری اور بیکاری عہد میں مجبوراً محض جذباتی اور رومانی کھیلوں پر وہ طاقت صرف ہو رہی ہے جو آزاد ملکوں میں خاصکر جاپان میں تعمیری کاموں پر صرف ہوتی ہے۔

لیکن شکر ہے کہ ایک طبقہ فلمی دنیا میں ایسا بھی ہے جو دنیائے فلم کی تعمیری ترقی اور اس کو عروج کمال کی منزلوں کی طرف راہبری کرتا ہے۔ "موی ٹون" ایک ایسا ہی رسالہ ہے جس میں زیادہ تر اصلاحی اور فلمی مضامین ہوتے ہیں۔ جن حضرات کو فلم اور اس کے متعلقات سے دلچسپی ہے، ان کیلئے یہ بہترین سامان مطالعہ فراہم کرسکتا ہے۔

ساغر نظامی

گئی، اب اُس نے دوبارہ اسی طرح درد والم میں ڈوبی ہوئی وہی آواز پھر سنی، لہٰذا اُس نے اس راز کا معلوم کرنا ضروری خیال کیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اُس مجسمہ کی طرف چلی یہاں تک کہ اُس کے پاس جا پہونچی، اُس نے دیکھا کہ ایک نحیف انسان مسکین صورت چپ لیٹا ہوا لال محل کی دیوار کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ اب سوزاں نے اپنی نظریں اسی طرف دوڑائیں جدھر یہ غریب دیکھ رہا تھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا، اس پر اختلاج کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور دل دھڑکنے لگا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ یہ مسکین لال محل کی اُس کھڑکی پر نظر جمائے ہوئے ہے جس میں کبھی راتوں کو یہ خود پوری آن بان سے بیٹھ کر فضائے عالم کی سیر کیا کرتی تھی۔ اِس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ غمزدہ ایک سفید ٹکڑا جو کسی کا خط معلوم ہوتا ہے بار بار اپنے کلیجے سے لگاتا ہے کبھی اُس کو چومتا ہے اور کبھی آنکھوں پر رکھتا ہے، اب وہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے اس پر جھک پڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خط تو خود اِس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور وہ نیم مردہ انسان اس کا سچا عاشق جلبرت ہے اس وقت اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ آخری سانسیں لے رہا ہے اور قبر میں عذاب دیئے جانے والوں کی سی پریشانی ہے۔ بھرائی اور ضعیف آواز میں اِن کلمات کی تکرار کر رہا ہے۔

"پیاری سوزاں"! رخصت" "جان سے زیادہ عزیز سوزاں رخصت" وہ یہ دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی اور ایک دردناک چیخ ماری جس سے فضائیں غم والم سے معمور ہو گئیں، اُس نے کہا "افسوس! پیارے بھائی! تجھے میں نے تباہ کیا ہے"، پرانی صحبتیں یاد آگئیں اور قدیم محبت نے جوش مارا، زمین پر گر پڑی، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور جلبرت کے ہاتھ پر بے شمار بوسے دیئے،

جلبرت کا ہاتھ اِس غمزدہ کے آنسوؤں سے تر ہو گیا اور رحم طلب انداز میں کہنا شروع کیا "پیارے جلبرت! میں یہ جو مصیبت کی ماری تیرے قدموں میں پڑی ہوں، تیری گناہگار ہوں، مجرم ہوں، مجھے معاف کر دے مجھے بخش دے میری خطائیں معاف کر دے، میں ایک بدنصیب اور آفت زدہ عورت ہوں، مجھ سے زیادہ کوئی دنیا میں رحم و کرم کا مستحق اور مدد و یاری کا محتاج کوئی نہیں۔ جلبرت کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری لُٹی ہوئی دولت اور تباہ شدہ زندگی پھر مل گئی۔ اُس نے سوزاں کی پیاری آواز کو محسوس کر لیا پہلے اس کا تمام جسم لرزنے لگا اور پھر اپنی کمزور نگاہیں اپنی زندگی کی اُجڑی بہار کی طرف اٹھائیں اور اُس کو دیکھ لیا۔

اس کی پلکوں سے ایک گرم آنسو سوزاں کے ہاتھ پر گرا یہی اس کی زندگی کا آخری سرمایہ تھا اس کو بھی اپنی پیاری سوزاں کی نذر کر دیا اور رخصت ہو گیا۔

"شاید اِسی اُمید پر جلبرت جی رہا تھا" ○

جلبرت سوزاں کا چچازاد بھائی تھا منگیتر تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ سوزاں سے ایسی محبت کرتا تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، اور عمر بھر سوزاں کا ہی دم بھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اِسی شغل میں جان گنوا دی۔ سوزاں اب اس کے بے جان جسم کے قریب بیٹھ گئی تاکہ اُن روابط کے سبب جلبرت کے جس قدر حقوق اس کے ذمہ واجب تھے اِس آخری دم میں اِن میں سے جس قدر ممکن ہو ادا کر دے

وہ کچھ دیر اسی شغل میں محو رہی پھر اسے ہوش آیا اور یہ یاد آتے ہی بصد حسرت وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ میں نے اپنی لخت جگر کو اُس اونچے ٹیلے پر اکیلا سوتا چھوڑا ہے، وہ وہاں سے ایک خوفناک کام کا ارادہ کر کے نہایت تیزی کے ساتھ روانہ ہوئی۔

پیاری بیٹی! میں نہیں جانتی کہ اِس آخری وقت میں تجھ معصوم کے متعلق کس کو وصیت کروں اِس لئے کہ تیرے باپ نے تجھے بیٹی بنانے سے انکار کر دیا اور اس دنیا میں جو واحد شخص مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا وہ تو چل بسا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس عالم کا ایک رحیم خدا ہے جو دماغوں کے تمام پوشیدہ خیالات اور دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں اور خواہشوں کو جانتا ہے اور غمگینوں کے دلوں میں غم کی دہکتی ہوئی آگ اور بدبختوں کے پہلوؤں میں بدنصیبی کے بھڑکتے ہوئے

شعلوں کو دیکھتا ہے، میری پیاری بیٹی! میں تیرا معاملہ اُس کے سپرد کرتی ہوں اور تجھے اس کی رحمت کی آغوش میں دیتی ہوں جو تمام شفیقوں سے زیادہ شفیق اور سارے مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ بیٹی میں تیرے لئے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ دنیا والے میری اس رسوائی کو جس کی میں مرتکب ہوئی ہوں، ہرگز نظر انداز نہ کریں گے۔ وہ شیطان نما انسان جس نے مجھے اس روسیاہی پر آمادہ کیا اور جو میرے ساتھ اس معاملہ میں برابر کا شریک ہے جب اُس نے ہی مجھے نہ بخشا تو کسی اور سے رحم کی کیا اُمید ہے۔ بیٹی مجھے اس دنیا سے کوئی اُمید کرم نہیں اس لئے اب میں اُس عالم علوی کو جا رہی ہوں جو عدل اور رحم سے بھرا ہوا ہے ممکن ہے مجھے وہاں کوئی طاقت ایسی مل جائے کہ اگر میں بے خطا ہوں تو مجھے معاف کر دے اور اگر گنہگار ہوں تو مجھ پر رحم فرمائے، بیٹی! میں اس لئے مر رہی ہوں، میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی کی بدبختی تیری معصوم زندگی کو بھی بے ڈھب ہے" مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ جب لوگ تجھے میری گود میں دیکھیں تو تجھ پر بھی وہی حقارت آمیز نظریں ڈالیں جو میری قسمت میں لکھی ہیں۔ بیٹی! میں تجھے اس لئے یہاں اکیلا چھوڑے جاتی ہوں کہ ممکن ہے کوئی شفیق رہگیر اِدھر سے گزرے اور تیرے خستہ حال پر رحم کھا کر تجھے سینہ سے لگائے اور تجھ پر شفقت کرے اور اُسے تیرے حالات کا علم نہ ہو اور اُس سے تیرا تمام معاملہ پوشیدہ رہے اور تو اس کے گھر اپنی زندگی سعادت مندی، خوشی اور اطمینان سے بسر کرے، تجھے نہ اپنے باپ کے کرتوت یاد آ آ کر ستائیں اور نہ ماں کا خیال اور اُس کی پُر مصیبت زندگی کا تصور تجھ پر قیامت ڈھائے۔

الٰہی! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کمزور عاجز اور چھوٹی سی بچی کسی شفقت بھرے دل اور رحمت اثر سائے کی محتاج ہے اور اسے ایک ایسا حامی درکار ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا ذمہ دار بنے۔ اور میں اس کی حفاظت اور پرورش کے لئے زندہ رہنے سے عاجز ہوں اور یہ ہر گناہ سے پاک اور ہر خطا سے بری ہے اور جس خطا کا ارتکاب اس کے والدین نے کیا ہے اس کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تو تو اس پر رحم کر اور اپنی شفقت کی وسیع چادر میں اس کو چھپا لے، اور شفیق دل، خوشگوار گہوارہ اور ابدی عیش و عشرت اس کے لئے مہیا کر دے۔

اب سوزاں نے اپنے جسم کے کپڑے ایک ایک کر کے اتارنے اور اپنی لختِ جگر اُڑھانے شروع کئے تاکہ پچھلی رات کی ہوشربا سردی اس معصوم کو تکلیف نہ دے۔ اس نے اپنے جسم پر صرف ایک قمیص رہنے دی وہ بھی اس لئے کہ جب اس کی لاش ڈوب کر پانی کی سطح پر آ جائے تو اس قمیص سے جسم کا کچھ حصہ ڈھکا رہے۔

سوزاں آج دنیا کی ہر چیز سے رخصت ہونے کا ہمیشہ کے لئے پختہ ارادہ کر چکی ہے۔ اس کی زندگی کی کل کائنات ایک معصوم بچی رہ گئی تھی جو اس وقت عالم کے ہر ایک انقلاب سے بے خبر اس کے سامنے پڑی تھی۔ محبتِ مادری نے جوش مارا وہ بے اختیار ماریہ پر جھک پڑی اور بڑے پیار سے اس کی معصوم پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ جس کے پردے میں اپنی ساری محبت، شفقت، رحمت اور تڑپ نچھاور کر دی اور پھر غم انگیز لہجہ میں چلائی "لختِ جگر ماریہ رخصت پیارے جلبرت میں بھی تیرے پاس آتی ہوں" محترم کاترین میری خطائیں معاف کر دے"

اور پانی میں کود پڑی۔

اس جوانا مرگ کی موت پر موجیں کفِ افسوس ملنے لگیں، تارے حسرت و یاس سے سطح آب کو تکنے لگے اور اِرد گرد کے پہاڑوں پر مایوسی کا عالم طاری ہو گیا۔

مرکز نے شہرِ عسل (ہنی مون) کی پہلی رات اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ لال محل کی سب سے اونچی کھڑکی میں پُر لطف قصّے اور مزے دار کہانیاں کہتے، راز و نیاز کرتے ایک عجیب کیف و سرور کے عالم میں گزاری۔ اس خلاصۂ حیات رات میں کبھی دونوں فراق کے غم انگیز واقعات بیان کرتے اور کبھی بادۂ وصال کے نشہ میں مدہوش ہو جاتے کبھی اِن کی نظریں دریا کے صاف شفاف پانی کو عبور کرتی تھیں اور کبھی زمین کی ہری بھری گھاس پر لوٹتی اور آسمانی وسعت کی سیر کرتی وہاں جا رکتی تھیں جہاں آسمان و زمین دونوں ایک جگہ ملتے ہیں کبھی موجودہ سعادت پر مسرور اور آئندہ خوش بختی سے خوش ہوتے اور کبھی شرابِ ارغوانی کے جام پر جام اُڑاتے، جس سے اُن کی فرحت

میں اضافہ ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ دونوں اِس قدر سرمست اور سرشار ہوگئے کہ اپنے آس پاس کی چیزوں کا بھی ہوش نہ رہا جب رات تمام ہوئی اور نسیمِ سحر نے متین اور ضابطہ غنچوں کو گدگدایا درختوں کی زلفوں کو سلجھایا اور لال محل کے بُرجوں میں ٹکرائی تب اِن دونوں کو ہوش آیا اور محسوس ہُوا کہ رات تمام ہوگئی اور نسیمِ صبح بیدار ہوئی اِس لئے یہ اپنے مقام سے اُٹھے اور سونے کے لئے اپنی خوابگاہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔

وہ دونوں ابھی اِسی کھڑکی میں کھڑے تھے دفعتہً مرکزیہ نے محسوس کیا کہ مرکز کے چہرے پر کچھ خوف اور پریشانی کے آثار ہیں، اُس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کسی طرف کان لگائے ایک آواز سُننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے اپنے خاوند سے پوچھا کہ یہ اچانک تمہارا کیا حال ہوگیا۔ مرکز نے اُس کو کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے ذرا جھک کر دریا کے کنارے پر نظریں جمادیں۔

اگرچہ صبح ہوچکی تھی لیکن چاند اب بھی فضاؤں میں چاندی لُٹا رہا تھا اور لال محل اور اُس کے سامنے کے کل مناظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ مرکز اور مرکزیہ دونوں نے چاندنی صاف اور دُھلی ہوئی روشنی میں دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی بچی کھڑی بلبلا رہی ہے اور دریا کے بہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کرکے "ہائے امّاں" "ہائے امّاں" چلا رہی ہے۔ اِن دونوں کی نگاہوں نے اس کے اشاروں کا پیچھا کیا تو انھیں دریا میں ایک جگہ نظر آیا کہ ایک نیم عریاں عورت ہے اور ڈوبی ہوئی لاش کی طرح پانی کی موجیں جھکولے اور تھپیڑے دے کر کبھی اس کو اِدھر لے جاتے ہیں اور کبھی اُدھر، مرکز یہ منظر دیکھ کر اپنی عشرتکدہ سے دریا کے کنارے کی طرف یہ کہتا ہُوا بے تحاشا بھاگا کہ "اگر وہ مرگئی تو بڑی خرابی آئے گی" اور پھر اپنے نوکروں کو آواز دی کہ میرے ساتھ آؤ اور دریا کے کنارے پر جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی جا پہونچا۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہوگئی، غم و الم کے بادلوں نے اس کو گھیر لیا جب اس نے دیکھا کہ یہ لڑکی اس کی اپنی بیٹی ہے اور ڈوبنے والی وہ معصوم فطرت سوزاں ہے جس کو پہلے تو بھولا بھالا بن کر اِس نے اپنے جال میں پھنسایا اور پھر اپنی ہوس کاری سے اس کی زندگی برباد کرکے اُسے گھر سے نکال دیا۔

مرکز نے اپنے ایک نوکر کو حکم دیا کہ اِس لڑکی کو لال محل میں لے جاؤ اور باقی نوکروں سے کہا کہ اس لاش کے پیچھے دریا میں کود پڑو، اور اس کو کنارے تک لانے کے لئے اپنی جان تک لڑا دو، اِس عجیب منظر سے مرکز کے دل پر یہ اثر ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ نوکروں کا شور شغب اور لڑکی کی چیخ پکار سُنکر تماشائی کافی تعداد میں دریا کے کنارے پر جمع ہوچکے تھے۔ اِن میں سے جو تیرنا جانتے تھے لاش کی تلاش میں دریا میں کود پڑے۔ باقی مرکز کے چاروں طرف بیٹھ کر اس کی پریشاں حالی پر افسوس کرنے لگے کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

تیراک اور غوطے خور ڈوبنے والی کی تلاش میں پھیل کر دریا کے مختلف حصّوں کی طرف روانہ ہوئے تھے اور اِن کے پیچھے کنارے سے تمام دیکھنے والوں کی شفقت آمیز نگاہیں تھیں، اور دعا اور رحم بھرے دل۔ دریا اِس وقت طغیانی پر تھا، تیرنے والوں اور دریا کی طوفانی موجوں میں ایک خوفناک جنگ ہورہی تھی جس میں کبھی تیرنے والے فتحیاب ہوتے اور موجوں کو چیرتے پھاڑتے دور نکل جاتے اور کبھی دریا کی لہریں انھیں دبالیتیں اور نہایت بے بسی اور مجبوری کے عالم میں پیچھے دھکیلتیں کنارے کے بالکل قریب چھوڑتی تھیں۔ تیرنے والوں کو جب کبھی ڈوبنے والی کے سر کے بال یا کرتہ دکھائی دے جاتا تو اُن کی اُمیدیں بڑھ جاتیں رگ رگ میں نئی روح پیدا ہوجاتی اور گئی ہوئی قوّت واپس آجاتی اور وہ نہایت قوت ہمّت، جذبۂ تلاش اور دلیری سے طوفانی موجوں کے خونخوار گرداب پہاڑوں کے سینے پھاڑتے اور اُن کو چیرتے پھاڑتے آگے بڑھتے اور جب بہزار دشواری اس جگہ پہونچتے جہاں ڈوبنے والی کا نشان پایا تھا تو انھیں وہاں کچھ نہ ملتا۔ وہ بے جان ہوجاتے اور اُن کا دل ٹوٹ جاتا پھر طغیانی لہریں انھیں ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دیتی تھیں بلکہ ان کو پیچھے ہٹا کر پھر وہیں لے آتی تھیں جہاں سے وہ چلے تھے۔ ڈوبنے والی کی لاش کبھی تہِ دریا میں بیٹھ جاتی اور کبھی پھر سطح پر اُبھر آتی یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا یہاں تک کہ ایک دفعہ وہ ایسی نیچے بیٹھی کہ دیر تک نہ اُبھری جب اس کے متلاشی اِس کے اُبھرنے سے نااُمید ہوگئے تو سب نے ایک دم غوطہ لگا

کر تب دریا میں اُس کو ڈھونڈنا شروع کیا، دیر تک وہ سب دریا کے اندر غائب رہے پھر اُبھرے تو ڈوبنے والی اُن کے ہاتھوں پر تھی، لوگوں کو ابھی یہ بات نہ معلوم ہو سکا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی۔ اِدھر سارے تیراک اِس جواں مرگ کو ہاتھوں پر اُٹھائے تیرتے ہوئے کنارے کی طرف آرہے تھے اِدھر ناظرین کی دعاؤں کی آہ و زاریوں اور آہ و زاری کی چیخ پکار نے دریا کے کناروں کے درمیان ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا اور آسمان کی آفاقی فضائیں اِن سے گونج رہی تھیں یہاں تک کہ تیراک کہ اِس معصوم فطرت کو لے کر کنارے پر پہونچے اور زمین پر اُگے ہوئے سبزے کے نرم بستر پر اس کو لٹا دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں دریا کا کنارہ اچھا خاصا ماتم کدہ بن گیا۔ عورتیں شہیدہ پر سینہ کوٹ رہی تھیں اور مرد شہیدہ کے سوگوار تھے۔

جس طرح سوزآں سے بچھڑ کر غریب جلبرت کی زندگی تباہ ہو گئی اور اس کا امن چین غارت ہو گیا اور اسے ایک لمحہ کو بھی چین نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح مرکیز پر اس حادثہ کے بعد آگے پیچھے اِس قدر آفتیں آئیں اور پے در پے اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اِس غریب کی زندگی اجیرن ہو گئی اور پھر اس کو جیتے جی شکست ملا۔ اِس واقعہ کے کچھ دن بعد اس کی بیٹی ماریہ ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئی اور تین دن تک مصیبتیں اُٹھا کر اپنی ماں سے جا ملی۔

اِس کی نئی بیوی کے نزدیک پہلے تو یہ واقعہ ایک معمّا تھا لیکن دو چار دن کے بعد اسے تمام حالات کا علم ہو گیا جس سے اِس نے مرکیز کے تمام کردار کا اندازہ لگا لیا رفتہ رفتہ اس کے دل سے مرکیز کی محبت کم ہونا شروع ہو گئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں مرکیز کے اس نئے شکار کو اس سے سخت نفرت ہو گئی اور وہ اس کی نظروں میں انتہا درجہ حقیر اور ذلیل ہو گیا، الحاصل وہ موافقت کا عہد توڑ کر "نیس" میں اپنے گھر چلی گئی، اِن تمام آفتوں سے زیادہ تباہ کن آفت جس نے مرکیز کو کہیں کا نہ رکھا یہ تھی کہ اِس محل کی کھڑکی سے شبِ عشرت کی صبح کو دریا کے کنارے جو خونی منظر اس نے دیکھا تھا وہ اس کے دماغ پر ایسا بے طرح چھا گیا کہ رات کا کوئی حصہ اور دن کی کوئی گھڑی ایسی نہ تھی کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہو اسے رستہ چلتے چلتے یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ میرے سامنے ایک ناپیدا کنار دریا ہے جس میں طوفانی موجوں نے ہنگامۂ محشر بپا کر رکھا ہے۔ سوزآں کی لاش اس میں بہی چلی جا رہی ہے اور موجیں اس کو اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہیں "ماریہ" اس کے کنارے پر کھڑی بلبلا رہی ہے اور وہ چلا پڑتا تھا کہ "ماریہ سوزاں میں مدد کو آرہا ہوں"

اور وہ اس وہمی دریا میں خیالی ڈوبنے والی کو بچانے کے جذبہ کے تحت ایک فقرہ لگاتا، اتنے میں وہ منظر اس کی نگاہوں سے دور ہو جاتا۔ اس سے وہ دلی رنج محسوس کرتا اور اس ناقابلِ برداشت قلبی تکلیف کی تاب نہ لا کر وہیں بیہوش ہو کر گر جاتا تھا۔ کبھی وہ غلبۂ جنون اور جوشِ وحشت میں کسی طرف نکل جاتا اور غیر معلوم طریقہ پر قریۂ "لینی" میں جا پہونچتا جو کبھی سوزآں اور جلبرت کا عشرتکدہ اور اب اِن دونوں کا مقبرہ تھا، وہاں وہ دو قبروں کے درمیان ایک ضعیفہ بیٹھی آہ و زاری کرتی نظر آتی وہ سمجھ لیتا کہ یہ ضعیفہ جلبرت کی غمزدہ ماں "کاترین" ہے اور یہ دونوں قبریں اسی کے ظلم و ستم کے دو شہیدوں یعنی غریب جلبرت اور معصوم سوزآں کی ہیں وہ یہ محسوس کر کے وہاں سے حیران پریشان بھاگتا اور زور سے چلاتا "رحم" "رحم" "بخشش بخشش"

بسا اوقات کسان، ان کی عورتیں اور بچے "مرکیز" کو وارفتگی، مدہوشی اور خود فراموشی کے عالم میں انہیں مقاموں پر پڑا دیکھتے، جہاں کبھی مرکیز کے ستم کے تیروں کا نشانہ غریب جلبرت پڑا رہتا تھا وہ کہہ اُٹھتے کہ خدا نے ظالم مرکیز سے غریب جلبرت اور مسکین سوزاں کا بدلہ لے لیا۔

اس کے لئے زندگی کی اِس آخری منزل میں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز پانی تھا جب کبھی کسی موج خیز دریا پر اس کی نظریں پڑتیں تو وہ پریشان اور بے چین ہو جاتا تھا اور اس میں کودنے کے لئے بے تحاشا دوڑتا مگر کوئی راہگیر دیکھ پاتا اور اُس کو اس مجنونانہ حرکت سے روک دیتا۔

مرکیز کا یہی حال مدت تک رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز معدودے لوگوں نے دریا میں اسی جگہ مرکیز کی لاش کو سطحِ آب پر تیرتا اور موجوں کے تھپیڑے برداشت کرتا دیکھ لیا۔ جہاں کچھ دن پہلے سوزاں کو نیم عریاں حالت میں دیکھ چکے تھے، وہ سب یک زبان ہو کر بولے

"آج انتقام مکمل ہو گیا"

اِس حادثہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر قریۂ لینی اور اُس کے آس پاس کے گاؤں کی بوڑھیوں کو آج تک یہ واقعہ یاد ہے۔ جب کبھی وہ اس کو دہراتی ہیں تو اُن کے دل غم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور جب کبھی کسی مرد کی شرارت سے اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اپنی قریبی رشتہ دار لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کو عبرت اور نصیحت کے لئے یہ واقعہ سنایا کرتی ہیں۔

(ترجمہ — از مصطفےٰ منفلوطی مصری)

خطبۂ صدارت

مشاعرۂ سالانہ بزمِ ادب بھساول کل برار، سی پی و خاندیس منعقدہ ۲۱ مئی ۱۹۳۹ء

از

ساغر نظامی

خطبۂ صدارت

مشاعرۂ سالانہ بزمِ ادب بھساول کُل برار سی پی و خاندیس ۲۱ مئی ۱۹۳۹ء

کسی مشاعرہ کی صدارت کے فرائض ادا کرتے ہوئے شاعری اور اس سے تعلق رکھنے والی باتوں کے متعلق کچھ عرض کرنا اتنا معمولی نہیں ہے جتنا عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں۔ خاص کر ایسی مجلس میں جس میں شعر و ادب کے تجربہ کار اور ماہر اصحاب موجود ہوں۔ شائد یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ میرے بجائے اس ادبی جلسے کی اہم صدارت کسی ایسے شخص کو بخشی جاتی جو اپنے ٹھوس تجربات سے آگاہ کر سکتا اور میں سکون کے ساتھ بیٹھ کر اسکے ارشادات سے فائدہ اٹھاتا! اور اگر بھولے سے یا بزمِ ادب کے اراکین کی نیکی کی وجہ سے یہ فروگذاشت ہو ہی گئی تھی تو کم از کم میرا فرض ہونا چاہئے تھا کہ میں اپنے سترہ سالہ خام تجربوں کی روح اور محدود فکر و مطالعہ کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کرتا مگر کیا محرومی ہے کہ ادھر آپ سے بھول ہوئی ادھر میری مجبوریوں اور مصروفیتوں نے اتنا موقع نہ دیا کہ میں کہنے کی طرح شاعری کے متعلق اس بزم میں کچھ کہہ سکتا ———— !؟ سچ ہے قدرت کے جبر و ظلم سے جکڑی ہوئی زندگی پر مجبور انسان کو ذرہ برابر قابو نہیں ———— !!

جس وقت میں نے بزمِ ادب کی دعوت کو منظور کیا اس وقت مصروفیتیں کم نہ تھیں لیکن ارادے نے کچھ گنجائشیں پیدا کر لی تھیں اور میرا خیال تھا کہ شاید میں شاعری کے متعلق اپنے اُن تمام خیالات اور تجربوں کو جامع صورت میں ظاہر کر سکوں گا جو ایک زمانے سے میرے دل و دماغ میں چکر لگا رہے ہیں لیکن ہائے مجبوری حالات نے ایسا پلٹا لیا کہ بجائے موتیوں کی مالا کے میں بکھرے اور ٹوٹے ہوئے موتی آپ کی خدمت میں نذر دے رہا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ شاعری ہی نہیں زندگی اور زندگی کی ہر جدوجہد اور جملہ معاشری و تمدنی کوششوں کا حاصل محض انسانی زندگی میں مسرت اور راحت ترقی اور بلندی پیدا کرنا ہے۔ اس کلّیہ کے ماتحت ہر آرٹسٹ کے آرٹ کا انتہائی مقصد بھی سوائے انسان کی خدمت کے اور کچھ نہیں۔ خواہ کسی فن کار کے فن کا مقصد وہی تسلیم کیوں نہ کر لیا جائے جو افلاطون نے بتایا ہے۔ یعنی اگر شاعری کا مقصد انسانی سوسائٹی میں مسرت ہی پیدا کرنا تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ کوئی معمولی فریضہ نہیں ہے کہ اس دُنیا میں جہاں قدم قدم پر جبر و ظلم

کا ایک ہنگامہ اور لوٹ کھسوٹ کی ایک قیامت برپا ہے، پوری انسانی سوسائٹی کو ایک لمحہ کے لئے مسرت سے ہمکنار کر دیا جائے۔
رومی نے کہا ہے کہ "شاعری جزو ایست از پیغمبری"
لیکن میرے ناچیز خیال میں یہ محض کارِ پیغمبری نہیں، بلکہ .... ایک نہایت لطیف قسم کی
"کبریائی" ہے۔ لیکن کیا بدقسمتی ہے کہ انسان اپنی آبائی محرومی کی بناء پر اس لطیف قسم کی کبریائی کے فیضان کو سمجھنے سے قاصر ہے اور
اسکی فطرت کی بدبختانہ عاجزی اس کو طاقت سے مرعوب ہونے کی ذلیل عادت ڈال چکی ہے۔ وہ اعلیٰ تصورات اور لطیف جذبات
سے اس قدر متاثر نہیں ہوتا جس قدر لاٹھی سے !؟

لاٹھی اور شعر ! ۔ دو کتنی مختلف چیزیں ہیں، یہی وہ اختلاف ہے جو ازل سے آج تک سیاست اور شاعری
کا رقیب بنا رہا اور موجودہ دُنیا کی رفتار تو یہ بتا رہی ہے کہ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنس اور اس کی خلاق تباہ کاریاں
ایک ایسے ماحول کا ساز و سامان جمع کر رہی ہیں جس میں شاید فنونِ لطیفہ کی تعریف بالکل ہی بدل جائے اور اس کے اصلی خط و خال
بالکل ناپید ہو جائیں۔

آئیے ذرا ان مسائل کو ایک ایک کر کے دیکھیں اور معلوم تو کریں کہ وہ کیا وجوہ و اسباب ہیں جن کی بناء پر ہمیں ایک بالکل عجیب انقلاب کا
سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ پرانی سماج صرف ایک طبقے پر مبنی تھی، شاعری، مصوری اور موسیقی یہاں تک علوم بھی عوام کی قسمت میں نہیں تھے
جو کچھ تھا وہ اعلیٰ طبقے کے افراد کے لئے مخصوص تھا، لیکن اب بہت بڑی حد تک سماجی نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور سماج ایک طبقے تک
محدود نہیں رہی بلکہ نئی سماج مختلف طبقوں سے مل کر ایک جماعت بنی ہے جس میں تعداد کے لحاظ سے عوام کا حصہ زیادہ ہے۔

اس نئے اور خوشگوار انقلاب نے تخیلی، لسانی اور ذہنی انقلاب پیدا کیا ہے اور آرٹ و علوم کا رشتہ براہِ راست زندگی سے جوڑ دیا ہے
اس ذہنی انقلاب نے ہمیں واقعیت نگاری کا احساس اور مفہوم بخشا ہے۔ جب کسی ملک کے ادب میں واقعیت نگاری کا آغاز ہوتا ہے تو کنوئیں
کی مٹی کی طرح شوخی کا ملبہ تو نکلتا ہے مگر تخیل فطری ضرور ہو جاتا ہے اور زبان درباری نہیں رہتی یعنی شاعر اور ادیب کو اس زبان میں اپنے خیالات
اور جذبات کا اظہار کرنا پڑتا ہے جسے لوگ زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں، اور ایسے موضوعات کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے جو آسمانوں کے بجائے
زمین پر پھیلی ہوئی حقیقتوں اور زندگی سے تعلق رکھتے ہیں
مصوّر کو تصویر میں ایسے رنگ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو کم از کم عوام کے ناسوروں پر عارضی مرہم تو ثابت ہوں !
اور مغنی کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ فن کی نزاکتوں کو نئی صورت دیدے۔
اونچے خیالات اور پاکیزہ جذبات کے نظم کرنے اور ان کی اشاعت سے آخر مقصد کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ انسانی کردار بلند اور
پاکیزہ ہو، ظاہر ہے کہ کسی سچے آرٹسٹ کا یہ محدود خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ فقط اونچے طبقے کے آدمیوں ہی کو بلند اور پاکیزہ کرے مگر ہوتا
یہی رہا کہ ہمارا ادب بادشاہوں اور امراء کی ملکیت بنا رہا، اس سلسلے میں اعلیٰ طبقے کے افراد کو موردِ عتاب قرار نہیں دیا جا سکتا پہلے زمانے
کی سیاسی نوعیت ہی یہ تھی اور سچی بات یہ ہے کہ انہیں کے ذوق اور سرپرستی کی وجہ سے ہر زبان میں اتنے وافر ادب کی تخلیق ہو سکی لیکن اسکے
ساتھ ہی ادب کو ایک بسیط غلامی کے دور سے بھی گذرنا پڑا، اور وہ چند محدود عنوانات اور اسالیب میں گھر کر رہ گیا، لیکن اب زمانہ ہزاروں
کروٹیں لے چکا ہے اور قدیم زاویہ ہائے نگاہ کی جگہ نئے فلسفوں اور نظریوں نے لے لی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ادب کی مشینری

ایک ایک پُرزہ بدل ہی جانا چاہیئے۔

اور شاید یہ درست بھی ہے کہ صدیوں کے پُرانے اور کرم خوردہ خیالات و تصورات موجودہ ترقی یافتہ انسانوں کی ضرورت اور فطرت کے مطابق نہیں ہیں ' بیسویں صدی میں وہ باتیں قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں جو سولہویں یا سترہویں صدی میں آیت و حدیث کا درجہ رکھتی تھیں۔

اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ شعر و ادب اپنے عہد کی مخلوق اور شاعر و ادیب اپنے ماحول و زمانہ کی پیداوار ہوا کرتا ہے اُردو شاعری پر اوّل اوّل دکن کے شیعہ فرمانرواؤں کے معتقدات کا اثر تھا' اور جب وہ دُکھیا جوان ہوئی تو مغلوں کی حکومت نے بوڑھی ہوکر دم توڑ دیا، یہی نہیں بلکہ وہ کس بَل جاتا رہا جس سے قسمتیں بنا کرتی ہیں، چنانچہ اُردو شاعری کے آغاز میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو زوال کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ غزل کے انتہائی عروج و زوال کا زمانہ غالب و مومن کا عہد خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ پورا عہد مسلمانوں کی زندگی کا آخری سانس تھا۔ دم توڑتے ہوئے انسان کی کسی بات میں جان نہیں ہوتی مسلمانوں کے زوال کے عہد کی غزل دراصل اس وقت کے ماحول کی پیداوار تھی اور اس عہد کے تمام شعراء کے محسوسات المناکی' اور بے اعتمادی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بہت ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے شاید کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عشقیہ شاعری ہمیشہ قوموں کے دورِ انحطاط میں عروج پاتی ہے۔ اُردو غزل نے جس قدر جلد ترقی کی وہ ترقی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو ایک سازگار ماحول ہاتھ آگیا تھا۔

تقریبًا دو صدی کے بعد ہندوستان کی سیاسی بیداری نے پہلے پہل سماج میں ان بنیادی تصوّرات کو شک کی نگاہ سے دیکھا جو ماضی نے اسکے لئے بطور ورثہ چھوڑے تھے اور جنہیں مٹانے یا جن کو سمجھنے کا خیال بھی کبھی فرد کو نہیں ہوا تھا۔

اپنے گرد و پیش کو اس طرح سمجھنے کا خیال جب سماج میں سختی کے ساتھ پیدا ہوا؛ تو سب سے پہلے جس چیز پر نظر گئی وہ مُلکی غلامی تھی۔ مسلمان رہبر ہوں یا ہندو لیڈر، سب کے سب پُرانی سماج اور اسکے اخلاقی رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ لہذا انہیں اس ملکی غلامی سے نجات پانے کا ذریعہ حال سے رجعت اور بغاوت میں نظر آیا، یعنی اک طرف مسلمان مفکرین نے کہا کہ یہ تمام مجلسی و سیاسی بیماریاں محض اس لئے ہیں کہ ہم سچے اسلامی نہیں ہیں تو دوسری طرف ویدانتی نیتاؤں نے بتایا کہ ہم نے اپنی سماجی و مذہبی روایتوں کو چھوڑ دیا ہے اس لئے ملک غلام ہے اور اسی لئے ہم ترقی بھی نہیں کر سکتے۔

مغرب اور مغربی کلچر اور اس سے پیدا شدہ غلامی سے رہائی حاصل کرنے کیلئے یہ نسخۂ اکسیر تجویز ہوا۔ ایک طرف اہنسا قرار دی گئی جو دراصل خود قدیم ترین اصول ہے اور جسے مہاویرازم اور بُدھ ازم کا نچوڑ کہنا چاہئیے، دوسری طرف مسلمانوں میں "احیائے اسلام" کی اسپرٹ پیدا ہوئی۔

ملک میں پیدا ہونیوالے اس شعور کو ہم نیم مذہبی سیاسی شعور کہہ سکتے ہیں۔ اس شعور کے نتیجے کے طور پر جو ادب اور شاعری پیدا ہوئی وہ بڑی حد تک مولانا حالی کے نیم مذہبی قومی تخئیل کی تکمیل تھی۔ اور میرے ناقص خیال میں اقبال و ٹیگور اس شعور کی صحیح پیداوار ہیں۔ اوّل الذکر پین اسلام ازم اور مؤخر الذکر ویدانتک کلچر کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔

یہ اور ان کی تقلید کرنے والے اپنے عہد کے نئے ادب پیدا کرنے والے کہلائے اور سماجی و سیاسی شعور کے لحاظ سے انکی شاعری کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً چکبست اور جوش۔

شروع شروع میں جوش کی شاعری بھی اکبر اور اقبال کی شاعری کی طرح مغربیت کے خلاف ایک تند و تیز آواز تھی۔ اسکے بعد قومی

ارتقا کا درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل سفر آپ کے سامنے ہی ہوا ہے، رات کی کہانی ہے، بار بار کیا دہراؤں؟ لیکن شاعری اور ادب کی انقلابی روح محض یہاں آ کر رک نہیں گئی، وہ اک ہوا کا نہ رکنے والا تیز جھونکا تھی جو سارے چمن کو بیدار کرتی ہوئی بالکل نئے پودوں کے قریب پہنچ گئی، اور ان کو تخلیق کی گود میں چونکا دیا، ایک بالکل نیا باب کھلا۔ یوں تو پہلے ہی قدیم ماحول کے اثر سے اُردو نثر و نظم میں کافی آفاقیت پیدا ہو چکی تھی، اُردو و ہندی نثر میں پریم چند جس کے علم بردار تھے، اور ترقی یافتہ نظم میں اکبر و اقبال چکبست جوش وغیرہ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو غیر شعوری طور پر نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں جس قدر آفاقیت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے وہ اُردو شاعری کے کسی عالیہ شاعر کے کلام میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اقبال کا ماحول حجازی ہے اور چکبست کے یہاں تکمیل نہیں، جوش کے کلام میں آفاقیت اور انفرادیت کا رنگ جا بجا پایا جاتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر ان کے ایوانِ شاعری ...... کا سارا ساز و سامان ایرانی معلوم ہوتا ہے۔

زمانہ کچھ اور آگے بڑھا۔ سماج کے نئے شعور اور تقاضوں نے ہماری شاعری میں واقعیت نگاری کا نیا باب کھولا، یہ بات تو مبارک تھی مگر شعرا کی تمام تر توجہ محض رومانی واقعیت نگاری ہی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ زیادہ سے زیادہ ترقی جو ہوئی تو وہ صرف اس قدر کہ کسان اور مزدور کو شاعری میں خاص مقامات مل گئے کم از کم اُردو شاعری تو کسان اور مزدور کی ڈائری بن کر رہ گئی۔ یہ احساس اور شعور بھی نہایت ہی مبارک تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس شاعری کی زبان قدیم درباری ہی رہی، اس میں جن طبقات کی نمائندگی کی گئی تھی، وہ ان نظموں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے! ہونا یہ چاہیئے تھا کہ نئی شاعری میں ہمہ گیری پیدا کرنے کے لئے خیال کے ساتھ زبان میں بھی انقلاب کیا جاتا اور وہ آفاقیت پیدا کی جاتی جو مزدور اور کسان کی نمائندگی کو زیادہ مکمل کرتی۔

آپ سوچ رہے ہونگے، یہ آفاقیت کیا بلا ہے۔ آفاقیت کے کئی مفہوم ہیں لیکن اصطلاحی طور پر میری مراد شاعری میں مقامی رنگ پیدا کرنے اور اُردو شاعری کو جو ایرانی تشبیہات و استعارات اور ساز و سامان سے بھری پڑی ہے آزاد کر کے ہندوستانی استعارات و تشبیہات اور ساز و سامان سے آراستہ کرنے سے ہے اس طرح ہماری شاعری میں وہ انفرادیت پیدا ہو سکتی ہے جو کسی قوم کی بلند اور ترقی یافتہ شاعری کا طرۂ امتیاز کہی جا سکتی ہے!؟

نفسیاتی طور پر بھی یہ نہایت ضروری اور درست معلوم ہوتا ہے۔ ہم تاثرات کو کامیابی ...... کے ساتھ اُسی زبان میں ادا کر سکتے ہیں جو ہماری مادری زبان ہوتی ہے اور انہیں چیزوں سے موضوع کے اجزاء کو تشبیہ دیتے ہیں جو ہمارے بہت آس پاس ہوتی ہیں، یا جنہیں ہم دیکھ چکے ہوتے ہیں! فنی طور پر بھی تشبیہ کی صحیح ترین تعریف یہی ہے کہ وہ قریبی ماحول سے تعلق رکھتی ہو!

کوئی شک نہیں کہ فن میں اس خیال کو کلیہ قطعی کی حیثیت نہیں دی جا سکتی، شاعر کا تخیل غیر مرئی چیزوں کی تخلیق کرنے میں بھی آزاد ہے لیکن پھر بھی دیکھی اور چھوئی جانے والی چیزوں کو وہ محسوس اور دیکھی جانے والی چیزوں سے تشبیہ دینے کیلئے قدرتی طور پر مجبور ہے۔ بہرحال نیم مذہبی سیاسی شعور کا اثر ہندوستان کی دیسی زبانوں کے ادب پر بہت گہرا پڑا، اور اس تغیر نے اُردو شاعری کی تو بالکل کایا پلٹ ہی کر دی شاعری کے اس نئے اسکول نے تقریباً ہر کسی کو متاثر کیا یہاں تک کہ لکھنؤ اسکول بھی جس کو اپنی انفرادیت پر بڑا زعم تھا نہ بچ سکا، لیکن ابھی اس اسکول کی امکانی ترقیوں کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ زمانہ کی رفتار نے اس کو بھی قدیم اور بے مصرف کر دیا۔ سیاسی و ملکی شعور نے ترقی کی اور کئی منزلیں طے کیں اور سوچنے والوں کو یہ احساس ہو گیا کہ مرض کا علاج غلط تجویز کیا گیا ہم زمانے اور واقعیت سے بہت پیچھے ہیں۔

سیاسی تجربات نے یہ بھی بتایا کہ ملک کا مرض اخلاقی نہیں اقتصادی ہے اس مرض کو معلوم کرتے ہی سوشلزم کے ابتدائی خیالات عوام میں پھیلنے شروع ہوئے اور گو انہیں پھیلانے کی پوری طرح کوشش نہیں کی گئی تاہم نوجوان طبقے میں اس نئے خیال نے جلد ہی اپنی جگہ پیدا کر لی۔ اس نئے شعور کا اثر ہندوستانی ادب کے ہر گوشہ پر پڑا، پڑ رہا ہے اور شاید زیادہ پڑے گا!

میرا خیال ہے کہ حقیقی شاعر کی قوتِ متاثرہ کبھی محدود نہیں ہوتی، دُنیا کے جتنے بڑے شاعر گذرے باوجود اسکے کہ وہ مختلف زمانہ اور ماحول کی پیداوار رہے۔ لیکن ان کے کلام میں قدرے عوام کی نمائندگی اور ہمہ گیری بھی پائی جاتی ہے۔ فارسی میں ابن یمین اور اُردو میں خاصکر نظیر اسکی خاص مثالیں ہیں۔

جس وقت تک شاعر کا موضوعِ سخن محض حسن و عشق تھا اس وقت تک نقاد اس کو حسن و عشق کے دائرے ہی میں دیکھ اور پرکھتا تھا۔ لیکن موجودہ ماحول نے شاعر کو حسن و عشق کے منفی سے کچھ زیادہ حیثیت دیدی ہے اس لئے پرکھ کا معیار بھی اونچا اور کڑا ہوگیا ہے۔ یعنی فکرِ انسانی اور ذہن و دماغ ترقی او جدّت کی جس منزل تک آگے چلے جارہے ہیں اس منزل میں پاؤں چلتے، ادب بے معنی شاعری کی گنجائش نہیں؛

کوئی حقیقی شاعر اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر وہ خلاق اکبر نہیں ہے تو نئی تخلیق کیلئے اس کو اپنے معتقدات کو مرتب کرنا پڑیگا اور قدامت و جدّت کے اختیار کے بعد وہ اپنی شاعری سے پیدا ہونیوالے اثرات پر ضرور غور کرے گا۔ شاید ایسے ہی شاعر کیلئے کہا گیا ہے کہ اس منزل پر پہنچکر وہ گرد و پیش کا غلام نہیں رہتا بلکہ خود ایک ماحول پیدا کرتا ہے۔

شاعر کے لئے احتساب اور فکر لازمی ہے، حقیقی شاعر اپنے معتقدات کے بارے میں بہت ذی ہوش ہوتا ہے، اس کا مذہب یہ ہے کہ شاعری کو قومیت، رنگ و نسل، ملکی و غیر ملکی بندھنوں سے آزاد رکھے اور جس طرح فطرت کا حُسن عام ہے اسی طرح شاعری کی برکتوں کو بھی عام رکھے۔

حقیقی شاعر کا دین انسانیت ہوتا ہے اور اسکا مذہب ان تمام دبے ہوئے حلقوں کو اُبھار دینا، جو کسی بوجھ سے دبے ہوئے ہوں؛

یہ بکھرے ہوئے خیالات ہیں جن سے حاصل اخذ کرنا آپ کا کام ہے، گو میرے لئے یہ سعی لاحاصل ہی ثابت ہوئی؛

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک سال پہلے اسی جگہ سے موضوعاتِ شعر و شاعری کی ترمیم و تجدید کے عنوان سے اس مشاعرہ کے گذشتہ صدر[1] محترم نے اپنے خیالات سے مستفید فرمایا تھا، ان کے تمام خطبۂ صدارت کی روح یہ تھی کہ موضوعاتِ شعر و شاعری کی تجدید کی جائے؛ اور تجدید سے غالباً ان کا مقصد محض یہ تھا کہ اُردو شاعری سے موضوعِ جام و شراب قطعی خارج کردیا جائے۔

جہانتک شاعری میں موضوعات کی ترمیم و تنسیخ کا تعلق ہے، یہ ایک صریحی حماقت ہے کہ شاعری کو میکینیکل بنادیا جائے، شاعر کی فکر کسی قید کی پابند نہیں ہوسکتی، شاعری کو خارجی شئے تصور کرنا شاعری کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے؛ شعراء سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کہیں اور کہیں یہ نہ پھیر تاروں کا ذکر کریں اور روشنی کا نام لب پر نہ لائیں، محبت کے گیت گائیں اور ترغیبات جنسی سے انکار کریں، ایک مہمل مطالبہ ہے، کوئی صاحبِ عقل یہ مطالبہ شاعر جیسی عظیم اور آزاد و عالم شخصیت سے نہیں کرسکتا؛ شاعری شاعر کے وجود سے تعلق رکھتی ہے اور شاعر کا وجود اس کی روح کا پرتو ہے جو اسکے معتقدات، تخیل، جذبات، محسوسات اور خاص خاص فطری محرکات کی گود میں پرورش پاتی ہے؛

---

[1] مولانا سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی۔

موضوعات میں تنسیخ و ترمیم کو کہا، یہ مطالبہ کرنا کہ شاعری قومی ہو یا انقلابی، یہ بھی ایک نہایت مہمل مطالبہ ہے اندازہ یہ کرنا چاہیئے کہ
بھی قومی یا انقلابی ہے، جب تک شاعر کا خونِ دل شعر کو رنگین نہیں کرتا شعر تاثیر سے محروم رہتا ہے۔

میں مُلا ہوں نہ محتسب اور حرام و حلال کو سمجھنے کی قابلیت بھی نہیں رکھتا، اس لئے میرا یہ منصب نہیں کہ میں خطیب ممدوح کی تجویز کہ
جام و شراب "پر دینی نقطۂ نگاہ سے کوئی تبصرہ کروں، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان کی تجویز کے پس منظر میں ایک دلیل ایسی نہیں جس کی بناء
شاعری سے شراب کے ذکر کو خارج کر دیا جائے؛ یہاں تک کہ دلائل کے علاوہ تاریخی شواہد بھی بغیر حوالہ کے ہیں؛
مجھے تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہی نہ تھا، اس لئے کہ شاعری میں شراب
ذکر اکثر مقامات پر حقیقی معنی میں نہیں کیا جاتا، ہم استعارۃً اور مجازاً تصور اور مفہوم میں کیفیت پیدا کرنے کیلئے بادہ و ساغر کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

فارسی شاعری میں ساقی اور بادہ کے پس منظر میں کیف کی ایک ایسی پُراسرار دُنیا پوشیدہ ہے جس کی نازک اور رنگین کرنیوالی
تفسیر کا بار زبان و بیان برداشت نہیں کر سکتے تو کیا ہم اس سے دست بردار ہو جائیں۔
اس تجویز کو تسلیم کرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ خیام و کلامِ خیام کے تمام انگریزی و فرانسیسی ترجموں کو آگ لگا دی جائے اور خواجہ
حافظ کے دیوان کو انڈین اوشن میں غرق کر دیا جائے۔ غرضکہ تمام مشرقی شاعری کے ایک پُرکیف عظیم عنصر کو مٹا کر شاعری کو نور نامہ اور راہِ
نجات بنا دیا جائے۔ سبحان اللہ۔

محترم خطیب کو اس سے بھی زیادہ عجیب تجویز پیش کرنے کا حق حاصل ہے لیکن انہیں یہ تاریخی حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے
کہ روس کی بالشویک حکومت بھی اس قسم کے تجربے میں ناکام رہی، اور پانچ سال کے بعد اس نے بالآخر روس کے ادبی اداروں کو جنہیں
نے حکومتی کنٹرول میں لے لیا تھا آزاد کر دیا۔ اب زبان و بیان پر کوئی پابندی نہیں؛

"جدید موضوعات" کے عنوان سے جو دس نئے موضوعاتِ شعر سیماب صاحب نے پیش کئے تھے۔ ان میں سخت قسم کا تضاد ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں۔
(ا) اُردو شاعری میں ایسے جذبات و احساسات کا اظہار جو "بین الاقوامی اتحاد" پیدا کر سکیں۔
لیکن موضوع نمبر ۹ میں وہ چاہتے ہیں کہ
(۹) وطنیت اور قومیت کی تبلیغ بھی شاعری میں ہو)
یورپ نے جو نظریۂ قومیت پیش کیا ہے اسکے مظاہر یورپ کی سیاسیات میں نظر آ رہے ہیں۔ رہی وطنیت سو وہ اپنے حقیقی معنی میں نہایت محدود جذبہ ہے
بالنتیجہ وطنیت و قومیت جیسی محدود تحریکات ہی نے اس وقت تک اقوامِ عالم میں بین الاقوامی اتحاد پیدا نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ آگ اور
پانی ایک جگہ ہو سکیں؛
موضوع نمبر (۳) بھی یہ بتاتا ہے کہ اس کا واضع علم النفس فلسفۂ جذبات اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ و تخلیق سے قطعی ناواقف ہے۔ یہ کیسی تحریر
ہوتا ہے کہ:-
(۳) حُسن و محبت کے بلند ترین جذبات جو جنسی تعلقات اور نفسانیت سے بالاتر ہوں؛

"حسن و محبت" کی قید کے ساتھ کتنے ہی بلند نہیں جذبات ہوں وہ جنسی کیفیت سے خالی نہیں ہو سکتے۔ یہ نفسیاتی کلیہ ہے۔ فنونِ لطیفہ (جس میں مصوری، موسیقی اور شاعری شامل ہیں) کی اصل بنیاد جنسی تقاضات ہی ہیں، اس جذبہ کی یہ ساری بہار ہے، جو اصحاب اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو زیادہ جانتے ہیں!؟

باقی ۷ موضوعات میں بھی موٹے موٹے الفاظ کی بھرمار ہے جو ممدوح کا پڑانا مشغلہ ہے، باقی کوئی بات مناسب اور متناسب نہیں ہے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

(۱۰) تدبیرِ منزل اور تہذیب و تربیتِ اخلاق کی تلقین۔

اور یہ سب کچھ وہ "غزل" میں چاہتے ہیں۔ بھلا آپ غور تو کیجئے کہ کہاں لکڑی چولھا اور سینا پرونا (تدبیرِ منزل) اور کہاں غزل!؟ کہاں تربیتِ اخلاق کی تلقین اور کہاں محبت کے گیت، ________________ !؟ ان کو جاننا چاہئے کہ غزل صرف اس گیت کو کہتے ہیں جس میں محبت کے جذبات بے ساختہ نظم کئے جائیں اور بس؛

یہ چند بکھرے ہوئے خیالات تھے جن کو میں نے آج ہی بمشاورل میں ترتیب دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ناقص اور غلط ہوں، بہرحال ٹھیک لگیں تو شکریہ؛ ورنہ اسکے اظہار سے ہرگز میرا مقصد کوئی "قدغن" نہیں ہے؛

غور کیجئے تو اس قسم کی پابندی ادب کی قدرتی خلاقیوں کیلئے زہر ہے اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی شاعر کو اسکے دماغ و دل فطری ترنگ کے خلاف مجبور نہیں کر سکتی؛

معاف کیجئے، میں نے آپ کا بہت دماغ کھایا، لیکن اس اظہارِ خیال کا سہرا آپ ہی کے سر ہے، میں بزمِ ادب بمشاورل کا شکر ادا کرتا ہوں تو زیادہ سے زیادہ ایک اُس آدمی کا اور اضافہ ہو جائیگا جو بزم اور اسکے اراکین کی مسافر نوازیوں کے شکر گزار ہیں۔ لیکن چُپ رہوں تو خصوصیت اور وحدت قائم ہو جائیگی؛
میں وحدت اور خصوصیت کا پُجاری شکریہ ادا کرنے سے بالکل انکار کرتا ہوں؛

(ساغر نظامی)

دو سال ہوئے انگورہ میں مجھے اتاترک سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، دوران گفتگو میں عصمت انونو آگئے، جب میرا ان سے تعارف کرایا گیا تو غازی نے فرمایا "ہز اکسیلنسی وزیر اعظم اس رقم کا بندوبست کریں گے، آپ دیکھ لیجئے گا"۔ عصمت ہی اس زمانہ میں وزیر اعظم کا اہم کام انجام دیتے تھے۔

۱۹۱۸ء میں (Caucasus) کوہ قاف کے محاذ پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی، کرنل عصمت اور جنرل مصطفی کمال کی حیثیت سے کمال تدابیر بتایا کرتے تھے۔ انھیں پورا کرنا عصمت کے ذمہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد جب کمال کے دماغ میں سلطان اور پرانی طرز حکومت سے بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ ان کو سلطان نے اناطولیہ بھیج دیا کہ اس ترکی فوج کو غیر مسلح کریں، جو دول متحدہ کے خیال میں (جس نے سلطان و خلیفہ کو سخت خوف میں مبتلا کر رکھا تھا) صلحنامہ کی دفعات کے خلاف اس وقت ہتھیار بند تھی۔ جانے کو کمال گئے لیکن اس مرکز سیاست پر ایک معتمد معاون کو چھوڑ گئے۔ دفتر جنگ میں انھوں نے نائب معتمد کی جگہ پر عصمت کو فائز کرا دیا تھا۔

بجائے اس کے کہ فوج کے اس دستہ کو غیر مسلح کریں انھوں نے وہاں جا کر ایک منظم بغاوت کی۔ قسطنطنیہ میں جو واقعات رونما ہورہے تھے ان سے عصمت ایک خاص زبان کے ذریعے کمال کو مطلع کرتے رہے۔ اور اس ہوشیاری کے ساتھ کہ کمال نے ایک سال تک خفیہ طور سے اپنی تدابیر پر عمل کیا۔ جب دول متحدہ کو ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوجی دستے بھیجے۔ عصمت فوراً کمال سے جا ملے، یہ سنہ ۱۹۲۰ء کی بہار کا زمانہ تھا۔

انگورہ میں کمال نے ایک باغی سلطنت قائم کر لی تھی، اس میں عصمت کو ایک وزیر کا عہدہ مل گیا۔ اتنے میں ہی یونانیوں نے حملہ کر دیا، کمال نے مغربی حصۂ فوج کی کمان ان کے سپرد کر دی۔ انونو کے مقام پر عصمت کو فتح حاصل ہوئی، اس طرح یونانیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ عصمت نے ابھی اپنے نام کے ساتھ انونو کا اضافہ کیا ہے، جبکہ اہل ترک نے اپنے ناموں کے ساتھ لقب [illegible] ایزاد کئے، یوں کمال کمال اتاترک ہوئے اور عصمت سے عصمت انونو۔

جب ان کو کمان حاصل تھی انھوں نے منذروتیا کے مقام پر اہل برطانیہ سے صلح کی بات چیت کی، لائڈ جارج کی ہمدرد یونان پالیسی نے آخر اس کیلئے اہل برطانیہ کو تقریباً مجبور کر ہی دیا۔ ازاں بعد انھوں نے دول مغرب سے ایک نئی صلحنامہ کی گفت و شنید کی جس سے صلحنامہ سیورے کی بیخ کنی مقصود تھی، جس کی سلطان کی جانب سے منظوری نے ترکی قوم پرستوں کی بغاوت کو بھڑکایا تھا۔

جب اس گفت و شنید کے لئے وہ لاسین پہنچے تو انھیں لارڈ کرزن سے سابقہ پڑا جو اس زمانہ میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ مسولینی سے اطالیہ، اور پوان کیر کے فرانس کے نمائندگان کرزن کی ہمراہی میں تھے۔ عصمت کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان لوگوں کے لئے بے ہتھے کی کرسیاں خالی پڑی تھیں حالانکہ سیاست دان مغرب ہتھے دار کرسیوں پر آرام سے تشریف فرما تھے۔ عصمت اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے اور گفت و شنید جاری کرنے سے اس وقت تک انکار کر دیا۔ جب تک ویسی ہی کرسیاں ترکی وفد کے اراکین کیلئے مہیا نہ کر دی جائیں اس کانفرنس میں انھوں نے آبنائے کی آزادی طلب کی۔ اس معاہدہ کی تنسیخ چاہی جس کی رو سے ترکی کے غیر ملکی باشندے وہاں کے قانون و قواعد سے بری کر دئے گئے تھے۔ جب کانفرنس میں انھوں نے یہ جتایا کہ وہ ترکی کے حصے بخرے کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو کرزن نے ان مطالبات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا، اور کانفرنس اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

کرزن کو یوں اپنی ذلت ناگوار گزری، اس نے جل کر کہا "تمہیں دولت کی ضرورت ہے، دولت میرے ملک میں ہے، جب بھی تم اس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پھیلاؤ گے، میں ان اقرارناموں میں سے ایک تمہارے حوالے کر دیا کروں گا۔ جن کو اس وقت تم نہیں مانتے"۔ یہ ایک خاصی دھمکی تھی لیکن عصمت کا مشرقی وقار آڑے آیا۔ انھوں نے نرمی سے کہا "مجھے اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، وقت اس کا جواب دیگا"۔

موسم خزاں تک آپ دیکھینگے کہ ہٹلر یوگوسلویکیا پر قبضہ کرچکا ہوگا - اسکے بعد گریس پر قبضہ کرے اور گریس کے بعد مشرق قریب میں
ے کے راستے مکمل جائینگے - اسوقت ہندوستان پر بھی سخت وقت آئے گا - صدر کانگریس سوبھاش چندر بوس کا یہ کہنا غلط نہیں ہے
ں غیر ملکی خطروں سے بے خبر نہ رہنا چاہئے " یہی وہ وقت ہوگا کہ جب ہندوستان کو برطانیہ کی شاطرانہ چالوں کے سامنے نہ صرف ٹھہرنا ہوگا
اُسے پوری مات دینی ہوگی - اروِن گاندھی پیکیٹ " کے مہلک نتائج ہمارے سامنے ہیں - مجھے یقین ہے کہ ہمارے رہنما پچھلی غلطیوں
ے تجربوں سے فائدہ اُٹھائیں گے - ذرا سی لغزش سے ہماری پچاس سالہ جد و جہد بے معنی ہو جاسکتی ہے - ہندوستانی قوم کو اپنی آزادی
ر صورت حاصل کرنی ہے - اور برطانیہ سے آزاد ہو کر دوسرے ملکوں کے زیر نگیں ہرگز نہیں ہونا ہے - اسلئے اور بھی ہوشیاری
ے چلنے کی ضرورت ہے - ہمارے لیڈروں کو ایک ہو کر کام کرنا چاہئے - ہندوستان بھوکا اور جاہل ہی لیکن اسلئے نہیں کہا سکی
ک اور جہل سے لیڈروں کو بقائے دوام ملے - تری پورہ میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد بوڑھے اور جوان لیڈروں کے جو بیانات
ری نظر سے گذرے اسکو پڑھکر میں نے خون کے آنسو گرائے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے کرتا دھرتاؤں میں بھی وہ اعتماد
اتحاد کی روح نہیں ہے جو ایسی اہم جماعت کے لئے نہایت ضروری ہے -
ہیں چاہئے کہ ہم کانگریس سے ایسے تمام افراد کو وہ چاہے بوڑھے ہوں چاہے جوان ہٹادیں جو اپنے نفس کو جنتا کے مفاد پر
یح دیتے ہیں -

ساغر

۵۳

گہ کی تنگی کی وجہ سے دو نہایت ضروری نوٹ "چین و جاپان" اور "سوویٹ روس کی جمہوریت" اور "مسئلہ فلسطین کا حل" شائع ہونے سے
رہ گئے جسکا افسوس ہے -